ہزار داستان
انوار علیگی

وہ ایک عجیب رات تھی۔

آسمان کی پیشانی پر چاند کسی دلہن کے ٹیکے کی طرح چمک رہا تھا۔ پورے چاند کی رات تھی۔ ریت کے سمندر پر چاندنی کسی چاندی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ پھر بھی یہ ایک وحشت ناک رات تھی۔

ایسی روشن رات اور ایسی بھیانک؟

جب دلوں پر وحشت برستی ہو۔ اگلے پل کی خبر نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے تو چاندنی کیا کرے گی۔ چاند کا حسن کون دیکھے گا۔ باہر کا موسم اسی وقت اچھا لگتا ہے جب آدمی کے اندر کا موسم اچھا ہو۔ اس کا دل پُرسکون ہو۔

لق و دق صحرا...... کسی دبیز قالین کی طرح زمین پر بچھی ریت، ٹھنڈی ہوا ہولے ہولے بہتی ہوئی، روشن چاند کسی حسینہ کے چہرے کی طرح چمکتا ہوا...... لیکن اس دلکش رات سے محظوظ ہونے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ جو تھے ان کی آنکھوں میں خباثت بھری ہوئی تھی یا آنسو یا پھر نیند۔

کسی کی آنکھ میں آنسو تھے تو کوئی سو رہا تھا۔ جس کی آنکھیں بند تھیں اس کی قسمت کا جگنو اس کی زندگی میں اندھیرا پھیلانے والے تھے۔ اس معصوم کا کیا قصور تھا۔ اس معصوم کا کوئی قصور نہ تھا، ابھی تو اس کا نام بھی نہ رکھا گیا تھا۔ اس دنیا میں آئے ہوئے اسے ہوا ہی کتنا وقت تھا۔

بس ایک دن!

اس ایک دن نے اسے یہ دن دکھا دیا تھا کہ اس کا پالنا اونٹ پر کسا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر جاتی تھی کہ اس معصوم کو اس پالنے میں ڈال کر اونٹ کو ہنکا دیا جانا تھا۔

یہاں دو اونٹ تھے۔ دوسرا اونٹ اس مظلوم کے لئے تھا جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی

تھی۔ اس کا رُواں رُواں چیخ رہا تھا مگر ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ ایسی بے آواز چیخ کو کون سنتا، یہاں تو چیخنے والوں کی کوئی نہیں سنتا۔ دوسرے اونٹ پر کاٹھی باندھی جا رہی تھی، اس کاٹھی پر اس آنسو بھری آنکھوں والی مظلوم عورت کو بٹھا کر اونٹ کو ہانک دیا جانا تھا۔

یہاں تین گھوڑے بھی تھے۔ دو گھوڑوں کی پیٹھ خالی تھی، ان کے سوار، اونٹوں کو تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے جب کہ ایک گھوڑے پر گھڑسوار موجود تھا۔ اس کا انداز ہی نرالا تھا۔ وہ پچاس پچپن سال کا ایک مضبوط کاٹھی کا شخص تھا۔ اس کا لباس راجاؤں والا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر سیدھی کمر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی گول آنکھیں کسی اُلو کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے اپنی مونچھ کو بَل دے رہا تھا۔ وہ ایک نشے میں چُور شخص تھا، اسے اپنی دولت کا نشہ تھا۔ وہ ایک فرعون تھا اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا۔

ایسے شخص کا نام روشن رائے تھا۔ وہ نام کا روشن تھا اس کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے اپنی مونچھ چھوڑ کر ہاتھ سیدھا کیا اور بھیانک آواز میں دھاڑا۔

''جلدی کرو۔''

اس کی کرخت آواز سن کر وہ دونوں گھڑسوار جو اس کے نمک خوار تھے اور تیزی سے اپنا کام نمٹانے لگے۔

پھر جلد ہی پالنے کو اونٹ کی پیٹھ پر کس دیا گیا اور اس کی دُم میں ایک بڑی گھنٹی باندھ دی گئی۔ دوسرا اونٹ بھی تیار ہو گیا تھا۔ اس پر کاٹھی باندھی جا چکی تھی اور ایک بڑی گھنٹی دم سے لٹکائی جا چکی تھی۔ کام پورا کر کے وہ دونوں گھڑسوار روشن رائے کے سامنے مؤدبانہ آ کھڑے ہوئے اور سینے پر ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر باری باری بولے۔

''سرکار، میرا اونٹ تیار ہے۔''

''مالک، میرا اونٹ بھی تیار ہے۔''

''جاؤ پھر روانہ ہو جاؤ۔'' روشن رائے کی کرخت آواز رات کے سناٹے میں گونجی۔

وہ دونوں نمک خوار واپس پلٹے۔ سامنے کھڑی ہوئی عورت جو غم سے نڈھال تھی اور آنے والے وقت کا تصور کر کے جس کا دل کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں نیر اور دل میں پیوست تیر تھا جس کی دنیا اندھیر تھی، اس عورت کے سینے سے لگا اس کا لختِ جگر جو آنے والے وقت سے بے خبر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا، اس نمک خوار نے ایک جھٹکے سے چھین لیا اور اونٹ کی طرف لے چلا۔

ممتا تڑپ اُٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس نمک خوار سے اپنا بچہ لینا چاہا لیکن دوسرے نمک خوار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دوسرے اونٹ کی طرف لے چلا۔

اب اس عورت کے ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ اُٹھی۔ اس کی دکھ میں ڈوبی ہوئی آواز لق و دق صحرا میں گونج اُٹھی۔ صحرا کا دل چیر گئی۔

''روشن رائے تو نے مجھ سے میرا بچہ چھینا ہے، مجھے برباد کیا ہے، یاد رکھنا ایک دن تو بھی برباد ہو جائے گا۔ تیرا بچہ بھی کوئی تجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ یہ میری بددعا ہے۔ ایک ماں کی بددعا۔''

اس دکھ بھری فریاد کے جواب میں روشن رائے کا ایک بھیانک قہقہہ گونجا۔

ماں کی گود چھنتے ہی اس ننھی بچی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر ایک دلدوز چیخ ماری اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ روشن رائے کے نمک خوار نے اس بچی کے رونے کی کوئی پروانہ کی۔ اس نے بچی کو اونٹ پر کسے پالنے میں ڈالا اور اونٹ کی دُم پکڑ کر اسے ہلا دیا۔ اونٹ ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔

تب وہ نمک خوار واپس پلٹا۔ تیزی سے نزدیک کھڑے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اونٹ کے نزدیک آ کر اس نے اپنے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور اس کی دم زور سے ہلائی۔ وہ اونٹ ایک سمت تیزی سے دوڑنے لگا۔

بچی کے رونے کی آواز، اونٹ کی دُم میں بندھی گھنٹی کی ٹن ٹن۔ چاندنی رات اور ریت کا سمندر ایک عجیب ہولناک منظر تھا۔

وہ عورت اپنی بچی سے بچھڑنے کے اس دلخراش منظر کی تاب نہ لا سکی۔ وہ لڑکھڑا کر ریت پر گر پڑی۔ وہ نمک خوار جو اسے ہاتھ پکڑ کر دوسرے اونٹ کی طرف لئے جاتا تھا۔ اس نے عورت کا ہاتھ نہ چھوڑا اور ریت پر گھسیٹتا ہوا اسے اونٹ کی طرف لے چلا۔

نمک خوار نے اونٹ کے نزدیک پہنچ کر جلدی سے اس عورت کو اُٹھا کر کاٹھی میں ڈالا۔ آواز نکال کر اونٹ کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر اونٹ کو مخالف سمت میں دوڑا دیا۔

اب صحرا میں دو گھنٹیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ یہ دونوں آوازیں مخالف سمت سے آ رہی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے یہ آوازیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ نہ وہ اونٹ رہے اور نہ ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے گھڑسوار، دونوں طرف دھند رہ گئی۔

لق و دق صحرا میں اب اکیلا روشن رائے رہ گیا تھا۔ چاند اس کے پیچھے تھا اس لئے اس کے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی تھی۔ اونٹوں اور گھڑسواروں کے جانے کے باوجود وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر دونوں سمتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کیلئے پھر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور ایک خباثت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ اس نے اپنی مونچھ کو ایک خاص انداز سے مروڑا اور گھوڑے کو ایڑ دے کر اس کا رخ موڑا اور پھر چند لمحوں میں اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ پیچھے اُڑتی ہوئی ریت رہ گئی تھی جو چاند کا روشن چہرہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

جب ریت کا سمندر عبور کر کے روشن رائے اپنی حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے فوراً اپنے گھوڑے کو واپس موڑا اور آہستہ آہستہ حویلی کی دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ حویلی کے مالک کو واپس پلٹتے دیکھ کر حویلی کے دو نمک خوار اس کے گھوڑے کے پیچھے پوری رفتار سے دوڑنے لگے۔

روشن رائے اپنا گھوڑا دوڑاتا، دیوار کے ساتھ چلتا حویلی کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنی مونچھ کو بل دے کر آبائی قبرستان کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اسے قبرستان کا گیٹ کھلا ہوا دکھائی دیا۔ وہ گھوڑا تیزی سے دوڑاتا گیٹ میں داخل ہوا۔

پھر اس نے گھوڑا روک کر قبرستان کے چاروں طرف نظر ڈالی۔ قبرستان پر ایک پُر ہیبت سناٹا طاری تھا۔ اس قبرستان میں پچاس ساٹھ قبریں بنی ہوئی تھیں اور ایک وسیع علاقہ خالی پڑا تھا۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک پیٹرومیکس کی روشنی نظر آئی۔ وہ گھوڑے کو آہستہ روی سے دوڑاتا روشنی کی جگہ پر پہنچ گیا۔

وہاں اس کے تین ملازم موجود تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک ملازم جو پستہ قد اور موٹا تھا، آگے آیا اور روشن رائے کے مقابل ہاتھ باندھ کر اور جھک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں رولی...... کیا ہوا؟ کام ٹھیک طرح ہو گیا؟'' روشن رائے نے پوچھا۔

''جی سرکار'' رولی نے اپنے بائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

روشن رائے نے گھوڑے سے اُترنے کا تکلف نہیں کیا۔ اس نے گھوڑے کو تھوڑا آگے بڑھایا اور بیٹھے بیٹھے ''کام'' کا جائزہ لیا۔

اس کے سامنے دو تازہ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک قبر چھوٹی تھی اور ایک بڑی۔

قبروں کا جائزہ لے کر اس نے گردن ہلائی اور پھر اپنا گھوڑا موڑ کر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ رولی گھوڑے کے ساتھ چل رہا تھا۔

''ٹھیک ہے رولی...... اب تم جاؤ...... یہاں ایک بندے کو چھوڑ دینا۔ وہ ذرا قبرستان کا خیال رکھے گا۔ ادھر کوئی جانور مانور نہ گھس آئے۔ بات کو سمجھے کہ نہیں۔'' روشن رائے نے اپنی ایک مونچھ کو بل دیا۔

''سمجھ گیا سرکار۔'' رولی فوراً بولا۔

''بس تو پھر جاؤ...... آرام کرو، میں بھی آرام کرتا ہوں آج تو کچھ لمبی ہی شہ سواری ہو گئی۔''

''جی سرکار۔'' رولی چلتے چلتے رک گیا اور جب روشن رائے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تو وہ قبروں کی طرف پلٹ گیا۔

قبرستان کے دروازے پر وہ دونوں نمک خوار کھڑے ابھی ہانپ رہے تھے جو حویلی سے روشن

رائے کے پیچھے یہاں تک دوڑ لگاتے ہوئے پہنچے تھے۔ اتنے میں انہوں نے روشن رائے کو پھر واپس آتے ہوئے دیکھا۔

روشن رائے نے ان دونوں نمک خواروں پر ایک نظر التفات ڈالنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ وہ قبرستان کے گیٹ سے نکلتے ہی اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے لگا۔ وہ دونوں پھر اپنے مالک کے گھوڑے کے تعاقب میں ہو لئے۔ جب حویلی کے دروازے پر پہنچے تو اس وقت تک روشن رائے اپنے بیڈروم میں داخل ہو چکا تھا۔

ابھی وہ کپڑے تبدیل کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ نفیسہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے آتے ہی تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟''

''نفیسہ بیگم...... مردذات کے پیچھے سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اتنی بڑی جاگیر کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جہاں سے بھی آ رہا ہوں، کچھ کر کے ہی آ رہا ہوں۔ تمہارے بیٹے کی طرح نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ کا نام روشن کر رکھا ہے۔ ایک وہ ہے کہ اس نے روشن رائے کے نام پر بٹہ لگایا ہوا ہے۔ پڑھائی ایک طرف رکھے گلوکار بنا ہوا ہے، بابا ایسے ہوتے ہیں بڑے لوگوں کے پوت؟'' روشن رائے غصے میں آ گیا۔

''پڑھ تو رہا ہے اور کیسے پڑھے۔ ایم اے کر رہا ہے میرا بیٹا۔ ہمارے خاندان میں تو ایک بھی ایم اے نہیں ہے۔ میٹرک اور بی اے بھرے پڑے ہیں۔ پڑھنے کے ساتھ اگر اس نے اپنا شوق پورا کر لیا تو کون سا ایسا جرم کر دیا۔ بالآخر اس نے پلٹ کر حویلی میں آنا ہے۔ تمہارے بعد اپنی جاگیر سنبھالنی ہے۔''

''بس، سنبھال لی اس نے جاگیر...... کیا بات کرتی ہو نفیسہ بیگم، پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔'' روشن نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اب پوت کے پاؤں پالنے میں نہیں، آٹھ نمبر جوتے میں ہیں۔ ذرا سنبھل کر رہنا۔ تمہارے اور اس کے پاؤں میں اب کوئی فرق نہیں رہا ہے۔ کہیں کسی دن وہ تمہارے جوتوں میں پاؤں نہ ڈال دے۔'' نفیسہ بیگم نے اپنے لہجے کو معنی خیز بنا کر کہا اور پھر بے اختیار ہنس دی۔ ہنسی میں بھی زہر گھلا ہوا تھا۔

''مجھے دھمکی دے رہی ہو؟'' روشن رائے نے اسے گھور کر دیکھا۔

''دھمکی نہیں دے رہی...... حقیقت بتا رہی ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم مجھے بالکل نہیں جانتی ہو۔'' روشن رائے کی آنکھوں میں غصہ اُترنے لگا۔

''روشن رائے صاحب میں تمہیں جاننا بھی نہیں چاہتی۔'' نفیسہ بیگم نے بڑے خشک انداز میں کہا

اور پھر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

بیوی کا یہ انداز، یہ لہجہ روشن رائے کو قطعاً پسند نہ آیا۔ اس کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا اور لاپروائی سے بولا۔ ”نفیسہ بیگم، میں اب سونا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، سو جاؤ...... کیا تمہیں اتنی جلدی نیند آ جائے گی۔ ابھی تو رات آدھی بھی نہیں ہوئی۔“ یہ کہہ کر نفیسہ بیگم نے روشن رائے کی طرف دیکھا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولی۔ ”اس کا فون آیا تھا۔“

”کس کا؟“ روشن رائے بیڈ پر بیٹھتا ہوا بولا۔

”کمال رائے کا، وہ کل یہاں آ رہا ہے۔“

نفیسہ بیگم نے ایک دھماکہ خیز خبر بڑے اطمینان سے سنائی۔

”تم نے اسے کچھ بتایا تو نہیں۔“ روشن رائے نے فکرمندی سے پوچھا۔

”میں اسے کیا بتاتی...... میرے پاس اپنے بیٹے کو بتانے کیلئے کیا ہے۔“ نفیسہ بیگم کا لہجہ دُکھ بھرا تھا۔

”نفیسہ بیگم...... تم ایک خوش نصیب عورت ہو۔ تم نے کچھ نہ بتا کر عقلمندی کا ثبوت دیا۔ اپنی زندگی دراز کر لی۔“ روشن رائے نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

نفیسہ بیگم نے اپنے شوہر کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے اس کے چہرے پر کوئی کالا ناگ پھن پھیلائے نظر آیا۔ وہ اپنے شوہر کی سفاکی سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ موت سے کھیلنا اور کسی کی کتابِ زندگی بند کرنا اس کیلئے تیتر مارنے جیسا تھا۔ نفیسہ بیگم اس سے اندر ہی اندر خوفزدہ رہتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ اپنے خوف کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ بھی آخر اسی خاندان کی تھی۔ وہ روشن رائے کی چچازاد تھی اور آٹھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور ان کی لاڈلی تھی۔ جب کبھی اس کے آٹھوں بھائی اکٹھا ہو کر کسی تقریب میں شرکت کیلئے اس کی حویلی آتے تھے تو حویلی کے درودیوار لرزنے لگتے تھے۔ ان کے درمیان بیٹھ کر روشن رائے کو اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ کوئی رعب ڈالنے والی بات کرتا تو نفیسہ بیگم کا کوئی بھائی، اس کی بات لے اُڑتا اور ہنس کر کہتا۔ ”چھوڑیں بھائی جی آپ کیا بات کرتے ہیں۔“

نفیسہ بیگم کے نام اچھی خاصی جائیداد تھی۔ گویا وہ ہر طرح سے مضبوط تھی۔ اپنی تمام تر مضبوطی کے باوجود وہ روشن رائے کی گول گول اُلوؤں جیسی آنکھوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر لرز جاتی تھی۔ وہ اس کی سفاک آنکھوں میں خون کی جھلک دیکھتی تھی۔ اپنے اندر کے اس خوف کو دور کرنے کیلئے وہ کبھی کبھی بدزبانی پر اُتر آتی۔

اس وقت بھی جب روشن رائے نے بڑے سلیقے سے اس کی زندگی ختم کرنے کی دھمکی دی تو وہ خوفزدہ ہو گئی پھر اپنا خوف دور کرنے کے لئے وہ بڑی جرأت سے مسکرا دی اور پھر اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ روشن رائے اس بات کو سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ خود نفیسہ بیگم بھی اپنے اس جملے پر حیرت زدہ ہو گئی۔

اس نے کہا۔ ”روشن رائے صاحب، کیا آپ کو یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ آپ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔“

روشن رائے کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے نفیسہ بیگم نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا ہو، اس کا چہرہ جیسے شعلوں میں گھر گیا۔ اس نے اپنے موٹے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ اس کی گول آنکھیں پھیل کر مزید سفاک ہو گئیں۔ یہ کیفیت بس چند لمحوں تک رہی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے جواباً غصہ دکھایا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ کل اس کا بیٹا کمال رائے آ رہا تھا۔ اگر نفیسہ بیگم نے کمال رائے کو وہ سب بتا دیا جو اسے معلوم ہے تو کمال رائے ایک آتش فشاں بن جائے گا۔ پھر اس طوفان سے بچنا کسی طور ممکن نہ ہو گا۔

روشن رائے نے نفیسہ بیگم کا خطرناک جملہ سن کر ایک قہقہہ لگایا اور پھر اپنے لہجے میں نرمی بھرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، نفیسہ بیگم مجھے یاد ہے۔ بابا، اسی تھپڑ نے تو ہمیں تمہارا دیوانہ بنا دیا۔ بڑے ہو کر بالآخر ہم تم سے شادی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بابا تم ہم سے دو سال بڑی بھی تو ہو۔ اگر بچپن میں ہماری کسی شرارت پر تم نے تھپڑ مار لیا تو کیا ہوا...... بڑے بچوں کی سرزنش کیا ہی کرتے ہیں۔“

”رائے صاحب...... آپ کا جواب نہیں۔ کوئی باتیں بنانا تو آپ سے سیکھے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ آپ آرام فرمائیے۔“ پھر وہ روشن رائے کا جواب سنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

اور روشن رائے اس دروازے کو گھورتا رہ گیا جہاں سے نفیسہ بیگم ابھی باہر گئی تھی۔

کچھ دیر تک وہ اپنی گول گول آنکھوں سے دروازے کو گھورتا رہا، پھر تکیے درست کر کے بیڈ پر لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کیں تو نوزائیدہ بچی کے رونے کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ صحرا کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس عورت کی بددعا اس کا دل چیرنے لگی۔ روشن رائے نے ایک دم گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔

اس کے بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا۔ لائٹ روشن تھی وہ اس نے بند نہ کی۔ وہ اب اندھیرے میں نہیں سو سکتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ ذرا سی روشنی بھی اسے چین کی نیند نہ سونے دیتی تھی۔ اس کے بیڈروم کے دروازوں اور کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے جب

انہیں پھیلا دیا جاتا تو اس کا بیڈروم کسی فوٹو گرافر کے ڈارک روم میں بدل جاتا تھا۔ نفیسہ بیگم کو ایسے اندھیرے سے وحشت ہوتی تھی۔ شروع کے کچھ دنوں تو وہ روشن رائے کے ساتھ سوئی، پھر اس نے مجبور ہو کر اپنا بیڈروم الگ کر لیا۔ وہ آج تک اپنے بیڈروم میں سوتی تھی۔ اب جبکہ روشن رائے کو اندھیرے میں نیند نہ آتی اور وہ کمرے کی لائٹ جلا کر سوتا تھا تو بھی نفیسہ بیگم نے اپنا طور نہ بدلا تھا۔ ایسی تیز روشنی میں بھی اس کا سونا ممکن نہ تھا۔ وہ شروع سے سبز رنگ کے زیرو وولٹ کے بلب کی روشنی میں سونے کی عادی تھی۔

روشن رائے کو جہاں دوسرے شوق تھے وہاں شکار کھیلنے کا شوق بھی تھا۔ تیتر کا شکار کھیلتے ہوئے ایک مرتبہ اس کے راستے میں کالا ناگ آ کھڑا ہوا تھا۔

روشن رائے کا اور کوئی راستہ روکے یہ بات اسے کسی طور پسند نہ تھی۔ وہ اپنے راستے میں آنے والے کو بڑی بے دردی سے کچلنے کا عادی تھا۔ اس سانپ کو وہ بھلا کیا خاطر میں لاتا۔ اس نے کندھے سے بندوق اُتار کر اس کالے ناگ کا نشانہ لیا جو راستے میں پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی زبان بار بار باہر نکل رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر پھنکار مار رہا تھا۔ روشن رائے نے اس کے پھن کا نشانہ باندھ کر بندوق کی لبلبی دبا دی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور سانپ کے پرخچے اُڑ گئے۔

وہ ٹکڑوں میں تقسیم اس سانپ کو نخوت سے دیکھتا آگے بڑھ گیا۔

یہاں سے اس مشکل کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے روشن رائے لائٹ جلا کر سونے پر مجبور ہوا۔ یہ اسی رات کی بات ہے۔ روشن رائے جب شکار کھیل کر حویلی لوٹا اور رات کو محو استراحت ہوا تو اس نے ایک بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا۔ وہ خواب اتنا گہرا اور صاف تھا کہ اسے لگا جیسے یہ حقیقت میں ہو گیا ہے۔ اس نے گھبرا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ روشن کیا اور سامنے لگے آئینے میں گھبرا کر اپنی آنکھ پر نظر ڈالی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا، اس کی آنکھ صحیح سلامت تھی۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا ہے اچانک سانپ کی پھنکار سنائی دیتی ہے۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے تو اپنی آنکھوں کے سامنے کالے ناگ کو پاتا ہے۔ آنکھیں کھلتے ہی ناگ اس کی سیدھی آنکھ پر پھن مارتا ہے تو اس کی آنکھ لہولہان ہو جاتی ہے۔ آنکھ میں شدت کا درد اُٹھتا ہے۔ اچانک اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔

حواس بحال ہونے کے بعد جب یہ حقیقت اس پر آشکار ہوئی کہ یہ محض ایک خواب تھا تو اس کی جان میں جان آئی لیکن اس خواب کی دہشت جانے کیوں اس کے حواس پر چھا گئی۔

پھر اس رات روشن رائے نے اپنے بیڈ کے چاروں طرف بے شمار سانپ دیکھے اتنے کہ اگر وہ پاؤں قالین پر رکھتا تو وہ کسی سانپ پر پڑتا۔ یہ خواب دیکھ کر اس نے کئی گلاس ٹھنڈا پانی پیا تب کہیں جا کر حواس بحال ہوئے ..... پھر ان خوابوں نے فریبِ نظر اور فریبِ سماعت کا روپ

دھارنا شروع کیا۔

وہ بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہوتا کہ اچانک اسے کسی سانپ کے پھنکارنے کی آواز سنائی دیتی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے نزدیک سے کوئی سانپ تیزی سے سرسراتا ہوا گزر گیا ہو۔

اس کے بعد ان خوابوں اور فریبِ نظر نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ ایک رات جب وہ رات گئے اپنے بیڈروم میں آیا تو اس نے ایک کالے سانپ کو تکیے پر کنڈلی مارے بیٹھا دیکھا۔ وہ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ روشن رائے کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے پھسل کر بیڈ کے نیچے چلا گیا۔

اس رات اس نے پہرہ دینے والے ملازموں کو بلا کر کمرے کا چپہ چپہ چھنوا مارا لیکن سانپ کہیں دکھائی نہ دیا۔ یہ بات بھی طے تھی کہ سانپ کمرے سے نہیں نکلا تھا کیونکہ ملازموں کے آنے تک روشن رائے دروازے پر موجود رہا تھا اور بیڈروم میں کوئی ایسا سوراخ نہ تھا جس میں داخل ہو کر سانپ غائب ہو جاتا۔

اب روشن رائے اندھیرے میں سوتے ہوئے ڈرنے لگا تھا۔ شروع شروع میں اسے روشنی میں نیند نہ آتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ روشنی کا عادی ہو گیا۔ اب وہ روشنی میں بغیر کسی پریشانی کے سو جاتا تھا۔

آج کی رات ایک مرتبہ پھر اس پر بھاری تھی۔ وہ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بچی کے بلک بلک کر رونے کی آواز کبھی دور سے آتی اور کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کے بیڈ کے سامنے کھڑی ہو۔ وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جاتا لیکن اس کے سامنے کچھ نہ ہوتا۔

کبھی اس کے خیالوں میں کمال رائے کا چہرہ آ جاتا۔ غصے میں لال بھبھوکا..... آنکھوں سے آگ ق ہوئی۔ وہ طیش میں آ کر پوچھتا۔ ''بابا، آپ نے یہ کیا کیا..... مجھے کس جرم کی سزا دی آپ نے۔''

وہ رات روشن رائے کی آنکھوں میں کٹی۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا جو دوسروں کو دُکھ دیتے ہیں جو سروں کی زندگی جہنم بناتے ہیں، وہ بھلا کس طرح سُکھ کی نیند سو سکتے ہیں۔

صبح اذانوں کے وقت بمشکل اس کی آنکھ کھلی۔ ابھی وہ کچھ دیر سویا ہوگا کہ اچانک اسے احساس ہوا ہے وہ کسی گہرے اندھیرے میں ہے۔ قبر میں لیٹا ہے۔ اتنا گھور اندھیرا تھا کہ آنکھیں کھولتے ہوئے ی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کمرے کی لائٹ کیسے بجھ گئی۔ کمرے کے اندر بھی کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دروازے بند کر کے سویا تھا۔

واس بحال ہوئے تو اسے خیال آیا کہ کہیں لائٹ نہ چلی گئی ہو؟

ہاں بجلی جا سکتی تھی لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کی حویلی میں جنریٹر موجود تھا جو بجلی جاتے ن آن ہو جاتا تھا۔ اس نے کان لگا کر غور سے سنا۔ جنریٹر کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا ا ات نہیں گئی تھی۔ پھر کمرے میں اندھیرا کیوں ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اُٹھا۔ اندازے

سے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ پھر خیال آیا کہ پردہ ہٹا کر کیوں نہ دیکھ لے۔ حویلی کی راہداری میں پوری رات روشنی رہتی تھی۔ اس نے ابھی پردہ سرکانے کیلئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کمرے میں ایک دَم اُجالا پھیل گیا۔

کمرہ روشن ہوتے ہی اس نے ایک زوردار پھنکار کی آواز سنی اور اس نے ایک سانپ کو پردے کے پیچھے جاتے دیکھا۔ اس نے پردہ چھوڑ کر تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور تیزی سے پردہ سمیٹا لیکن اسے سانپ کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے اچھی طرح پورا پردہ دیکھ لیا۔ سانپ پردے کے پیچھے گیا تھا، یہ بات یقینی تھی۔ اب سانپ پردے کے پیچھے نہ تھا، یہ بات بھی یقینی تھی۔ اتنی دیر میں وہ کہاں غائب ہوگیا۔ یہ بات کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

اس نے احتیاطاً رات کے پہرہ داروں کو بلا کر کمرے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا لیکن سانپ برآمد نہ ہوا۔

صبح ہو چکی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ وہ ملازموں کو ہدایت کرکے کہ اس کے دروازے پر اس وقت تک دستک نہ دی جائے جب تک وہ خود دروازہ نہ کھول دے۔ وہ سو گیا۔

☆......☆......☆

نفیسہ بیگم صبح سویرے ہی اُٹھ جانے کی عادی تھی۔ وہ صبح اُٹھتے ہی اپنے روز کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ کام کے دوران اس نے کئی مرتبہ اپنی ملازمہ خاص بھاگ بھری سے روشن رائے کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ ہر بار باہر سے یہی خبر لائی۔ ''مالک ابھی نہیں اُٹھے۔''

جب ناشتے کا بھی وقت گزر گیا اور دوپہر کے کھانے کا وقت سر پر آ پہنچا تو نفیسہ بیگم نے ایک مرتبہ پھر بھاگ بھری کو روشن رائے کے بارے میں معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔ وہ پھر وہی خبر لائی۔ ''بی بی مالک ابھی نہیں اُٹھے۔ وہ کہہ کر سوئے ہیں کہ جب تک وہ خود دروازہ نہ کھولیں، دستک نہ دی جائے۔''

نفیسہ بیگم سوچ میں پڑ گئی۔ ویسے تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ روشن رائے اکثر دیر تک سوتا رہتا تھا لیکن بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ضرور اُٹھ جاتا تھا۔ اب تو دو بج رہے تھے۔ اتنی دیر تک وہ کبھی نہ سویا تھا۔ نفیسہ بیگم فکرمند تھی۔ وہ فکرمند ضرور تھی لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ کسی ملازم سے اس کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دلوا دے۔ وہ اپنی پریشانی دور کرنے کیلئے بھاگ بھری سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔

ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ نفیسہ بیگم نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اس کے چہرے پر خوشی تھی۔ وہ کوئی خوشخبری لائی تھی۔ نفیسہ بیگم نے سکون کا سانس لیا اور پھر بولی۔ ''کیا ہوا؟''

''مالکن، چھوٹے مالک آئے ہیں۔''

''اچھا۔'' اس کے چہرے پر پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ بھاگ بھری نے فوراً اس کے پیروں میں جوتیاں پہنائیں۔ پھر کچھ سوچ کر ایک دَم نفیسہ کا چہرہ اُداس ہوگیا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔

ابھی وہ دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ کمال رائے کی آواز سنائی دی۔ ''میری ماں تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں ہوں بیٹے ...... میرے کمال۔'' اس نے اندر سے آواز دی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بے اختیار اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ ''ماں، تم کیسی ہو؟''

نفیسہ بیگم کچھ نہ بولی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو اس کا گلا رندھ گیا۔ جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اپنی ماں کو لرزتے دیکھ کر کمال رائے نے اسے خود سے جدا کیا اور ذرا پیچھے ہو کر نفیسہ بیگم کا چہرہ دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے جذبات پر کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہو لیکن جذبات بے قابو ہوتے جا رہے ہوں۔

''ماں کیا ہوا......؟ خیریت تو ہے۔'' کمال رائے نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹا...... سب خیریت ہے۔'' انہوں نے کمال کو اپنے قریب کرلیا۔ وہ اس سے اپنی آنکھیں چھپانا چاہتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں نیر بھرنے لگا تھا۔

''اماں...... بابا تو ٹھیک ہیں نا۔''

''ہاں بیٹا...... وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''پھر کیا گڑبڑ ہے...... ماں کچھ ہوا ضرور ہے۔'' کمال نے اسے دوبارہ اپنے آپ سے الگ کرکے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا کمال...... آ تو بیٹھ...... کئی گھنٹے سفر کرکے آیا ہے۔''

نفیسہ بیگم نے اسے اپنے بیڈ پر پیار سے بٹھایا اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر محبت سے پوچھا۔ ''تجھے بھوک لگی ہوگی، کھانا لگواؤں؟''

''ہاں ماں بھوک تو لگی ہے...... لیکن ذرا میں نہا لوں...... پھر کھاؤں گا کھانا۔''

''بھاگ بھری جا...... صاحب کے کپڑے نکال...... اور ذرا واش روم بھی دیکھ لینا...... دیکھ ذرا بھی گندا نہ ہو۔'' نفیسہ بیگم نے تنبیہہ کی۔

''بی بی، آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر بھاگ بھری کمرے سے نکل گئی۔

''ہاں، اماں...... ایک بات تو بتائیں...... ماروی کا کیا حال ہے۔ میں اُدھر نہیں گیا، سیدھا آپ

کی طرف آیا ہوں۔ پہلے ماں پھر بیوی......''

یہ بات سنی تھی کہ نفیسہ بیگم کے منہ سے ایک دم سسکاری نکل گئی۔ لاکھ ضبط کیا لیکن ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ بے اختیار سسک اُٹھی۔

''ماں تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو...... بولو نا...... ماروی تو ٹھیک ہے؟''

''نہیں کمال وہ ٹھیک نہیں ہے...... وہ ایک بچی کو جنم دے کر چل بسی۔'' نفیسہ بیگم نے دل پر پتھر رکھ کر خبر سنائی۔

''اوہ، میری ماروی چل بسی۔'' کمال رائے کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ ''اور میری بچی؟''

''وہ بھی نہ رہی۔'' نفیسہ بیگم نے دوسری خبر سنائی۔

''اُسے کیا ہوا؟''

''ماروی کی موت کے بعد وہ گھنٹہ بھر بھی زندہ نہ رہی...... وہ بھی چل بسی۔''

''ماں، اتنا بڑا سانحہ گزر گیا اور آپ نے مجھے اطلاع بھی نہ دی۔'' کمال رائے نے احتجاج کیا۔

''بیٹا...... میں نے چاہا تھا کہ تمہیں اطلاع دے دوں لیکن تمہارے باپ نے مجھے روک دیا۔'' نفیسہ بیگم نے بتایا۔

''کیوں؟'' کمال رائے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''میں نہیں جانتی...... شاید اس میں تمہاری کوئی بہتری ہوگی۔ بیٹے تُو غم نہ کر، صبر سے کام لے...... تُو میرا بیٹا ہے۔'' وہ اسے تو صبر کی تلقین کر رہی تھی لیکن خود اس کا یہ حال تھا کہ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہے چلے آتے تھے۔

''ماں، میری بیوی مر گئی، میری بچی مر گئی اور تُو کہتی ہے صبر کر...... میں کیسے صبر کروں۔'' وہ بڑے دُکھ سے بولا۔

''ارے چھوڑ لڑکی ہی تو تھی۔ لڑکی کا کیا غم...... چل بسی تو اچھا ہوا، تجھے اپنی جاگیر کیلئے وارث چاہئے اور رہی ماروی کی بات تو وہ کون سی ہمارے خاندان سے تھی۔ خاندان میں کئی لڑکیاں تیرے نام لکھی ہیں جس پر انگلی رکھے گا اسے لے آؤں گی۔'' نفیسہ بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''ماں، یہ تم کہہ رہی ہو...... تم پر کب سے بابا کا سایہ پڑ گیا۔'' کمال رائے حیرت اور دکھ کے ملے جلے لہجے میں بولا۔

''دیکھ بیٹا بات......'' نفیسہ بیگم کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ بھاگ بھری کمرے میں داخل ہوئی۔

''بی بی...... مالک اِدھر آ رہے ہیں۔'' یہ اطلاع دے کر بھاگ بھری اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔

''اوہو...... میرا بیٹا آیا ہے۔'' بھاگ بھری کے نکلتے ہی روشن رائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمال رائے کو گلے سے لگایا۔ کمال رائے خاموشی سے اس کے گلے لگ گیا۔ پھر روشن نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے دبایا اور بولا۔ ''میرا بہادر بیٹا۔''

کمال رائے نے خالی خالی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ بولے کمرے سے نکل گیا۔

روشن رائے اسے ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

کمال رائے کی بے قراری قابل دید تھی۔ اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ وہ پوری رات ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ اسے خواب میں ماروی نظر آئی تھی۔ وہ کسی جنگل میں بھٹک رہی تھی اور اس کا نام لے کر آوازیں لگا رہی تھی۔ اس خواب نے اسے اور بے کل کر دیا تھا۔

حویلی میں عجیب سی فضا تھی۔ ماروی کے بارے میں کوئی کچھ بتانے کو تیار نہ تھا۔ ہونٹوں پر مہر لگی تھی۔ ساتھ ہی کئی ان کہی کہانیاں ماروی اور اس کی بچی کے بارے میں گردش کر رہی تھیں، لیکن کسی بات کی کوئی تصدیق کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ خود ماں باپ کا رویہ عجیب سا تھا۔ نفیسہ کے چہرے پر جو رقم تھا، وہ اس کی زبان پر نہ تھا اور جو زبان پر تھا وہ اس کے چہرے سے میل نہ کھاتا تھا۔

ماروی اور اس کی بچی کے پیچھے کوئی اسرار ضرور تھا لیکن وہ کیا اسرار تھا، اس کا سرا کمال رائے کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بے چینی، بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

شاید اس سے غفلت ہو گئی تھی۔ ابھی پندرہ روز پہلے تو اس کا خط ملا تھا۔ وہ بس ایک سطر کا خط تھا لیکن اس جملے میں پوری ایک داستان رقم تھی۔ ماروی نے لکھا تھا۔

''میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔ ہو سکے تو مجھ سے مل جاؤ۔''

اس مختصر ترین خط کو پڑھ کر وہ کچھ دیر کیلئے اُداس ہو گیا تھا۔ اس شام اسے ایک میوزک کے پروگرام میں جانا تھا۔ اسی وقت اس کے دوست اسے لینے آ گئے۔ وہ میوزک کنسرٹ میں شامل ہو کر کچھ ایسا محو ہوا کہ ماروی اس کے ذہن سے نکل گئی۔

پھر کراچی کی پُر رونق شاموں، موسیقی بھری راتوں، یونیورسٹی کی ہنستی مسکراتی صبحوں میں وہ کچھ اس طرح گم ہوا تھا کہ بعض وقت وہ یہ بھی بھول جاتا تھا کہ وہ کون ہے؟

ماروی اس کا انتخاب تھی۔ وہ اسے ایک موسیقی کی محفل میں ملی تھی۔ ان کی پہلی ملاقات ہی بہت گہری ثابت ہوئی۔ وہ ایک دوسرے کے دلوں میں اُترتے چلے گئے۔ ماروی ایک متوسط گھرانے کی

لڑکی تھی۔ اس کے والد کافی پہلے اپنا شہر چھوڑ کر کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔

ماروی چند ملاقاتوں میں کسی اسٹیکر کی طرح اس کے دل پر چسپاں ہوگئی۔ کمال رائے نے شادی کی پیشکش کی۔ ماروی شادی کیلئے فوراً رضامند ہوگئی لیکن اس کے ماں باپ نے کہا جب تک کمال کے گھر والے رشتہ لینے نہیں آتے، وہ یہ رشتہ نہیں کریں گے۔

کمال رائے نے اپنے باپ سے بات کی۔ اس نے کمال فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ماروی کو اپنی بہو بنانے پر تو رضامندی ظاہر کردی لیکن اپنے سے چھوٹے لوگوں کے در پر رشتہ مانگنے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

بغیر والدین کے آئے ماروی کے والد رشتہ دینے پر تیار نہ تھے اور کمال کا بابا رشتہ مانگنے پر راضی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسمی انداز میں ماروی اور کمال کا رشتہ نہ ہوسکا۔ تب ماروی اور کمال نے غیر رسمی طور پر یہ رشتہ کرلیا۔ کمال نے ایک دوست کے گھر خاموشی سے ماروی سے نکاح کرلیا۔

جب ماروی کے والد کو اپنی بیٹی کے اس سنگین قدم کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے زندگی بھر کیلئے اس کا منہ نہ دیکھنے کی قسم کھالی...... اور جب کمال، ماروی کو لے کر اپنی حویلی پہنچا تو اس کے والدین نے بڑی سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔ باپ تو باپ اس کی ماں کو بھی یہ بات پسند نہ آئی تھی۔ پسند نہ آنے کے باوجود نفیسہ بیگم نے ماروی کو حویلی بدر نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایسا کیا تو کمال رائے بگڑ جائے گا اور وہ دونوں اپنے اکلوتے بیٹے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے۔

ماروی حسین تو تھی ہی، خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھی۔ اس نے بہت جلد نفیسہ بیگم کو اپنی طرف مائل کرلیا۔ ساس بہو کے تعلقات میں جو سرد مہری تھی، وہ دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی۔ ماروی نے اپنی ذہانت اور اپنے حسن سلوک سے نفیسہ بیگم کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا

ادھر وہ ساس کے دل میں گھر کرتی جارہی تھی تو کمال کے دل سے نکلتی جارہی تھی۔ وہ اسے بھولتا جارہا تھا۔ کمال رائے ایم اے کررہا تھا۔ وہ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ کراچی میں ڈیفنس کے علاقے میں اس کے باپ کا بنگلہ موجود تھا لیکن اسے وہاں رہنا پسند نہیں تھا۔ اس کی تو حویلی سے ہی جان جلتی تھی۔ پھر وہ اتنے بڑے بنگلے میں اکیلا کیسے رہتا۔ اسے ہوسٹل میں رہنا پسند تھا۔ اسے انسانوں میں رہنا پسند تھا۔ اسے ایک پُر جوش اور جیتی جاگتی زندگی پسند تھی۔ وہ ایک جذباتی اور لاابالی لڑکا تھا۔ جو ذہن میں سما جاتا، اسے کر گزرتا۔ ماروی سے شادی بھی اس نے دل میں اُٹھنے والے جوار بھاٹے کے زیر اثر کرلی تھی۔ اب وہ جوش کم ہورہا تھا۔ وہ ماروی کو حویلی میں پہنچا کر جیسے بھول گیا تھا۔

یہاں تک کہ ماروی کا آخری، ایک سطری خط بھی اس کے دل کے سمندر میں ہلچل نہیں مچا سکا تھا

اور یوں ماروی تنہائی کا رونا روتی اور اسے یاد کرتی گزر گئی تھی۔

وہ سوچے جارہا تھا اور جتنا سوچ رہا تھا، اس کے دل میں درد بڑھتا جارہا تھا۔ اس کا گلا بار بار رندھ جاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر بھر جاتے تھے۔ وہ گاڑی لے کر قبرستان کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ اچانک اسے بریک لگانا پڑا۔ وہ شخص اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔

اگر وہ پھرتی سے پاؤں بریک پر نہ رکھتا تو گاڑی یقیناً اس پر چڑھ جاتی۔ وہ کوئی فقیر تھا اس کے سر کے بال لمبے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ مونچھ اور داڑھی کے بال بھی بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اس کا جسم ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ سانولے رنگ اور اونچے قد کا آدمی تھا اس کی سیاہ آنکھوں میں خاص طرح کی چمک تھی۔

ایک فقیر کی یہ جرأت دیکھ کر اسے سخت غصہ آیا، اس علاقے کا کون سا ایسا شخص تھا جو کمال رائے سے واقف نہ تھا...... مالک کی گاڑی آتے دیکھ کر اسے سامنے آکر روکنا تو بڑے دل گردے کا اور جان لیوا عمل تھا لوگ تو گاڑی دیکھ کر اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس شخص نے اور وہ بھی ایک بھیک منگے نے اس کی گاڑی کے سامنے آکر ایک طرح سے اپنی جان عذاب میں ڈال دی تھی۔

کمال رائے ویسے ہی اپنے آپے میں نہ تھا وہ اسے دیکھ کر غصے سے چیخ اُٹھا۔ ''کیا ہے؟''

اس فقیر پر، اس اول جلول شخص پر کمال رائے کے غصے کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ گاڑی کے سامنے سے ہٹ کر کمال رائے کے نزدیک آگیا اور اپنی چمکیلی تیز نگاہیں اس کی پیشانی میں گاڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولا۔ ''مورکھ قبرستان میں کیا رکھا ہے، وہاں کیا جاتا ہے، ارے جانا ہے تو صحرا میں جا خالی قبروں میں تجھے کیا ملے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ شخص رکا نہیں، وہ گھوم کر گاڑی کے پیچھے آیا اور پھر سڑک سے اُتر کر درختوں کے جھنڈ میں چلا گیا۔

کمال رائے اس کی بات سن کر ایک دم چونکا اور فوراً گاڑی سے اُتر کر باہر آیا تا کہ اس اجنبی شخص سے سوال جواب کر سکے اس سے پوچھ سکے اس کی کیا مراد تھی...... گاڑی سے اُتر کر ایک نگاہ ماری تو وہ سڑک سے اُتر کر درختوں کے جھنڈ میں جارہا تھا۔

''ٹھہرو سنو!'' وہ اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے لپکا لیکن جب کمال درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا وہ پُراسرار شخص اسے کہیں نظر نہ آیا، اتنی دیر میں وہ جانے کہاں چھپ گیا تھا، غائب ہو چکا تھا۔

وہ مایوس ہو کر گاڑی کی طرف واپس آیا، اور گاڑی اسٹارٹ کر کے قبرستان کی طرف چل دیا۔

کمال رائے کا دل پہلے ہی قابو میں نہ تھا، ماروی کی اچانک موت کی اطلاع اس کیلئے سوہان روح ثابت ہورہی تھی اس کے دل میں درد بڑھتا ہی جاتا تھا، اسے اپنے باپ پر بڑا غصہ تھا۔ آخر انہوں نے کیوں چھپائی تھی...... اس میں کمال کا کیا فائدہ تھا، یہ اس کی ماں کا خیال تھا۔ ہوسکتا ہے...... اس کی

ماں نے محض اس کی تسلی کیلئے ایسا کہہ دیا ہو......وہ ماروی کی قبر پر جا کر رونا چاہتا تھا تا کہ اس کے بے قرار دل کو قرار ملے۔

وہ جانے کون تھا؟ اچانک سامنے آیا اور اچانک ہی غائب ہو گیا......دیکھنے میں وہ بھیک منگا لگتا تھا لیکن اس نے بھیک تو نہ مانگی تھی......وہ تو کچھ پراسرار بول، بول کر چلا گیا تھا......اس وقت وہ حویلی سے کہاں جانے کیلئے نکلا تھا، یہ بات اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا......اس کی ماں بھی نہیں، پھر اس پراسرار شخص نے کیسے اندازہ لگا لیا......اس نے خالی قبروں کا ذکر کیوں کیا؟ صحرا کی بات زباں پر کیوں لایا......آخر کون تھا وہ؟ کیا چاہتا تھا۔

وہ ابھی اسی طرح کی باتیں سوچ رہا تھا کہ اسے دور سے قبرستان کا گیٹ نظر آیا۔ گیٹ بند تھا۔ اس نے گیٹ بند دیکھتے ہی گاڑی کا ہارن بجانا شروع کر دیا اور گاڑی کی رفتار بھی کم کر لی۔

قبرستان کا گورکن خیرو جو اس وقت ایک قبر کے گرد لگے پودوں میں پانی دے رہا تھا۔ گاڑی کا ہارن سن کر چونکا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ادھر آنے والی گاڑی مالک کی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ فوراً گیٹ کی طرف بھاگا اور جلدی سے گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

کمال رائے کو گیٹ کھلنے کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ گاڑی کو قبرستان میں لیتا چلا گیا۔ پھر جب وہ گاڑی بند کر کے اُترا تو خیرو ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کمال رائے کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی تھی اس پر اندر ہی اندر لرزا طاری ہو گیا تھا۔

کمال رائے نے ایک نظر ہاتھ باندھے کھڑے خیرو کی طرف دیکھا اور بہت نرم لہجے میں بولا۔

''خیرو مالکن کہاں ہیں؟''

''وہ اس طرف مالک......'' خیرو نے کپکپاتی آواز پر قابو پاتے ہوئے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

کمال رائے اس سمت بڑھنے لگا جس طرف خیرو نے اشارہ کیا تھا۔ خیرو ہاتھ باندھے اور گردن جھکائے اس کے ساتھ ہو لیا۔

قبروں کیلئے ایک غیر نمایاں حصہ منتخب کیا گیا تھا۔ وہ درختوں کی آڑ میں تھیں، دور سے دیکھنے میں نظر نہ آتی تھیں۔ قبریں پختہ ہو چکی تھیں انہیں سفید پتھر سے بنایا گیا تھا۔ قبروں کو دیکھ کر کمال رائے بے اختیار ہو گیا۔ اس نے بے تابانہ ماروی اور اپنی بچی کی قبر کے گرد ایک چکر لگایا۔ ضبط کا بند ٹوٹ چکا تھا وہ کوشش کے باوجود اپنے بہتے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔

وہ کچھ دیر یونہی خاموش کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ اس کی نظریں کبھی ماروی کی قبر کا طواف کرتیں، کبھی اپنی بچی کی قبر کا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں کبھی دھندلاتیں، کبھی صاف دکھائی دینے لگتیں۔

پھر کمال رائے نے رومال سے اپنے بہتے آنسو پونچھ کر فاتحہ کیلئے ہاتھ اُٹھائے۔ ابھی اس نے فاتحہ پڑھنا شروع ہی کی تھی کہ اچانک اس کی سماعت سے اس پراسرار شخص کی آواز ٹکرانے لگی۔ اس کے کہے ہوئے جملے بار بار سنائی دینے لگے، اسے فاتحہ پڑھنی مشکل ہو گئی۔

فاتحہ پڑھنے کے بعد ایک دوسرا خیال دماغ میں آیا۔ اس خیال پر اس نے فوراً عمل کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے ایک نظر خیرو پر ڈالی، وہ ہاتھ باندھے اور سر جھکائے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ کمال رائے کو ہٹتا دیکھ کر وہ فوراً ایک طرف ہو گیا۔ کمال رائے اس کے نزدیک سے گزرتا ہوا بولا۔ ''آؤ خیرو۔''

''جی مالک۔'' وہ بہت سعادت مندی سے اس کے پیچھے ہو گیا۔

راستے میں کمال رائے نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اطمینان سے گاڑی میں آ کر بیٹھا، گاڑی اسٹارٹ کی اور سامنے کھڑے خیرو کو اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بھاگ کر کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ ''جی مالک حکم۔''

''آؤ گاڑی میں بیٹھو۔'' کمال رائے نے نرم لہجے میں کہا۔

''جی مالک!'' یہ کہہ کر خیرو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، وہ جیسے پتھر کا ہو گیا۔

اس کا پتھر کا ہو جانا بجا تھا۔ اس سرزمین پر آج تک کسی زمینوں کے مالک نے اپنے ملازم اور وہ بھی گورکن کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی پیشکش نہ کی تھی۔ یہ تو وہ لوگ تھے جو اللہ کی بنائی ہوئی زمینوں کے خود مالک بن بیٹھے تھے۔ ان فرعونوں سے کوئی ملازم کیسے توقع کر سکتا تھا۔ وہ یہ توقع کر سکتا تھا کہ ''مالک'' اسے گاڑی کے نیچے کچل کر گزر سکتا ہے لیکن اسے یہ توقع ہرگز نہ ہو سکتی تھی کہ کوئی مالک اسے اپنی گاڑی میں ساتھ بیٹھنے کی پیشکش کرے۔

''خیرو آؤ، میرے پاس وقت کم ہے۔'' کمال رائے بہت گمبھیر لہجے میں بولا۔

''اچھا مالک......'' وہ ڈرتے ڈرتے پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔

''نہیں خیرو، ادھر آؤ۔'' کمال رائے نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اب خیرو کیلئے کوئی جائے مفر نہ تھی۔ اب اسے یہ بھی شبہ نہ رہا تھا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ مالک اسے اپنے برابر بیٹھنے کیلئے کہہ رہا تھا اس کا حکم نہ ماننا بھی خود کو عذاب میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔

خیرو کا گھر بھی قبرستان میں تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا اس نے اپنے کچے مکان پر دور ہی سے نظر ماری۔ وہ کچا گھر دیکھتے ہی دیکھتے دھندلا گیا۔ جانے کیا سوچ کر خیرو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے کندھے پر پڑے ہوئے انگوچھے سے تیزی سے آنسو پونچھے اور پھر سکڑ سمٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ کمال رائے نے قبرستان سے نکل کر حویلی کی طرف جانے

کے بجائے جنگل کا راستہ اختیار کیا۔ خیرو کے ہونٹ سختی سے بھنچے تھے اور اس کے دل پر سناٹا طاری تھا۔ وہ آنے والے وقت کا سوچ کر ہول رہا تھا۔

گاڑی جب جنگل میں داخل ہوئی تو خیرو کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''مالک مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟''

''نہیں خیرو، آؤ...... ذرا جنگل کی سیر کریں۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اُتر آیا۔

''جی مالک!'' وہ ڈرتا ڈرتا گاڑی سے اُتر آیا۔

''خیرو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر میرا ریوالور پڑا ہے...... ذرا وہ نکال کر مجھے دے دو۔''

''جی مالک۔''

''جب خیرو نے کانپتے ہاتھوں سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو پیچھے سے کمال رائے کی آواز آئی۔ ''رہنے دو خیرو۔''

''اچھا مالک۔'' اس نے فوراً دروازہ بند کیا اور کمال رائے کے پیچھے ہو لیا جو جنگل کے اندر جا رہا تھا۔

کچھ دور اندر جا کر وہ ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ خیرو بھی اسے دیکھ کر رک گیا۔ کمال رائے نے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا اور پھر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولا۔ ''خیرو، دیکھو مجھ سے جھوٹ نہ بولنا جو پوچھوں اس کا جواب بالکل سچ سچ دینا اگر تم نے جھوٹ بولا تو یہ بات اچھی طرح جان لو کہ میں یہاں سے اکیلا واپس جاؤں گا۔ ...... میرے اکیلے جانے کا مطلب تم اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے۔ اگر تم نے سچ سچ کہہ دیا تو میری تمہاری اس ملاقات کا کسی کو کچھ نہ معلوم ہو گا، یہاں تک کہ تیرے مالک کو بھی نہیں ...... یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''جی مالک پوچھیں ...... آپ جو پوچھیں گے اس کا جواب بالکل سچ سچ دوں گا۔'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

''شاباش۔'' کمال رائے نے خوش ہو کر کہا۔ ''خیرو، کیا یہ دونوں قبریں تم نے کھودی تھیں؟''

''نہیں مالک۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ!'' وہ حیران ہوا۔ ...... ''یہ کام تو تمہارا ہے، یہ کام پھر کس نے کیا؟''

''رولی نے۔'' خیرو نے آہستہ سے کہا۔

''قبروں میں جنازے کس نے اُتارے؟'' کمال رائے عجیب سوال کر رہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' خیرو نے اس عجیب سوال کا جواب سکون سے دیا۔

''کیا تم نے جنازے بھی نہیں دیکھے۔''

''نہیں مالک۔''

''تم قبرستان میں موجود نہیں تھے...... آخر تم کہاں تھے؟''

''مجھے رولی نے حکم دیا تھا کہ میں اپنے گھر جا کر سو جاؤں اور سورج نکلنے سے پہلے گھر سے نہ نکلوں۔''

''خیرو جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو۔''

''ہاں مالک۔'' خیرو نے ڈرتے ڈرتے نظریں اُٹھائیں۔

''آؤ، پھر میرے ساتھ ...... اب باقی باتیں گاڑی میں بیٹھ کر کروں گا۔''

''مالک میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر سچ بول دیا ہے۔ اگر بڑے مالک کو معلوم ہو گیا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے تو وہ میرے بیوی بچوں کو بھی نہ چھوڑیں گے۔''

''میں جانتا ہوں...... خیرو، تو بے فکر ہو جا...... تیری زندگی کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ میرے جیتے جی تجھ کو کوئی ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ آ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز چلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے خیرو کو گاڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔

''مالک...... آپ اجازت دیں تو پیچھے بیٹھ جاؤں۔'' خیرو نے التجا کی۔

''اچھا خیرو...... چل پیچھے بیٹھ جا۔''

خیرو جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''مالک آپ کا ریوالور...... اگلی سیٹ پر رکھ دوں۔'' خیرو نے پوچھا۔

''نہیں خیرو...... اسے وہیں پڑا رہنے دو۔'' کمال رائے نے لاپروائی سے کہا اور جنگل سے نکلتے ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

☆......☆......☆

''ماں، ایک بات پوچھوں، بتاؤ گی۔'' کمال رائے نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے آہستہ سے دباتا ہوا بولا۔

''ہاں پوچھو بیٹا ...... تمہیں نہیں بتاؤں گی تو پھر کس کو بتاؤں گی۔'' نفیسہ بیگم نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

''ماں، تم نے میری ماروی کا آخری دیدار تو کیا ہو گا ...... وہ کیسی لگ رہی تھی اور ماں میری بچی کیسی تھی، وہ کس پر گئی تھی؟'' اس نے حسرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''کمال، میں اپنی بہو اور پوتی کے آخری دیدار سے محروم رہی۔'' نفیسہ کی آواز میں دُکھ تھا۔

''کیوں ماں؟'' وہ حیران ہوا۔

''جنازوں کو حویلی نہیں لایا گیا اور مجھے یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب انہیں دفنا دیا گیا۔''

''ماں، بابا نے ایسا کیوں کیا؟'' اس نے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے اس بحث میں اُلجھنے سے احتراز کیا۔

''ہاں ماں، اللہ یقیناً سب کچھ جانتا ہے لیکن اس نے اپنے بندوں کو بھی کچھ کچھ جاننے کیلئے عقل سے نوازا ہے، اور میری عقل اب وقت یہ کہہ رہی ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔'' کمال رائے نے ماں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہاتھ پاؤں پھیلا کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ نفیسہ بیگم اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''ماں مجھ سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ میں اسے حویلی میں چھوڑ کر شہر کی رنگینیوں میں گم ہو گیا۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ماں تمہیں وہ بری لگتی تھی۔''

''کمال بیٹے...... ایسی باتیں مت کرو۔''

''ماں، میری ماروی یہاں بہت تنہا تھی...... وہ آخری وقت تک مجھے پکارتی رہی اور میں بہرہ ہو گیا۔''

''میں نے اس کا بہت خیال رکھا اور تمہارے بابا بھی ماروی پر جان دیتے تھے۔''

''جان دیتے تھے یا جان لینے کے چکر میں رہتے تھے۔'' کمال رائے نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

''کیسی بات کرتے ہو کمال۔''

''ماں میری ماروی سے کوئی قصور ہو گیا تھا۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''نہیں۔'' نفیسہ بیگم نے مختصر جواب دیا۔

''ماں ایک تو وہ باہر سے آئی تھی دوسرے اس نے بیٹی کو جنم دیا...... وہ قصوروار تو تھی ہی ناماں۔''

''وہ قصوروار تھی یا نہیں...... یہ سوال تو اس وقت کھڑا ہوتا جب وہ زندہ سلامت حویلی میں آ جاتی۔ وہ اسپتال میں ہی چل بسی نہ وہ رہی نہ اس کی بچی رہی...... پھر جھگڑا کیا باقی رہ گیا۔'' نفیسہ بیگم نے کمال رائے کا ذہن صاف کرنے کیلئے دلیل دی، دلیل میں خاصا وزن تھا۔

''ماں جو بات بابا جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتیں اور جو تم جانتی ہو وہ میں نہیں جانتا اور جو میں جانتا ہوں وہ کوئی نہیں جانتا...... فکر مت کرو ماں وہ وقت زیادہ دور نہیں جب سب کو سب معلوم ہو جائے گا اور وہ دن اس حویلی کے مکینوں کیلئے خوشگوار نہ ہوگا۔'' کمال رائے نے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ نفیسہ بیگم کا دل اچانک لرز اُٹھا۔ وہ گھبرا کر بولیں۔ ''دیکھ بیٹا کوئی غلط قدم اُٹھانے سے پہلے سو بار سوچنا...... ہو سکے تو مجھ سے مشورہ کر لینا۔''

''اچھا ماں۔'' اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی پھر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

جب وہ ڈاکٹر ذاکر انصاری کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کمال رائے کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑے تپاک سے اس سے ہاتھ ملایا اور حال احوال پوچھا۔

''رائے صاحب آپ کی بچی کا کیا حال ہے؟'' حال احوال پوچھنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر نے سوال کیا۔

یہ سوال سن کر کمال رائے کو جھٹکا سا لگا اسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ ماروی بچی کو جنم دیتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور اس کے انتقال کے کچھ دیر بعد بچی بھی چل بسی تھی اور وہ وہی اسپتال تھا جہاں ماروی کو لایا گیا تھا۔

کمال رائے نے اپنی حیرت کو بڑی کامیابی سے چھپا لیا۔ وہ اس سے کوئی ایسا سوال نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر اس سے الٹا سوال کرنے بیٹھ جائے، وہ چونک جائے۔

''ڈاکٹر وہ بچی تو مر گئی؟'' کمال رائے نے افسردگی سے کہا۔

''ارے، کیسے؟'' ڈاکٹر حیران رہ گیا۔ ''ڈاکٹر ثمینہ نے آپ کی بیوی کی ڈلیوری کا کیس کیا تھا، میں بھی اسپتال میں موجود تھا۔ روشن رائے صاحب خود اسپتال آئے تھے۔ آپ کے بارے میں معلوم ہوا کہ کراچی میں ہیں۔ آپ کی بچی کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی بچی مکمل طور پر صحت مند تھی۔ ماشاءاللہ ایسی تندرست بچی آج کل کہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کے علاوہ خوبصورت بھی بہت تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہوتا تھا۔ اتنی پیاری بچی تھی وہ...... آخر اسے کیا ہوا؟''

''میرے خیال میں اسے نظر لگ گئی۔'' کمال رائے نے اس کی باتوں سے جواب نکالا۔

''اوہ، بہت افسوس ہوا...... آپ کی بیگم کا کیا حال ہے؟'' یہ ایک اور پریشان کن سوال تھا۔

''ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے...... کچھ ٹمپریچر اور کمزوری وغیرہ ہو گئی ہے...... میں انہیں کراچی لے جا رہا ہوں۔ میں آپ کے شہر کچھ کام سے آیا تھا۔ سوچا آپ سے بھی ملتا چلوں۔''

''رائے صاحب! آپ کی بڑی مہربانی...... اگر آپ فرمائیں تو کسی لیڈی ڈاکٹر کو ساتھ کر دوں۔''

''نہیں ڈاکٹر...... اس کی ضرورت نہیں...... بس آپ بخار وغیرہ کی دوا لکھ دیجئے، میں لیتا ہوا نکل جاؤں گا۔'' کمال رائے نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''آج کی رات گزر جائے پھر کل صبح تو میں کراچی چلا ہی جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے رائے صاحب میں آپ کو دوائیں لکھ دیتا ہوں..... انشاء اللہ اسی نسخے سے صبح تک بھلی چنگی ہو جائیں گی۔'' ڈاکٹر انصاری نے بہت پُر امید ہو کر کہا۔

پھر ڈاکٹر نے چند دوائیں لکھ کر نسخہ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور کمرے کے دروازے تک اسے چھوڑنے آیا۔ انہی بڑے لوگوں کی وجہ سے اسپتال چل رہا تھا، ان کی پذیرائی بہت ضروری تھی۔

☆.....☆.....☆

''ماں ایک بات پوچھوں، بتاؤ گی۔'' کمال رائے نے ماں کے گھٹنے پکڑ لئے اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔

''بیٹا..... اوپر بیڈ پر آجا۔''

''نہیں ماں، میں ٹھیک ہوں..... تم میری بات کا جواب دو۔''

''ہاں پوچھو۔''

''ماں جس اسپتال میں، میری ماروی اور بچی کا انتقال ہوا..... وہاں کے بڑے ڈاکٹر کو ان دونوں کی موت کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔'' کمال رائے نے انکشاف کیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' نفیسہ بیگم پریشان ہو گئی۔

''ایسا اس طرح ہو سکتا ہے کہ ماروی اور میری بچی کی موت اسپتال میں نہیں ہوئی۔''

''لیکن تمہارے بابا نے تو مجھے یہی بتایا تھا۔''

''ماں، بابا جھوٹے ہیں۔'' کمال رائے نے ماں کے گھٹنے چھوڑے اور سامنے پڑے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا۔

''باپ کو جھوٹا کہتے ہو کیسے بیٹے ہو تم؟''

''جھوٹے باپ کو جھوٹا نہ کہوں تو کیا کہوں؟''

کمال رائے نے تلخی سے کہا۔ ''ماں تم جانتی ہو کہ میری بچی کس قدر خوبصورت تھی۔ وہ اتنی صحت مند تھی اور اتنی حسین تھی کہ کوئی اسے ایک بار دیکھ لیتا تو پھر دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا، ماں میں اب ایسی بچی کہاں سے پاؤں گا؟ کہاں سے لاؤں گا؟..... میرے باپ نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے..... اور ماں تم اس جرم میں باپ کی برابر کی شریک ہو۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے میں رکا نہیں..... نفیسہ بیگم کہتی رہ گئیں۔ ''بیٹا سنو تو۔''

☆.....☆.....☆

کمال رائے حویلی کے پچھلی طرف بنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا..... وہ ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا..... سوچ رہا تھا اور ٹہل رہا تھا..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے.....؟ کیسے

ہوا ہے.....؟

اس کی بیوی اور بچی کا انتقال ہوا..... مگر اسے اطلاع نہیں دی گئی، ماں نے خبر کروانی چاہی بھی تو بابا نے انہیں روک دیا..... اس کی بھلائی کیلئے، بھلا اس میں اس کی کیا بھلائی تھی، یہ بات وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ پھر جنازوں کو حویلی نہیں لایا گیا..... ماں نے اپنی پوتی اور بہو کا آخری دیدار نہیں کیا اس میں بھلا کس کی بھلائی تھی..... گورکن نے قبریں نہیں کھودیں..... اسے اپنے گھر میں قید کر دیا گیا..... جنازے کس نے قبروں میں اُتارے، یہ بات خیرو کو معلوم نہیں..... آخر گورکن کو ان قبروں سے دور کیوں رکھا گیا..... اس میں کس کی بھلائی تھی..... ماں نے بتایا کہ اس کی بیوی اور بچی کا انتقال اسپتال میں ہوا، جس اسپتال میں انتقال ہوا وہاں کے ڈاکٹر نے کچھ اور بیان دیا..... وہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس نے ڈاکٹر سے جاتے ہی ماروی اور بچی کے انتقال کا ذکر کر کے اس کے بارے میں معلومات نہیں کیں ورنہ وہ اسپتال گیا اسی ارادے سے تھا کہ ڈاکٹر سے ماروی اور بچی کی بیماری کے بارے میں پوچھے اور یہ معلوم کرے کہ ان دونوں کا انتقال کیوں کر ہوا.....؟

اب تک کی تحقیق اور جستجو سے جو بات سامنے آئی تھی وہ یہ تھی کہ ماروی اور اس کی بچی کی لاش کسی نے نہیں دیکھی تھی..... تو آخر ان دونوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

وہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ تب یکا یک اس کے ذہن میں اپنے باپ روشن رائے کے ''فرشتے'' آئے۔ وہ ان دونوں کو بابا کے فرشتے ہی کہتا تھا..... ان دونوں کا نام تھارو لی اور ہو لی..... !

وہ دونوں جڑواں بھائی تھے ان دونوں کی شکلوں میں مشابہت تھی لیکن بہت زیادہ نہیں تھی..... ایک کی بڑی مونچھیں تھیں تو دوسرے کی مونچھیں صفاچٹ تھیں..... ایک نے لمبے لمبے بال رکھے ہوئے تھے تو دوسرے نے اپنے سر کو ''فارغ البال'' رکھا تھا..... قد دونوں کے برابر تھے، جسامت بھی ایک جیسی تھی، ناٹے اور موٹے دیکھنے میں دونوں ''رف اینڈ ٹف'' تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو بابا کے اُٹھنے سے لے کر بیڈ پر جانے تک ساتھ رہتے تھے۔ بابا کے ساتھ جہاں کوئی اور نہیں جا سکتا تھا وہاں دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ضرور ہوتا تھا..... یہ دونوں بابا کے خاص آدمی تھے..... اتنے خاص کہ جو بات بابا بھی اپنے بارے میں نہیں جانتے تھے وہ یہ جانتے تھے..... یہی وجہ تھی کہ کمال رائے ان دونوں کو بابا کے ''فرشتے'' کہتا تھا..... ان دونوں کے ہاتھ میں روشن رائے کا ''اعمال نامہ'' جو تھا۔

ابھی تک اس نے ان دونوں میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا..... چھوا نہیں تھا، ویسے ان دونوں میں سے کسی کو ہاتھ لگانا، چھونا اتنا آسان بھی نہ تھا..... ان پر ہاتھ ڈالتے ہی بابا کو خبر ہو جاتی اور یہ ''خبر'' اس کیلئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی..... اسے اپنے باپ کے مزاج کا اچھی طرح پتہ تھا..... وہ

ایک پتھر دل شخص تھا......سفا کی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی......اپنے کام میں مداخلت یا کسی قسم کی رکاوٹ وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتا تھا اگرچہ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا لیکن وہ اپنی اَنا کے پیچھے کسی اکلوتی تو دور وہ اولاد ماننے سے بھی انکار کرسکتا تھا۔ایسی صورت میں ان دونوں کو ''زیر تفتیش'' لانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

اب اس مسئلے کا ایک ہی حل اس کے پاس رہ جاتا تھا۔اس حل پر عمل کرنے کے لئے وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

وہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا، بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

روشن رائے اس وقت ہواخوری کیلئے اپنی زمینوں پر نکلا ہوا تھا۔وہ گھوڑے پر سوار آگے چل رہا تھا اس کے پیچھے رولی اور ہولی اپنے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ چل رہے تھے، دونوں جدید اسلحے سے لیس تھے۔

روشن رائے گھوڑے کی پیٹھ پر کمر اکڑائے، گردن اکڑائے اور سر اوپر اُٹھائے بیٹھا تھا۔وہ اپنی جاگیر اور اپنی زمینوں پر گھوم کر بہت خوش ہوتا تھا۔اپنی جاگیر کو دیکھ کر اس کا رواں رواں سرشار ہو جاتا تھا۔جب اس کی طبیعت میں اضمحلال یا تکدر پیدا ہوتا تو وہ فوراً رولی اور ہولی کو لے کر اپنی جاگیر کی سیر کرنے نکل جاتا۔زمینوں کی سیر کرتے ہوئے وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتا تھا، اس کی آنکھیں ویسے ہی اُلو کی طرح گول تھیں، ان گول آنکھوں کو دیکھتے ہوئے وہ مزید پھاڑ لیا کرتا تھا۔

سیر کرتے ہوئے اگر اسے اپنی پسند کی کوئی ''شے'' دکھائی دے جاتی تو وہ رولی کی طرف اشارہ کرکے کہتا۔''دیکھو بھئی ہماری زمینوں کی شان۔''

رولی ہولی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی کہ زمینوں کی شان کہہ کر کس ''شان'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔وہ اس ''شان'' کو اچھی طرح تاڑ لیتے اور ان میں ایک اس ''شان'' کے تعاقب میں رہتا جب تک اس ''شان'' کو مالک کے حضور پیش نہ کر دیا جاتا۔

ہواخوری روشن رائے کا محبوب مشغلہ تھا۔اس مشغلے کے دوران زمینوں کی ''شان'' ہی نہیں اور بھی فیصلے سنا دیئے جاتے تھے اور رولی ہولی ان احکامات پر اس طرح عمل کرتے جیسے وہ انسان نہ ہوں روبوٹ ہوں، جذبات سے عاری۔

اس حویلی میں پہلے رولی آیا تھا، حلیہ تو خیر اس کا وہی تھا جو آج تھا، گنجا سر اور موٹی مونچھیں لیکن چہرے پر آج جو خباثت تھی وہ نہ تھی، مسکین صورت بنائے روشن رائے کے حضور پیش ہوا تھا۔اب سے دس سال پہلے اس کا کوئی قریبی رشتے دار روشن رائے کا ملازم تھا اس کے ذریعے رولی روشن رائے تک

پہنچا تھا اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا تھا۔روشن رائے نے اس سے کچھ پوچھنے سے پہلے اسے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا تھا۔وہ اسے ایک ہی نظر میں کام کا آدمی دکھائی دیا تھا۔اس نے فوراً فیصلہ کرلیا تھا کہ اس بندے کو حویلی کی فوج ظفر موج میں شامل کرے گا۔لہٰذا اس نے شروع سے نرم لہجہ اختیار کیا۔

''ہاں بابا ابھی کچھ بولو یا ہاتھ جوڑے ہی کھڑے رہو گے۔''

''مالک ایک فریاد لے کر آیا ہوں۔''

''ہاں بابا بولو......ہم اِدھر کس لئے بیٹھے ہیں......ہم لوگوں کی فریاد نہیں سنیں گے تو کون سنے گا۔ ہاں بابا بولو......تمہیں کس نے پریشان کیا ہے کیا فریاد ہے تمہاری؟'' روشن رائے نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''مالک...... مجھے میرے چاچا نے بہت ستایا ہے۔'' اس نے فریاد کی۔

''اچھا بابا......ابھی وہ کیا کہتا ہے......کوئی زمین ممین کا جھگڑا ہے کیا؟''

''ہاں مالک زمین کا جھگڑا ہے......آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔''

''تمہاری زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے وہ۔''

''نہیں مالک زمین اسی کی ہے۔'' انکشاف کیا گیا۔

''ارے بابا، زمین اس کی ہے تو پھر جھگڑا کیسا؟'' روشن رائے ذرا حیران ہوا۔

''مالک میرا چاچا...... بالکل اکیلا ہے، نہ جورو، نہ بچے......عمر بھی کافی ہے......میں کہتا ہوں زمین میرے حوالے کردو تو کرتا نہیں۔دیکھیں نہ مالک یہ زمین کل بھی میرے ہی نام ہونی ہے تو پھر زمین کا قبضہ چھوڑتا کیوں نہیں۔'' رولی نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا۔

یہ سن کر روشن رائے نے زوردار قہقہہ لگایا......پھر مسکراتے ہوئے بولا۔''بابا بات تو تم ٹھیک کہتے تمہاری فریاد بڑی جائز ہے۔پر بابا ابھی میں اس میں کیا کروں......؟ دیکھو کسی چیز کو حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ میری نظر میں ہے۔اگر کوئی تمہارا حق دینے پر راضی نہ ہو تو اس سے چھین لو...... تمہارا چاچا تمہاری ہونے والی زمینوں پر سانپ بنا بیٹھا ہے تو بابا لاٹھی اُٹھاؤ اور اس کا سر کچل دو، جوان ''مار رہو، تمہارے لئے یہ کام مشکل تو نہیں۔''

''پولیس سے ڈرتا ہوں!'' رولی نے صاف گوئی سے کہا۔

''اور پولیس ہم سے ڈرتی ہے؟'' روشن رائے نے سوال بھی کیا اور جواب بھی دیا۔

''ہاں مالک!'' رولی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''پولیس کو ہم دیکھ لیں گے......تم اپنے چاچا کو دیکھو۔'' روشن رائے نے فیصلہ سنایا۔

رولی خوش ہوگیا...... وہ روشن رائے کی سرپرستی حاصل کرنے کیلئے ہی یہاں آیا تھا...... اس کے رشتے دار نے بھی مشورہ دیا تھا کہ اگر مالک نے تیرے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو تیرا بیڑا پار ہے...... مالک نے بھی یونہی اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھ دیا تھا...... اتنی بڑی جاگیر تھی، جاگیر کو سنبھالنے کیلئے ہر طرح کے بندوں کی ضرورت تھی...... رولی انہی بندوں میں سے ایک تھا۔

بس پھر کیا تھا...... مالک کا آشیرواد ملتے ہی اس نے اپنے چاچا کا ''کلیان'' کردیا۔

اپنے چاچا کو قتل کرکے جب وہ فرار ہوکر پناہ کی تلاش میں حویلی کی طرف آرہا تھا کہ راستے میں اسے پولیس نے دھر لیا...... ساتھ ہی آلۂ قتل بھی اس سے برآمد کرلیا...... تھانیدار کو روشن رائے نے یہی حکم جاری کیا تھا۔

رولی کی گرفتاری کی روشن رائے کو فوراً ہی خبر مل گئی لیکن اس نے دو راتوں تک رولی کی کوئی خبر نہ لی...... وہ تھانے کے لاک اپ میں بند مالک کی طرف سے کسی مدد کا انتظار کرتا رہا...... دو راتیں گزرنے پر اس کے چھکے چھوٹ گئے...... وہ اپنے چاچا کے قتل کے الزام میں آلۂ قتل کے ساتھ پکڑا گیا تھا اسے اب پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا...... جب ناامیدی اپنی حدوں کو چھونے لگی تو روشن رائے کا چہرہ چمکا اس نے تھانیدار سے دکھاوے کا ''مک مکا'' کیا اور رولی پر یہ ظاہر کرکے کہ اس نے پچیس ہزار روپے بطور نذرانہ ادا کرکے اسے چھڑایا ہے۔ اسے ہمیشہ کیلئے اپنے ''دام الفت'' میں جکڑ لیا۔

رولی، روشن رائے کیلئے بہت کام کا آدمی ثابت ہوا...... آہستہ آہستہ وہ روشن رائے کا خاص آدمی بن گیا...... ایک سال گزرنے کے بعد رولی نے اپنے جڑواں بھائی ہولی کا ذکر کیا...... وہ اس وقت کراچی میں تھا...... اور وہاں ہر طرح کی وارداتوں میں ملوث تھا...... وہ کراچی سے فرار ہوکر گاؤں پہنچا تو رولی نے اسے روشن رائے کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کرلیا...... جب روشن رائے نے ہولی کے بارے میں سنا تو وہ اسے کام کا آدمی معلوم ہوا اور اس نے فوراً رولی سے کہا۔

''ہاں بابا...... لاؤ اسے...... ابھی ہم دیکھیں کراچی میں واردات کرنے والے کو۔''

ہولی کو ایک نظر دیکھتے ہی روشن رائے نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کرلیا...... اس طرح جلد ہی دونوں بھائی روشن رائے کے اعتماد کے بندے بن گئے۔

ایک طویل عرصے سے وہ دونوں روشن رائے کے پاس تھے...... وہ دونوں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے...... اسی لئے کمال رائے انہیں بابا کے ''فرشتے'' کہتا تھا۔ ایسے فرشتے جن کے بیان پر بابا پکڑے جاسکتے تھے۔

روشن رائے نے اچانک دوڑتے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور گھوڑا کا ذرا رخ موڑ کر پیچھے

یلما...... رولی اور ہولی زیادہ پیچھے نہ تھے وہ چند لمحوں میں روشن رائے کے نزدیک پہنچ گئے...... اور خا۔وشی سے اس کی طرف دیکھنے لگے...... روشن رائے نے اپنے فرشتوں کی طرف باری باری غور سے یلما...... اور پھر بڑی فکرمندی سے بولا۔

''بابا کمال رائے کی کچھ سمجھ نہیں پڑ رہی...... ابھی تم لوگ اس پر نظر رکھو۔''

''جی مالک۔'' رولی نے سعادت مندی سے کہا۔

''دیکھو ذرا ہوشیاری سے...... اسے پتہ نہ پڑے کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے...... ورنہ وہ اسے گولی مار دے گا...... جب اسے غصہ آجائے تو پھر کچھ نہیں دیکھتا......'' روشن رائے اپنے بیٹے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔

''جی مالک...... آپ فکر نہ کریں۔'' اس مرتبہ ہولی بولا...... ''میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

''آؤ، پھر چلیں...... شام ہونے کو ہے۔'' یہ کہہ کر روشن رائے نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی اور اس کا گھوڑا دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

☆......☆......☆

کمال رائے نے خیرو کو کام پر لگا دیا تھا۔

خیرو جانتا تھا کہ یہ خطرناک کام ہے...... اگر اس کام کی بڑے مالک کو بھنک بھی پڑ جائے تو وہ بیوی بچوں سمیت اسے کتوں کے آگے ڈلوا دیں گے۔

ادھر بڑے مالک تھے تو اُدھر چھوٹے مالک تھے...... وہ بھی کسی عذاب سے کم نہ تھے...... اگر وہ کام سے انکار کرتا تو جان پھر بھی محفوظ نہ تھی...... ایک طرف آگ تھی تو دوسری طرف کھائی، اس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کمال رائے کا ساتھ دینے کا ارادہ کرلیا۔ خیرو کو کمال رائے سے ہمدردی ہوئی تھی...... ویسے بھی وہ چھوٹے مالک تھے...... نوجوان تھے۔ وہ فاتحہ کیلئے ہاتھ اُٹھاتے تو ان کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ ان قبروں میں کیا راز تھا...... اسے ان سے دور کیوں رکھا گیا تھا...... اس تجسس نے بھی اسے اس کام پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے ایک محفوظ جگہ سے سرنگ کھودنا شروع کی تھی...... وہاں مہ ازیاں بہت تھیں، ایک نظر دیکھنے میں کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہاں سے سرنگ کھودی جارہی ہے...... ویسے بھی کسی کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا تھا...... اگر قبر کو پختہ نہ کرا دیا گیا ہوتا تو سرنگ کھودنے کی ضرورت نہ پڑتی...... خیرو راتوں رات قبر کھود کر دوبارہ اس کو جوں کا توں بند کر دیتا اب پختہ قبر کو توڑا نہیں جا سکتا تھا...... اگر توڑا جاتا تو چند گھنٹوں میں اس کی تعمیر ممکن نہ تھی...... اگر اس طرح قبر کو پختہ کر بھی دیا جاتا تو راز کھلنے کا خطرہ تھا۔

خیرو رات کے بارہ بجے سے صبح چار بجے تک سرنگ کھودنے کا کام کرتا تھا...... اس نے دو راتوں میں سرنگ کو ماروی کی قبر تک پہنچا دیا۔

پھر جب کمال رائے پروگرام کے مطابق فجر کے وقت قبرستان پہنچا اور سرنگ میں داخل ہو کر اس نے ایمرجنسی لائٹ میں قبر کا معائنہ کیا تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

قبر خالی تھی اس میں ماروی کی لاش موجود نہ تھی۔

وہ سرنگ بند کرنے کا حکم دے کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر حویلی آ گیا...... ایک پہریدار نے گاڑی کا ہارن سن کر حویلی کا دروازہ کھولا...... وہ گاڑی کو حویلی کی اصلی عمارت تک لے گیا...... حویلی پر سناٹا طاری تھا...... اگرچہ آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو گئی تھی لیکن حویلی کے مکین اندھیرے میں پڑے خواب خرگوش کے مزے لیتے تھے...... اس حویلی کے اس مکین تھے ہی کتنے...... گنتی کے تین، ایک بابا، ایک ماں اور ایک وہ...... تین مکین اور حویلی اتنی بڑی کہ بیک وقت تین سو آدمی بآسانی سما جائیں...... اس حویلی میں ملازموں سے رونق تھی اگر وہ نہ ہوتے تو حویلی پر ہُو کا عالم ہوتا۔

کمال رائے کو اس سناٹے سے سخت چڑ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہوسٹل میں رہنا پسند کیا تھا...... چاہتا تو وہ اپنا ڈیفنس کا بنگلہ رہائش کیلئے استعمال کر سکتا تھا لیکن وہ فلیٹوں میں رہنا چاہتا تھا...... ایک ہنگامہ خیز زندگی گزارنا چاہتا تھا...... ماروی کو بھی اس نے اسی لئے حویلی میں چھوڑا ہوا تھا...... وہ دو میاں بیوی بھلا اتنے بڑے بنگلے میں رہ کر کیا کرتے...... ماروی خود بھی اکیلا نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسی لئے ماروی کی حویلی میں رہائش کمال رائے کیلئے فکر کا باعث نہ بنی لیکن اب وہ پچھتا رہا تھا...... کاش! اس نے ماروی کو حویلی میں نہ چھوڑا ہوتا۔

اب یہی معاملہ خاصا اُلجھ گیا تھا...... ماروی کی لاش قبر میں موجود نہ تھی...... لاش کی غیر موجودگی سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ ماروی کا انتقال نہیں ہوا...... اس نے بچی کی قبر نہیں کھدوائی تھی لیکن اس بات کا اسے پکا یقین تھا کہ وہ قبر بھی خالی ہو گی...... اگر دونوں ماں بیٹی زندہ تھیں تو انہیں مردہ کیوں ظاہر کیا گیا؟

قبر میں لاش نہ ہونے کی وجہ سے اس کے دل کو تقویت ملی تھی...... اب کم از کم اسے اپنی بیوی اور بیٹی کے ملنے کی اُمید تو ہو گئی تھی۔

کمال رائے کو حویلی آئے پانچ چھ دن ہو گئے تھے...... ابھی تک اس نے ناشتہ نفیسہ بیگم کے ساتھ نہیں کیا تھا...... موقع ہی نہیں ملا تھا...... آج صبح نفیسہ نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ وہ ناشتہ اس کے ساتھ کرے گی...... پھر وہ اپنے ہاتھوں سے ٹرالی دھکیلتی ہوئی اس کے کمرے میں آ گئی تھی...... وہ ابھی ابھی باتھ روم سے نہا کر نکلا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا کہ آئینے میں اسے اپنی ماں کی

صورت دکھائی دی...... وہ بال بناتے بناتے رک گیا اور اپنی ماں کا چہرہ بغور دیکھنے لگا۔

نفیسہ نے بھی اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر لیں...... وہ دھیرے سے مسکرائی اور ٹرالی میز کے نزدیک کر کے اس پر سے ناشتے کا سامان اُتار کر میز پر رکھنے لگی۔

''ماں حویلی کے سارے ملازم کیا ہوئے؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''سب ہیں...... میں نے سوچا کہ آج اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کراؤں گی۔'' نفیسہ پیار سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا ماں، تمہاری مہربانی۔'' کمال رائے نے میز کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹا...... اب تو اتنا بااخلاق ہو گیا ہے کہ ماں کا بھی شکریہ ادا کرے گا۔''

''بری بات ہے یہ؟'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''ہاں، بہت بری......'' نفیسہ بیگم نے کہا۔ ''آئندہ مجھ سے اس انداز اور لہجے میں بات نہ کرنا۔''

''اچھا، معافی۔'' کمال رائے نے ہاتھ جوڑے۔

''جا معاف کیا......'' نفیسہ نے خوش ہو کر کہا۔

''ماں، کیا واقعی تم کچھ نہیں جانتی ہو......؟'' کمال رائے کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

''اب کیا ہوا؟''

''ماں تم نے آخر مجھ سے کیوں چھپایا؟'' اس کا لہجہ شکوہ بھرا تھا۔

''بیٹا...... میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔'' نفیسہ بیگم کا دل فکر میں ڈوب گیا...... ''میرا یقین کرو۔''

''کس کا یقین کروں اور کس کا یقین نہ کروں...... مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔'' کمال رائے کے لہجے میں کسی حد تک سختی آ گئی۔ ''ماں مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ ماروی اور میری بیٹی زندہ ہیں۔''

''ماروی زندہ ہے سچ......'' نفیسہ بیگم کے چہرے پر خوشی آ گئی پتہ نہیں یہ خوشی سچی تھی یا جھوٹی۔

''ہاں، ماروی کی قبر مصنوعی بنائی گئی ہے۔''

''مصنوعی کیا مطلب......؟ کیا اب قبریں بھی دو نمبر کی بننے لگی ہیں۔''

''ہاں ماں...... قبر میں ماروی کی لاش نہیں ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''ہیں......؟'' نفیسہ بیگم نے حیران ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ماں، آخر تم مجھے سچ بتا کیوں نہیں دیتیں۔'' کمال رائے نے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

نفیسہ بیگم ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک ملازمہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کیا ہوا؟'' کمال رائے نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''وہ مالکن...... وہ...... قبرستان میں آگ لگ گئی ہے۔'' ملازمہ نے پھولی ہوئی سانسوں کے

درمیان بتایا۔

’’قبرستان میں آگ لگ گئی ہے...... اری کیا بکواس کررہی ہے۔‘‘ نفیسہ بیگم نے ملازمہ کوڈانٹا۔

’’قبرستان میں آگ...... اوہ مائی گاڈ۔‘‘ یہ کہہ کر کمال رائے ناشتہ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

’’بیٹا...... تم ناشتہ کرو، کہاں جارہے ہو۔ میں تمہارے بابا کو بتاتی ہوں۔ وہ دیکھ لیں گے۔‘‘ نفیسہ بیگم اُٹھتے ہوئے بولی۔

’’ماں...... میں قبرستان جارہا ہوں۔ بابا سورہے ہوں گے، انہیں سونے دو، میں خود جا کر دیکھ آتا ہوں۔ کیا صورتحال ہے۔ ناشتہ پھر آکر کرتا ہوں۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس نے اپنی ماں کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا۔

کمال رائے کی گاڑی حویلی کے دروازے پر موجود تھی، گاڑی اسٹارٹ کرکے اس نے حویلی کے دو ملازموں کو اپنے ساتھ لیا اور قبرستان پہنچ گیا۔

قبرستان میں اس نے جو کچھ دیکھا، وہ اس کیلئے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

خیرو کا کچا گھر پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اس کے علاوہ ماروی اور بچی کی جعلی قبروں سے بھی شعلے اُٹھ رہے تھے۔ یہ بڑا اندوہناک منظر تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی قبرستان میں آتشزدگی کا نہیں سنا تھا۔ کوئی خدا بن گیا تھا اس نے قبرستان کو جہنم رسید کردیا تھا۔

قبرستان میں روشن رائے کا ایک ’’فرشتہ‘‘ موجود تھا۔ وہ آگ بجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ملازمین اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ قبرستان میں ایک چھوٹا ٹیوب ویل لگا ہوا تھا، وہ چلایا جاچکا تھا۔ قبرستان کے پودوں کو جس پائپ سے پانی دیا جاتا تھا اس سے آگ بجھانے کی ناکام کوشش کی جارہی تھی۔

رولی نے جب کمال رائے کی گاڑی دیکھی تو وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا اور بڑے افسردہ انداز میں گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

’’یہ آگ کس نے لگائی ہے؟‘‘ کمال رائے نے غصے بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’مالک کچھ پتہ نہیں۔‘‘ رولی نے سر جھکائے جواب دیا۔

کمال رائے گاڑی سے اُتر کر قبروں کی طرف بڑھنے لگا۔ شعلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ قبروں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا ہے۔

’’چھوٹے مالک۔‘‘ رولی تیزی سے چلتا ہوا اس کے آگے آیا۔ ’’چھوٹے مالک، آپ اس طرف نہ جائیں۔ وہاں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لوگ آگ بجھارہے ہیں۔ چھوٹے مالک آپ حویلی چلیں۔ میں وہاں آکر ساری صورتحال بتاتا ہوں۔ آپ بےفکر رہیں۔ یہ جس نے بھی کیا ہے، میں

اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

’’رولی، تم ایک منٹ ذرا میری گاڑی کے پاس رکو...... میں ذرا قبروں کو دیکھ کر آتا ہوں۔ دیکھنا کہیں کوئی میری گاڑی کو آگ نہ لگادے۔‘‘ کمال رائے نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دونوں قبریں پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھیں۔ شعلے قبروں سے نکل رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پختہ قبروں کو توڑ کر پھر آگ لگائی گئی ہو۔ کمال رائے نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ آج صبح ہی قبر کا حال دیکھ گیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ قبروں کو مسمار کرکے کیوں آگ لگائی گئی ہے۔ آگ لگانے والا چاہتا تھا کہ قبروں میں موجود لاشوں کے وجود کو عدم وجود کردیا جائے، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، نہ رہیں گی قبریں نہ پڑھے کوئی فاتحہ۔

پھر اچانک اسے خیرو کا خیال آیا۔ وہ ابھی تک کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کا گھر جلا کر کس بات کا غصہ اُتارا گیا تھا۔ تب فوراً ہی اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اوہ...... کہیں ایسا تو نہیں کسی نے خیرو کو سرنگ کھودتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ اوہ، ضرور یہی بات ہے۔ اسی لئے اسے اس کا گھر جلا کر سزا دی گئی ہے لیکن مسئلہ صرف اتنا ہی نہ تھا۔

روشن رائے کے حکم کے مطابق کمال رائے کی نگرانی جاری تھی۔ فجر کے وقت جب کمال رائے ماروی کی قبر کا معائنہ کرکے واپس حویلی گیا تو رولی کو فوراً خبر مل گئی۔ وہ اطلاع ملتے ہی قبرستان پہنچا۔ اس نے خیرو کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ بڑی تیزی سے سرنگ بند کرنے کیلئے پھاوڑے سے قبر میں مٹی پھینک رہا تھا۔

رولی نے گردن سے پکڑ کر اسے گاڑی میں ڈالا اور حویلی لے آیا۔ رولی کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھا کہ روشن رائے رات بھر جاگنے کا عادی تھا۔ اسے اذانوں کے وقت ہی نیند آتی تھی۔ جب انسانوں کے جاگنے کا وقت ہوتا تھا وہ شیطانوں کی طرح سونے لگتا تھا۔

ابھی اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ لائٹ تو اس کے کمرے کی جلتی ہی رہتی تھی کہ اب وہ اندھیرے میں نہیں سو سکتا تھا۔ جب سے سانپ دکھائی دینے کا چکر چلا تھا، تب سے اس کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ کچھ اس کے اعمال تھے اور کچھ عمر کا تقاضا تھا۔ اب وہ پہلی سی نیندیں نہ رہی تھیں۔

رولی نے ایک مخصوص انداز میں دستک دی۔ اس دستک کو روشن رائے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ابھی وہ سونے کی تیاری کرہی رہا تھا کہ رولی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت یہ کیسے آگیا۔ اس نے کوئی ایسا کام بھی سپرد نہیں کیا تھا جس کی تکمیل کرکے وہ یہاں پہنچا ہو۔ بہر حال اس نے رسالہ بند کرکے میز پر رکھا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

رولی دروازے پر موجود تھا اور اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔

"ہاں، کیا ہوا؟" روشن رائے نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔ "آؤ اندر آؤ۔"

روشن رائے کے ساتھ سہمے سہمے وہ بھی اندر آ گیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "مالک...... قبرستان سے خیرو کو اُٹھا لایا ہوں۔"

"خیرو، کیوں......؟ بابا خیر تو ہے۔" روشن رائے نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"مالک خیر نہیں ہے...... اس نے چھوٹے مالک کو قبر کھود کر دکھادی ہے۔" رولی نے دھماکا کیا۔

"نہیں بابا۔" روشن رائے کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اُڑ گئیں۔ اتنی محنت سے تیار کیا گیا اسٹیج ذرا سی ہوا نے اُڑا کر رکھ دیا۔ ارے بابا، یہ خیرو نے کیا کیا۔ اس نے ہمارا سارا کھیل ہی چوپٹ کر دیا۔ بابا وہ ہے کہاں؟"

"حویلی میں موجود ہے۔ اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔" رولی نے بتایا۔

"او، بابا اس کو یہاں کیوں لے آئے۔ بابا اسے تو قبرستان ہی لے جاؤ، پہلے اس کی بیوی بچوں کو آگ دکھاؤ پھر اسے بھی بھون دو۔ دیکھو اس کا گھر بار کچھ نہ بچے اور ہاں اب ان قبروں کا ہمیں کیا فائدہ۔ بابا انہیں بھی جلا دو۔ آگ لگا دو۔ جاؤ جلدی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ کمال رائے حویلی سے باہر نکلے سب کچھ جل چکا ہو۔ سمجھ گئے بابا۔"

"جی مالک، اچھی طرح سمجھ گیا۔" رولی نے فرمانبرداری سے گردن ہلائی۔

"بس تو بابا پھر جاؤ...... ابھی اِدھر کیوں کھڑے ہوں...... اس خیرو کے بچے نے بڑی بے وقوفی کا کام کیا۔"

رولی فوراً ہی پنجوں کے بل گھوما اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

پھر اس نے قبرستان پہنچ کر جو تماشا کیا، وہ اب کمال رائے کے سامنے تھا۔ کمال رائے قبروں کا حال دیکھ کر واپس آیا تو اس نے رولی کو گاڑی کے پاس مستعدی سے کھڑا پایا۔ وہ ملازمین کو ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ہدایات دے رہا تھا۔

کمال رائے نے اس کے نزدیک پہنچ کر گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ "رولی، خیرو کہاں ہے؟"

"نہیں معلوم چھوٹے مالک۔" رولی نے بڑی آہستگی سے جواب دیا۔

"کہیں آگ لگانے والے نے اسے گھر سمیت تو نہیں جلا دیا۔ پھر اس گھر میں اس کے بیوی بچے بھی تھے۔ اگر ایسا ہوا تو یاد رکھنا عذاب آئے گا۔" کمال رائے نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں چھوٹے مالک۔ آگ بجھے تو کچھ پتہ پڑے۔" اس نے مکاری سے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قبرستان میں کیا ہوا تھا۔

رولی نے روشن رائے کا حکم پاتے ہی سب سے پہلے خیرو کو اس کے گھر میں لا کر ایک چارپائی سے باندھ دیا تھا۔ یہی عمل اس نے اس کے بیوی بچوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے پورے گھر میں پٹرول چھڑک کر گھر کو دیا سلائی دکھا دی تھی۔ خیرو بے چارہ اپنی آنکھوں سے رحم کی اپیل کرتا رہ گیا تھا۔ بول وہ سکتا نہیں تھا کیونکہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خیرو اپنی بیوی بچوں سمیت زندہ جل گیا۔

اتنی دیر میں اس کے آدمیوں نے پختہ قبروں کو توڑ دیا تھا۔ وہاں رولی نے یہی عمل دہرایا۔ ٹوٹی قبروں میں سوکھی لکڑیاں لا کر ان پر پٹرول ڈال دیا اور پھینک دی۔ جلتی دیا سلائی، قبروں میں جیسے جہنم کی آگ بھڑک اُٹھی۔

رولی نے جن لوگوں کے ساتھ مل کر یہ آگ لگائی تھی۔ اب وہی لوگ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ آگ کم بجھا رہے تھے، شور زیادہ مچا رہے تھے۔ اِدھر اُدھر فضول بھاگ رہے تھے اور یہ بات کمال رائے نے اچھی طرح نوٹ کر لی تھی۔ پھر وہ وہاں رکا نہیں۔ وہ وہاں رک کر کیا کرتا، جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا تھا۔

دوپہر تک اسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ خیرو اور اس کے بیوی بچے بھی اس آگ میں جل مرے ہیں۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آخر اس غریب کا کیا قصور تھا۔ قصور تو تھا، اس نے اپنی بساط سے آگے جانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاید اپنی اوقات بھول گیا تھا۔ وہ کمال رائے کی باتوں میں آ کر گمراہ ہو گیا تھا۔ اس نے جعلی قبروں کا راز فاش کر دیا تھا اور مملکت کا "راز" فاش کرنے پر اسے موت کی سزا تو بہر حال ملنا تھی۔

☆......☆......☆

روشن رائے اس وقت بڑے انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔ نفیسہ بیگم اس کے سامنے بیٹھی اسے گھورے جا رہی تھی۔ روشن رائے روسٹ مرغی کو بھنبھوڑتے بھنبھوڑتے اچانک رُکا اور نفیسہ بیگم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ارے بابا، کیا ہوا...... کھانا کھاؤ، مجھے کیا دیکھ رہی ہو، کیا نظر لگاؤ گی۔"

"اسے چپ لگ گئی ہے۔" نفیسہ بیگم نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں کہا۔

"کسے بابا......؟" روشن رائے مرغی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"کمال رائے کو...... میں اور کس کی بات کروں گی۔" نفیسہ بیگم نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

"کوئی بات نہیں...... ٹھیک ہو جائے گا۔ چند دن تو وہ پریشان رہے گا ہی۔" روشن رائے نے تسلی دی۔

"اسے قبروں کا حال معلوم ہو گیا ہے۔"

"قبر کا حال تو صرف مردہ جانتا ہے بھلا اسے کیسے معلوم ہو گیا۔ خیر اگر معلوم ہو گیا ہے تو اس نے قبروں میں دوزخ کی آگ بھڑکتی ہوئی بھی دیکھ لی ہو گی۔" روشن رائے کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"وہ اسپتال بھی ہو آیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ماروی اور اس کی بچی کا انتقال اسپتال میں نہیں ہوا۔" نفیسہ بیگم نے راز کھول دیا۔

"تم نے اس خبر کی تصدیق تو نہیں کی۔" روشن رائے نے لاپروائی سے پوچھا۔

"میں کس طرح تصدیق کر سکتی ہوں۔" نفیسہ بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔ "وہ بہت پریشان ہے مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔"

"نفیسہ بیگم کچھ نہیں ہوا، تم پریشان مت ہو......" روشن رائے پورے اطمینان سے بولا۔ "بس تم اپنے لب نہ کھولنا۔"

"مجھے پوری بات بتاؤ۔ آخر ماروی اور اس کی بچی کہاں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ماروی کا بیٹی کو جنم دینا پسند نہیں آیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" روشن رائے نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر وہ دونوں زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم...... دیکھو بابا، مجھے کھانا کھانے دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بھوک لگتی ہے۔" روشن رائے پھر سے کھانے میں منہمک ہو گیا۔

نفیسہ بیگم کچھ دیر تو اسے دیکھتی رہی۔ پھر جانے کیوں اسے دیکھ کر کتے کی سی شکل بار بار اس کے سامنے آنے لگی۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گئی اور باہر جانے لگی۔

"نفیسہ بیگم، اپنی زبان بند رکھنا...... اسی میں اس حویلی کی بھلائی ہے۔" اس نے صاف لفظوں میں تنبیہ کی۔

نفیسہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا، بس تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

روشن رائے چند لمحے شعلہ بار نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں اسی دروازے سے بھاگ بھری، دو اور ملازماؤں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ نفیسہ بیگم نے کھانا لگانے کے بعد ان خادماؤں کو باہر جانے کا حکم دیا تھا۔ جب نفیسہ بیگم کمرے سے نکل گئی تو وہ خادمائیں فوراً اندر آ گئیں اس لئے کہ بڑے مالک کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

بھاگ بھری نے اندر آ کر جب نفیسہ بیگم کی پلیٹ بالکل صاف دیکھی تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ

بے اختیار روشن رائے سے مخاطب ہو بیٹھی۔

"ارے مالکن نے کھانا نہیں کھایا؟"

"پتہ نہیں۔" روشن رائے نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ اس کے بعد بھاگ بھری میں مزید کوئی بات کرنے کی ہمت نہ رہی۔

☆......☆......☆

"ماں میں کیا کروں؟" کمال رائے ماں کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔

"صبر کرو بیٹا۔" ماں نے اس کے سر پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"ماں، میں صبر نہیں کر سکتا۔ میں ماروی کو تلاش کروں گا۔ میں اسے ڈھونڈ کر رہوں گا۔ تم نہیں جانتیں کہ مجھے میری بچی کتنی یاد آ رہی ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے بتایا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایک بار اس پر نظر پڑ جائے تو دیکھنے والا اس پر سے نظر ہٹا ہی نہ سکے۔ ماں، میں نے ماروی سے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں دل سے اس شادی پر راضی نہ تھے تو کیا ماں...... ماروی سے کسی قسم کا انتقام لیا گیا ہے۔ ماں کچھ تو بتاؤ۔" کمال رائے نے ماں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"میں کیا بتاؤں بیٹا...... بہت کچھ تو تُو نے خود ہی معلوم کر لیا ہے۔" نفیسہ بیگم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"ماں، کوئی ایسی بات جو مجھے ماروی تک پہنچا سکے۔" کمال رائے نے نفیسہ بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ماں...... اگر وہ مجھے مل گئی تو اسے یہاں سے لے کر چلا جاؤں گا۔ اس کی تم کبھی شکل بھی نہیں دیکھ پاؤ گی۔"

"بیٹا...... میں کچھ نہیں جانتی۔" نفیسہ بیگم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے بابا کا سامنا کرنا ہو گا۔ ماں تم جانتی ہو اگر انہوں نے ماروی کے بارے میں زبان نہ کھولی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیا کرے گا تُو...... اپنے باپ کو قتل کر دے گا۔ پھر کیا ہو گا، تجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ماروی تو تجھے پھر بھی نہ ملے گی۔" نفیسہ بیگم نے اسے ہولناک انجام سے آگاہ کیا۔

"ماں، میں پھر کیا کروں؟" کمال رائے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"اپنے باپ کے سامنے جانے کی کوشش نہ کرنا۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ میں اپنے طور پر ان سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں گی۔ تُو حوصلہ رکھ۔ جوش میں مت آ۔ بے تابی نہ دکھاؤ۔" نفیسہ بیگم نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"ماں، جو کچھ کرنا ہے۔ جلدی کرو...... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے کراچی بھی جانا ہے۔"

"بیٹا، میرا مشورہ مان تو کراچی چلا جا۔ تیرا پڑھائی کا حرج بھی ہوتا ہوگا۔ مجھے جیسے ہی ماروی کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا، میں تجھے وہاں سے بلوالوں گی۔" نفیسہ بیگم نے اسے کوئی اور ہی راستہ دکھانے کی کوشش کی۔

"اچھا ماں، جیسا تم کہو۔" کمال رائے کی زبان پر وہ بات آئی جو اس کے دل میں نہ تھی۔ دل میں اس نے کچھ اور ہی ٹھان لی تھی۔

☆......☆......☆

رولی ابھی جیپ میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اسے آواز لگائی۔ "رولی صاحب۔"

رولی نے مڑ کر دیکھا تو حویلی کا ایک ملازم شرفو اس کی طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ رولی پورے اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور اگنیشن میں چابی لگا کر شرفو کا انتظار کرنے لگا۔ شرفو یہ دیکھ کر کہ اس کے آواز دینے کے باوجود رولی گاڑی میں بیٹھ گیا ہے۔ کہیں وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے نکل ہی نہ جائے وہ اور تیزی سے بھاگا۔ رولی صاحب رکو۔"

پھر جب وہ جیپ کے نزدیک پہنچا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا شرفو؟" رولی نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

"رولی صاحب، آپ کو چھوٹے مالک نے بلایا ہے۔" شرفو نے اترتی چڑھتی سانسوں کے درمیان بمشکل کہا۔

"چھوٹے مالک نے!" رولی حیران ہوا، پھر یہ سوچ کر کہ شاید شرفو کو کوئی مغالطہ ہوا، اس نے دوبارہ تصدیق چاہی۔ "شرفو، چھوٹے مالک نے یا بڑے مالک نے۔"

"چھوٹے مالک نے۔" شرفو نے صاف لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا" رولی نے چابی گاڑی سے نکال لی اور پھر جیپ سے چھلانگ مار کر باہر آگیا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"اپنے کمرے میں۔" شرفو رولی کے ساتھ حویلی کی طرف بڑھنے لگا۔

"ان کے پاس کون ہے؟" رولی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" شرفو نے بتایا۔ "مجھے انہوں نے بڑے دروازے سے ہی آپ کو بلانے کا حکم دیا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ شرفو تم ذرا ایک کام کرو۔ میں چھوٹے صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ پتہ نہیں

وہاں کتنی دیر لگے۔ میں اس وقت بڑے مالک کے کام سے جارہا تھا۔ تم ذرا انہیں جا کر یہ بتادو کہ میں ابھی حویلی سے گیا نہیں ہوں۔ مجھے چھوٹے صاحب نے طلب کیا ہے۔"

"میں جا کر بڑے مالک کو بتادیتا ہوں۔ وہ کہاں ہیں، اس وقت؟"

"وہ بڑے والے ڈرائنگ روم میں ہیں، اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں۔ تم اندر نہ چلے جانا، دروازے پر جو بھی بندہ کھڑا ہو، اس سے کہلوادینا۔" رولی نے تنبیہ کی۔

"ٹھیک ہے جی!" شرفو یہ کہہ کر مخالف سمت کی راہداری میں چلا گیا۔

رولی یہ اندازہ لگاتا ہوا کمال رائے کے کمرے کی طرف بڑھا کہ اس نے آخر اسے کیوں بلایا ہے۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ جب وہ دروازے کے سامنے پہنچا تو ایک لمحے کو اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے ہمت کر کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

"آجاؤ!" اندر سے کمال رائے کی آواز آئی۔

وہ دروازہ کھول کر اندر گیا تو اسے کمال رائے سامنے صوفے پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس کا رخ رولی کی طرف تھا۔

ریوالور دیکھ کر رولی ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گیا۔

"آجاؤ، ڈرو مت۔" کمال رائے نے ریوالور صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"جی مالک۔ آپ نے مجھے بلایا۔" رولی کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"ہاں، میں نے تمہیں بلایا ہے اور یہ بات تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔"

"نہیں مالک۔ میں نہیں سمجھا۔" وہ کمال رائے سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔

"دیکھو، رولی مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔" کمال رائے نے اسے خبردار کیا۔

"مالک، میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ آپ کا غلام ہوں۔"

"ماروی اور میری بچی کہاں ہیں؟" کمال رائے نے ریوالور پھر اپنے ہاتھ میں اٹھالیا۔

"مالک، مجھے نہیں معلوم۔"

"رولی تو یہ جانتا ہے کہ وہ دونوں قبریں خالی تھیں۔"

"میں نہیں جانتا۔" رولی نے بڑی صفائی سے انکار کیا۔

"اچھا!" کمال رائے نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تو یہ تو جانتا ہے کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے؟"

کمال رائے نے اسے گھورا۔

''ہاں مالک۔آپ کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔'' وہ سیدھے انداز میں بولا۔

''رولی! یہ ریوالور گولیوں سے بھرا ہوا ہے۔تُو جانتا ہوگا کہ اس میں چھ گولیاں ہیں۔''

''ہاں مالک جانتا ہوں۔''

''اگر یہ ریوالور چل گیا تو پھر تیرے جسم کو چھلنی ہونے سے کوئی نہ بچا سکے گا۔''

''مالک میرا قصور تو بتائیں۔''

''میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تُو سب جانتا ہے لیکن تُو سچ بولنے سے گریزاں ہے۔''

''مالک مجھے کچھ معلوم ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔''

''رولی تُو اتنا تو بتا سکتا ہے کہ میری ماروی اور بچی زندہ ہیں؟''

''مالک یہ میں جانتا تو ضرور بتا دیا۔''

کمال رائے کو اس کا جواب سن کر شدید غصہ آ گیا۔اس نے ریوالور صوفے پر پھینکا اور اُٹھ کر رولی کے منہ پر کس کر چار پانچ تھپڑ لگائے۔

رولی نے تھپڑ کھا کر سر جھکا لیا۔بولا کچھ نہیں، خاموش رہا لیکن وہ اندر سے کھول کر رہ گیا۔

''دفع ہو جاؤ...... یہاں سے کتے۔'' کمال رائے شدت سے چیخا۔''ورنہ ابھی تجھے بھون کر رکھ دوں گا۔''

رولی نے موقع غنیمت جانا۔وہ بڑی تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا اور باہر نکل گیا۔جیسے ہی وہ دروازے سے باہر نکلا اسے ہولی دکھائی دیا۔وہ تیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔''کیا ہوا؟'' ہولی نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

''تم کیسے آئے؟'' رولی اور وہ دونوں ساتھ چلنے لگے۔

''مجھے مالک نے بھیجا ہے۔'' ہولی نے جواب دیا۔''تمہیں دیکھنے کے لئے۔''

''آؤ، پھر مالک کے پاس چلیں۔'' رولی اسے اپنے ساتھ لے کر روشن رائے کے کمرے کی طرف چل دیا۔

جب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو روشن رائے پتے پھینٹ رہا تھا۔اس نے انہیں دیکھ کر ہاتھ روک لیا۔پھر غور سے رولی کا چہرہ دیکھا اور بولا۔''رولی، کوئی پریشانی والی بات تو نہیں۔''

''نہیں مالک۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جاؤ، پھر۔وہ کام کر کے آ جاؤ جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔پھر اطمینان سے بات کریں گے۔''

''جی ٹھیک ہے مالک۔'' رولی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور پھر مؤدبانہ انداز میں چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ہولی روشن رائے کی کرسی کی پشت پر مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔

☆......☆......☆

صبح چھ بجے ہی نفیسہ بیگم نے کمال رائے کے کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹا دیا۔کمال رائے رات کو دیر سے سویا تھا۔ابھی وہ گہری نیند میں تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔وہ غصے اور بےزاری سے دروازے کی طرف بڑھا۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے نفیسہ بیگم کو پایا۔اس کی ماں پریشان تھی۔کمال رائے نے اسے دروازے سے ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دیا اور اس کے اندر آنے کے بعد پھر سے دروازہ بند کر دیا۔

''ماں، خیریت تو ہے۔'' وہ اپنی ماں کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، سب خیریت ہے۔تم ایسا کرو، منہ ہاتھ دھولو، تمہارا ناشتہ تیار ہے۔''

''ماں، تم کیا کہہ رہی ہو۔'' وہ بیڈ پر بیٹھتا ہوا بولا، اس پر ابھی تک غنودگی طاری تھی۔

''تم نے کراچی جانا ہے۔'' ماں نے فیصلہ سنایا۔

''کراچی جانا ہے...... لیکن کیوں؟''

''باہر بجیرو تیار کھڑی ہے۔تم جلدی سے ناشتہ کرلو۔''

''ماں صاف صاف بات کرو۔کیا یہ بابا کا حکم ہے۔''

''ہاں۔'' نفیسہ بیگم نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

''اور اگر میں جانے سے انکار کر دوں تو؟'' اس نے اپنی پوری آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے منع کیا تھا کہ بابا سے سامنا مت کرنا۔''

''ماں، میں نے بابا سے کوئی سامنا نہیں کیا۔البتہ اس کتے رولی کو ضرور تھپڑ لگائے ہیں۔''

''تم نے ایسا کر کے غلطی کی۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔

''ماں، اب تم میری بات غور سے سن لو۔میں ہاتھ منہ دھولو اس کے بعد بابا کے سامنے جاتا ہوں۔''

''تم ایسا نہیں کرو گے۔'' یہ کہہ کر نفیسہ بیگم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔''تمہیں خدا کا واسطہ۔''

''ماں، بابا مجھ پر برابر ظلم کئے جاتے ہیں۔میں کب تک چپ رہوں۔''

''تُو کیا چاہتا ہے کہ میں تیرے قدموں میں گر پڑوں۔''

''اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے۔'' کمال رائے نے اپنی ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔وہ ...ب آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔

''بیٹا، میری بات مان لے...... تُو کراچی چلا جا۔''

''ٹھیک ہے ماں، تمہاری خاطر چلا جاتا ہوں۔'' کمال رائے، ماں کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا۔ اس نے پسپائی اختیار کرلی۔ ''میں واش روم جاتا ہوں، آپ ناشتہ منگواؤ۔''

اس نے جلدی جلدی دانت برش کئے، منہ دھویا اور واش روم سے باہر آ گیا، اتنی دیر میں ناشتہ آچکا تھا۔ نفیسہ بیگم اسے واش روم سے نکلتا دیکھ کر کیتلی سے چائے کپ میں انڈیلنے لگیں۔

وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

''دیکھ بیٹا...... تُو اپنے بابا کے مزاج سے تو اچھی طرح واقف ہے۔'' نفیسہ بیگم نے سمجھانے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''تُو جانتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کچھ نہیں سوچتے، جو ان کے دل میں آتا ہے، کر گزرتے ہیں، چاہے وہ اچھا ہو یا برا ہو...... چاہے ان کے سامنے بیوی ہو یا بیٹا ہو یا کوئی غیر شخص ہو۔ وہ سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں، بیٹا تُو دل چھوٹا نہ کر، میں موقع دیکھ کر بات کرلوں گی۔''

''نہیں، ماں! اب تم کوئی بات نہ کرنا...... اب کیا بات کرنی ہے، مجھے حویلی چھوڑنے کا حکم مل گیا ہے، میں جا رہا ہوں لیکن ایک بات یاد رکھنا ماں، میں حویلی اس لئے نہیں چھوڑ رہا کہ یہ میرے باپ کا حکم ہے، یہ حویلی میں اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ میں نے اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں، میں تمہاری وجہ سے تمہارے کہنے پر یہاں سے جا رہا ہوں۔'' بات کرتے کرتے کمال رائے کی آواز رُندھ گئی۔ وہ چند لمحے رکا، اس نے ضبط سے کام لیا اور پھر بولا۔ ''ماں، میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، مجھے اپنا باپ کبھی پسند نہیں آیا، وہ باپ لگتا ہی نہیں...... پتہ نہیں ماں، تم ایک فرعون کے ساتھ کس طرح زندگی گزار رہی ہو۔ ماں تم ایک جنتی عورت ہو۔''

نفیسہ بیگم نے کچھ کہنے کیلئے لب کھولے مگر وہ بول نہ پائی، اس کے دل سے گھٹا سی اُٹھی اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

☆......☆......☆

کھانا کھاتے ہوئے اچانک روشن رائے نے سامنے بیٹھی ہوئی نفیسہ بیگم پر نظر ڈالی۔ وہ خالی پلیٹ سامنے رکھے اپنے خیالوں میں گم تھی۔

''کھانا کھاؤ نفیسہ بیگم......!'' روشن رائے نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''کھانا کیوں نہیں کھا رہیں۔''

''کھاتی ہوں، رائے صاحب۔''

''بیٹے کے جانے کا غم ہے، میری سمجھ میں نہیں آیا، آخر تمہیں غم کیوں ہے، بھئی وہ کراچی میں پڑھ رہا ہے، اسے آج نہیں تو کل وہاں جانا تھا، اگر وہ آج چلا گیا تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔'' روشن رائے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اسے جس طرح بھیجا گیا ہے، یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' نفیسہ بیگم نے روشن رائے کو تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔

''تم نہیں جانتیں کہ وہ اپنی معصومیت میں آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ میرا بیٹا ہے، میں آخر اسے آگ سے کس طرح کھیل لینے دیتا۔''

''رائے صاحب، آپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے، کیا اسے یہ حق بھی نہیں کہ وہ اپنی بیوی اور بچی کے بارے میں معلوم کر سکے...... آخر آپ بتا کیوں نہیں دیتے کہ وہ دونوں کہاں ہیں...... آپ کا خیال ہے کہ یہ بات اسے کبھی معلوم نہ ہوگی...... راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔''

''میں اب اس کی جلد شادی کر دینا چاہتا ہوں، وہ چند دنوں میں سب کچھ بھول جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ کمال کے بجائے آپ خود ہی شادی کرلیں۔'' نفیسہ بیگم نے غصے سے کہا اور اسے کھانا کھاتے چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

اس نے نفیسہ بیگم کے جانے کی بالکل پروا نہ کی۔ وہ پورے اطمینان سے کھانا کھاتا رہا۔

☆......☆......☆

اس دن بھی وہ حسب معمول سیر کیلئے نکلا تھا، گھڑ سواری اس کا شوق تھا، وہ سیر کیلئے زیادہ تر گھوڑے پر ہی نکلتا تھا، رولی اور ہولی دونوں اس کے پیچھے تھے۔

ابھی وہ لکھی باغ کے نزدیک پہنچا تھا کہ اس نے آم کے درخت کے نیچے ایک عجیب وغریب شخص کو کھڑا دیکھا۔ اس کا حلیہ بھی عجیب سا تھا، داڑھی نہ مونچھ...... دھوپ میں سر چمکتا ہوا، سر پر ایک بال نہیں، سفید لباس پہنے ہوئے، ہاتھ میں زنجیر...... جیسے اس کی گائے یا بکری زنجیر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو اور زنجیر اس کے ہاتھ میں رہ گئی ہو۔ وہ اگرچہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا لیکن بڑے انہماک سے روشن رائے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ کچھ اس طرح اسے دیکھ رہا تھا کہ روشن رائے اس کی تیز نظروں کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی شخصیت ہی کسی کو متوجہ کرنے کیلئے کیا کم تھی کہ اس کا اس طرح گھورا دیکھنا۔

روشن رائے کی اس عجیب وغریب شخص پر نظر پڑی تو اس نے فوراً اپنا گھوڑا روک لیا، اتنے میں رولی اور ہولی اس کے دائیں بائیں آ کر رک گئے۔

''رولی، یہ کون ہے؟'' روشن رائے نے سامنے اشارہ کیا۔

رولی نے اسے ایک نظر دیکھ کر کہا۔ ''مالک، اپنے علاقے کا نہیں معلوم ہوتا۔''

''مالک کیا آگے جا کر اسے راستے سے ہٹاؤں۔'' ہولی نے کہا۔

''نہیں، ہولی...... کھڑا رہنے دو، ہمارا کیا لیتا ہے۔'' روشن رائے کی زبان سے بڑی غیر متوقع

بات نکلی۔

دونوں بھائیوں نے چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، انہیں پوری امید تھی کہ وہ اس شخص کو راستے سے ہٹانے کا حکم دے گا۔

"جو حکم مالک۔" رولی بڑی وفاداری سے کہا۔

"تم دونوں آگے چلو۔" روشن رائے نے کچھ سوچ کر حکم دیا۔

اس کا حکم سنتے ہی دونوں بھائیوں نے اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔

وہ عجیب وغریب شخص راستے کے کنارے پر کھڑا تھا۔ جب رولی اور ہولی اس کے قریب سے گزرے تو اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں، وہ دونوں بھائی اسے دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ رولی کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ وہ اس شخص سے یہاں کھڑے ہونے کا سبب پوچھے لیکن وہ خواہش کے باوجود اس سے کوئی سوال نہ کر سکا۔

جب وہ دونوں آگے نکل گئے اور روشن رائے اس عجیب وغریب شخص کے نزدیک ہوا تو اس شخص نے فوراً اپنی نظریں اُٹھا کر دیکھا، اس کی نظروں میں جانے کیا بات تھی کہ روشن رائے نے اچانک اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی، اس کا گھوڑا عین اس شخص کے سامنے رک گیا۔

"کیسے ہو روشن رائے؟" اس شخص نے اپنی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

روشن رائے اس کی اس بے ادبی پر تلملا کر رہ گیا۔ حویلی کے باہر اسے اس کے نام سے پکارنے کی کسی میں جرأت نہ تھی لیکن اس اجنبی شخص نے یہ جسارت کر لی تھی اور روشن رائے چاہتا تھا کہ وہ اس کی اس بے ادبی پر اسے ٹوک دے، اس نے فوراً اپنی زبان کھولی۔

"ہم ٹھیک ہیں بابا۔" وہ اپنی زبان پر آنے والے ان الفاظ کو سن کر حیران رہ گیا، اس کی زبان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

"تمہارے گھر میں قیامت آنے والی ہے اور تم کہہ رہے ہو، ٹھیک ہو۔"

"ہیں؟" روشن رائے حیرت سے بولا اور بے اختیار گھوڑے سے کود پڑا۔

روشن رائے کو گھوڑے سے دیکھتا دیکھ کر وہ دونوں بھی تیزی سے اپنے گھوڑوں سے اُتر گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے روشن رائے کی طرف بڑھے۔

"اپنے نمک خواروں سے کہو کہ ہم سے دور رہیں...... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس عجیب شخص نے رولی اور ہولی کی طرف اشارہ کیا۔

روشن رائے نے نہ چاہتے ہوئے بھی رولی اور ہولی کو اشارے سے اپنے نزدیک آنے سے روک دیا۔ وہ ایک دم رک گئے۔

"بابا ابھی تم نے کس قیامت کا ذکر کیا...... میری حویلی میں کون سی قیامت آنے والی ہے، ابھی کچھ پتہ تو پڑے۔" روشن رائے نے بڑے ملائم لہجے میں بات کی۔ روشن رائے ایک وہمی شخص تھا، قیامت کا ذکر سن کر اس کا پتہ پانی ہونے لگا تھا۔

"پریشان مت ہو...... میں آ گیا ہوں، تمہیں بتانے...... میرے کہنے پر عمل کرو گے تو سکھی رہو گے ورنہ ایک دن آئے گا کہ تمہاری حویلی میں سانپ ہی سانپ ہوں گے۔" اس شخص نے روشن رائے کو اپنی کالی چمکیلی آنکھوں سے دیکھا۔

"سانپ......!" روشن رائے نے گھبرا کر کہا۔ وہ سانپ سے پہلے ہی ڈرا ہوا تھا، کتنی مرتبہ اس نے اپنے بیڈروم میں کسی سانپ کو سرسراتے ہوئے دیکھا تھا۔ "ایک سانپ تو پہلے ہی میرے پیچھے لگا ہوا ہے...... اب تم کن سانپوں کی بات کرتے ہو۔"

"وہ ایک معمولی سانپ ہے...... اس کو اگر تم مار بھی دو گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس شخص نے لاپروائی سے کہا۔

"تم اسے معمولی سانپ کہتے ہو، اس نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی ہے، میں بغیر بتی جلائے سو نہیں سکتا۔" روشن رائے نے فکرمندی سے کہا۔

"میں جس بات کا ذکر کر رہا ہوں، اگر ایسا ہو گیا تو تم سورج کی روشنی میں بھی چین نہ پاؤ گے۔"

"ہاں بابا...... وہ بات بتاؤ...... آخر کچھ پتہ تو پڑے۔"

"شنی وار کو، دوپہر کے وقت تمہاری حویلی میں ایک بچی جنم لے گی، اگر وہ بچی حویلی میں رہی تو تم پر قیامت گزر جائے گی، بس یوں سمجھ لو کہ چند ہی دنوں میں تمہاری حویلی سنسان ہو جائے گی، حویلی میں سانپوں کی پھنکار کے علاوہ کچھ سنائی نہ دے گا، میں نے تمہیں دن اور وقت بتا دیا ہے، جھوٹ اور سچ کا تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا۔" اس شخص نے بڑے گمبھیر لہجے میں بتایا۔

"بابا، ابھی تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"روشن رائے، میرا نام دیوانگ ہے۔"

"بابا دیوانگ...... پھر میں کیا کروں...... اس تباہی سے کیسے بچوں؟"

"اس بات کا تمہیں انتظام کرنا ہو گا کہ وہ لڑکی حویلی میں پیدا نہ ہو اور جب وہ جنم لے لے تو اسے حویلی میں لانے کے بجائے رات کو ایک اونٹنی پر ڈال کر صحرا میں ڈال دینا...... بس تمہارا کام ختم ہو جائے گا، تمہارے سر سے بلا ٹل جائے گی اور جس کی وہ امانت ہے، وہ وہاں تک پہنچ جائے گی اور تمہاری زندگی بچ جائے گی۔"

"اچھا بابا دیوانگ...... ابھی تم نے جیسا کہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔" روشن رائے نے بڑی

سعادت مندی سے کہا۔ اسے اپنی یہ سعادت مندی بڑی اوپری اوپری سی لگ رہی تھی۔ سعادت مندی تو اس نے سیکھی ہی نہیں تھی۔ وہ صرف حکم دینا جانتا تھا، حکم سننا نہیں......لیکن کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ سیر کو سوا سیر مل جاتا ہے۔

دیوانگ کی پیشگوئی نے اس کی سٹی گم کردی تھی۔ دیوانگ کی پیشگوئی پر اسے سو فیصد یقین ہو گیا تھا، اس کا نام جان لینا، بچی کی ولادت کا ذکر کرنا......روشن رائے جانتا تھا کہ اس کی بہو کے ہاں ولادت متوقع تھی اور یہ بات حویلی سے باہر کا آدمی کسی قیمت پر نہیں جان سکتا تھا پھر اس نے بچی کی ولادت کا دن اور وقت بھی بتادیا تھا، سنیچر زیادہ دور نہ تھا، چار دن کے بعد تھا۔

روشن رائے نے اس سلسلے میں کسی کو کچھ نہ بتایا۔ اس نے کمال کی بیوی کو فوراً نزدیک ہی ایک چھوٹے شہر کے اسپتال میں منتقل کردیا، دیوانگ کے بقول ابھی بچی کی ولادت میں چار دن باقی تھے جبکہ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق ابھی دو ہفتے باقی تھے، روشن رائے نے سوچا کہ چلو چار دن کے بعد دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔

روشن رائے کو ماروی ویسے ہی پسند نہ تھی، اس نے حویلی میں آکر خاندان کی لڑکی کے ساتھ آنے والی جائیداد کا راستہ روک دیا تھا، روشن رائے کو اندر ہی اندر اس بات کا دکھ تھا لیکن اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے ماروی کو برداشت کرلیا تھا مگر اس کا شیطانی ذہن نت نئے منصوبے تراش رہا تھا کہ دیوانگ کی پیشگوئی نے معاملہ ہی صاف کردیا تھا۔ ایک تو غریب گھرانے کی بہو، اوپر سے جنم دے ایک بچی کو اور بچی بھی کیسی......؟ سب کچھ تباہ کردینے والی......اس نے طے کرلیا کہ بچی کے ساتھ اس کی ماں کو بھی لگے ہاتھوں ٹھکانے لگادے گا۔

دیوانگ کی پیشگوئی سچ ثابت ہوگئی، ماروی کے ہاں ہفتے کو دن کے بارہ بجے ایک بچی نے جنم لیا، بچی کی پیدائش سے ایک دن پہلے حویلی کے آس پاس کئی سانپوں کو دیکھا گیا جنہیں روشن گوٹھ کے لوگوں نے فوراً مار دیا اور جس دن اسے پیدا ہونا تھا، اس صبح حویلی کے اندر آٹھ دس سانپ لہراتے ہوئے نظر آئے جن میں سے کچھ کو حویلی کے ملازمین نے مار دیا۔

اس دن روشن رائے نے خواب میں اپنے آس پاس بے شمار سانپ دیکھے، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جب وہ اٹھا تو اچھا خاصا سورج نکل آیا تھا، اسے حویلی میں غیر معمولی شور سنائی دیا، دروازہ کھولنے پر اسے معلوم ہوا کہ حویلی کی مختلف جگہوں پر سانپ نمودار ہوئے ہیں جن میں چند کو مار دیا گیا ہے۔

یہ آثار اچھے نہ تھے، جب وہ سوا بارہ بجے اسپتال پہنچا تو بچی کی پیدائش کی خبر اس کی منتظر تھی۔

اچانک ہی بچی کے رونے کی آواز اس کے نزدیک ہی سنائی دی۔ اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، وہ اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر تھا، بچی کی آواز کے ساتھ ہی اس رات کا سارا منظر اس کی آنکھوں

کے سامنے گھوم گیا۔ اس نے باری باری دوادونوں کو مخالف سمت میں جاتے ہوئے دیکھا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پھر وہ سوچتے سوچتے سوگیا۔

☆......☆......☆

رولی پجیرو چلا رہا تھا، اس کے برابر کمال رائے بیٹھا ہوا تھا، پیچھے چار مسلح بندوں کے ساتھ ہولی براجمان تھا۔ پجیرو روشن گوٹھ سے دس بارہ کلومیٹر دور نکل آئی تھی، اچانک ہی رولی کو بریک مارنا پڑے، سامنے سڑک پر ایک قالین کسی درخت کے گدے کی طرح راستہ روکے پڑا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ قالین کسی ٹینٹ سروس والے ٹرک سے لڑھک کر سڑک پر آرہا ہو۔

رولی کے ساتھ ہولی بھی اتر کر قالین کی طرف بڑھا۔ رولی نے قالین کا جائزہ لیا تو اسے ایک طرف سے لمبے بال دکھائی دیئے، یہ بال یقیناً کسی عورت کے تھے......اور جب رولی اور ہولی نے تیزی سے قالین کو کھولا تو اس میں سے جو عورت نکلی، اسے دیکھ کر کمال رائے کا سانس رک گیا۔

وہ اس کی بیوی ماروی تھی۔

کمال رائے نے پجیرو سے چھلانگ لگائی، وہ دوڑتا ہوا قالین کے پاس پہنچا۔ اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، اس نے جھک کر ماروی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، ماروی کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ سفید ہو رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے سرنج کے ذریعے اس کے بدن سے پورا خون نکال لیا گیا ہو، اس کا لباس درست حالت میں تھا البتہ جسم پر دوپٹہ موجود نہ تھا۔

کمال رائے نے اس کی نبض دیکھی، سانس چیک کی، دل کی دھڑکن محسوس کی......کہیں کچھ نہ تھا۔

وہ جانے کب کی اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکی تھی۔

اسے ماروی کا آخری خط یاد آیا، ہائے وہ کس قدر تنہا تھی۔ اس نے اس کی تنہائی کا کوئی خیال نہ کیا۔ کس قدر ظلم کیا اس نے ماروی پر...... جانے وہ کن حالات سے گزری، جانے اس پر کیا بیت گئی، ماروی کے لکھے ہوئے لفظ جیسے بچھو بن کر اسے ڈسنے لگے۔

اس نے ماروی کے چہرے سے بالوں کی لٹیں ہٹائیں اور بڑی محویت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

رولی اور ہولی اس کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

اس کی صورت دیکھتے دیکھتے کمال رائے کے دل میں ٹیس سی اٹھی، دکھ کی ایک لہر پورے جسم کو شرابور کرگئی، اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، بے اختیار اس نے ماروی کا چہرہ اپنے سینے سے لگالیا، اس کے ضبط کے تمام بند دکھ کے ریلے میں بہہ گئے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

تب رولی ہمت کرکے آگے بڑھا، اس نے کمال رائے کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور

افسردگی سے بولا۔ ”آئیں مالک حویلی چلیں۔“

کمال رائے نے جیسے اس کی بات سنی نہیں۔ وہ ماروی کی لاش سینے سے لگائے چیخ چیخ کر روتا رہا۔

رولی نے اب اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دبایا اور پھر کہا۔ ”مالک، حویلی چلیں۔“

تب اچانک جیسے اسے ہوش آیا، اس نے اپنی ہچکیوں پہ قابو پاتے ہوئے بمشکل کہا۔ ”نہیں رولی، اب میں حویلی نہیں جاؤں گا...... میں حویلی چھوڑ آیا ہوں۔“

”لیکن مالک ایسی حالت میں آپ کہاں جائیں گے؟“ رولی نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

”ہاں تو بتا دینا...... انہیں بتا دینا، میں نے اپنی بیوی کی لاش وصول کر لی ہے، اب میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ کمال رائے کی آنکھوں میں آنسو کے بجائے ڈھیرے ڈھیرے غصہ بھرنے لگا۔ اس نے ماروی کو دوبارہ قالین پر لٹا دیا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

کھڑا ہوا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، اس کے قدم ڈگمگانے لگے لیکن وہ قدم جمائے کھڑا رہا۔

”مالک ایسا نہ کریں...... ہمارے ساتھ حویلی چلیں۔“ رولی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

”تم مجھے ابھی کہاں لئے جا رہے تھے؟“ کمال رائے نے کھوئے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”مالک...... کراچی۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”کس کے حکم پر......؟“ کمال رائے نے پھر پوچھا۔

”بڑے مالک کے حکم پر۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر اب کیا ہوا...... ان کے حکم پر کراچی چلو...... میں کسی قیمت پر حویلی نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”اور مالک...... مالکن؟“ رولی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”انہیں حویلی لے جاؤں؟“

”یہ میری بیوی ہے، اس کا حویلی سے کیا تعلق...... حویلی والوں نے ہی تو اسے اس حال میں پہنچایا ہے۔“ کمال رائے نے ماروی کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

رولی نے ہولی کو اور ہولی نے رولی کو دیکھا، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں، کمال رائے کا فیصلہ اٹل تھا، یہ بات وہ جانتے تھے لیکن روشن رائے کو جب ساری صورتحال کا علم ہو گا تو وہ جانے ان دونوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے۔ یہ ایک ایسی صورتحال تھی جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قالین میں لپٹی لاش آخر یہاں کس نے لا رکھی تھی؟ کیا یہ محض اتفاق تھا یا کسی منصوبہ بندی کے تحت ماروی کی لاش کو کمال رائے کے راستے میں رکھ دیا گیا تھا۔

آخر وہ شخص کون تھا؟

☆......☆......☆

وہ ایک عجیب رات تھی۔

آسمان کی پیشانی پر چاند کسی دلہن کے ٹیکے کی طرح چمک رہا تھا، پورے چاند کی رات تھی، ریت کے سمندر پر چاندنی کسی چاندنی کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ پھر بھی یہ ایک وحشت ناک رات تھی۔

ایسی روشن رات اور ایسی بھیانک......؟

جب دلوں پر وحشت برستی ہو، اگلے پل کی خبر نہ ہو کہ کیا ہونے والا ہے تو چاندنی کیا کرے گی، چاند کا حسن کون دیکھے گا، باہر کا موسم اسی وقت اچھا لگتا ہے جب آدمی کے اندر کا موسم اچھا ہو، اس کا دل پُرسکون ہو۔

لق و دق صحرا...... کسی دبیز قالین کی طرح زمین پر بچھی ریت...... ٹھنڈی ہوا ہولے ہولے بہتی ہوئی، روشن چاند کسی حسینہ کے دلکش چہرے کی طرح چمکتا ہوا لیکن اس دلکش رات سے محظوظ ہونے والا یہاں کوئی نہ تھا۔

ماروی تھی لیکن اسے اپنا ہوش نہ تھا، اس پر جو ظلم ہوا تھا، اس پر وہ حیرت زندہ تھی، گم صم تھی، یہ اچانک کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

اس کی ایک دن کی بچی کو اس سے چھین لیا گیا تھا اور اسے ایک تیز رفتار اونٹ پر ڈال کر صحرا میں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا، اس ننھی سی جان سے کیا قصور ہو گیا تھا۔

خود اسے بھی یہی سزا دی گئی تھی، اونٹ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا اور اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، اس کی اپنی حالت ٹھیک نہ تھی، آج ہی اس نے ایک بچی کو جنم دیا تھا، کمزوری بے انتہا تھی۔ ایسی عورت کا تو بہت خیال رکھا جاتا ہے لیکن روشن رائے نے تو اس پر ظلم کی انتہا کر دی تھی، بچی تو اس سے چھینی ہی تھی، اسے بھی حویلی بدر کر دیا تھا۔

آخر اس سے کیا قصور ہوا تھا؟ قصور تو ہوا تھا، وہ ایک غریب کی بیٹی تھی، اس حویلی کے مالک کی وارث کی پسند تھی پھر اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور اس نے ایک لڑکی کو جنم دے دیا تھا، قصور ہی قصور تھے اس کے......!

وہ تخلیق کے عمل سے گزری تھی، پہلے ہی اس کی بری حالت تھی، اونٹ کی تیز رفتاری نے اسے مزید نڈھال کر دیا تھا، اس کی آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں، دماغ پر غبار سا چھا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ریت کے اندر دھنسی جا رہی ہو، اونٹ کی دُم میں بندھی گھنٹی کی ٹن ٹن ڈھیرے ڈھیرے ...ہوئی جا رہی تھی پھر کچھ دیر کے بعد اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

☆......☆......☆

اب چاند بے نور ہو چکا تھا۔ صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تھا، کنگن پور میں زندگی انگڑائی لے رہی تھی، حاکم علی اپنے کمرے سے نکل کر باڑے کی طرف جا رہا تھا، وہاں اس کے جانور اس کے منتظر تھے کہ وہ آئے اور انہیں اپنے ہاتھ سے چارہ ڈالے۔

جب حاکم علی باڑے کے دروازے پر پہنچا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا، پہلے تو اسے یقین نہ آیا، اپنی نظر کا دھوکا محسوس ہوا لیکن وہ نظر کا دھوکا نہ تھا، وہ اسی کا اونٹ ہی تھا جو باڑے کے دروازے پر بیٹھا، اونچی گردن کیے جگالی کیے جا رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر ایک کاٹھی بندھی ہوئی تھی اور اس کاٹھی میں ایک عورت بے سدھ سی پڑی تھی، اس عجیب منظر نے اسے دہلا کر رکھ دیا، وہ تیز قدموں سے اپنے اونٹ کی طرف بڑھا۔

وہ ایک خوبصورت عورت تھی، زندہ تھی مگر بے ہوش تھی۔

حاکم علی اس عورت کو اونٹ سمیت اپنے گھر لے آیا، گھر کی عورت نے اس عورت کو پوری احتیاط سے اونٹ سے اُتار لیا اور صحن میں بچھی ایک چارپائی پر لٹا دیا۔

حاکم علی کی ماں نے اس عورت کا اچھی طرح معائنہ کیا، وہ عورت کسی اچھے گھر کی لگتی تھی، بیمار دکھائی دیتی تھی، سب سے پہلا مسئلہ اس کو ہوش میں لانے کا تھا، حاکم علی کی ماں نے اس کے منہ پر آہستہ آہستہ چھینٹے مارے اس کے تلوے سہلائے، کچھ دیر کے بعد اس کے بے جان جسم میں جنبش ہوئی، اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں، اس نے اپنے سامنے دیہات کی ایک بوڑھی عورت کو پایا جو بڑی تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس بوڑھی عورت کا چہرہ ایک دم بدل گیا، وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔

''لیٹی رہو...... ابھی اُٹھنے کی کوشش نہ کرو...... میں تمہارے لئے دودھ لاتی ہوں۔'' وہ محبت سے بولی۔

''اماں، تم بیٹھو...... میں لاتی ہوں دودھ۔'' حاکم علی کی بیوی رحیمن نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے...... ذرا جلدی لا۔'' پھر وہ بزرگ عورت حاکم علی کی ماں اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام ماروی ہے، اماں جی!'' ماروی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

حاکم علی کی ماں نے جب محسوس کیا کہ ماروی نقاہت کی وجہ سے بولنے میں دقت محسوس کر رہی ہے تو اس نے اس سے مزید سوال نہ کیا۔

اسے گرم گرم دودھ پلایا، کچھ دیر کے بعد مکئی کی روٹی، مکھن اور گڑ کا ناشتہ کرایا، ماروی کو شدت کی

بھوک لگی تھی۔ پیٹ میں کچھ پڑا تو اسے سکون ملا، اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور اس گھر کو نظریں گھما کر دیکھا۔

وہ ایک چھپر کے نیچے چارپائی پر لیٹی تھی، اس گھر میں تین عورتیں تھیں، ایک حاکم علی کی ماں جو اس کی خدمت کرنے میں سب سے آگے تھی، دوسری حاکم کی بیوی رحیمن جو اپنی ساس کی مدد کر رہی تھی اور تیسری حاکم علی کی چھوٹی بہن کوئی سترہ اٹھارہ برس کی...... وہ بس دود کھڑی ماروی کو تکے جا رہی تھی۔

''اماں جی...... میں کہاں ہوں؟'' ماروی نے اماں جی سے پوچھا۔

''یہ کنگن پور ہے بیٹا...... پر تم کہاں سے آئی ہو؟'' اماں جی نے پوچھا۔

''اب میں کیا بتاؤں اماں کہ میں کہاں سے آئی ہوں؟'' وہ تذبذب کا شکار تھی۔

''اری بتائے گی نہیں تو ہمیں پتہ کیسے پڑے گا کہ تم کہاں کی ہو؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''میں روشن گوٹھ کی ہوں۔'' ماروی نے سچ بولا۔

''تو کہاں جا رہی تھی۔''

''کہیں نہیں اماں...... بس قسمت جہاں لے آئی وہاں آ گئی۔'' ماروی نے بھیگی آنکھوں سے کہا۔

''آخر کچھ پتہ تو پڑے تو اس نازک حالت میں گھر سے کیوں نکلی؟''

اس سوال کے جواب میں ماروی نے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا جو اس پر گزری تھی، وہ کہہ سنائی۔

حاکم علی کی ماں اس کی داستان سن کر حیران رہ گئی۔ اسے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ کسی بڑے گھر کی عورت ہے، اس کا اندازہ صحیح نکلا تھا، وہ حویلی سے آئی تھی اور روشن گوٹھ کے مشہور زمیندار روشن رائے کی بہو تھی، ماروی کی دکھ بھری آپ بیتی اس نے اپنے بیٹے حاکم علی کو کہہ سنائی، وہ بھی ماروی کی اصلیت جان کر مبہوت سا رہ گیا۔

پھر حاکم علی اپنی ماں کو ماروی کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت دے کر راجہ سلیم کی حویلی چل دیا۔

ماروی کے بارے میں اسے بتانا ضروری تھا۔

وہ ماروی کے بارے میں اسے بتا کر اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

حویلی پہنچ کر حاکم علی نے ایک ملازم کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع کروائی۔ راجہ سلیم اس وقت اپنی تین بیگمات ناشتے میں مصروف تھا، حویلی کی ایک ملازمہ نے تھوڑا سا جھجک کر راجہ سلیم کو بتایا۔

''سائیں، باہر ماسٹر حاکم علی آیا ہے۔''

''اس وقت......؟'' راجہ سلیم نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس وقت کیوں آیا ہے؟''

''معلوم نہیں جی۔'' بے چاری ملازمہ بھلا کیا بتاتی۔

''پتہ کرواؤ۔'' راجہ سلیم نے اپنی ملازمہ کو سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

حاکم علی، ماسٹر نہ تھا، وہ پچھلے وقتوں کا مڈل پاس تھا، حویلی کے بچوں کو شام کو پڑھانے آتا تھا اسی لئے وہ حویلی میں ماسٹر حاکم علی کہلاتا تھا جبکہ کنگن پور میں وہ حاکم علی کہلاتا تھا۔

ملازمہ باہر سے خبر لے کر آئی۔ اس نے راجہ سلیم کے نزدیک ہو کر اور ذرا سا جھک کر کہا۔ ''وہ جی کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔''

''اچھا، اسے برآمدے میں بٹھاؤ...... میں ناشتہ کر کے آتا ہوں۔'' راجہ سلیم نے ہدایت کی۔

ناشتہ کرنے کے بعد جب راجہ سلیم مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمدے میں پہنچا تو حاکم علی ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا، اسے دیکھتے ہی وہ اُٹھ گیا اور اپنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو ماسٹر سناؤ، صبح صبح آج کہاں نکل پڑے۔''

''راجہ سائیں...... آپ کے لئے ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں کہ سنیں گے تو جی خوش ہو جائے گا۔''

''اچھا......'' راجہ سلیم نے حیرت سے آنکھیں کھولیں، تخت پر بیٹھ کر اس نے گاؤ تکیے کیلئے اشارہ کیا تو وہاں مستعد کھڑے ایک ملازم نے گاؤ تکیہ راجہ سلیم کی کمر سے ٹکا دیا۔ ''بھئی اب ماسٹروں کے پاس بھی ہمارے لئے خبریں ہونے لگیں اور وہ بھی جی خوش کرنے والی...... اچھا بھئی تو پھر سناؤ۔ تمہاری خبر بھی سن لیتے ہیں۔''

حاکم علی، راجہ سلیم کے تخت کے نزدیک ہوا اور آہستگی سے بولا۔ ''راجہ سائیں خاص خبر ہے...... اکیلے میں۔''

''اوہو...... آج تو کمال ہی ہو گیا۔'' راجہ سلیم نے اپنے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا۔ ''ماسٹر کے پاس جی خوش کرنے والی خبر ہے اور وہ بھی خفیہ، تنہائی میں سنانے والی...... واہ، ماسٹر تو پھر سناؤ۔''

''راجہ سائیں...... خبر وڈیرے روشن رائے کے بارے میں ہے۔''

''اچھا......'' راجہ سلیم نے حیرت سے آنکھیں مٹکائیں۔ یہ اس کے بات کرنے کا ایک خاص انداز تھا۔ ''پھر تو بابا واقعی خبر زوردار ہو گی، جلدی بولو۔''

''راجہ سائیں...... روشن رائے کی بہو اس وقت میرے گھر میں بیٹھی ہے۔'' حاکم علی نے دھماکا کیا۔

''ہیں......!'' راجہ سلیم فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''بہو...... ماسٹر تیرا مطلب ہے کمال رائے کی بیوی......؟''

''ہاں، راجہ سائیں، آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔''

''ارے ماسٹر...... تُو خبر تو واقعی بڑی زوردار اور خطرناک لایا ہے، بھئی تُو تو ہمارے انعام کا مستحق ہو گیا، ہم تو تجھے نرا ماسٹر ہی سمجھتے تھے پر تُو تو بڑے کام کا بندہ نکلا بابا پھر پوری بات بتا، کمال رائے کی بیوی کنگن پور اور وہ بھی تیرے گھر کیسے پہنچی؟''

حاکم علی نے بلا کم و کاست وہ سب کچھ دہرا دیا جو ماردی نے اس کی ماں کو بتایا تھا۔

''بابا، یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی، آخر روشن رائے نے اپنی بہو کو اونٹ پر بٹھا کر صحرا میں کس طرح ہانک دیا اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اونٹ کنگن پور کیسے آ گیا اور وہ بھی تیرے دروازے کے آگے۔'' راجہ سلیم نے اپنا دماغ لڑایا۔

''راجہ سائیں...... وہ میرا اونٹ ہے، اسے میں نے پندرہ دن پہلے فروخت کیا تھا۔ جب اسے صحرا میں اکیلا ہنکایا گیا تو اس نے کنگن پور کا راستہ پکڑ لیا، وہ میرا اونٹ تھا، میرے باڑے میں پہنچ گیا۔'' حاکم علی نے بتایا۔

''اچھا، یہ بات تھی۔'' راجہ سلیم نے پھر آنکھیں پھاڑیں۔ ''میں یہی سوچ رہا تھا کہ ماسٹر کے دروازے پر روشن رائے کی بہو کس طرح پہنچ گئی...... ماسٹر تُو نے آج بڑا کمال کیا ہے...... تیرا انعام پکا...... اب میں تجھے جیسا بتاتا ہوں، ویسا کر۔''

''جو حکم راجہ سائیں۔'' حاکم علی نے دونوں ہاتھ باندھ لئے۔

''آ مونڈھا لا کر اِدھر بیٹھ جا...... میرے پاس۔'' راجہ سلیم نے بڑی خوشدلی سے کہا۔ ایسا شیریں لہجہ مشکل سے ہی کسی ملازم کو نصیب ہوتا تھا۔

کسی زمانے میں راجہ سلیم اور روشن رائے کی دوستی ضرب المثل تھی، ایسی دوستی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے، راجہ سلیم اگرچہ اتنا بڑا زمیندار تو نہ تھا جتنا روشن رائے لیکن اس کا رعب و دبدبہ روشن رائے سے زیادہ تھا، اس کا اثر و رسوخ حاکموں سے لے کر سیاست دانوں تک تھا، وہ اپنا کام نکلوانا خوب جانتا تھا، اس نے روشن رائے کے بے شمار کام کرا کر دیئے تھے، جہاں روشن رائے کا اثر و رسوخ کام نہ آتا وہاں راجہ سلیم کا مہرہ چل جاتا۔

ان دونوں کی دوستی کافی پرانی تھی، اسکول کا ساتھ کالج تک گیا، دونوں گریجویٹ تھے مگر تعلیم نے ان دونوں کا کچھ نہ بگاڑا تھا، ان کے کرتوت دیکھ کر ان کی ڈگریاں بھی شرماتی تھیں۔

پھر یہی دوستی ایک دن دشمنی میں بدل گئی۔

مشہور ہے کہ دشمنی تین چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے، ایک پیسہ، دوسرے عورت، تیسرے زمین...... لیکن یہاں دشمنی کی بنیاد چوتھی چیز تھی، جی ہاں چوتھی!

وہ ایک گھوڑی تھی، اس میں شبہ نہیں کہ وہ عربی النسل گھوڑی بلا کی خوبصورت تھی، اس کا مالک ارباب خان تھا، وہ دونوں کا مشترکہ دوست تھا، ارباب خان نے ان دونوں کو اپنے علاقے میں تیتر

کے شکار پر بلایا تھا۔

جب وہ جیپ کے بجائے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اپنی حویلی سے باہر آیا تو دونوں اس گھوڑی کو دیکھ کر مبہوت سے رہ گئے، وہ دونوں جیپ میں بیٹھے بیٹھے رک گئے، ارباب خان اپنی گھوڑی دوڑاتا ان کے نزدیک پہنچا اور ان کے قریب پہنچ کر گھوڑی سے اُتر گیا، اس نے گھوڑی کی گردن تھپتھپائی اور دونوں سے بیک وقت مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیسی ہے؟''

''بہت شاندار......'' راجہ سلیم نے کہا۔

''بہت خوبصورت......'' روشن رائے بولا۔

''ارباب خان، کیا اسے بیچو گے؟'' راجہ سلیم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''راجہ ایسی بات کیوں کرتے ہو...... کیا یہ آپ کو پسند ہے؟'' ارباب خان نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

''بابا، میں اسے دیکھتے ہی اس کا عاشق ہو گیا۔'' راجہ سلیم نے مسکرا کر کہا۔

''بس تو راجہ سائیں...... یہ گھوڑی آپ کی ہوئی۔'' راجہ ارباب خان نے فوراً ہی فیصلہ سنا دیا۔

''شکریہ ارباب خان...... تمہارا بہت شکریہ۔'' راجہ سلیم نے ذرا بھی تکلف نہ کیا، اس نے بھی گھوڑی فوراً قبول کر لی جبکہ روشن رائے اس گھوڑی کو حسرت سے دیکھتا رہ گیا، اسے اپنے آپ پر غصہ تھا کہ اس نے بولنے میں پہل کیوں نہ کی؟ کیوں سوچتا رہ گیا ورنہ یہ مشکی گھوڑی اس کی ہو چکی ہوتی۔

شکار ختم ہوا، وہ لوگ اپنی اپنی حویلیوں کی طرف لوٹ گئے لیکن وہ گھوڑی روشن رائے کے دماغ میں بیٹھ کر رہ گئی، وہ ہر وقت اس کے تصور میں رہنے لگا، رہ رہ کر اس کے دل میں کسک ہوتی، جانے اس نے بولنے میں پہل کیوں نہ کی ورنہ وہ گھوڑی آج اس کی ہوتی۔

پھر یہ قلق بڑھتا گیا، اس کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا، بہتیرا اس نے چاہا کہ اس گھوڑی کا خیال اس کے دل سے نکل جائے لیکن جوں جوں وہ اسے دل سے دور کرنے کی کوشش کرتا، توں توں وہ اس کے دل میں بستی جاتی۔ بالآخر اس آگ نے ایک سنگین صورت اختیار کر لی اور روشن رائے وہ کرنے پر اُتر آیا جو کبھی کسی نے نہ کیا ہو گا۔

ایک دن اس نے رولی کو اپنے بیڈ روم میں طلب کر لیا، اس طلبی پر رولی فوراً کھٹک گیا، اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی سنگین معاملہ ہے۔

''جی مالک حکم......!'' رولی، روشن رائے کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''رولی، راجہ سلیم کے پاس چند دنوں پہلے ایک مشکی گھوڑی آئی ہے، اس کو ٹھکانے لگانا ہے۔'' روشن رائے نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''مالک اگر میں نے سننے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے تو...... آپ کا مطلب ہے اس گھوڑی کو مارنا ہے۔'' رولی دراصل روشن رائے کی بات سن کر چکرا گیا تھا، کسی گھوڑی کا قتل اور وہ بھی جو کسی دوست کی ملکیت ہو...... ایسی گھوڑی کی موت بھلا کیا معنی رکھتی تھی۔

''مالک اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کے بجائے اسے وہاں سے نکال کر کیوں نہ لاؤں۔'' رولی نے ہمت کر کے پوچھا۔

''بے وقوف، ہم اسے کہاں چھپا کر رکھیں گے...... وہ چھپا کر رکھنے کی چیز تھوڑی ہے۔''

''مالک اگر آپ کا اس پر دل آ گیا ہے تو راجہ سائیں سے لے لیں۔'' رولی نے پھر ہمت کر کے ایک مشورہ دیا۔

''اس نے خود ارباب خان سے تحفتاً قبول کی ہے، بابا اسے ہم اس سے کیسے مانگ سکتے ہیں بھلا یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا بابا۔'' روشن رائے نے جواب دیا۔

''اچھا مالک۔'' رولی کے چہرے پر تذبذب تھا، وہ اس مسئلے کو سمجھ نہ پایا تھا۔

''دیکھو بابا، بات یہ ہے کہ جو چیز ہمیں پسند آ جائے، اسے ہم کسی اور کے پاس رہنے نہیں دیتے، اس لئے بابا یہ ہماری مجبوری ہے، رولی تم ہماری مجبوری کو سمجھو بابا۔''

''ٹھیک ہے مالک میں اب سمجھ گیا...... آپ بے فکر ہو جائیں، مجھے دو دن دے دیں، میں دو دن میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔'' رولی نے مہلت چاہی۔

''بابا میں تین دن دینے کو تیار ہوں۔'' روشن رائے خوشدلی سے بولا۔ ''پر ایک بات یاد رکھنا تم ہمارے خاص آدمی ہو اسی لئے تمہیں یہ خاص کام سونپ رہا ہوں۔ دوستی کا معاملہ ہے، ذرا خیال رکھنا، تم پر کسی کی نظر نہ پڑے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں مالک...... میں احتیاط رکھوں گا۔'' رولی نے خوش ہو کر بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

لیکن سارے فیصلے آدمی کے ہاتھ میں نہیں ہوتے، کبھی کبھی تقدیر بھی اپنا کھیل کھیلتی ہے، کچھ فیصلے وہ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے، ایسے فیصلے جنہیں تقدیر اپنے ہاتھ میں لے لیتی، تاریخ رقم کرتے ہیں، یہ فیصلہ بھی کچھ ایسا ہی تھا اس سے تاریخ رقم ہوئی، ایک مضبوط دوستی ایک مضبوط دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔

رولی نے تو اپنے طور پر ہر ممکن احتیاط کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کوشش کے باوجود وہ دیکھ لیا گیا۔

اپنی معلومات کی روشنی میں رولی پورے اطمینان سے جانوروں کے اس باڑے میں داخل ہوا جہاں رولی کے جانور بندھے ہوئے تھے، اس گھوڑی کے لئے ذرا الگ سے جگہ بنائی گئی تھی، اس

باڑے میں اس گھوڑی کے علاوہ دو گھوڑے اور تھے اور یہ دونوں ایک ساتھ بندھے تھے۔

جب رولی باڑے میں داخل ہوا تو آدھی رات کا وقت تھا، پورے باڑے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا، ایک چارپائی پر دو بندے سو رہے تھے، اب تقدیر نے اپنا کھیل شروع کیا۔

اچانک ایک بندے کی آنکھ کھل گئی، اس نے ملگجے اندھیرے میں ایک سائے کو مشکی گھوڑی کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا، وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے ٹارچ نکالی اور دبے پاؤں اس سائے کے پیچھے ہولیا، وہ چاہتا تھا کہ اس بندے کو جا کر پیچھے سے پکڑ لے۔

ابھی وہ سائے سے پانچ قدم پیچھے تھا کہ تقدیر نے اپنا فیصلہ رقم کیا اور وہ لمحہ تاریخی ہو گیا۔

رولی نے گھوڑی کے نزدیک ہوتے ہی اپنا ہاتھ بلند کیا اور گھوڑی کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا پھر اس نے دو گولیاں مزید چلائیں تاکہ گھوڑی کی موت یقینی ہو جائے، اس کے بعد وہ برق رفتاری سے پلٹا، پلٹتے ہی اس کے چہرے پر روشنی پڑی۔

فائر کی آواز سن کر دوسرا بندہ جو چارپائی پر سو رہا تھا، وہ تڑپ کر اُٹھا، اس نے ٹارچ کی روشنی میں ایک چہرہ دیکھا، اس چہرے کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا، اس نے بار بار روشن رائے کے ساتھ اس بندے کو دیکھا تھا۔

ٹارچ کی روشنی نے جب اس کے چہرے کا راز فاش کر دیا تو رولی نے اس بندے پر گولی چلانے میں ذرا بھی دیر نہ کی، گولی کھا کر بندہ نیچے گرا اور رولی برق رفتاری سے باڑے سے نکل گیا۔

دوسرے بندے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اُٹھ کر رولی کا پیچھا کرے، وہ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ چکا تھا البتہ اسے ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ باڑے میں آنے والی نئی گھوڑی کا بھی کام تمام ہو چکا ہے۔

صبح کی روشنی راجہ سلیم کی حویلی میں تہلکہ مچاتی ہوئی داخل ہوئی۔

باڑے کا رکھوالا، راجہ سلیم کے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا، وہ اپنے مالک کو بتا چکا تھا کہ گھوڑی اور اس کے ساتھی کو قتل کرنے والا روشن رائے کا بندۂ خاص رولی تھا۔

راجہ سلیم بہت کائیاں آدمی تھا، وہ اس واقعہ کو پی گیا، اس نے روشن رائے سے کوئی شکوہ کیا اور نہ ہی کسی کو بتایا کہ اس کا بندہ اور گھوڑی مارنے کے واقعے میں روشن رائے کا آدمی ملوث ہے۔

وہ روشن رائے سے اسی تپاک سے ملا جس طرح ملتا تھا، لیکن ہاتھ ملاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں اب گرمجوشی نہ تھی، اس کا ہاتھ ڈھیلا اور سرد تھا۔

راجہ سلیم نے کچھ عرصے خاموش رہنے کے بعد اپنا ہاتھ دکھایا۔

جتنے عرصے خاموشی رہی، روشن رائے بہت خوش رہا کہ رولی نے بہت عمدگی سے اس کام کو سرانجام دیا، وہ گھوڑی اگر اسے نہیں مل سکی تھی تو وہ راجہ سلیم کے پاس بھی نہیں رہی تھی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ راجہ سلیم کے اندر کیسا طوفان اُٹھ رہا ہے، ایک دن وہ حویلی کے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اس نے بابو کرنٹ کو بلوا بھیجا۔

دس منٹ کے بعد بابو کرنٹ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ باغ میں پڑی ایک بڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس نے بابو کرنٹ کو اوپر سے نیچے تک بڑے غور سے دیکھا۔ پھر بولا۔

''ہاں بھئی بابو کرنٹ تم آ گئے ہو۔''

''جی راجہ سائیں۔'' بابو کرنٹ نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''بابا، تم یہ بتاؤ کہ تم نام کے بابو کرنٹ ہو یا واقعی کسی کو کرنٹ مار سکتے ہو؟'' راجہ سلیم نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

''راجہ سائیں، آپ حکم کریں۔ چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگے ہی گے۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی جاں نثاری سے کہا۔

''بابو تمہیں روشن گوٹھ جانا ہوگا۔'' راجہ سلیم نے حکم صادر کیا۔

''جاؤں گا راجہ سائیں، سر کے بل جاؤں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''آج میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں غور سے سن، وہ جو ہماری گھوڑی اور ایک بندے کو کسی نے قتل کیا تھا، جانتا ہے وہ کون تھا؟'' راجہ سلیم نے سوال اُٹھایا۔

''راجہ سائیں، اگر اس کا پتہ پڑ جاتا تو میں تو قاتل کو پاتال سے بھی پکڑ لاتا۔'' بابو کرنٹ فوراً بولا۔

''وہ روشن رائے کا بندہ رولی تھا۔'' راجہ سلیم نے حقیقت سے آگاہ کیا۔

''اچھا راجہ سائیں...... حیرت ہے...... ایسا کام اس نے کیسے کیا؟''

''بابا، اس میں رولی کا کوئی قصور نہیں، اسے جیسا حکم ملا، ویسا کر دیا...... ابھی بابا، میں تمہیں کوئی حکم دوں گا تو تم کیا کرو گے؟''

''وہی راجہ سائیں...... جو آپ حکم کریں گے۔''

''اب دیکھو بابو کرنٹ...... روشن رائے نے ہماری پسند کی گھوڑی مروادی تو بابا خون کا بدلہ تو خون ہے نا بابا۔'' راجہ سلیم نے پوچھا۔

''بالکل راجہ سائیں بالکل...... آپ ٹھیک بولتے ہیں۔''

''پھر میری بات غور سے سنو...... روشن رائے کے پاس دس بارہ گھوڑے ہیں، ان میں سے سب سے اچھا گھوڑا سفید رنگ کا ہے، اس گھوڑے کی پہچان یہ ہے کہ وہ پورا کا پورا سفید ہے مگر اس کی پیشانی پر روپے بھر کالا نشان ہے بابا، وہ اس گھوڑے پر جان دیتا ہے بس اس گھوڑے کو اصطبل سے اُڑانا ہے بابا، کرلو گے یہ کام......؟'' راجہ سلیم نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا۔

''جان پر کھیل کر کروں گا۔'' بابو کرنٹ نے سچے لہجے میں کہا۔

''بس تو بابو کرنٹ ...... تو کرنٹ کی طرح دوڑ جا، پر ایک بات کا دھیان رکھنا گولی نہیں چلانی ہے بابا...... کلہاڑی چلانی ہے۔''

''راجہ سائیں...... میں سمجھا نہیں۔''

''کوئی بات نہیں بابو کرنٹ...... میں تجھے سمجھاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔''

پھر راجہ سلیم نے اچھی طرح سمجھا دیا، کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟

☆......☆......☆

وہ ایک قیامت کی صبح تھی۔

روشن رائے کو اُٹھا کر جب رولی نے اسے وہ اندوہناک خبر سنائی تو روشن رائے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، جس گھوڑے میں اس کی جان تھی، اس گھوڑے کی جان نکال لی گئی تھی۔

اصطبل کے چوکیدار کو باندھ کر سفید گھوڑا نکالا گیا اور اسے حویلی کے گیٹ پر لا کر اس کی گردن تن سے جدا کر دی گئی، وہ تین آدمی تھے۔ یہ واردات کر کے وہ تینوں مختلف سمتوں میں نکل گئے۔

روشن رائے باوجود کوشش کے یہ نہ جان سکا کہ یہ واردات کس نے کی۔ یوں اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اگر اس واردات کے پیچھے کوئی ہو سکتا ہے تو وہ راجہ سلیم ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس نے اس کی ...لی گھوڑی قتل کروا دی تھی، ابھی تک تو وہ مطمئن تھا کہ راجہ سلیم کو قتل کا پتہ نہیں چل سکا لیکن اس واردات نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں، اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی طرح راجہ سلیم کو اس کی گھوڑی کے قاتل کا پتہ چل گیا ہے اسی لئے اس نے جوابی کارروائی کے طور پر اس کا عزیز از جان گھوڑا ...ی دلیری سے مروا دیا تھا۔

روشن رائے نے اپنی ساری صلاحیتیں اس کوشش میں صرف کر دیں کہ راجہ سلیم کے خلاف کوئی ... کوئی سراغ ہاتھ آ جائے لیکن وہ ناکام رہا، بابو کرنٹ نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کچھ اس ... میں واردات کی تھی کہ کوئی سراغ کوئی ثبوت نہ چھوڑا تھا۔

اب دونوں دوستوں کے دلوں میں نفاق کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی لیکن دونوں نے ابھی ایک ... کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا، ان دونوں کے درمیان دوستی تھی لیکن یہ اور بات ہے کہ ...ی گرمجوشی نہ رہی تھی، سرد مہری بڑھتی چلی جاتی تھی اور دوستی کے اس درخت کو گرانے میں روشن

رائے کا زیادہ ہاتھ تھا، پہل اسی نے کی تھی، راجہ سلیم نے ثبوت ہونے کے باوجود روشن رائے سے کوئی گلہ شکوہ نہ کیا تھا لیکن روشن رائے کے پاس کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود انتقام کی آگ اس کے دل میں بھڑکتی جاتی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد الیکشن آ گئے، اگرچہ دونوں کے حلقے الگ الگ تھے اور اس سے پہلے روشن رائے نے کبھی الیکشن میں حصہ لینے کی کوشش بھی نہ کی تھی لیکن اس مرتبہ دونوں نے ایک ہی حلقے سے الیکشن لڑنے کی ٹھان لی، دونوں نے اپنی اپنی پارٹیوں سے ٹکٹ حاصل کر لئے اور الیکشن کی گہما گہمی شروع ہو گئی، دونوں نے جلسے جلوس کرنے شروع کر دیئے، دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف بولنا شروع کر دیا، روشن رائے کی کوشش تھی کہ جہاں راجہ سلیم جلسہ کرے، وہیں اس کا بھی جلسہ ہو، نتیجے میں ایک دوسرے کے جلسے درہم برہم ہونے لگے تھے اور ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں دوست ایک دوسرے کے سامنے کھل کر مقابل آ گئے۔

دوستی اندر ہی اندر دشمنی میں بدلی اور پھر یہ سیاسی رنگ اختیار کر گئی۔

پھر وہ وقت آیا کہ دونوں امیدواروں نے ایک ہی دن، ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت جلسے کا اعلان کر دیا، دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اس اعلان کا کیا نتیجہ نکلے گا، ظاہر ہے جب ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت جلسہ ہوگا تو کیا حشر ہوگا، دونوں کے کارکنوں نے اپنا اپنا اسٹیج تعمیر کرانے کی کوشش کی، خوب ہنگامہ ہوا، خون خرابہ ہوا، دونوں امیدوار جب ''میدانِ حشر'' میں پہنچے تو اپنا اپنا اعمال نامہ اِدھر اُدھر اُٹھائے پھرے، گولیاں چلیں، راجہ سلیم کے بازو میں بھی ایک گولی لگی، روشن رائے کو بھی زخم آئے، دونوں امیدوار اپنے اپنے زخم چاٹتے اپنے اپنے علاقے میں واپس چلے گئے، جلسہ کوئی نہ کر سکا۔

اس آپس کی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا، اس حلقے سے ایک تیسرا امیدوار کامیاب ہو گیا، اس شکست نے دونوں کے دلوں میں انتقام کی آگ مزید بھڑکا دی۔

اب دونوں دشمن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے جو چاہتے کر گزرتے اور چھپانے کے بجائے بتا دیتے کہ یہ کام اس نے کیا ہے، جب دوستی تھی تو وہ ضرب المثل تھی، اب دشمنی ہوئی تو وہ بھی ضرب المثل ہو گئی تھی۔

اب دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے، ایک دوسرے کی عزتوں کے دشمن تھے۔

اسی اثناء میں راجہ سلیم کے بیٹے کی بیوی کو شہر سے ایک ڈاکوؤں کی پارٹی نے اغواء کیا۔ روشن رائے تک جب یہ خبر پہنچی تو اس نے راجہ سلیم کی بہو کو ڈاکوؤں کے سردار سے تھوڑا بہت تاوان دے کر اپنے قبضے میں کر لیا اور پھر اس کی لاش راجہ سلیم کی حویلی بھجوا دی...... راجہ سلیم تڑپ کر رہ گیا۔

راجہ سلیم اب کسی موقع کی تلاش میں تھا کہ ''موقع'' خود بخود چل کر اس کے پاس آ گیا۔ ماروی کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ روشن رائے کے نزدیک اپنی بہو کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی، اس نے خود ہی اسے در بدر کر دیا تھا لیکن تھی تو وہ اس کی بہو...... اس کے اکلوتے بیٹے کمال رائے کی بیوی......!

اس نے ماسٹر حاکم کو شاباش دے کر اور انعام و اکرام کا وعدہ کر کے چند ہدایتوں کے ساتھ رخصت کیا اور اپنی حکمت عملی تیار کرنے لگا۔

اس حکمت عملی کے تحت بابو کرنٹ نے حاکم علی کے گھر سے ماروی کو اُٹھایا اور اسے مار کر قالین میں لپیٹا اور راتوں رات اس سڑک پر رکھ دیا جو سپر ہائی وے کو ملاتی تھی تو دوسری طرف روشن گوٹھ کو جاتی تھی۔

راجہ سلیم جانتا تھا کہ جس کی بھی نظر سب سے پہلے سڑک پر لپٹے قالین پر پڑے گی، وہ اس خبر کو حویلی تک ضرور پہنچا دے گا۔ اب اس کو کیا کہیے کہ وہ پہلا آدمی اس کا شوہر کمال رائے ثابت ہوا۔

کمال رائے اپنی بیوی کی گمشدگی سے پریشان تھا، اگرچہ اس کے باپ نے اسے یہی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ماروی ایک لڑکی کو جنم دے کر چل بسی ہے لیکن حقائق نے اس سانحہ کی سرے سے نفی کر دی تھی۔ جب اس نے اپنی بیوی کی تلاش میں سرگرمی دکھائی اور وہ اس راز کے نزدیک پہنچنے لگا تو اس کے باپ نے اس کی حویلی بدری کے احکامات جاری کر دیئے، اس نے حویلی بلا پس و پیش چھوڑ دی۔ وہ اپنی ماں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اسے کیا پتہ تھا کہ جن آنسوؤں کی وجہ سے اس نے حویلی چھوڑنا گوارا کر لیا، وہ آنسو خود اس کی آنکھوں میں بھر آئیں گے، اس کی بیوی یوں راہ میں رل جائے گی۔

ماروی کی لاش دیکھ کر اس کے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ ضبط کے تمام بند دُکھ کے ریلے میں بہہ گئے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، رولی اور ہولی اسے واپس حویلی لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

اس نے اپنی ماروی کی لاش کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھایا۔ اسے پجیرو کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

پھر اس نے انتہائی سرد لہجے میں حکم دیا۔ ''چلو کراچی چلو۔''

رولی نے جب چھوٹے مالک کو لاش کے ساتھ پیچھے بیٹھتے ہوئے دیکھا تو اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی قیمت پر حویلی نہیں جائیں گے، اس نے فوراً فیصلہ کیا اس نے ہولی کو چند ہدایات دے کر ایک بندے

کے ساتھ واپس حویلی جانے کو کہا اور پھر خود دو بندوں کے ساتھ •بجیر و میں بیٹھ گیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

اور •بجیر و کمال رائے کے حکم کے مطابق کراچی کی جانب روانہ ہوگئی۔

☆......☆......☆

•بجیر و کے جانے کے بعد ہولی اور اس بندے نے مل کر قالین کو رول کیا، ہولی نے اس قالین کو بندے کے کندھے پر رکھ دیا اور پھر وہ دونوں حویلی کی طرف پیدل ہی چل دیئے۔

اس وقت وہ دونوں حویلی سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھے، ان دونوں کیلئے یہ فاصلہ ایسا نہ تھا کہ وہ پیدل چل کر حویلی نہ پہنچ جاتے، ویسے انہیں توقع تھی کہ راستے میں کوئی نہ کوئی سواری انہیں ضرور مل جائے گا۔

''ہوا بھی یہی!

ابھی وہ ایک کلومیٹر بھی نہیں چلے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک اونٹ گاڑی آ گئی، گاڑی والا روشن گوٹھ کا ہی تھا، اس نے حویلی کے بندوں کو دیکھ کر خود ہی انہیں آواز دے دی، اس طرح ہولی اور حویلی کا دوسرا ملازم مع قالین حویلی پہنچ گئے۔

ہولی نے حویلی میں پہنچ کر قالین برآمدے میں رکھوایا اور خود روشن رائے کی تلاش میں چل دیا۔ اتنے میں اس کی نظر نفیسہ بیگم کی ملازمہ خاص بھاگ بھری پر پڑی۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا اس کے نزدیک پہنچا۔

''کیا ہوا؟'' بھاگ بھری نے ہولی کی پریشان صورت دیکھ کر پوچھا۔

''مالک کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ مالکن کے ساتھ ناشتہ کر رہے ہیں۔'' بھاگ بھری نے جواب دیا۔

''جب ناشتہ کر لیں تو انہیں خبر دینا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔''

بھاگ بھری ڈرائنگ روم میں پہنچی تو روشن رائے ناشتہ کر چکا تھا۔

''مالک، وہ ہولی آیا ہے، کوئی خبر لایا ہے۔'' بھاگ بھری نے بڑے مؤدبانہ انداز میں جھک کر کہا۔

''ہولی آ گیا۔'' روشن رائے نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ ''کیا اس کے ساتھ رولی بھی ہے۔''

''نہیں مالک اکیلا ہے۔'' وہ بولی۔

''اچھا میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، تم اسے وہاں بھیج دو۔'' روشن رائے، نفیسہ بیگم کے چہرے پر نظر ڈالتا ہوا اُٹھ گیا اور تمکنت سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

وہ حویلی کے اندرونی حصے سے اپنی نشست گاہ پہنچ گیا، ابھی وہ ملاقات کے اس خاص کمرے میں پہنچ کر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی اس نے موبائل فون کا بٹن دبا کر بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہیلو......''

''ہا......ہا......ہا......'' اُدھر سے ایک زہریلا قہقہہ سنائی دیا۔

''کون ہو تم؟'' روشن رائے نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ہا......ہا......ہا۔'' اِدھر سے پھر وہی زہریلا قہقہہ سنائی دیا۔

تب روشن نے فوراً ہی اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ قہقہہ سن کر وہ اندر ہی اندر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس زہریلی ہنسی کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی اس کی فتح کی خبر ہوگی۔ اس کی فتح مگر روشن رائے کی شکست...... جانے اس ہنسی کے پیچھے کیا خبر ہو۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ خبر کا انتظار کرنے لگا ......لیکن اِدھر سے فوراً ہی ٹیلی فون آف ہو گیا۔

روشن رائے نے اپنا موبائل فون بند کر کے ایک جھٹکے سے اسے صوفے پر پھینک دیا۔ اتنے میں ایک ملازم اندر آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہولی آیا ہے؟'' روشن رائے نے پوچھا۔

''جی مالک۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''بھیجو اسے۔'' روشن رائے نے حکم دیا۔

ملازم کے غائب ہوتے ہی ہولی کمرے کے اندر سہما سا داخل ہوا۔ روشن رائے نے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی اور اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی پریشان کن خبر لایا ہے۔

''کیا مصیبت آئی ہے؟ بولتا کیوں نہیں۔'' روشن رائے نے جھنجھلا کر کہا۔

''مالک میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں۔'' ہولی نے گویا جان کی امان پاتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے بابا...... تیرے پاس جو بھی خبر ہو...... وہ بتا۔ زیادہ ڈرامہ نہ کر۔'' روشن رائے سرد لہجے میں بولا۔

''مالک...... یہاں سے کوئی بارہ کلومیٹر پرے سڑک پر ایک لپٹا ہوا قالین دکھائی دیا۔ مالک اسے میں نے اور رولی نے کھولا تو اس میں سے چھوٹی مالکن کی لاش نکلی۔'' ہولی نے ڈرتے ڈرتے خبر سنائی۔

''چھوٹی مالکن کی لاش...... تیرا مطلب ہے کمال رائے کی بیوی کی لاش!'' اس خبر نے روشن رائے کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی سی دوڑا دی، اس نے گھبرا کر تصدیق چاہی۔

"جی مالک۔" رولی نے تصدیق کی۔

"کہاں ہے لاش، چلو مجھے دکھاؤ۔" وہ کھڑا ہونے لگا۔

"مالک لاش چھوٹے مالک کراچی لے گئے۔ وہ حویلی واپس آنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ رولی ان کے ساتھ گیا ہے اور میں گاڑی سے اُتر کر آپ کے پاس آگیا۔ میں وہ قالین ضرور لے آیا ہوں جس میں چھوٹی مالکن کی لاش لپٹی ہوئی تھی۔ وہ برآمدے میں پڑا ہے۔" رولی نے بتایا۔

روشن رائے کو اس وقت کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ہر طرف سے قہقہے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ قہقہہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ اس کا دل چیر رہا تھا...... یہ قہقہہ راجہ سلیم کا تھا۔

☆......☆......☆

کراچی پہنچنے تک پجیرو میں موت کا سناٹا چھایا رہا۔

کسی میں ہمت نہ تھی جو کمال رائے سے مخاطب ہو سکتا۔ رولی بس نظر اُٹھا کر آئینے میں دیکھ لیتا تھا۔ کمال رائے نے ماروی کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بار بار سر پر ہاتھ پھیر کر اس کا چہرہ دیکھتا تھا۔ ماروی کا چہرہ زرد تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان تھی کہ وہ جب بھی اپنے ہونٹ دھیرے سے بند کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے مسکرا رہی ہو۔ وہی مسکراہٹ مرنے کے بعد بھی اس کے ہونٹوں پر موجود تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

پورے راستے اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہتے رہے۔ اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ خود اسے رونے سے فرصت نہ تھی۔ وہ روتا یا اپنے آنسو پونچھتا۔

کراچی میں داخل ہونے سے پہلے رولی، کمال رائے سے مخاطب ہوا۔ "مالک...... کہاں جائیں گے؟"

"ایں۔" اس نے کئی گھنٹے کے بعد کسی کی آواز سنی تو چونکا۔

وہ اپنے حواسوں میں کب تھا۔ جب سے اس نے ماروی کی لاش دیکھی تھی، اس پر دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کے حواس گم ہو چکے تھے۔ وہ کسی صورت میں اپنی ماروی سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے لے کر ہوسٹل میں نہیں جا سکتا تھا، اس لئے اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "ڈیفنس چلو۔"

رولی، کمال رائے کے اس فیصلے سے خوش ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ مالک کہیں ایسی جگہ نہ چلے جائیں جہاں وہ ان کے ساتھ نہ جا سکے۔ وہ کمال رائے کے ساتھ رہنا چاہتا تھا تاکہ روشن رائے کو ساری صورتحال سے آگاہ کر سکے۔

ڈیفنس کے بنگلے پر پہنچ کر کمال رائے نے وہاں موجود ملازم دلدار کو اوپر کا بیڈروم کھولنے کا حکم دیا۔

کمال رائے نے ماروی کو پجیرو سے نکالا اور اسے اپنے کندھے پر ڈال کر اوپر والے بیڈروم

میں پہنچ گیا۔ اس نے بہت آہستگی سے اسے نرم بستر پر لٹایا، کچھ اس طرح کہ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو۔

پھر اس نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے، سر کے نیچے تکیہ درست کیا اور پھر اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے تنہا چھوڑ جانے کی اجازت طلب کر رہا ہو۔ پھر وہ تیزی سے پلٹا۔ بیڈروم سے نکلا۔ دروازہ لاک کر کے وہ تیزی سے نیچے آیا۔

رولی سامنے کھڑا دلدار سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ چپ ہو گیا اور بڑے مؤدبانہ انداز میں کمال رائے کی طرف بڑھا۔

"رولی...... اب تم جاؤ...... یہاں اب تمہیں چند منٹ بھی برداشت نہیں کروں گا۔ فوراً حویلی چلے جاؤ اور بابا سے کہہ دینا کہ وہ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔ ان سے کہہ دینا کہ ماروی کی طرح اب کمال رائے بھی مر گیا۔ جاؤ، رولی جاؤ۔" بولتے بولتے ایک دَم اس کے لہجے میں آگ بھر گئی۔ غصے سے اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں، رولی کا اب یہاں رکنا کسی طور مناسب نہ تھا۔

"ٹھیک ہے مالک...... جیسی آپ کی مرضی۔" اس نے فوراً بڑی سعادت مندی سے کہا اور بنگلے سے باہر جانے کیلئے فوراً پلٹ پڑا، اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے دونوں بندوں کو اشارہ کیا۔ جب وہ دونوں پجیرو میں بیٹھ گئے تو رولی خود بھی پجیرو میں سوار ہو گیا۔ اس نے بڑی مہارت سے گاڑی بیک کی اور پھر تیزی سے سیدھا نکلتا چلا گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر اس نے چند سیکنڈوں کی بھی دیر کی تو کمال رائے اسے گولی نہ مار دے۔

پجیرو کے گیٹ سے نکلتے ہی اس نے دلدار کو حکم دیا۔ "دلدار، گیٹ بند کر دو۔"

"جی مالک۔" وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگا۔

اچانک کمال رائے کو ماروی کا خیال آیا۔ وہ تنہا ہو گی۔ اس کی تنہائی کا خیال کر کے وہ جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

پھر بیڈ پر بیٹھ کر اس نے بے قراری سے ماروی کا ہاتھ تھام لیا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔ "ماروی معاف کرنا میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نیچے چلا گیا تھا۔ میں بابا کے کتے کو بھگانے گیا تھا۔ دیکھو مجھے دیر تو نہیں ہوئی نا...... میں فوراً ہی آ گیا ہوں۔"

ماروی کی موت نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا تھا اور یہ اثر بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اسے ماروی کو حویلی میں تنہا چھوڑ دینے کا گہرا رنج تھا۔ وہ شادی کر کے جیسے اسے بھول گیا تھا۔ وہ موسیقی کی محفلوں میں کچھ ایسا گم ہوا تھا کہ ماروی اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا آخری خط بھی اسے حویلی جانے پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔

''میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔ ہو سکے تو مجھ سے مل جاؤ۔''

اس خط کے ملتے ہی وہ تڑپ گیا تھا، اس نے فوراً حویلی جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پر برا ہو ان موسیقی کی شاموں کا، کچھ دوست اسے ایک میوزک کنسرٹ میں شرکت کیلئے لے گئے۔ بس ایک شام گزری تو ماروی کے خط کا تاثر دھیما ہو گیا اور پھر وہ روز جانے کا سوچ کر وقت ٹالتا رہا۔

فون اس کے پاس نہیں تھا۔ روشن رائے کی ہدایت کے باوجود اس نے موبائل فون اپنے پاس نہیں رکھا تھا۔ وہ دراصل اپنی آزادی میں کسی قسم کا خلل نہیں چاہتا تھا۔ حویلی والوں کو اس سے رابطہ کرنے کیلئے بندہ ہوسٹل بھیجنا پڑتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ کسی دوست کا موبائل لے کر اپنی ماں سے ضرور بات کر لیا کرتا تھا۔ ماں کے ذریعے ہی ماروی کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔

پھر ایک دن بڑی شدت سے ماروی یاد آئی تو اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کچھ ہو جائے وہ کل ضرور روشن گوٹھ جائے گا۔ اتفاق سے اس وقت کسی دوست کا موبائل فون بھی دستیاب تھا، سو اس نے اپنی ماں کو حویلی آنے کی اطلاع دے دی...... وہ کیا جانتا تھا کہ ماروی کے بلاوے پر نہ جا کر وہ کس قدر شدید غلطی کر رہا ہے۔ اگر وہ یہ جانتا کہ کب اب کبھی ماروی کو نہ پا سکے گا تو وہ کبھی ایسی لاپرواہی نہ کرتا۔

اب یہی لاپرواہی، اس کا لا اُبالی پن اس کیلئے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ ماروی اس کی محبت تھی اس نے ماروی سے بڑی چاہ سے شادی کی تھی۔ ماروی نے اس کیلئے اپنے والدین کو چھوڑا تھا۔ اگرچہ کمال رائے نے بھی ماروی کو اپنا کر اپنے والدین کو ناراض کیا تھا لیکن یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اسے الگ نہ کیا تھا۔ وہ اس کو الگ کر بھی نہیں سکتے تھے، وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔

کمال رائے، ماروی کی صورت تکے جا رہا تھا اور اس کے دماغ میں ماروی کے ساتھ گزارے وقت کی فلم بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔ بولے جا رہا تھا اور ماروی آنکھیں بند کیے، ہونٹوں پر مسکان سجائے خاموشی سے سنے جا رہی تھی، وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اسی طرح پوری رات گزر گئی۔

صبح ہوتے ہی روشن گوٹھ سے نفیسہ کا فون آیا۔ دلدار نے ریسیور اُٹھایا۔ ''ہیلو۔''

''کون دلدار؟'' اِدھر سے نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

''جی مالکن...... میں دلدار بول رہا ہوں۔'' دلدار نے نفیسہ بیگم کی آواز پہچان کر جواب دیا۔

''چھوٹے مالک کہاں ہیں؟'' نفیسہ بیگم نے تشویش سے پوچھا۔

''وہ تو اوپر کے کمرے میں ہیں۔ جب سے آئے ہیں وہیں ہیں، انہوں نے اندر سے کمرہ بند کر رکھا ہے۔ میں نے اور سروری نے اوپر کئی بار چکر لگائے مگر دروازہ بند پایا۔'' دلدار نے مختصراً رات کی رُوداد بیان کر دی۔

''جا اب اوپر جا...... دروازہ بجا کر چھوٹے مالک کو بتا کہ میرا فون ہے۔'' نفیسہ بیگم نے حکم دیا۔

''اچھا جی...... جاتا ہوں۔'' دلدار ریسیور رکھ کر اُٹھ گیا۔

دلدار کی بیوی سروری کچن میں ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ دلدار کے پاس آ گئی۔ اس نے دلدار کو ریسیور رکھ کر اُٹھتے دیکھا تو اشارے سے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

''مالکن کا فون ہے۔ وہ چھوٹے مالک کو بلا رہی ہیں۔'' دلدار نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

سروری بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ اوپر پہنچ کر دلدار نے دروازے کے ہینڈل کو آہستہ سے گھمایا لیکن دروازہ نہ کھلا، وہ اندر سے بند تھا۔ ابھی وہ دروازے پر دستک دینے ہی والا تھا کہ سروری نے اسے آواز دی۔ ''دلدار اِدھر آ۔''

اس کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔ وہ نزدیک پہنچ کر بولا۔ ''ہاں، کیا ہوا؟''

سروری خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کی طرف لے گئی۔ کھڑکی شیشے کی تھی اور درمیان سے تھوڑا سا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اندر لائٹ جل رہی تھی، کھلے ہوئے پردے میں سے کمال رائے صاف نظر آ رہا تھا۔ ''وہ ایک گیلے تولیے سے ماروی کا منہ صاف کر رہا تھا۔

''لگتا ہے...... چھوٹے مالک پاگل ہو گئے ہیں۔ کوئی لاش کا بھی منہ دھلاتا ہے۔'' دلدار پریشان ہو کر بولا۔ ''اب کیا کروں سروری...... دروازہ بجاؤں؟''

''ہاں بجاؤ...... انہیں بتاؤ کہ مالکن کا فون آیا ہے۔'' سروری نے مشورہ دیا۔

''اچھا'' دلدار ہمت کر کے آگے بڑھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بجایا۔

دلدار دروازہ بجا کر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے سروری کو اپنے قریب کر لیا۔ وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کمال رائے دروازہ کھول کر اس سے کس قسم کا برتاؤ کرے گا...... دروازہ بجانے کا کوئی اثر نہ ہوا، کچھ دیر انتظار کے بعد دروازہ نہ کھلا۔ تب سروری نے اسے دوبارہ دروازہ بجانے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ گیا اور اس نے سروری کو آگے کر دیا۔ مجبوراً سروری کو دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

چند لمحوں بعد اندر کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ دروازہ کھلتے ہی کمال رائے کا چہرہ نظر آیا۔ سروری اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے وہ رات بھر نہ سویا ہو۔ بال بکھرے ہوئے تھے، لباس بے ترتیب تھا۔

کمال رائے نے سروری کو دیکھتے ہی کہا۔ ''سروی ناشتہ لاؤ...... میری ماروی کب سے ناشتے کا انتظار کر رہی ہے۔''

"ہائے اللہ!" کمال رائے کی بات سن کر سروری پریشان ہو کر ایک دم پیچھے ہٹی۔

"چھوٹے مالک...... حویلی سے مالکن کا فون آیا ہے۔ وہ آپ کو بلا رہی ہے۔" دلدار آگے بڑھ کر بولا۔

"ارے بے وقوف...... میری بات سن...... میری ماروی رات سے بھوکی ہے۔ اس کیلئے جلدی سے ناشتہ لا...... جا جلدی جا۔" کمال رائے نے اپنی کہی، گویا اس نے دلدار کی بات سنی ہی نہیں۔

"چھوٹے مالک...... میں ابھی ناشتہ لے آتی ہوں۔ آپ جب تک مالکن سے بات کر لیں۔" سروری نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کون مالکن؟" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"چھوٹے مالک، کیا آپ اپنی ماں کو بھی بھول گئے۔" سروری نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"سروری یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ بس میری ماروی ہے۔ اس کیلئے ناشتہ لاؤ۔ وہ کب سے ناشتے کا انتظار کر رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جواب سننے کا بھی انتظار نہ کیا اور دھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ دونوں ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"اب کیا کریں۔" دلدار پریشان ہو کر بولا۔ "مالکن کو کیا بتائیں؟"

"دیکھ دلدار، مالکن سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں...... انہیں صاف صاف بتا دے۔" سروری زینے کی طرف بڑھی۔

"تو بات کر لے نا...... تو انہیں سمجھا کر بتا دے گی۔" دلدار نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

"چل ٹھیک ہے...... میں بات کر لیتی ہوں۔" سروری نے جرأت مندی کا ثبوت دیا۔

پھر نیچے پہنچ کر سروری نے قالین پر بیٹھ کر ریسیور اُٹھایا اور ہر وہ بات بتا دی جو اس نے دیکھی اور سنی تھی۔ یہ ساری باتیں سن کر نفیسہ بیگم کے تو ہوش اُڑ گئے۔ اس کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا اور اس کی یہ حالت۔ وہ اگر سچ پاگل ہو گیا تو وہ کہیں کی بھی نہیں رہے گی۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور کمال رائے کی کیفیت کے پیشِ نظر اس نے سروری کو ہدایت دی۔ "سروری، دیکھ چھوٹے مالک کا خیال رکھنا۔ دلدار سے کہہ کر گھر کے گیٹ پر تالا ڈلوا دے...... کہیں چھوٹے مالک باہر نہ نکل جائیں۔ میں فوراً ہی بڑے مالک کو لے کر نکل رہی ہوں۔ تم دونوں اس وقت تک چھوٹے مالک کا خیال رکھو...... وہ جیسا کہیں کر دینا...... ٹھیک ہے۔"

"جی مالکن...... ٹھیک ہے، میں ابھی گیٹ پر تالا ڈلوا دیتی ہوں۔ چھوٹے مالک ناشتہ مانگ رہے ہیں، ابھی اوپر جا کر دے آتی ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں ان کا پورا خیال رکھوں گی۔" سروری

نے بڑی سعادت مندی اور بردباری سے کہا۔

سروری کا جواب سن کر نفیسہ بیگم کو ڈھارس سی ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ سروری خاصی سمجھدار عورت ہے۔ کمال رائے کو خوش اسلوبی سے سنبھال لے گی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے روشن رائے نے اپنی مونچھ پر تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا نفیسہ؟"

"فوراً کراچی چلنے کا انتظام کریں۔ کمال رائے نے پوری رات لاش کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ کہیں وہ سچ مچ پاگل نہ ہو جائے۔" نفیسہ بیگم کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیا کہہ رہا ہے...... کچھ بتاؤ تو۔" روشن رائے نے پوچھا۔

"وہ لاش کا منہ دُھلا رہا ہے۔ لاش کیلئے ناشتہ مانگ رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے۔ ابھی آئی سمجھ میں۔" نفیسہ بیگم نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

"بابا...... یہ بات تو بڑی خطرناک ہے۔" روشن رائے فکرمندی سے کھڑا ہو گیا۔ "تم ایسا کرو، جلدی سے کپڑے تبدیل کر لو...... میں رولی کو کہتا ہوں وہ گاڑی لے کر آ جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" نفیسہ بیگم نے کہا اور جانے کی تیاری میں لگ گئی۔

☆......☆......☆

رولی نے پجیرو گیٹ کے سامنے روکی۔ دو مرتبہ اس نے ہارن بجایا۔ اس کے بعد وہ پجیرو سے اُترا۔ گیٹ پر لگے کال بیل بٹن کو دو تین مرتبہ جلدی جلدی دبایا اور پھر پجیرو میں آ کر بیٹھ گیا۔

دلدار نے گھنٹی کی آواز سنی تو وہ دوڑتا ہوا گیٹ تک آیا۔ سروری بھی بنگلے سے باہر آ گئی۔ دلدار نے گیٹ پر لگا تالا کھولا اور پھر جلدی سے گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیئے اور خود ایک طرف ہو گیا۔

رولی تیزی سے پجیرو اندر لیتا چلا گیا۔ اس نے گاڑی روک کر جلدی سے اُتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ پہلے روشن رائے اور اس کے بعد نفیسہ بیگم اُتری۔ دلدار نے دونوں کو سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ دونوں سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے اندر بنگلے میں داخل ہو گئے۔

روشن رائے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے ایک مونچھ موڑنے لگا۔

نفیسہ بیگم بیڈ روم میں داخل ہو کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ سروری نے جلدی سے مالکن کے پیر پکڑ لئے اور انہیں آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

"چھوٹے مالک کہاں ہیں؟" نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

"وہ اوپر ہی ہیں...... میں انہیں ناشتہ دے آئی تھی۔" سروری نے بتایا۔

"وہ ابھی تک بیڈ روم سے نہیں نکلا۔" نفیسہ بیگم فکرمند ہوئی۔

"نہیں مالکن۔" سروری نے بتایا۔

"اچھا، آؤ...... میرے ساتھ اوپر چلو۔" نفیسہ بیگم نے بیڈ سے پاؤں نیچے اُتارتے ہوئے کہا۔

سروری نے جلدی سے نفیسہ بیگم کے پیروں میں جوتے پہنائے اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

نفیسہ بیگم بیڈروم سے نکل کر باہر آئی اور راہداری پار کر کے اوپر چڑھنے لگی۔ اس کے پیچھے سروری تھی۔

نفیسہ بیگم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہول رہی تھی کہ کمال رائے کی جانے کیا حالت ہوگی۔ اوپر پہنچ کر اس نے دو لمبے لمبے سانس لئے اور سروری کو دروازہ کھٹکھٹانے کا اشارہ کیا۔

سروری نے دروازہ پر دستک دینے کے ساتھ آواز بھی لگائی۔ "چھوٹے مالک...... چھوٹے مالک ...... دروازہ کھولیں۔"

کچھ دیر کے بعد اندر سے کھٹ پٹ کی آواز آئی جیسے دروازہ کھول رہا ہو۔ پھر ایک دَم دروازہ کھلا۔ کمال رائے کا دحشت زدہ چہرہ نظر آیا۔ نفیسہ اس کا چہرہ دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ پھر اس کے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کمال رائے کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور رقت آمیز لہجے میں بولی۔ "میرے چاند تُو نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔"

کمال رائے نے اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور اپنا چہرہ اس کے ہاتھوں سے الگ کرلیا اور واپس کمرے میں چلا گیا۔ نفیسہ بیگم اس کے پیچھے لپکی۔

کمرے کا برا حال تھا۔ ماروی کی لاش بیڈ پر پڑی تھی اور ناشتہ اس کے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ کمال رائے نے اسے بھرپور ناشتہ کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے منہ پر جام، انڈا، مکھن، ڈبل روٹی کے پیس لپٹے ہوئے تھے۔ کپڑوں پر چائے پڑی تھی۔

کمال رائے کے ہاتھ میں مکھن لگا ڈبل روٹی کا سلائس موجود تھا۔ وہ بڑی فکرمندی سے ماروی کی طرف بڑھا جیسے اسے ناشتے میں دیر ہوگئی ہو۔ پھر اس نے بڑی چاہ سے اس کے منہ پر سلائس رکھا اور گویا ہوا۔ "ماروی، جلدی سے ناشتہ کرلو۔ یہ لوگ آگئے ہیں، تم سے سب چھین کرلے جائیں گے۔"

"نہیں میرے کمال...... تم پریشان نہ ہو، میں نے ماروی کیلئے ڈھیروں کھانا بنوایا ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔ ماروی سے کوئی کچھ نہیں چھینے گا بیٹے۔ یقین کرو۔" نفیسہ بیگم نے اس کی ذہنی حالت پر اندر ہی اندر روتے ہوئے اپنے اوپر بمشکل جبر کر کے کہا۔

"ہاں۔" کمال رائے کے چہرے پر ایک دَم خوشی پھیل گئی۔ "تم بہت اچھی ہو، تم کون ہو؟"

"ہائے میرے لعل۔" نفیسہ بیگم کا کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ "تُو مجھے بھی نہیں پہچانتا۔ ارے میں تیری ماں ہوں۔"

"اچھا تم میری ماں ہو؟" اس کی آنکھوں میں کوئی پہچان نہ تھی، وہ بدستور اجنبی تھیں۔ "ماروی سنا تم نے...... میری ماں آئی ہے۔"

کمال رائے کے اجنبی لہجے پر نفیسہ پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمال رائے کو اپنی بانہوں میں بھرلیا اور روتے ہوئے بولی۔ "میں تیری ماں ہوں۔ تُو مجھے پہچانتا کیوں نہیں۔"

"پہچان تو رہا ہوں۔ ماروی کو بتا رہا ہوں کہ تم میری ماں ہو۔ ماروی سنو یہ میری ماں ہیں۔ انہیں اچھی طرح پہچان لو۔" کمال رائے کے لہجے کی اجنبیت برقرار تھی۔ "اس کیلئے کھانا لاؤ...... میری ماروی بھوکی ہے۔"

"ہاں، میں اس کیلئے بہت سا کھانا لائی ہوں۔ میں تمہاری ماروی کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی۔ آؤ تم نیچے چلو۔ چل کر کھانا دیکھ لو۔ کیا کیا کھائے گی۔ تمہاری ماروی...... اپنی پسند سے ڈشیں بھروا لو۔" نفیسہ بیگم نے بڑی محبت سے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" کمال رائے نے نفیسہ بیگم سے اتفاق کیا۔ پھر وہ نفیسہ بیگم کو الگ کر کے ماروی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا اور دھیرے سے بولا۔ "ماروی، تم کیا کھاؤ گی۔ مجھے بتاؤ۔" پھر وہ کان لگا کر جیسے کچھ سننے لگا اس کے بعد اس نے گردن ہلائی جیسے وہ کچھ سمجھ گیا ہو، پھر وہ بولا۔

"ٹھیک ہے ماروی...... میں سمجھ گیا۔ میں ابھی تمہاری پسند کی ڈشیں لے کر آتا ہوں۔"

اس نے پھر نفیسہ کے ساتھ چلنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ جیسے جلدی میں تھا۔ جلدی سے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔

نیچے آکر وہ راہداری میں آکر رک گیا۔ کھڑے ہوکر چاروں طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا جیسے وہ کسی نئی جگہ آگیا ہو۔ اتنے میں نفیسہ بیگم اس کے پاس پہنچ گئی اور وہ کمال رائے کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "اِدھر آؤ کمال۔"

کمال رائے نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا جیسے کسی اندھے کو لاٹھی کا سہارا مل جائے۔

نفیسہ بیگم اسے اپنے ساتھ بیڈروم میں لے آئی اور دروازہ اندر سے بند کردیا۔ اسی وقت اس نے دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ تالا بند ہونے کی آواز پر اس نے سکون کا سانس لیا اور کمال رائے سے مخاطب ہوکر بولی۔ "بیٹا بیٹھ جاؤ۔"

"اچھا۔" کمال رائے نے کہا اور لاپرواہی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

ماں نے اپنے بیٹے کا چہرہ غور سے دیکھا تو دل پر آری سی چل گئی۔ دو دن میں اس کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ بکھرے بال، سرخ آنکھیں، چہرے پر مُردنی، بے ترتیب لباس...... یہ وہ کمال ہی نہ تھا۔

"بیٹا، ماروی تمہاری شکایت کر رہی تھی۔" نفیسہ بیگم کچھ سوچ کر بولی۔

"میری شکایت......؟" کمال رائے کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

"ہاں، بیٹا......شکایت تو وہ کرے گی......کوئی بیوی اپنے شوہر کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"مجھے کیا ہوا؟" کمال رائے نے اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ کہہ رہی تھی، انہوں نے منہ ہاتھ دھویا ہے نہ کپڑے بدلے ہیں اور نہ کچھ کھایا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے......میں واش روم میں جا کر ہاتھ منہ دھو لیتا ہوں۔"

"بیٹا......نہالو......فریش ہو جاؤ گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

"تم واش روم میں جاؤ......میں ماروی سے تمہارے کپڑے منگواتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" کمال رائے بڑی سعادت مندی سے واش روم چلا گیا۔

اس کے واش روم جانے کے بعد نفیسہ نے بیڈروم کا دروازہ بجایا۔ فوراً ہی باہر سے آواز آئی۔

"جی مالکن۔"

"میرا سوٹ کیس لاؤ......جو میں حویلی سے لائی ہوں۔"

"اچھا مالکن۔" سروری نے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور سروری ایک سوٹ کیس لے کر اندر داخل ہوئی اور پھر اسے میز پر رکھ کر فوراً واپس چلی گئی۔ دروازے میں پھر سے تالا لگ گیا۔

نفیسہ بیگم نے سوٹ کیس سے کمال رائے کے کپڑے اور شیونگ بکس نکالا اور واش روم کا دروازہ بجایا۔

کمال رائے نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر ہاتھ باہر نکال دیا۔ اس نے کپڑے اور شیونگ بکس اسے تھماتے ہوئے کہا۔ "ماروی نے کہا ہے کہ شیو بھی بنا لیں۔"

کمال رائے نے کوئی جواب دیئے بغیر کپڑے اور شیونگ بکس پکڑ لیا اور واش روم کا دروازہ بند کر لیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ واش روم سے باہر آیا تو اس کی شکل تبدیل ہو چکی تھی۔ نفیسہ بیگم نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ اب وہ انسان کا بچہ دکھائی دے رہا تھا۔

"بیٹھو کمال......مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" نفیسہ بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" کمال رائے نے فوراً ہی اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"مجھے ماروی کیلئے کھانا لے کر جانا ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

وہ کھانا ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ نفیسہ بیگم کا خیال تھا کہ وہ جب نہا دھو کر آئے گا تو اس میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور آئے گی لیکن وہ تو وہیں کا وہیں تھا۔ ماروی کی یاد میں ڈوبا ہوا۔ ماروی کیلئے فکرمند۔

اس نے بے قراری سے دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ اپنی طرف کھینچا۔ اس کا خیال تھا کہ دروازہ فوراً کھل جائے گا اور وہ باہر نکل جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا تھا، وہ کھلتا کیسے!

کمال رائے نے دوسری مرتبہ ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ جھنجھلا کر بولا۔ "یہ دروازہ کیوں نہیں کھلتا......کھولو دروازہ۔"

"بیٹا کمال۔" نفیسہ بیگم جلدی سے اس کے نزدیک آئی۔ "بیٹا آؤ، اِدھر آؤ......میرے پاس بیٹھو......میری بات سنو۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا ہے۔ جلدی سے دروازہ کھولو......یہ کس گدھے کے بچے نے بند کیا ہے۔ میں اسے گولی مار دوں گا۔" پھر اس نے غصے سے دروازہ بجایا۔ "دروازہ کھولو، دروازہ کھولتے کیوں نہیں۔"

دروازہ باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت بند کیا گیا تھا۔ اس پلان پر باہر عمل ہو چکا تھا۔ جب کمال رائے نے بہت زور سے دروازہ بجایا، کئی لاتیں دروازے پر ماریں اور غصے سے چلایا۔ "گدھے کے بچو دروازہ کھولو۔"

تب اچانک دروازے میں چابی گھومی اور وہ اگلے لمحے کھل گیا۔ سامنے دلدار کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چابی تھی۔

دلدار کو دیکھتے ہی کمال رائے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک زوردار تھپڑ دلدار کے منہ پر رسید کیا۔ اتنی زور سے کہ اس کا منہ پھر گیا۔

"کتے کے بچے......تُو نے دروازہ کیسے بند کیا؟" اس نے آگ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بھاگتا ہوا چلا گیا......اس نے بڑی تیزی سے راہداری پار کی اور دھڑا دھڑ زینہ چڑھتا اوپر پہنچ گیا۔

اوپر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگتا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا کندھا دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ کندھے پر اسے شدید چوٹ لگی لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے جب بیڈ کے نزدیک پہنچا تو وہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

بیڈ پر ماروی کی لاش موجود نہ تھی۔ بیڈ شیٹ تبدیل کی جا چکی تھی۔ کمرے کی اچھی طرح صفائی

کردی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو یہاں گندگی تھی اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس وقت وہ ایک عالی شان بنگلے کا عالی شان بیڈروم لگ رہا تھا۔

''ماروی کہاں گئی؟'' وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے تیزی سے کمرے میں چاروں طرف نظر گھمائی۔ مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔'' وہ جلدی سے باتھ روم کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا اس نے بہت آہستگی سے آواز دی۔ ''ماروی۔''

اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا اندر اندھیرا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹا تو کسی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ ساتھ دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔

دروازہ بند کر کے سروری نے چابی نفیسہ بیگم کے ہاتھ میں دے دی اور خود ذرا پیچھے ہٹ کر مؤدبانہ کھڑی ہو گئی۔

جب کمال رائے کو احساس ہوا کہ کمرہ باہر سے لاک کر دیا گیا تو وہ دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔

''کھولو، کمینو...... دروازہ کھولو...... کتے کے بچو دروازہ کھولو۔''

اپنے بیٹے کی ہذیانی چیخیں وہ دروازے سے پیٹھ لگائے بڑی خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ کمال رائے کو بہلا پھسلا کر اس لئے نیچے لے گئی تھی کہ روشن رائے کے منصوبے کے مطابق یہاں سے ماروی کی لاش کو ہٹا دیا جائے۔ ماروی کی لاش ہٹانے میں مشکل سے چند منٹ لگے۔ رولی دو بندوں کے ساتھ ماروی کی لاش کو آناً فاناً پجیرو میں ڈال کر لے گیا۔ اس کے بعد کمال کو ماروی کا پتہ نہ چلا کہ اسے کہاں دفنایا گیا۔ دفنایا بھی گیا یا دریا برد کر دیا گیا۔ کسی گڑھے میں پھینکا گیا یا کسی جنگل میں جانوروں کے نوچنے کیلئے ڈال دیا گیا۔

روشن رائے اور نفیسہ بیگم دونوں ہی کا خیال تھا کہ کمال رائے نے ماروی کی موت کا صدمہ کچھ زیادہ ہی لے لیا ہے۔ اس لئے جتنی جلد ممکن ہو، ماروی کو اس سے الگ کر دیا جائے۔ ویسے بھی کسی لاش کو کسی زندہ آدمی کے ساتھ کس طرح رہنے دیا جا سکتا تھا۔

وہ کمرے میں بند بری طرح چیخ رہا تھا۔ اپنے بیٹے کی ہذیانی چیخیں سن کر نفیسہ بیگم کا دل کسی پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ اپنا دل مٹھی میں بھینچے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اتنے میں اندر سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کھڑکی پر جالی کا مضبوط فریم لگا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی کھولنے کے بجائے غصے میں آ کر توڑ دی تھی۔

نفیسہ بیگم شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر کھڑکی کی طرف لپکی۔ وہ نفیسہ بیگم کو باہر دیکھ کر چیخا۔ ''میری ماروی کہاں ہے؟''

''میرے کمال...... میری بات کا اعتبار کر لے۔ وہ مر چکی ہے تو خود ہی تو اس کی لاش اُٹھا کر لایا تھا۔

''نہیں۔'' وہ بہت زور سے چیخا۔ ''وہ نہیں مر سکتی۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے دوسری کھڑکی کے شیشے پر مکا مارا۔ شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

نفیسہ بیگم سے اب اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے اُتر کر ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں روشن رائے ایک دبیز صوفے میں دھنسا اپنے بائیں ہاتھ سے ایک مونچھ مروڑے جا رہا تھا۔ نفیسہ بیگم کو دیکھ کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟''

''کمال کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس پر جنون طاری ہے۔ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلوائیں، نہیں تو وہ اپنے آپ کو زخمی کر لے گا۔ وہ کھڑکیوں کے شیشے توڑ رہا ہے۔'' نفیسہ بیگم کہتے کہتے رو پڑی۔

''اچھا، اچھا...... بابا رومت...... میں ابھی کرتا ہوں کچھ، تم پریشان مت ہو۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے صوفے پر پڑا موبائل فون اُٹھایا اور جلدی جلدی اپنے جاننے والے ایک ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔

ڈاکٹر اشرف دس پندرہ منٹ میں اپنے ساتھ ایک ایمبولینس لے کر بنگلے پر پہنچ گیا۔

جب ڈاکٹر تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو کمال رائے بیڈ پر بیٹھا چیخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ شیشہ توڑنے کی وجہ سے لہولہان تھے۔ ڈاکٹر اشرف نے سب سے پہلے اسے کسی طرح بہلا پھسلا کر بے ہوشی کا انجکشن لگایا۔ کچھ دیر میں ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر تیزی سے اس پر نیند طاری ہوتی چلی گئی۔

پھر کمال رائے کو ایمبولینس میں ڈال کر ایک پرائیویٹ ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں نفسیات کا وارڈ بھی تھا۔ وہاں فوری طور پر اس کا علاج شروع ہو گیا۔

روشن رائے نے وہاں کے ڈاکٹروں کو صرف اتنا بتایا کہ کمال رائے کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسے اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی اور اس کا انتقال بھی اچانک ہوا، اس وجہ سے وہ اپنی بیوی کی موت کا یقین نہیں کر رہا۔ صدمے نے اسے جنون میں مبتلا کر دیا ہے۔

ڈاکٹروں نے پہلے مرحلے میں اسے سکون بخش دوائیں دینا شروع کر دیں۔

☆......☆......☆

ماروی کی لاش پجیرو کی پچھلی سیٹ پر آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ اس کے اوپر ایک سفید چادر ڈال

دی گئی تھی۔ لاش کے لگاتار ہلنے کی وجہ سے وہ چادر اب اس کے چہرے سے ہٹ گئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پھسل کر نیچے آ گیا تھا۔ جو اب لاش کے ساتھ جھول رہا تھا۔ ماروی کے چہرے پر نرمی تھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کو مرے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے۔

پجیرو اپنی پوری رفتار سے سفر طے کر رہی تھی۔ رولی گاہے بگاہے پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ وہ کس حالت میں ہے کہیں ہل ہل کر سیٹ کے نیچے تو نہیں آ رہی......

وہ کراچی سے بہت آگے نکل آئے تھے۔ وہ ماروی کو ٹھکانے لگانے لایا تھا۔ روشن رائے نے اس سے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اسے ٹھکانے لگا دو۔ پتہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں اور کیسے؟ اب یہ معاملہ اس کی صوابدید پر تھا اور وہ سوچ رہا تھا، اس کام کو کیسے اور کہاں کیا جائے؟

پھر اس نے کچھ سوچ کر گاڑی صحرا کی طرف موڑ لی۔ دور تک ریت ہی ریت تھی۔ اونچے نیچے ریت کے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کانٹے دار پودے اُگے ہوئے تھے۔ وہ جب کافی اندر تک صحرا میں آ گئے اور رولی کو یقین ہو گیا کہ وہ ایسے علاقے میں پہنچ گیا ہے جہاں سے آدم زاد کا گزر مشکل ہے تو اس نے ایک جگہ پجیرو روک دی۔ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں بندوں کو نیچے اُترنے کا اشارہ کیا اور خود بھی نیچے اُتر گیا۔

ریت پر کھڑے ہو کر اپنی کمر سیدھی کی۔ وہ کافی دیر سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پھر اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ دور تک کسی انسان کا گزر نہ تھا۔

رولی کو قریب ہی ایک گھڑا نظر آیا۔ یہ گڑھا دو تین فٹ گہرا تھا۔ اس گڑھے کے ساتھ ہی چار پانچ فٹ بلند ریت کا ٹیلا تھا۔ رولی نے اس گڑھے کو اپنے کام کیلئے منتخب کر لیا۔ اس نے اپنے ایک بندے کی مدد سے ماروی کی لاش کو گاڑی سے نکالا۔ پھر آہستگی سے گڑھے میں اتارا۔ اس پر چادر اچھی طرح ڈال کر ہاتھ پاؤں کے نیچے دبا دی اور پھر وہ تینوں مل کر اپنے ہاتھوں سے ریت کو اس گڑھے میں منتقل کرنے لگے۔

پھر رولی کو خیال آیا کہ ایک پلاسٹک کی بالٹی پجیرو میں موجود ہے۔ وہ اسے پانی وغیرہ کے لئے گاڑی میں رکھتا تھا اس نے وہ بالٹی گاڑی سے منگوالی اور پھر اس کے ذریعے ریت بھر بھر کر لاش پر ڈالنے لگا۔

تینوں نے مل کر بہت جلد اس لاش کو ریت سے ڈھک دیا۔ لاش ڈھکنے کے ساتھ اس پر اتنی ریت اونچی ہو گئی کہ وہ ایک قبر سی دکھائی دینے لگی۔

رولی کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ ماروی کی لاش اچھی طرح محفوظ ہو گئی ہے تو وہ ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

رولی کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی وہ دونوں بندے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رولی نے دور سے ریت کی قبر پر ایک نظر ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے اسٹیئرنگ کو تیزی سے گھمایا۔ پھر اس کی پجیرو اپنے بنائے ہوئے پہیوں کے نقش پر دوڑنے لگی۔ جب پجیرو اس ریت کی قبر سے بہت دور نکل گئی تو مغرب کی طرف سے ایک اونچے قد کا آدمی آتا نظر آیا۔ اس کا رخ ماروی کی قبر کی طرف تھا۔ وہ اگرچہ ایک ایک قدم کر کے چل رہا تھا، دوڑ نہیں رہا تھا، نہ تیز چل رہا تھا۔ اس کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ قبر سے اس کا فاصلہ بہت تیزی سے سمٹتا جا رہا تھا۔ بس پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے قبر کے نزدیک آ پہنچا۔

وہ کوئی آٹھ فٹ اونچا آدمی تھا۔ ایک دم کالا بھجنگ۔ سیاہ بدن چمکتا ہوا، اس نے بس ایک سفید چادر اپنے جسم سے لپیٹ رکھی تھی۔ اوپر کا بدن ننگا اور یہ چادر بھی گھٹنوں سے اوپر تھی۔ ننگے پاؤں، بڑی اور سفید آنکھیں چمکتی ہوئی کالی پتلیاں، موٹے موٹے ہونٹ، تھوڑا کھلا ہوا منہ اور ان میں سے جھانکتے ہوئے سفید دانت، گھنگھریالے سخت بال، چہرہ داڑھی مونچھ سے صاف، کندھے پر ایک موٹی زنجیر اور اس سے بندھی ہوئی گھنٹی۔ یہ گھنٹی بائیں ہاتھ کے نزدیک لٹکی تھی۔ زنجیر لوہے کی تھی جبکہ گھنٹی پیتل کی۔ جب وہ قبر کی طرف آ رہا تھا تو یہ گھنٹی ٹن ٹن بج رہی تھی۔

وہ عجیب وغریب شخص قبر کے مقابل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائیں۔ پھر زنجیر میں بندھی گھنٹی اُتاری۔ سیدھے ہاتھ میں گھنٹی کی زنجیر پکڑ کر گھنٹی کو ایک دائرے میں گھمایا۔ اور پھر بڑے زور سے جھک کر اس گھنٹی کو قبر پر مارا اور بولا۔ ”میں ہو ہورا۔“

ایک دم ریت کا بادل سا اُٹھا اور وہ شخص ریت کے بادل میں چھپ گیا۔

☆......☆......☆

ایک ہال نما کمرہ......جس کی چاروں دیواروں میں چھوٹے چھوٹے طاق بنے ہوئے تھے اور ان طاقوں میں بے شمار مجسمے کھڑے تھے۔ دیواریں سفید تھیں اور کمرے کی چھت سرخ تھی جبکہ اس کا فرش اینٹوں کا تھا اور یہ اینٹیں بھی سرخ تھیں۔

کمرے کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا کالا گدا بچھا ہوا تھا اور اس پر گلابی کپڑوں میں ایک نوزائیدہ بچی لیٹی تھی۔ وہ مشکل سے دن پندرہ دن کی ہوگی۔ وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ شاید وہ بھوک سے بلک رہی تھی۔

اس کمرے کی ہر دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ یہ چاروں دروازے سرخ رنگ کے تھے۔ ان چاروں دروازوں پر ایک سنہرے سانپ کی شکل بنی ہوئی تھی۔ یہ شکل سونے سے بنائی گئی تھی اور ان سونے میں ڈھلے سانپوں کو کیلوں سے جڑ دیا گیا تھا۔

جب بچی کی چیخیں زیادہ بلند ہونے لگیں اور وہ بھوک سے بہت بے تاب نظر آئی تو اچانک چاروں دروازے ایک ساتھ کھلے...... اور ان چاروں دروازوں سے جو چیز برآمد ہوئی اس کی وجہ سے بچی ایک دَم خاموش ہوگئی۔

وہ تیز ہوا کے جھونکے تھے۔ یہ ہوا بگولوں کی صورت کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ساحل سمندر پر چلنے والی ہوا سے بھی تیز تھی۔ اس ہوا میں ایک مہک سی رچی تھی۔ ایک خاص مہک۔

کمرے میں تیز ہوا داخل ہو جانے کی وجہ سے بچی بھی گھبرا گئی تھی۔ اس کے بدن کے کپڑے اُڑے جا رہے تھے۔ اس کے نیچے بچھے گدے کا کونا بھی بار بار ہوا کے زور سے اُٹھ رہا تھا۔ اس بچی کی آنکھوں میں تیز ہوا گھس رہی تھی۔ اس لئے وہ اپنی آنکھوں کو بار بار بند کر رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت بچی تھی، ہوا کی وجہ سے آنکھیں مچکاتی اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔

ہوا کی اچانک آمد نے اس بچی کو ایک دَم چونکا دیا تھا اس لئے وہ سہم کر خاموش ہوگئی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ دروازے کھلتے ہی ہوا جس تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی، اسی تیزی سے وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ چاروں دروازے اب بھی کھلے تھے لیکن کمرے میں ذرا سی بھی ہوا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بچی کے کپڑے بھی نہیں ہل رہے تھے۔

وہ بچی اب بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اس کی ننھی چیخیں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا اور اس کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ ہوا بھی بس چکر لگا کر چلی گئی۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

پھر تیزی سے تین دروازے دھاڑ دھاڑ کر کے بند ہوئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان دروازوں کے بھاری کواڑوں کو زور سے دھکا دے کر بند کیا ہو۔

بند ہوتے دروازوں کی دھماکے دار آوازوں کی وجہ سے وہ بچی روتے روتے ایک مرتبہ پھر چپ ہوئی۔ ہر دروازہ بند ہونے کی آواز پر وہ ڈر کر لیٹے لیٹے اُچھل سی جاتی۔ جب آوازیں آنا بند ہوگئیں تو اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

پھر چوتھے دروازے سے جو ابھی تک کھلا ہوا تھا، ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ کالے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ سانولی رنگت، گھنے بال، مسکراتی مگر چمکتی آنکھیں۔ وہ ایک ادائے بے نیازی سے کمرے میں داخل ہوئی اور تیزی سے چلتی ہوئی اس بچی کے پاس پہنچی۔ اس نے اینٹوں کے فرش پر بیٹھ کر اس بچی کو گدے سمیت اُٹھا کر اپنی گود میں لٹا لیا۔ وہ بچی بار بار منہ کھول رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں مار کر چیخ رہی تھی۔ اس کے ننھے حسین ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس عورت نے بچی کو بڑے پیار سے اپنے سینے سے لگا لیا۔

بچی بڑی بے تابی سے اور ہمک ہمک کر دودھ پینے لگی۔ وہ عورت اس بچی کے سنہرے چھوٹے چھوٹے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ بچی کا پیٹ بھرتے ہی اس کی خوبصورت آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر اس نے دودھ چھوڑ دیا اور گہری نیند سو گئی۔

وہ سوتے ہوئے اتنی حسین لگ رہی تھی کہ وہ عورت اسے پیار کئے بنا نہ رہ سکی۔ پھر اس عورت نے اسے گدے سمیت اینٹوں کے فرش پر لٹا دیا۔ اور ایک کالی چادر سے اس کا منہ ڈھک کر کھڑی ہوگئی۔

اتنے میں پیلے کپڑوں میں ملبوس ایک عورت اندر داخل ہوئی، اس نے اس بچی کو اپنی گود میں اُٹھایا اور ایک بند دروازے کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازے کے نزدیک پہنچی تو دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ عورت اس بچی کو لے کر اس دروازے سے نکل گئی۔ اس عورت کے جاتے ہی وہ دروازہ پھر کھٹاک سے بند ہو گیا۔

اب وہ پہلے والی عورت جس نے بچی کو دودھ پلایا تھا، کھلے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے چلنے کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ بڑی تمکنت سے لہرا کر چل رہی تھی۔

اس عورت نے اسے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک نفرت جاگ اُٹھی تھی۔ وہ بل کھاتا ہوا، بہت تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور پھن پھیلا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا اس کا راستہ روک لینا چاہتا ہو۔ وہ ایک کالا ناگ تھا۔

وہ عورت چلتے چلتے رک گئی اور اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا چاہتا ہے تُو کیوں بار بار میرے راستے میں آتا ہے۔ کیا تجھے اپنی زندگی عزیز نہیں۔“

اس کالے ناگ نے اپنے پھن کو دائیں بائیں گھمایا اور اپنی زبان لپلپاتے ہوئے اپنی آنکھیں اس عورت پر جما دیں۔ جیسے کہتا ہو، عشق بنا کیا جینا۔

”کچھ شرم کر شونیتا...... تُو جانتا ہے کہ تیرا اس طرح بار بار راستے میں آنا...... میری راہ روک کر کھڑے ہو جانا بے کار ہے۔ تُو جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ میں تیوح ہوں۔ ایک ایسا پتھر جس پر کسی زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ اگر تیرے دل میں مجھے ڈسنے کی حسرت ہے تو پھر آجا...... ڈس لے۔“ یہ کہہ کر وہ زمین پر اپنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

وہ کالا ناگ جسے تیوح نے شونیتا کہہ کر پکارا تھا، تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے بالکل نزدیک پہنچ کر پھر اپنا پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ اب تیوح کے ہاتھ اور اس کے پھن کے درمیان دو تین انچ کا فاصلہ تھا۔ شونیتا ذرا جھک کر اس کے ہاتھ پر بآسانی کاٹ سکتا تھا۔

اب دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے تھے۔ تیوح کی آنکھوں میں غصہ بڑھتا جا رہا تھا جبکہ شونیتا کی آنکھوں میں محبت اُبھرتی آ رہی تھی۔ وہ ایک ایسا

عاشق دکھائی دے رہا تھا جس سے اپنی محبوبہ کی بے اعتنائی برداشت نہیں ہو رہی تھی اور آج جیسے اس نے کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

''اب انتظار کس بات کا ہے...... تُو نے میرے قریب آنے کی جرأت کرلی ہے تو اب اونو کر۔'' یہ کہہ کر تیوح نے اپنا ہاتھ بالکل اس کے نزدیک کر دیا۔ شوغیتا نے کسی رند مستانہ کی طرح اس کی خوبصورت اُنگلی پر زور سے پھن مارا اور اس کی انگلی میں دو دانت گاڑ دیئے۔

بس یہ چند لمحے ہی اسے وصالِ یار کے ملے۔ جب اس نے پیچھے ہٹ کر دوبارہ اس کے ہاتھ پر ڈسنا چاہا تو وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ جھوم سا گیا۔ اس کا وار خالی گیا۔ پھر وہ چند لمحے اینٹوں کے فرش پر لوٹا اور اپنی جان گنوا بیٹھا۔

تیوح نے اسے بڑی نخوت سے دیکھا۔ وہ ایک شان بے نیازی سے اُٹھی۔ اس نے اپنی انگلی جہاں شونیتا نے دانت مارے تھے، اپنے منہ میں لے لی اور پھر وہ تمکنت سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی وہ چوتھا دروازہ بھی بند ہوگیا۔

☆......☆......☆

پیلے کپڑوں والی عورت اس بچی کو گود میں اُٹھائے، سیڑھیاں چڑھتی ایک دروازے پر پہنچی۔ پھر اس نے بچی کو ایک ہاتھ میں سنبھال کر دروازے پر زور سے دوسرا ہاتھ مارا۔

چند لمحوں بعد وہ دروازہ کھل گیا۔ پیلے کپڑوں والی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ مگر اس کمرے میں بھی چار دروازے تھے۔ اس کمرے کی دیواریں بھی سفید تھیں جبکہ چھت سرخ تھی اور زمین لال اینٹوں کی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکی پڑی تھی جس عورت نے دروازہ کھولا تھا اس نے بھی پیلے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن وہ ذرا عمر رسیدہ تھی۔

''نیی آگئی تُو...... لے آئی برہا کو۔'' عمر رسیدہ عورت نے پوچھا۔

''ہاں لے آئی ہوں ورشی...... سو رہی ہے۔'' نیی نے بتایا۔

''چوکی پر لٹا دے۔'' عمر رسیدہ عورت ورشی نے کہا۔

نیی آگے بڑھی۔ اس نے کمرے کے وسط میں پڑی چوکی پر برہا کو لٹا دیا اور پھر واپس دروازے کی طرف لوٹ گئی۔ ورشی ابھی دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ شاید وہ اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

نیی نے ورشی کے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''اچھا، چلتی ہوں...... تم اچھی طرح دروازہ بند کرلو۔''

''ٹھیک ہے۔'' ورشی نے مسکرا کر کہا اور نیی کے جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر کے وہ برہا کے پاس پہنچی۔ اس نے برہا کے چہرے سے کالی چادر ہٹائی۔ وہ معصوم بچی بڑے مزے سے سو رہی

تھی۔ سوتے ہوئے وہ اتنی پُرکشش لگ رہی تھی کہ بے اختیار ورشی نے اسے چوم لیا۔

یوں تو ورشی نے اب تک کئی بچیوں کی پرورش کی تھی اور آنے والی بچیاں ایک سے ایک ہوتی تھیں لیکن اس نے برہا جیسی بچی ابھی تک نہ دیکھی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے چہرے پر نظر ڈال کر بندہ اس کے حسن کے جال میں پھنس جاتا تھا۔ اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا۔

جب پہلی بار برہا کو اس کی گود میں ڈالا گیا تو وہ اسے مبہوت ہو کر دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ یہ پرمان کا انتخاب ہے، اس کا خاص خیال رکھا جائے۔

پرمان نے اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے برہا کا پتہ چلایا تھا۔ اس نے دیوانگ کو اس کے حصول کیلئے روانہ کیا تھا۔ چمکتے سر والے دیوانگ نے روشن رائے کو لکھی باغ کے راستے میں روک لیا تھا اور اپنی پیش گوئی کے ذریعے اسے ٹھیک ٹھاک ڈرا دیا تھا۔ ایک تو پوتی کی پیدائش، وہ بھی ایسی خطرناک پوتی کہ جو پیدا ہوتے ہی حویلی کو سنسان کر دے، حویلی میں ہر طرف سانپوں کی پھنکار سنائی دے۔ ایک سانپ تو پہلے ہی اس کے تعاقب میں تھا۔ اب اپنی اس پوتی کو حویلی میں رکھ کر وہ خود کو تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو ویسے ہی لڑکیوں سے نفرت تھی۔ لڑکی کے ساتھ اس کی ماں بھی پسندیدہ شخصیت نہ تھی۔ وہ اپنی منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا کہ قسمت نے یاوری کی۔ دیوانگ کی پیش گوئی نے اس کا سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ اس نے پوتی کے ساتھ منحوس بہو سے بھی نجات حاصل کرلی۔

اس نوزائیدہ بچی کو جس کا نام بعد میں پرمان نے برہا رکھا، اسے ایک اونٹ پر ڈال کر صحرا میں ہانک دیا گیا۔ کچھ دور تو روشن رائے کا نمک خوار جو گھوڑے پر سوار تھا اس اونٹ کے پیچھے دوڑا، جب اس نے دیکھا کہ وہ اونٹ اپنی دُم میں بندھی گھنٹی کی آواز پر ناک کی سیدھ میں دوڑا چلا جاتا ہے تو اس نے اپنا گھوڑا واپسی کیلئے موڑ لیا۔

اونٹ پر پالنا بندھا تھا اور پالنے میں کپڑوں میں لپٹی برہا لیٹی تھی۔ ابتدا میں تو وہ بلک بلک کر روئی مگر روتے روتے اسے نیند آگئی تھی۔ اونٹ صحرا میں سفر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ سورج ابھی نمودار نہیں ہوا تھا لیکن اُجالا اچھا خاصا پھیل گیا تھا۔

اونٹ نے اب دوڑنا بند کر دیا تھا۔ اس کی دُم میں بندھی گھنٹی کھل کر کہیں گر گئی تھی۔ وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک گھوڑے پر سوار ہورا نمودار ہوا۔ اس سیاہ فام وحشی نے اونٹ کی نکیل پکڑ کر اسے روکا اور پھر پالنے سے برہا کو نکالا اور گھوڑے پر بیٹھ کر ریت اُڑاتا مغرب کی جانب روانہ ہوگیا۔

ابھی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی تھی کہ ہورا کے سامنے ایک گھنا جنگل نمودار ہوا، وہ اس جنگل میں داخل ہوگیا۔ پھر وہ پُرپیچ راستوں پر گھوڑا دوڑاتا سرخ اینٹوں سے بنی ایک اونچی عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ عمارت کے بھاری دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُترا اور جھومتا ہوا

دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے برہا کو ایک ہاتھ سے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے کندھے پر لٹکی زنجیر اُتاری اور اس زنجیر کو گھما کر اس میں بندھی گھنٹی کو زور سے دروازے میں مارا اور دھاڑ کر بولا۔

''میں ہوں ہورا۔''

دروازہ ایک دَم کھل گیا۔ یہ ایک قلعہ نما عمارت تھی۔ اندر چھوٹے بڑے سرخ مکان بنے ہوئے تھے۔ ان مکانوں کے تمام دروازے سفید تھے۔

ہورا سب سے بڑے حویلی نما مکان کے سامنے رک گیا۔ اس مکان کی دیواریں سفید اور دروازے سرخ تھے۔ یہ پرمان کا محل تھا۔

''میں ہوں ہورا۔'' اس وحشی نما شخص نے دروازے پر کھڑے دربان کو دیکھ کر نعرہ لگایا۔

''جانتا ہوں...... جانتا ہوں۔'' اس دربان نے بے نیازی سے کہا۔ ''کام بتاؤ۔''

''جانتا ہے تو یہاں کھڑا کیوں ہے۔ اندر جا اور پرمان کو بتا باہر کون آیا ہے۔ ذرا جلدی کر۔ میرے پاس وقت کم ہے۔'' ہورا نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

''جاتا ہوں...... جاتا ہوں...... ذرا چھری تلے دم تو لو۔'' دربان بھی آخر پرمان کا تھا۔ وہ بھلا ہورا سے کیوں متاثر ہو جاتا۔ وہ آرام سے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

دربان کے اندر جانے کے بعد برہا کلبلائی، تب ہورا نے اس کے چہرے پر پڑا کپڑا ہٹا دیا۔ اس نے ایک اُچٹتی سی نظر برہا پر ڈالی لیکن پھر وہ اپنی نظر اس پر سے ہٹا نہیں سکا۔ پتھر دل ہورا برہا کے معصوم حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کسی پھول کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنی کالی اور موٹی انگلی سے برہا کے رخسار کو چھوا۔ برہا ایک دم چونک کر رونے لگی۔

اتنے میں دربان نے اندر سے واپس آ کر آواز لگائی۔ ''جاؤ...... ہورا۔''

ہورا جلدی سے دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیاں اُترنے لگا۔ یہ سیڑھیاں جہاں ختم ہوتی تھیں۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا تھا، جہاں تک سورج کی روشنی جا رہی تھی وہاں تک سفید مرمر کا فرش نظر آ رہا تھا۔ آگے اندھیرا تھا۔

اس نے دروازے پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ہورا کو نزدیک آتے دیکھ کر اس کالے ناگ نے اپنا پھن اُٹھایا اور واپس پلٹ کر تیزی سے اندھیرے کمرے میں چلا گیا۔

چند لمحوں بعد ہی اندر سے تیوح نمودار ہوئی۔ سانولی رنگت، کمر پر نیچے تک لہراتے بال، پُرکشش چال...... وہ دروازے پر آ کر رک گئی۔ ہورا نے گہری نظر سے تیوح کو دیکھا۔ تیوح نے ان نظروں کو محسوس کر لیا لیکن انجان بن گئی۔ اس نے ایک ادائے خاص سے اپنے ہاتھ اوپر اُٹھائے۔ وہ بولی کچھ نہیں۔

ہورا نے برہا کو اس کے ہاتھوں میں دے دیا اور بولا۔ ''کیسی ہو تیوح؟''

تیوح کو اس کی یہ بے تکلفی بری لگی۔ اس نے جل کر کہا۔ ''تیری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں کیا؟''

''نہیں تو۔'' ہورا اس کی بات نہ سمجھ سکا، بڑی معصومیت سے بولا۔

''پھر میں تجھے بھلی چنگی نظر نہیں آ رہی۔'' تیوح نے جل کر کہا۔

''ہاں، نظر آ رہی ہے، کیوں نظر نہیں آ رہی ہے۔''

''بس پھر جا تو...... اب تیرا کام ختم ہو گیا۔ پرمان کا یہی حکم ہے تیرے لئے۔'' تیوح نے اسے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں چلتا ہوں۔'' ہورا فوراً ہی واپسی کیلئے پلٹ پڑا۔

اس کے جانے کے بعد تیوح نے برہا پر نظر ڈالی اور ''ہائے'' کہہ کر اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور خودکلامی کے انداز میں بولی۔ ''واہ، پرمان...... تیرا انتخاب لاجواب ہے۔''

پھر وہ برہا کو اندر لے کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ایک کالا ناگ برآمد ہوا اور کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور اپنا پھن اُٹھا اُٹھا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا جیسے نگرانی کر رہا ہو۔

پُراسرار قوتوں کے مالک پرمان کو چند لوگوں کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اندھیروں کا باسی تھا۔ اندھیروں میں گم رہتا تھا۔ تیوح نے پرمان کے حضور برہا کو پیش کیا، وہاں سے اسے حکم ملا کہ برہا کو ورشی کے حوالے کر دو۔ وہ اس کی پرورش کرے گی اور تم اسے دودھ پلاؤ گی۔ اس حکم کے ساتھ بچی کا نام برہا رکھ دیا گیا۔

اس طرح ورشی، برہا کی کھلائی گئی اور تیوح اَنا۔

نٹنی کے جانے کے بعد ورشی نے اس کے کپڑے تبدیل کئے۔ اسے صاف ستھرا کر کے دوبارہ چوکی پر لٹا دیا۔ برہا اب ورشی کو پہچاننے لگی تھی۔ اس نے اپنی چمکتی آنکھوں سے ورشی کو دیکھا اور ہاتھ پاؤں چلانے لگی، ورشی چوکی پر بیٹھ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

اچانک شمالی دروازے پر ایک کھٹکا سا ہوا، اس نے فوراً دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک پھنکار سی دی۔ اس پھنکار کو سن کر ورشی سہم گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی دروازے کے نزدیک آئی اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بولی۔ ''ابھی نہیں، ابھی تم چلے جاؤ۔ پرمان کے حکم کا انتظار کرو۔''

دروازے پر ایک ہلکا سا کھٹکا ہوا جیسے کسی سانپ نے اپنا پھن دروازے میں مارا ہو۔ اس کے بعد پھنکارنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد سناٹا چھا گیا، ورشی خطرہ ٹل جانے کے بعد دوڑتی ہوئی برہا کے پاس آئی اور برہا سے کھیلنے لگی۔

☆......☆......☆

کمال رائے ابھی اسپتال میں ہی تھا۔ اسے سکون بخش دوائیں دی جارہی تھیں۔ اس علاج سے اسے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا لیکن اب اس نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ ڈاکٹروں نے چند دن اسپتال میں رکھ کر اسے گھر منتقل کرنے کا مشورہ دیا تا کہ وہ گھر میں رہ کر معمول کی زندگی کی طرف لوٹ جائے۔ روشن رائے اور نفیسہ بیگم اپنے بیٹے کو روشن گوٹھ لے گئے۔ ڈیفنس کے بنگلے میں اسے تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا اور نفیسہ بیگم یہاں رہنے کیلئے تیار نہ تھی۔

کمال رائے اپنے کمرے میں جیسے قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلتا ہی نہ تھا۔ نفیسہ بیگم اس کے کمرے کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس کا کھانا پینا سب کمرے میں ہی تھا۔ وہ اپنی ماں سے صرف ''سلام'' کی حد تک گفتگو کرتا تھا۔ ماں کمرے میں آجاتی تو وہ اسے سلام کر کے کمرے کا کوئی گوشہ پکڑ لیتا اور وہاں بیٹھ کر اپنی ماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ اس نے ماروی کی لاش دیکھ کر اپنی ماں سے کسی قسم کا شکوہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ماں کے ساتھ تو اس نے اتنی رعایت رکھی تھی کہ اسے سلام کر لیتا تھا اور اپنے کمرے میں برداشت کر لیتا تھا لیکن باپ کے ساتھ اس نے کسی قسم کی گفتگو بھی روا نہیں رکھی تھی۔ ابتدا میں روشن رائے ایک دو مرتبہ اس کے کمرے میں آیا تھا تو وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے سے نکل گیا تھا اور اس وقت تک واپس نہیں آیا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا کہ روشن رائے اس کے کمرے سے جاچکا ہے۔ بیٹے کا رویہ دیکھ کر روشن رائے نے خود اس کے کمرے میں آنا ترک کر دیا تھا۔

نفیسہ بیگم منت سماجت کر کے کمال رائے کو حویلی کے باغ میں لے جاتی تھی۔ وہ ماں کے پیہم اصرار پر چلا تو جاتا تھا لیکن آرام کرسی پر بیٹھا نیلگوں آسمان کو تکے جاتا تھا۔ اس دوران نفیسہ بیگم اس بات کا پورا خیال رکھتی کہ روشن رائے اس طرف نہ آنکلے۔

روشن رائے کو اپنے دھندوں سے ہی فرصت نہ تھی۔ آج کل وہ ماروی کے قتل کا انتقام لینے کیلئے سرگرداں تھا۔ ماروی کی قالین میں لپٹی ہوئی لاش اس کی اَنا کا مسئلہ بن گئی تھی۔ روشن رائے عجیب مزاج کا شخص تھا۔ یہ وہی ماروی تھی جسے اس نے بے آب وگیاہ صحرا میں چھڑوا دیا تھا تا کہ وہ بھوکی پیاسی چل بسے اور ریت کے ٹیلے اس کی قبر بن جائیں۔ اس نے جان بوجھ کر ماروی کے قتل کا باقاعدہ انتظام کیا تھا۔

وہی ماروی جب اسے قالین میں لپٹی لاش کی صورت میں ملی تو اس کا انتقامی جذبہ ایک دَم بیدار ہو گیا۔ ماروی اس کی بہو تھی اور دشمن نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اس کے قتل کا بدلہ تو اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اب وہ ہر وقت انتقام کی آگ میں جلتا رہتا تھا اور سوچتا رہتا تھا کہ راجہ سلیم سے ماروی کے

قتل کا انتقام کس طرح لیا جائے...... سوچتے سوچتے بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ راجہ سلیم کے بیٹے کو اغوا کروالیا جائے۔ اس سے پہلے وہ اسی بیٹے کی بیوی کو ڈاکوؤں سے خرید چکا تھا اور اسے قتل کروا چکا تھا۔ اب اس نے راجہ سلیم کے بیٹے نسیم کو براہِ راست اغوا کروانے کا منصوبہ بنایا۔

روشن رائے کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اس کے ہاتھ کراچی تک پھیلے ہوئے تھے۔ رولی اور ہولی اگرچہ بڑے کام کے آدمی تھے لیکن وہ محض ان پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا۔ اس نے اس مرتبہ رولی اور ہولی کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور اپنے ''اوپر'' کے بندوں سے نسیم کو اغوا کروالیا۔

یہ اغوا برائے تاوان نہ تھا بلکہ اغوا برائے انتقام تھا لہٰذا اغوا کے دو دن بعد ہی اسی قالین میں نسیم کی لاش لپٹوا کر اس کی حویلی کے بڑے دروازے پر رکھوا دی اور موبائل پر ویسا ہی زہر بھرا قہقہہ راجہ سلیم کو سنا دیا جیسا اس نے ماروی کی لاش بھیج کر سنایا تھا۔

روشن رائے کے دل میں جیسے ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ اسی خوشی میں جھومتا ہوا وہ کمال رائے کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ نفیسہ بیگم اس وقت کمرے میں موجود تھی، وہ اپنے شوہر کو بیٹے کے کمرے میں پا کر حیران رہ گئی۔ کمال رائے کی نظر جیسے ہی اپنے باپ پر پڑی وہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ گیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ روشن رائے ایک دم اس کے سامنے آگیا اور قہقہہ لگا کر بولا۔ ''بس بیٹا، ایک سنٹ...... خوشی کی خبر سنتے جاؤ۔''

کمال رائے پھر بھی نہ رکا تو روشن رائے نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور جلدی سے بولا۔ ''میں نے ماروی کا انتقام لے لیا ہے۔ میں نے قاتل کے بیٹے کو قتل کروا کر اسی قالین میں اس کی لاش بھجوا دی ہے۔ بیٹا اب تو خوش ہو نا تم۔''

اس خبر سے کمال رائے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ روشن رائے سمجھ رہا تھا کہ شاید وہ خوش ہو جائے گا اور اس سے گفتگو شروع کر دے گا۔ اس خبر کو سن کر اس نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو چھڑائے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

روشن رائے حیران و پریشان ہو کر نفیسہ بیگم کو دیکھنے لگا۔ نفیسہ بیگم نے بھی اس کے اس ''کارنامے'' کوئی توجہ نہ دی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

روشن رائے کمرے میں تنہا کھڑا رہ گیا۔

☆......☆......☆

وہی ہال نما کمرہ...... جس کی دیواروں میں بے شمار طاق بنے ہوئے تھے اور ان طاقوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے مجسمے کھڑے تھے۔ کمرے کے عین وسط میں ایک کالی چادر پر بر ہا بیٹھی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر دو چار چھوٹے بڑے سانپ اِدھر اُدھر لہرا رہے تھے لیکن ان میں کوئی نزدیک آنے کی

جرأت نہیں کر رہا تھا۔

برہا بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ جب وہ رو رو کر ہلکان ہونے لگی تو اس بڑے کمرے کے چاروں دروازے ایک دَم کھلے اور ان دروازوں سے اچانک تیز ہوا اندر داخل ہوئی۔ اس ہوا میں ایک مہک سی رچی تھی، ایک خاص مہک۔

برہا روتے روتے ایک دَم چپ ہو گئی۔ پھر ہوا ایک دَم ساکت ہو گئی۔ برہا پھر رونے لگی۔ تب اچانک تین دروازے دھاڑ دھاڑ بند ہوئے اور چوتھے دروازے سے تیورح اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کالی ٹرے تھی۔ اس ٹرے میں ایک سفید پیالہ، ایک پلیٹ سے ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ تیورح شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی برہا کے پاس پہنچی۔ ٹرے کالی چادر پر رکھی۔ برہا، تیورح کو دیکھ کر ایک دَم چپ ہو گئی اور خوشی سے اپنے ہاتھ چلانے لگی۔ برہا کی آنکھیں ٹرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح وہ اس پیالے پر ٹوٹ پڑے۔

''صبر، برہا صبر۔'' تیورح نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا اور وہ سفید پیالہ ٹرے سے اُٹھا کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ اس میں کوئی شربت جیسی چیز تھی۔ برہا نے اس شربت کو جلدی جلدی بڑی بے قراری سے پی لیا۔ اس شربت کو پیتے ہی اس پر نشہ سا چھا گیا اور وہ تیورح کی گود میں بیٹھی بیٹھی سو گئی۔

برہا کے سوتے ہی نینی کمرے میں داخل ہوئی، اس نے برہا کو تیورح کی گود سے اُٹھا لیا اور کندھے سے لگا کر ایک بند دروازے کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازے کے نزدیک پہنچی تو وہ دروازہ خود بخود کھل گیا اور نینی کمرے سے نکل گئی۔ نینی کے کمرے سے نکلتے ہی دروازہ کھٹاک سے دوبارہ بند ہو گیا۔

☆......☆......☆

آج کی رات روشن رائے پر بہت بھاری تھی۔

شام سے ہی اس کا دل اُچاٹ تھا۔ اس نے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر تاش کھیلے تھے۔ پینے پلانے کا چکر بھی چلایا تھا۔ رات کو رقص و سرور کی محفل بھی جمائی تھی لیکن دل تھا کہ کسی طور بہلتا ہی نہ تھا۔ دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ یہ نامعلوم بوجھ اسے ایک دَم اُداس کر دیتا تھا۔ قہقہہ لگاتے لگاتے اچانک اس کے دل پر مردنی سی چھا جاتی۔

ایک طرف تو اس کے دل پر اُداسی چھائی تھی۔ دوسری طرف وہ ایک اور اُلجھن کا شکار تھا۔ اچانک بیٹھے بیٹھے اسے اپنی ٹانگ پر کوئی رسی سی لپٹی اور رینگتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے فوراً سانپ کا خیال آتا۔ وہ گھبرا کر اپنی ٹانگ اُٹھا لیتا۔ اس کے دوست اس کی اس حرکت پر حیران ہو کر دیکھنے لگتے۔

''کیا ہوا؟'' کوئی پوچھتا۔

''او، کچھ نہیں سائیں...... ٹانگ پر کوئی چیز چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔'' روشن رائے جواب دیتا۔ بات آئی گئی ہو جاتی...... لیکن روشن رائے اچھی طرح جانتا تھا کہ آج کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اس کا دل ہولنے لگتا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔

آج کی رات اس پر بہت بھاری تھی۔

☆......☆......☆

بڑے ہال نما کمرے کے چاروں دروازے بیک وقت کھلے۔ ہوا کے تیز جھکڑ اندر داخل ہوئے۔ اس تیز ہوا میں ایک مہک سی رَچی ہوئی تھی...... ایک عجیب مہک۔

اس بڑے کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ ہوا کے بند ہونے کے بعد ایک دروازے سے ایک شخص بڑے شاہانہ انداز میں چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک زرق برق سنہری ریشمی چادر اپنے جسم سے لپیٹ رکھی تھی۔ سر پر ایک سنہری سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس سانپ کی آنکھوں میں ہیرے جیسی چمک تھی اور وہ اس کے سر پر کچھ اس انداز سے لپٹا ہوا تھا کہ وہ سر کا تاج معلوم ہوتا تھا۔ اس سانپ کے علاوہ ایک کالے رنگ کا سانپ اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس شخص کے پیروں میں کوئی جوتا نہ تھا، اس کے پاؤں چھوٹے اور خوبصورت تھے۔

اس شخص کے داخل ہونے کے بعد اسی دروازے سے اس کے پیچھے چلتی ایک خوبصورت عورت داخل ہوئی۔ یہ بھی اس شخص کی طرح زرق برق لباس میں تھی۔ ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی کمرے کے تین دروازے ایک کے بعد ایک بند ہو گئے۔ بس ایک دروازہ کھلا رہ گیا۔

وہ شخص بڑی شان بے نیازی سے چلتا، دیواروں میں بنے طاقوں کی طرف بڑھا۔ وہ ان طاقوں میں رکھے مجسموں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک طاق کے سامنے رک گیا۔ وہ خوبصورت عورت بھی اس کے ساتھ رک گئی۔

اس شخص نے سامنے طاق میں رکھے ایک مجسمے کو اُٹھایا۔ وہ کسی نوجوان کا مجسمہ تھا۔ پھر اس نے اس مجسمے کو دو چار قدم آگے بڑھ کر ایک طاق میں رکھ دیا۔ اس طاق میں پہلے ہی ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ موجود تھا اور پورے کمرے میں یہ واحد طاق تھی جس میں اب دو مجسمے تھے۔

''پرمان...... یہ تُو نے بہت اچھا کیا...... میں تیرے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں۔'' اس خوبصورت عورت نے خوشی کا اظہار کیا۔

لیکن پُراسرار قوتوں کے مالک، اس بستی کے راجہ پرمان نے اس عورت کی بات کو سنا اَن سنا کر دیا۔ اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ اپنے کام میں مگن رہا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک دو

مجسموں کی طاقتیں تبدیل کیں...... ابھی وہ اس کام میں مشغول تھا کہ اچانک تیوح اس کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا ہے؟'' تیوح کو دیکھ کر پرمان کے ساتھ آنے والی عورت کی پیشانی پر ایک دَم بَل پڑ گئے۔ اسے تیوح کی آمد سخت ناگوار گزری۔ اسی لئے اس نے اسے دیکھتے ہی اپنی ناگواری کا اظہار کر دیا۔

پرمان جو اس وقت ایک مجسمہ طاق سے اُٹھا رہا تھا، ایک دم رُک گیا۔ اس نے گردن گھما کر پہلے اپنے ساتھ آنے والی عورت کو دیکھا اور پھر تیوح پر نظر ڈالی۔

''رانی ملائے کا۔'' پرمان کے انداز میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔ ''تیوح کو آنے دو۔''

''آ تو گئی اور کیسے آئے گی۔'' رانی ملائے کا نے بڑی نخوت سے کہا۔

''ہاں، تیوح...... اس وقت تمہیں یہاں کیا چیز لے آئی...... تم جانتی ہو، یہ وقت فیصلے کا ہے۔''

''جانتی ہوں پرمان...... معافی کی خواستگار ہوں۔'' وہ بہت ادب سے بولی۔

''جاؤ، معاف کیا۔'' راجہ پرمان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ایک فیصلہ کروانا ہے پرمان۔'' تیوح کی ہمت بڑھی۔

''اب تیرا اتنا حوصلہ ہوگیا کہ تُو اپنی مرضی کے فیصلے کروانے کیلئے اندر آنے لگی۔'' رانی ملائے کا غصے سے بولی۔

''رانی ملائے کا۔'' پُراسرار قوتوں کے مالک پرمان نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

''خاموشی اختیار کر۔''

رانی ملائے کا کے سامنے تیوح کی حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ محض ایک راج نرتکی تھی لیکن پرمان کی تنبیہہ نے رانی کے دل میں آگ لگا دی۔ وہ چپ تو ہوگئی کہ پرمان کے سامنے مزید کچھ بولنا، اسے کسی مصیبت میں مبتلا کر سکتا تھا لیکن اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس ''ناچنے والی'' کو وہ اس توہین کا مزہ چکھا کر رہے گی۔

''ہاں، تیوح بولو......'' پرمان اس سے مخاطب ہوا۔

''پرمان...... سلاؤ نے مجھے پریشان کر رکھا ہے...... اس کے آنسو اب مجھ سے نہیں دیکھے جاتے ...... پرمان تُو اسے اجازت کیوں نہیں دے دیتا۔'' تیوح نے مسئلہ بیان کیا۔

''اجازت دینا یا نہ دینا ...... یہ پرمان کا حق ہے۔ تیوح تُو حد سے نہ بڑھ۔'' پرمان نے سرزنش کی۔

''میں معافی کی خواستگار ہوں پرمان...... میرا مطلب یہ نہ تھا۔''

رانی ملائے کا تیوح کی اس سرزنش پر بہت خوش ہوئی۔ وہ منہ موڑ کر مسکرا دی۔

''تیرا جو مطلب بھی ہوگا...... بات مختصر کر...... میرے پاس وقت کم ہے۔''

''سلاؤ کے ساتھ ایک انسان نے بہت ظلم کیا ہے۔ کافی عرصے پہلے اس نے اس کی جوڑی کو مار دیا تھا۔ سلاؤ اپنا انتقام چاہتا ہے۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو چکا ہے۔ اُسے انتقام کی اجازت دی جائے۔'' تیوح نے بڑے مؤدبانہ انداز میں اپنی بات پوری کی۔

''اچھا۔'' یہ کہہ کر پرمان تیزی سے چلتا ہوا ایک طاق کے پاس رکا۔ یہ ایک اُدھیڑ عمر شخص کا مجسمہ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں اُٹھا کر اس مجسمے کو دیکھا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''سلاؤ تجھے اجازت ہے۔ تُو جس طرح چاہے اس سے انتقام لے۔ اب تک ہم نے تجھے روکا ہوا تھا تو اس کے پیچھے مملکت کا کوئی راز تھا اور مملکت کا راز بس بادشاہ ہی جانتا ہے۔ جا اب تُو آزاد ہے۔''

پھر اس نے سلاؤ کا مجسمہ اُٹھا کر طاق پر رکھ دیا اور تیوح کی طرف رخ کر کے بولا۔ ''تیوح، اب تم خوش ہو۔''

''بہت خوش۔'' تیوح واقعی بہت خوش ہوگئی تھی۔ اس کا رواں رواں سرشار ہو اُٹھا تھا۔

''جا پھر...... سلاؤ کو خوشخبری سنا اور مجھے میرا کام کرنے دے۔''

تیوح فوراً آگے بڑھی، اس نے پرمان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگائے اور پلٹ کر دروازے کی طرف چلی گئی۔

رانی ملائے کا اسے حسد بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' پرمان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں دیکھ رہی ہوں پرمان کہ راج محل میں ناچنے والی یہ راج نرتکی، کچھ زیادہ ہی تیرے دل پر چھاتی جا رہی ہے۔'' رانی کے دل کی بات بالآخر زبان پر آ گئی۔

''رانی ملائے کا...... کیا تُو نہیں جانتی کہ وہ محض راج نرتکی ہی نہیں، کس قدر کام کی عورت ہے۔''

''ہاں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ راجہ کے کون کون سے کام کرتی ہے۔'' لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔

''رانی ملائے کا...... وہ ہماری ایک ادنیٰ ملازمہ ہے اور تم ہماری رانی ہو۔ تمہارا اور اس کا بھلا کیا مقابلہ۔'' پرمان نے اس کے دل پر مرہم رکھتے ہوئے کہا۔

''راجہ پرمان...... وہ خادمہ ہی رہے۔'' رانی ملائے کا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''بے شک وہ خادم ہی رہے گی۔'' راجہ پرمان نے بڑے یقین سے کہا۔

''وعدہ؟''

''وعدہ۔''

لیکن یہ وہ وعدہ تھا جو اکثر مرد اپنی بیویوں سے بے دھڑک کر لیا کرتے ہیں اور بیویاں بھی اچھی

طرح جانتی ہیں کہ یہ وعدہ کس طرح کیا گیا ہے۔

☆......☆......☆

آج کی رات روشن رائے پر بہت بھاری تھی۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی اور روشن رائے منہ کھولے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ آج نیند کی گولیاں کھا کر لیٹا تھا۔ اسے رات کو نیند ویسے ہی نہ آتی تھی۔ خواب آور گولیوں کا اب وہ مستقل عادی ہو گیا تھا۔ آج کی رات اس نے معمول سے زیادہ خوراک کھائی تھی۔

سلاؤ، روشن رائے کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی اس کے بیڈ کے نیچے آ کر چھپ گیا تھا۔ جب کمرے میں روشن رائے کے خراٹے گونجنے لگے تو وہ سرسراتا ہوا باہر نکلا۔ وہ ایک خوفناک سانپ تھا۔ اس کی زبان بار بار اندر باہر ہو رہی تھی۔

روشن رائے نے کافی عرصے پہلے اس کی ناگن کو جنگل میں گولی سے اُڑا دیا تھا۔ تب سے سلاؤ اپنی ناگن کی موت کا انتقام لینے کی فکر میں تھا لیکن پرمان سے اس کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ بس وہ روشن رائے کو خوفزدہ کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ وہ اتنا زہریلا سانپ تھا کہ اس کا ایک دو بوند ہی زہر روشن رائے کو جہنم رسید کر سکتا تھا لیکن سلاؤ نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کو ایک دَم ختم نہیں کرے گا۔ اس سے ایسا انتقام لے گا کہ روشن رائے جب تک جیئے گا اسے یاد رکھے گا۔

وہ بیڈ پر چڑھ کر روشن رائے کے تکیے کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے غصے میں ایک پھنکار ماری اور جلدی جلدی اس نے دو مرتبہ روشن رائے کے چہرے پر اپنا پھن مارا۔

گہری نیند کے باوجود روشن رائے تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری اور گھبرا کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

سلاؤ بہت تیزی سے بیڈ سے اُترا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل کر اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ اس نے روشن رائے کی دنیا اندھیر کر دی تھی۔

جب نفیسہ بیگم کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ بھاگم بھاگ روشن رائے کے بیڈ روم میں پہنچی اور اس نے وہاں جو منظر دیکھا اس نے اس پر غشی طاری کر دی۔

روشن رائے کی دونوں آنکھوں کی جگہ دو گڑھے بنے ہوئے تھے اور ان سے خون جاری تھا۔ کسی نے اس کی دونوں آنکھیں اُدھیڑ دی تھیں۔

اسے فوری طور پر کراچی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹروں کیلئے یہ کیس بالکل انوکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ روشن رائے کی آنکھیں کسی انسان نے نکالی ہیں یا کسی غیر انسان

نے۔ نیز فی الحال تو روشن رائے کے زخموں کا علاج کرنا تھا، سو وہ شروع ہوا۔

پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا لیکن بے سود...... روشن رائے کی آنکھوں کی روشنی واپس نہ لائی جا سکی۔ اس کی آنکھیں ہوتیں تو روشنی واپس لانے کی کوشش کی جاتی۔ وہاں تو آنکھیں ہی نہ تھیں۔ مختلف زاویوں سے ڈاکٹروں نے یہ اندازہ تو کر لیا کہ یہ کسی سانپ کی کارروائی ہے لیکن آج تک کسی سانپ کو آنکھوں پر حملہ کرتے نہ دیکھا گیا تھا اور نہ سنا گیا تھا۔

لیکن روشن رائے کو اچھی طرح یقین آ گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ کارروائی اسی سانپ کی تھی جو اسے اکثر اپنے بیڈ روم میں دکھائی دیتا تھا۔ بالآخر وہ انتقام لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اسپتال والوں نے اس کی آنکھوں کے حلقوں میں ٹانکے لگا کر اور ہاتھ میں ایک چھڑی دے کر بالآخر ایک دن اسے رخصت کر دیا۔ روشن رائے کے چہرے پر مصنوعی آنکھیں لگانے کے بارے میں سوچا گیا تھا لیکن آنکھوں کے حلقے کچھ اس طرح مجروح ہوئے تھے کہ مصنوعی آنکھیں لگانے کی گنجائش نہ تھی۔ تب مجبوراً آنکھوں کے حلقوں کو سی دیا گیا۔ سلی ہوئی آنکھوں نے اس کا چہرہ اس قدر بھیانک کر دیا تھا کہ کوئی نظر بھر کر اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ نفیسہ بیگم نے ایک تاریک چشمہ اس کی آنکھوں پر لگا دیا تا کہ اس کی بھیانک آنکھیں سیاہ شیشوں میں چھپ جائیں۔

روشن رائے کو اپنی آنکھیں چلے جانے کا بے حد افسوس تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ آدمی کے چہرے پر آنکھیں کتنی اہم ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے بغیر وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ نفیسہ بیگم اسے بیڈ روم سے نکال کر حویلی کے باغ میں لے آتی تھی تو وہ چلا آتا تھا ورنہ اپنے بیڈ پر بیٹھا اپنے روشن دنوں کو یاد کرتا رہتا تھا اور ان یادوں کے ساتھ اپنی بے بسی پر آنسو اس کے دل پر گرتے رہتے تھے۔

ایک شام وہ ایسے ہی اُداس، صوفے پر بیٹھا تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ رولی نے ٹیلی فون اُٹھا کر اس کا بٹن آن کیا تو اُدھر سے آواز آئی۔ ”ہیلو، روشن رائے صاحب ہیں؟“

”آپ کون بول رہے ہیں۔“ رولی نے ادب سے پوچھا۔

”میں ارباب خان بات کر رہا ہوں۔“ اُدھر سے بھاری آواز میں جواب ملا۔

”اچھا جی...... ایک منٹ۔“ یہ کہہ کر رولی نے روشن رائے کے ہاتھ میں ٹیلی فون تھمایا اور بولا۔

”مالک...... ارباب خان صاحب آپ سے بات کریں گے۔“

”ہیلو...... بابا ارباب کیسے ہو؟“ روشن رائے نے اپنی آواز میں جان پیدا کر کے کہا۔

”ہا...... ہا...... ہا“ جواب میں زہریلا قہقہہ سنائی دیا۔

اس قہقہے کو سن کر روشن رائے کی روح میں سناٹا اُترنے لگا۔

"بابا......کون ہو تم؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"روشن رائے...... میں ارباب خان نہیں ہوں...... میں راجہ سلیم ہوں۔ پہچانا مجھے۔"

"ہاں، بابا...... کیوں نہیں۔" روشن رائے نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"روشن رائے تم نے میرا بیٹا مارا ہے...... میری آنکھیں چھینی ہیں...... اوپر والے نے تمہاری آنکھیں چھین لیں لیکن ابھی میرا انتقام پورا نہیں ہوا۔ وہ دن اب زیادہ دور نہیں، جب کمال رائے کی لاش تمہارے قدموں میں ہوگی۔" یہ کہہ کر راجہ سلیم نے زہریلا قہقہہ لگایا اور موبائل آف کر دیا۔

"نہیں۔" روشن رائے تڑپ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

برا وقت بھی کیا چیز ہے جب کسی پر آتا ہے تو تباہی پر تباہی پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ دوسروں کو انتقام کا نشانہ بنانے والا اب خود نشانے پر آ گیا تھا۔ سلاؤ اپنا انتقام لے کر جا چکا تھا۔ اب ایک اور ناگ اس کے سامنے پھن اُٹھائے آ گیا تھا۔ راجہ سلیم کی یہ دھمکی اس کا دل چیر گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ اس نے جو کہا ہے، وہ اس پر عمل کر گزرے گا۔ کمال رائے میں اس کی جان تھی۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کمال رائے کی موت اسے زندہ قبر میں اُتارنے کے مترادف تھی۔ یہ بات اس کی اس وقت سمجھ میں نہ آئی تھی جب اس نے راجہ نعیم کی بیوی اور بعد میں خود راجہ نعیم کو قتل کروایا تھا۔ آخر وہ بھی تو کسی کا بیٹا تھا۔ بے شک اکلوتا نہ سہی۔

موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ سن ہوتا جا رہا ہو۔ جب ہاتھ کی گرفت کم ہونے لگی تو روشن رائے نے انداز سے موبائل والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

رولی، روشن رائے کی بدلی ہوئی رنگت دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً فون اپنے ہاتھ میں لے لیا اور گھبرا کر بولا۔ "مالک کیا ہوا؟...... خیر تو ہے۔"

"بابا...... خیر نہیں...... راجہ سلیم نے کمال کو مارنے کی دھمکی دی ہے۔" روشن رائے نے انتہائی افسردگی سے کہا۔

"مالک آپ پریشان نہ ہوں...... ہم چھوٹے مالک کی حفاظت کریں گے۔ ان پر جان نثار کر دیں گے۔" رولی نے بڑے خلوص سے کہا۔

"ہاں بابا...... اب تم نے ہی میرے بیٹے کی حفاظت کرنی ہے۔ اپنی جان نثار کرنی ہے۔" یہ کہتے کہتے اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور بایاں بازو بے جان ہو کر ایک طرف گر گیا۔

حویلی میں بھونچال سا آ گیا۔ یہ فالج کا حملہ تھا۔ فوری طور پر حیدر آباد کے ایک اسپتال میں روشن

رائے کو منتقل کیا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کراچی لے جانے کا مشورہ دیا۔ کراچی لے جانے کے انتظامات کیئے گئے۔ جب تک روشن رائے کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں داخل ہوا، اس وقت تک فالج کا اثر اس کے پورے جسم پر ہو چکا تھا۔

بہترین علاج کے باوجود اس کی حالت سنبھلنے میں نہ آئی۔ آنکھیں پہلے ہی چھن چکی تھیں۔ اب قوت گویائی بھی گئی۔ ہاتھ پاؤں بھی جواب دے چکے تھے لیکن قوت سماعت پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ وہ شخص جس نے لوگوں کو ہمیشہ ترچھی نظر سے دیکھا تھا، وہ شخص جس نے زندگی بھر لوگوں کو ستایا تھا۔ اسی شخص سے اس کی ترچھی نظر چھین لی گئی۔ اس کی کڑوی زبان بند کر دی گئی تھی مگر اس کی قوت سماعت کو باقی رکھا گیا تھا۔ اب وہ نہ دیکھ سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا بس سن سکتا تھا۔ اب وہ سننے کیلئے رہ گیا تھا۔ یہ کیسا عذاب تھا جس سے وہ آج کل دوچار تھا۔

اسپتال والے اس زندہ لاش کو اسپتال میں کب تک رکھتے، ایک دن اسے وہاں سے فارغ کر دیا گیا۔ روشن رائے اپنی حویلی میں آ گیا۔ اس حویلی میں جو اس کے قدموں کی دھمک سے گونجتی تھی۔ اب اسی حویلی کی دیواریں اسے حسرت سے تکتی تھیں۔ پیسے کی کمی نہ تھی، لہٰذا ایک نرس کو حویلی میں مستقل رکھ لیا گیا۔ ڈاکٹر بھی اپنی فیس بنانے کیلئے اسے دیکھے جاتے تھے اور نفیسہ بیگم کو تسلی دیئے جاتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ روشن رائے ایک ایسی گرتی دیوار ہے جسے اب کوئی سہارا گرنے سے روک نہیں سکتا۔

روشن رائے بہت سخت جان تھا یا اوپر والے نے زندگی میں ہی اس کے اعمال کا حساب کتاب شروع کر دیا تھا کہ وہ اس حالت میں بھی چھ ماہ جیا۔

پھر وہ ایک رات بغیر کسی کو کچھ بتائے، اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ صبح نرس نے جب اسے اُٹھ کر دیکھا تو وہ زندہ لاش اب سچ مچ کی لاش بن چکی تھی۔

موت کے بعد روشن رائے کی صورت اس قدر بھیانک ہو چکی تھی کہ نفیسہ بیگم بھی اس کی شکل چند لمحوں سے زیادہ نہ دیکھ سکی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر اپنا منہ پھیر لیا۔

روشن رائے کی لاش سے تعفن اُٹھنے لگا تھا۔ اسے جلد از جلد دفنا دیا گیا۔ کمال رائے نے آخری مرتبہ اسے کندھا دیا۔ اسے اپنے ہاتھوں قبر میں اُتارا لیکن آخری بار اس کی صورت نہ دیکھی، وہ فوراً ہی قبر سے باہر نکل آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے قبر اچانک تنگ ہوتی جا رہی ہو۔

زمین پر اکڑ کر چلنے والا بالآخر زمین کے اندر چلا گیا۔ نام کا روشن رائے، اندھیرا بن کر قبر کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

روشن رائے نے جو بیج بوئے تھے ان کا ثمر اُٹھانے کیلئے کمال رائے تنہا رہ گیا۔ باپ کے اعمال

اب اس کے آگے آ رہے تھے۔ راجہ سلیم اس کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔

اب تک اس پر دو حملے ہو چکے تھے لیکن وہ ان دونوں جان لیوا حملوں میں بال بال بچ گیا تھا۔ ایک حملے میں محض ایک گولی اس کے بازو کو معمولی زخمی کر کے گزر گئی تھی۔

نفیسہ بیگم پریشان تھی۔ جب پہلا حملہ ہوا تو روشن رائے حیات تھا۔ نفیسہ بیگم نے روشن رائے کو کچھ نہ بتایا۔ وہ بھلا کرتا بھی کیا......؟ اس نے کمال رائے کو تنبیہہ کی کہ وہ حویلی سے باہر نہ نکلے، یہ بات کمال رائے کو منظور نہ تھی۔ آخر وہ کب تک حویلی میں قید ہو کر بیٹھتا۔ باہر نکلنے کی صورت میں ماں کی خواہش تھی کہ وہ رولی اور ہولی کو اپنے ساتھ لے کر نکلے لیکن کمال رائے نے ان دونوں بندوں کو اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ماں سے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ماں، میں ان حرام صورتوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ ویسے بھی میں موت اور زندگی اللہ کی دین سمجھتا ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر میری موت آئی ہوئی تو دنیا کا کوئی محافظ مجھے نہ بچا سکے گا۔ ماں تم فکر نہ کرو...... میں احتیاط رکھوں گا۔''

یہ بات اس نے محض ماں کی تسلی کیلئے کہہ دی تھی۔ اس نے بھلا کیا احتیاط رکھنی تھی اسے جب بھی حویلی سے کہیں جانا ہوتا، بے دھڑک نکل جاتا۔

روشن رائے کی موت کے بعد اس پر دوسرا حملہ ہوا۔ اس حملے میں اس کا بازو معمولی زخمی ہوا۔

راجہ سلیم کو جب یہ معلوم ہوا کہ کمال رائے اس حملے میں بھی بچ نکلا ہے تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ اسے بابو کرنٹ پر سخت غصہ تھا۔ اس نے بابو کرنٹ کو قبرستان میں طلب کر لیا۔

بابو کرنٹ جب قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا اس بیری کے درخت کے نزدیک پہنچا جس کے نیچے راجہ سلیم کھڑا ہوا تھا تو اس کے تیور دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ آئندہ چند لمحوں میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ وہ یہاں سے فرار ہو جائے لیکن وہ جانتا تھا کہ راجہ سلیم کے دائیں بائیں کھڑے رائفل بردار اسے چند قدم بھی نہ بھاگنے دیں گے۔

تب اس نے فرار ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جی مالک...... آپ نے مجھے بلایا۔''

''واہ رے بابو کرنٹ...... بابا تُو کس قسم کا آدمی ہے تُو تو اڑتے تیتر گرانے کا دعویدار ہے، پر تجھ سے ایک چھ فٹ کا بندہ نہیں گرا...... بابا تجھے کیا ہو گیا ہے۔ لگتا ہے تیری ساری بیٹریاں فیل ہو گئی ہیں۔ تجھ میں اب کوئی کرنٹ باقی نہیں رہا...... بابا ہمیں پتہ نہیں تھا کہ تیرا نشانہ اتنا کھٹل ہو گیا ہے۔ ورنہ ہم تجھے اس کام پر نہ لگاتے...... بابا تُو نے ہمیں بڑا مایوس کیا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

فوراً ہی نزدیک کھڑے ایک بندے نے اس کے ہاتھ میں ریوالور تھما دیا۔ راجہ سلیم نے وقت

ضائع کئے بغیر بابو کرنٹ کے دل کا نشانہ لیا اور ایک فائر کر دیا۔

''بابا...... کسی بندے کو مارنے کیلئے...... ایک گولی کافی ہوتی ہے...... تُو نے درجنوں گولیاں ضائع کر دیں۔ پھر بھی کمال رائے کو نہ مار سکا۔'' اس نے بابو کرنٹ کی لاش کو ٹھوکر لگائی اور پھر بولا۔ ''بابا اسے زمین میں گاڑ دو۔''

یہ کہہ کر وہ سامنے کھڑی اپنی جیپ کی طرف بڑھا اور جیپ فوراً ہی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

اس بڑے ہال نما کمرے میں جس کی طاقوں میں مجسمے سجے تھے۔ تیوح ایک چمڑے کی گدی پر بیٹھی تھی۔ کمرے کے تین دروازے بند تھے، ایک کھلا ہوا تھا۔ اس کمرے میں برہا اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھر رہی تھی۔ کمرے کے فرش پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے سانپ گھوم رہے تھے۔ برہا ان سانپوں سے کھیل رہی تھی۔ ایک چھوٹا سانپ اس نے اپنے گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ وہ پورے کمرے میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ تیوح ایک طرف بیٹھی اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

برہا دوڑتے دوڑتے ایک جگہ رکی۔ ایک سانپ بڑی تیزی سے زمین پر دوڑ رہا تھا۔ اس نے اسے دُم سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور پھر رسی کی طرح گھما کر دور پھینک دیا۔ وہ سانپ پٹ سے اینٹوں کے فرش پر گرا، اس کے چوٹ لگی اسے برہا کی یہ حرکت اچھی نہ لگی۔ وہ اپنا منہ کھول کر برہا کی طرف بڑھا۔ برہا نے اب دوسرا سانپ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ایک سانپ منہ کھولے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ ایک خطرناک صورتحال تھی۔ وہ سانپ اسے کاٹ بھی سکتا تھا لیکن وہاں تیوح موجود تھی اور وہ اسی لئے یہاں موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سانپ غصے میں برہا کو نقصان پہنچاتا، تیوح نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ''ہوش میں نہیں ہے کیا تُو...... میرے ہاتھوں کیوں اپنے دانت تڑوانا چاہتا ہے۔ تُو جانتا نہیں ہے کہ برہا کون ہے۔ نہیں جانتا تو اب جان لے، یہ پرمان کا انتخاب ہے۔ اس کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو وہ تیری سات نسلوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اگر تیرے دانت نئے نئے آئے ہیں تو میری طرف آ جا...... اپنے دانت مجھ پر آزما۔ برہا پر کیا غصہ اُتارنا چاہتا ہے۔ وہ کھیل رہی ہے اور تُو بھی ایک کھلونا ہے۔ بس ایک کھلونا ہی رہ۔''

تیوح کی ڈانٹ سن کر اس سانپ کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ فوراً ہی کنڈلی مار کر اور سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ برہا اس بات سے بے خبر ان چھوٹے بڑے سانپوں سے کھیلتی رہی، بھاگتی دوڑتی رہی۔

پھر ان تین دروازوں میں سے ایک دروازہ کھلا اور نینی اندر داخل ہوئی۔ اس نے برہا کی انگلی پکڑی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اسی دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد دروازہ

خود بخود بند ہو گیا۔

برہا کے جانے کے بعد تیوح اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اس نے اپنے کھلے بالوں کا جُوڑا سا بنایا اور بڑی تمکنت سے چلتی ہوئی ایک طاق کے سامنے رک گئی۔ اس طاق میں ایک قد آور مرد کا مجسمہ رکھا تھا۔

یہ مجسمہ ہورا کا تھا۔ تیوح اسے غور سے دیکھنے لگی اور پھر بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دھیرے سے بولی۔ ''وحشی۔''

☆......☆......☆

نفیسہ بیگم نے اپنے شوہر کی موت پر رسماً بھی آنسو نہیں بہائے تھے۔ وہ رونے بیٹھتی تو روشن رائے کا کوئی نہ کوئی ظلم اس کے سامنے آ جاتا۔ اس کی کوئی سفاکی اس کا دل چیر جاتی۔ اس نے کمال رائے کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ ایک نا قابلِ معافی جرم تھا۔

آنکھیں چلی جانے کے بعد روشن رائے نے ماروی اور اس کی بچی کے بارے میں ایک ایک بات سچ بتا دی تھی لیکن اسے اپنی اس حرکت پر کوئی شرمندگی نہ تھی، یہ سب اس نے اپنی حویلی بچانے کیلئے کیا تھا...... ظلم کی یہ داستان سن کر نفیسہ بیگم کے دل میں نفرت اور گہری ہو گئی تھی۔

اس نے یہ راز کی باتیں کمال رائے کے گوش گزار کر دی تھیں۔ یہ سب سن کر کمال رائے کے دل میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی جا کر اس سفاک شخص کے ٹکڑے کر دے لیکن وہ باپ تھا، کمال رائے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے باپ جیسا نہیں بننا چاہتا تھا۔ ویسے بھی مکافاتِ عمل شروع ہو چکا تھا۔ قدرت نے حساب کتاب شروع کر دیا تھا۔ اس کی دنیا اندھیر کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد روشن رائے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ عبرت پکڑنے کیلئے کافی تھا۔ اب کمال رائے کو اپنا اعمال نامہ خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قدرت خود ہی اس کی سفاکیوں کا انتقام لینے پر اُتر آئی تھی۔

باپ کی موت کے بعد اس نے حویلی کے تمام ملازمین کی چھان بین کی۔ اسے پندرہ بیس ملازمین ایسے نظر آئے جو کسی نہ کسی طرح جرائم میں ملوث تھے۔ ان میں سرفہرست رولی اور ہولی کا نام تھا۔

اپنی تحقیق مکمل کرنے کے بعد ایک دن کمال رائے نے اس موضوع پر اپنی ماں سے بات کی۔

''ماں، میں اس حویلی کو جرائم پیشہ لوگوں سے پاک کرنا چاہتا ہوں۔''

''حویلی میں جرائم پیشہ لوگ؟ میں سمجھی نہیں۔'' نفیسہ بیگم نے سوال کیا۔

''ماں، اس حویلی میں پندرہ بیس ایسے ملازمین ہیں جو کسی نہ کسی طرح بابا کے شریکِ جرم رہے ہیں۔''

''بیٹا...... تم جیسا چاہے کرو۔ بس اتنا یاد رکھنا...... کسی پر ظلم نہ ہو۔'' نفیسہ بیگم نے ہدایت کی۔

''ماں، میں اسی لئے ان لوگوں کو یہاں سے نکال دینا چاہتا ہوں تا کہ اب کسی پر ظلم نہ ہو۔ یہ لوگ

یہاں رہیں گے تو انسانوں کو تکلیف پہنچانے اور میری خوشامد کے علاوہ کچھ نہیں کریں گے۔'' کمال رائے نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو...... میری طرف سے پوری اجازت ہے جو چاہو کرو۔'' نفیسہ بیگم نے اسے کھلی چھٹی دے دی۔

ماں سے اجازت ملنے کے بعد اگر کمال رائے چاہتا تو ان مشکوک ملازمین کو کھڑے کھڑے کان پکڑ کر نکال دیتا لیکن اس نے ظالموں پر بھی ظلم کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے مطلوبہ ملازمین کو اتنا کچھ دے دیا کہ وہ سال بھر تک آرام سے گھر میں بیٹھ کر کھا سکیں۔

حویلی سے رخصت کرتے ہوئے اس نے ان ملازمین سے بس اتنا کہا۔ ''آئندہ میں اس علاقے میں تمہاری شکلیں نہ دیکھوں۔ اگر ایسا ہوا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

رولی اور ہولی جو سب سے آگے کھڑے تھے، انہوں نے کچھ کہنا چاہا تو کمال رائے نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روک دیا۔ ''بس اب میں کچھ نہیں سننا چاہتا...... تم لوگ جاؤ۔''

اس طرح کمال رائے نے حویلی سے برے لوگوں کو نکال باہر کیا۔ وہ سارے لوگ اندھیروں میں کہیں گم ہو گئے۔ انہوں نے روشن گوٹھ کو واقعی چھوڑ دیا۔ کمال رائے کو وہ پھر کبھی اس کے علاقے میں نظر نہیں آئے۔

حویلی میں یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔ ان ملازموں کے جانے کے بعد حویلی میں ان کے جرائم کی داستانیں سنائی دیتی رہیں جو لوگ خوف کی وجہ سے اب تک خاموش تھے انہوں نے نئی نئی کہانیاں سنائیں۔ بہر حال روشن گوٹھ کے لوگ اب بہت خوش تھے۔

کمال رائے نے اپنی جاگیر کا انتظام بخیر و خوبی سنبھال لیا تھا۔ اس کام میں اس کے ماموؤں نے بھی مدد کی تھی۔

نفیسہ بیگم اپنے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ وہ کمال رائے کو ایک لاابالی سا لڑکا سمجھتی تھی اور وہ تھا بھی لاپرواہ لڑکا...... لیکن ماروی کی موت کے بعد اس کی یکسر کایا پلٹ گئی تھی۔ وہ انتہائی گمبھیر ہو گیا تھا۔

اب اسے جو بھی دیکھتا پہچانتا نہ تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جسے گلوکاری کا شوق تھا اور جس کی زندگی میں [illegible]وں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہلا گلا کرنے والا لڑکا اب اچانک ایک متین وڈیرہ بن گیا تھا۔

نفیسہ بیگم کو اب کمال رائے کی شادی کی فکر تھی۔

آس پاس لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ خود اس کے بھائیوں کی لڑکیاں تھوک کے حساب سے موجود تھیں۔ خوبصورت اور بدصورت لڑکیاں، پڑھی لکھی اور اَن پڑھ لڑکیاں، نفیس اور دبنگ لڑکیاں، بول بول کر کان کھا جانے والی اور خاموش رہ کر اُکتا دینے والی لڑکیاں، میک اَپ کی شوقین اور میک اَپ سے

بے نیاز لڑکیاں ہر سائز، ہر مزاج اور ہر طرح کی لڑکیاں موجود تھیں۔ بس نفیسہ بیگم کے اشارے کی دیر تھی کوئی بھی لڑکی اس کی بہو بن سکتی تھی لیکن وہ اشارہ کیسے کرتی، اشارہ تو اوپر سے ہونا تھا۔ کمال رائے نے کرنا تھا اور کمال رائے کو خاندان کی لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے ویسے بھی لڑکیوں سے دلچسپی نہ تھی۔

نفیسہ بیگم کے اشارے پر ماموؤں کی لڑکیوں نے حویلی میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ لڑکیاں تو خیر پہلے بھی آتی تھیں اور اپنی پھوپھی سے مل کر چلی جاتی تھیں، اب انہوں نے خصوصی توجہ کے ساتھ آنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ نفیسہ سے مل کر واپس نہیں جاتی تھیں بلکہ کمال رائے کے کمرے کا چکر بھی مارتی تھیں۔

کمال رائے کو اس کے ماموؤں نے خصوصی طور پر گھر کی تقریبات میں بلانا شروع کر دیا تھا۔ تقریبات تو پہلے بھی ہوتی تھیں لیکن کمال رائے شاذ ہی ان تقریبات میں شریک ہوتا تھا۔ بس ان تقریبات کو نفیسہ بیگم ہی بھگتاتی تھی۔ اب ہر تقریب میں کمال رائے کی شرکت ضروری قرار دے دی گئی تھی، جس کے گھر تقریب ہوتی وہ تو اصرار کرتا ہے، ادھر سے نفیسہ بیگم بھی دباؤ ڈالتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اسے جاتے ہی بنتی۔

ان ڈھیر ساری لڑکیوں میں ایک لڑکی ان سب میں نمایاں تھی۔ وہ سب سے بڑے ماموں کی بیٹی تھی۔ اس کا نام مائرہ تھا۔ اچھی خوبصورت لڑکی تھی۔ میٹرک پاس تھی۔ اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ تھا۔ دبلی پتلی اور نفیس مزاج تھی۔ یہ ماموں ارشاد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ نفیسہ بیگم کی اس پر نظریں تھیں لیکن کمال رائے اپنی ماں کے انتخاب سے بے خبر تھا۔

اس کو اپنے غموں سے ہی فرصت نہ تھی کہ وہ کسی کو نظر اُٹھا کر دیکھتا۔ ماروی اس کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ماروی کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ وہ اسے اب بھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ اس کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی۔ یہ زخم اب شاید عمر بھر بھرنے والا نہ تھا۔ ماروی کے ساتھ اسے اپنی بیٹی بھی یاد آتی تھی۔ ماروی کی موت کی تو تصدیق ہوگئی تھی لیکن اپنی بیٹی کے بارے میں وہ پُراُمید تھا، جانے اسے یہ اُمید کیوں تھی کہ ایک دن وہ اس سے ضرور آملے گی۔

کمال رائے نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اس نے کراچی جانا بھی ترک کر دیا تھا۔ گلوکاری بھی اب ماضی کی بات ہوگئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو اب اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا اور نہ نفیسہ بیگم ہی اس کے بغیر رہ سکتی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ کراچی سے اس کے دوست اس کے پاس آتے رہتے تھے، وہی اپنے ساتھ کبھی کسی گلوکار اور کبھی کسی گلوکارہ کو لے آتے تو حویلی میں رونق آجاتی۔ حویلی کے سبزہ زار پر محفل موسیقی جمتی اور اس گلوکار یا گلوکارہ کو رات بھر سنا جاتا۔ ان محفلوں میں وہ خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو

ہرگز مدعو نہ کرتا۔ بس اس کے چند دوست ہوتے اور وہ ہوتا...... اس طرح پوری توجہ سے اس آرٹسٹ کو سنا جاتا۔

کبھی کبھی منعقد ہونے والی اس محفل موسیقی کے علاوہ اسے مچھلی کے شکار سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ تنہائی پسند تھا۔ شاید اسی لئے اس نے مچھلی کے شکار کو اپنایا تھا۔ دریا میں ڈور ڈالے وہ اپنی تصور کی دنیا میں گم ہو جاتا تھا۔ مچھلی پھنسے یا نہ پھنسے اسے اس کی پروا نہ تھی۔

پھر ایک دن، ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

مائرہ کی بڑی بہن سعدیہ کی مہندی کی تقریب تھی۔ ایسی تقریب میں لڑکیوں کا اکٹھا ہونا یقینی تھا اور ساتھ ہی بن سنور کر آنا بھی ضروری تھا۔ نفیسہ بیگم کمال رائے کو اپنے ساتھ باندھ کر لے گئی۔ کمال رائے ماں کے کہنے پر چلا تو گیا..... مگر ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔

مہندی کی رسم کے بعد جب لڑکیوں نے ایک دوسرے کو اُبٹن لگانا شروع کیا تو اس کھیل میں لڑکے بھی شامل ہوگئے۔ اتنے میں کسی لڑکی نے شوشہ چھوڑا۔ ''کمال بھائی کے کوئی اُبٹن لگائے تو جانیں۔''

مائرہ کو جانے کیا سوجھی اس نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور ہاتھ میں اُبٹن لے کر ایک طرف بیٹھے کمال رائے کی طرف بڑھی۔ کمال رائے نے جب مائرہ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے فوراً اس کے عزائم کا اندازہ کر لیا۔ اس نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو، مائرہ مجھے اُبٹن نہ لگانا۔''

مائرہ لڑکیوں کا چیلنج قبول کر کے آئی تھی۔ وہ کمال رائے کی درخواست پر بھلا کیسے واپس ہو جاتی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کمال رائے کے چہرے پر اُبٹن ملنا چاہا...... کمال رائے نے فوراً اس کی کلائی تھام لی۔ مائرہ نے اپنی کلائی چھڑانی چاہی تو کٹ کٹ کر کے اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک دو چوڑیاں ٹوٹ کر مائرہ کی نازک کلائی میں گھس گئیں۔ کمال رائے کے ہاتھ میں بھی چوڑیاں چبھیں، مائرہ کی کلائی پر گہرا زخم لگا۔ بھل بھل کر کے خون بہنے لگا۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ کمال رائے شرمندہ تھا جبکہ مائرہ کے چہرے پر زخمی ہونے کے باوجود سرشاری تھی۔

''میں نے منع کیا تھا نا۔'' کمال رائے نے اسے دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔ ''چوٹ لگ گئی نا۔''

مائرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک لمحہ گہری نظر سے اسے دیکھا اور پلٹ کر لڑکیوں میں گم ہوگئی۔

تب لڑکیوں نے ایک دم شور مچایا۔ ''مائرہ ہار گئی...... مائرہ ہار گئی۔''

کمال کے کان کھڑے ہوئے۔ مائرہ ہار گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ ان لڑکیوں نے آپس میں کوئی شرط لگائی تھی۔ اسے بڑا دکھ ہوا۔ اگر وہ ذرا سا اُبٹن لگوا لیتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ اس نے مائرہ پر خواہ

مخواہ ظلم کیا۔اس نے کسی پر ظلم کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔

وہ فوراً اُٹھا۔اس نے مائرہ کو تلاش کیا۔وہ ابھی تک اپنی کلائی پکڑے کھڑی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی کلائی پر باندھا، پھر مسکرا کر بولا۔"مائرہ ہار نہیں سکتی۔لاؤ لگاؤ اُبٹن۔"

یہ سن کر مائرہ کھل اُٹھی۔اس نے فوراً کمال رائے کے چہرے پر تھوڑا سا اُبٹن مَل دیا۔

لڑکیوں نے پھر شور مچایا۔"مائرہ جیت گئی...... مائرہ جیت گئی۔"

کمال رائے کی فطرت میں کیونکہ کسی کو دُکھ دینا شامل نہ تھا،اسی لئے یہ سوچ کر کہ اس نے مائرہ کا دل دکھایا ہے اس پر ظلم کیا ہے،اس سے اُبٹن لگوالیا تھا......لیکن مائرہ نے اس واقعہ کو کسی اور طرح لیا اور اس کی سہیلیوں نے اس مسئلے کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

کمال رائے اب مائرہ کے خوابوں میں بس گیا،اس کے خوابوں کا شہزادہ ہو گیا۔

نفیسہ بیگم کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی کہ چلو اس کے بیٹے نے کسی میں دلچسپی کا اظہار تو کیا۔وہ مائرہ کو اپنی بہو بنانے کا خواب دیکھنے لگی۔ویسے مائرہ خاندان کی سب لڑکیوں سے اچھی لڑکی تھی۔اگر نفیسہ بیگم اسے اپنی بہو بنانے کا خواب دیکھ رہی تھی تو کوئی برا نہیں کر رہی تھی۔

برا تو راجہ سلیم کر رہا تھا۔

دو حملوں کے باوجود وہ کمال رائے کو ٹھکانے نہیں لگا سکا تھا۔اپنی ناکامی کا بدلہ اس نے باپو کرنٹ کو مار کر لے لیا تھا لیکن انتقام کی آگ ابھی تک نہیں بجھی تھی۔

وہ کمال رائے کی موت کا خواہاں تھا اور اس کام کو اب اس نے خود کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس نے کمال رائے کے اردگرد اپنے لوگ پھیلائے ہوئے تھے جو اس کی سرگرمی کی پل پل کی اطلاع پہنچا رہے تھے۔آج اسے معلوم ہوا تھا کہ کمال رائے اپنے بڑے ماموں ارشاد کے گوٹھ آیا ہوا ہے۔اس گوٹھ کا راستہ کنگن پور کے قریب سے ہی گزرتا تھا۔

مہندی کی رسم کے بعد کمال رائے نے اپنی ماں کو حویلی واپس چلنے کا اشارہ کیا تو ماموں ارشاد کی ساری لڑکیاں پیچھے پڑ گئیں۔انہوں نے نفیسہ سے رات کو رکنے پر اصرار کیا۔رات کو گیت گائے جانے تھے۔جب ماموں ممانی نے نفیسہ کے ساتھ کمال کو بھی روکنا چاہا تو کمال رائے نے یہی غنیمت سمجھا کہ ماں کو چھوڑ دے اور خود یہاں سے نکل جائے۔

نفیسہ بیگم اگرچہ رکنا نہیں چاہتی تھی لیکن سب کے اصرار کے آگے وہ بے بس ہو گئی۔طے یہ ہوا کہ کل صبح کو ماموں خود نفیسہ بیگم کو روشن گوٹھ چھوڑ کر آئیں گے۔یہ طے ہونے کے بعد کمال رائے جیپ میں بیٹھ کر روشن گوٹھ چل دیا۔اس کے ساتھ دو ملازم تھے۔جو جیپ میں پیچھے بیٹھے تھے۔گاڑی وہ خود

چلا رہا تھا۔وہ دونوں ملازم اسلحہ سے لیس تھے۔کمال رائے نے تو کبھی محافظوں کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔اسے اپنے اللہ پر مکمل یقین تھا لیکن اپنی ماں کی تسلی کیلئے وہ ایک دو اسلحہ بردار بندوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتا تھا۔

وہ نیم پختہ سڑک پر اپنی جیپ کو دوڑائے چلا جا رہا تھا۔اس بات سے بے خبر کہ دشمن آگے اس کی گھات میں بیٹھا ہے۔

راجہ سلیم نے کمال رائے پر حملے کی بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بندی کی تھی۔اس نے اپنے کئی بندے آموں کے درخت پر بٹھا دیئے تھے جہاں سے سڑک صاف نظر آتی تھی۔راجہ سلیم خود باغ کے اندر جیپ میں بیٹھا تھا۔درختوں کی وجہ سے باغ میں اندھیرا تھا۔سڑک سے آنے والا اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اندر سے اسے نشانے پر لئے ہوئے ہے۔راجہ سلیم کی رائفل پر دوربین لگی تھی اور اس نے سختی سے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس سے پہلے گولی نہ چلائیں۔سب سے پہلے وہ خود گولی چلائے گا۔وہ ماہر شکاری تھا،اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔وہ کافی دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ایک موٹر سائیکل سوار یہاں سے دو کلومیٹر دور سڑک کے کنارے کھڑا تھا جو کمال رائے کے گزرتے ہی شارٹ ٹ کے ذریعے انہیں اطلاع کرے گا کہ کمال رائے اس طرف آ رہا ہے۔اطلاع ملتے ہی وہ سارے کے سارے مستعد ہو جائیں گے۔

راجہ سلیم بڑی بے چینی سے موٹر سائیکل سوار کے آنے کا منتظر تھا۔آج اسے پختہ یقین تھا کہ کمال رائے اس کے ہاتھوں بچ کر نہیں نکل سکے گا۔اس نے بڑی شاندار منصوبہ بندی کی تھی۔

دو بندے درخت پر اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے جبکہ ایک بندہ اس کے پیچھے تھا اور وہ خود جیپ میں اس طرح بیٹھا تھا کہ موٹر سائیکل سوار کا سگنل ملتے ہی رائفل کھلی جیپ کے شیشے پر رکھے اور دنادن فائرنگ شروع کر دے اس کے ساتھ ہی گھات لگائے بندے بھی فائرنگ میں شریک ہو جائیں۔اس گولیوں کی اس قدر بوچھاڑ کر دی جائے کہ زندہ بچ نکلنے کا ذرہ بھر بھی احتمال نہ رہے۔

راجہ سلیم اپنی منصوبہ بندی پر خوش اور مطمئن تھا اور سب کا راہ، کائنات کا مالک، کائنات کا خالق اپنی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔

اچانک دور سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔درختوں پر بیٹھے حملہ آوروں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔راجہ سلیم بھی مستعد ہو گیا۔یہ کوئی اور موٹر سائیکل والا بھی ہو سکتا تھا لیکن حملے کیلئے تیار رہنا ضروری تھا کیونکہ موٹر سائیکل سوار کے باغ میں آنے کے بعد کمال رائے کی گاڑی نمودار ہونے میں زیادہ وقت نہ لگتا۔

موٹر سائیکل سوار کے سامنے آنے سے پہلے ہی ایک بھاری آم ڈال پر سے ٹوٹ کر پیچھے بیٹھے بندے کی رائفل کی نال پر گرا۔ نال نیچے جھکی لبلبی پر انگلی اچانک دبی۔ گولی چلی اور سیدھی راجہ سلیم کی کھوپڑی میں لگی جو جیپ میں کمال رائے کیلئے موت کا فرشتہ بنا بیٹھا تھا۔

دوسرے کیلئے بنا موت کا فرشتہ خود ہی اجل کا شکار ہو گیا۔ ایک گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

بابو کرنٹ کو مارتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''بابا، کسی بندے کو مارنے کے لئے ایک گولی کافی ہوتی ہے۔''

اس کا کہا سچ ثابت ہو گیا تھا۔ واقعی ایک گولی بندے کی جان لینے کیلئے کافی ہوتی ہے۔

اور جب اوپر والے کو کسی کو بچانا ہوتا ہے تو اسے کوئی نہیں مار سکتا تھا۔

کمال رائے کو اس وقت کچھ پتہ نہ چلا کہ سڑک کے نزدیک باغ میں اس کیلئے کیا جال بچھایا گیا تھا اور اس جال میں خود جال بچھانے والا ہی پھنس گیا تھا۔

وہ پورے اطمینان سے باغ کے نزدیک سے گزر کر روشن گوٹھ پہنچ گیا۔

اسے اگلے دن راجہ سلیم کی موت کا پتہ چلا۔ گولی چلانے والا مفرور تھا اور یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ راجہ سلیم کے نمک خوار نے اس پر گولی کیوں چلائی۔

اس کی موت معمہ بن کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

پرمان اپنی زرنگار کرسی پر براجمان تھا۔

یہ بھی چاروں دروازہ والا بڑا کمرہ تھا۔ جس میں دیوار سے دیوار تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں اونچا اسٹیج تھا۔ اس اسٹیج پر سیڑھیوں تک قالین بچھا ہوا تھا۔

اسٹیج پر ایک طرف دو سازندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بین تھی اور دوسرے کے گلے میں ڈھول۔

بین کی آواز اور ڈھول کی تھاپ پر تیوح رقصاں تھی۔ اسٹیج کے بالکل سامنے ایک اونچی زرنگار کرسی پر پرمان بیٹھا تھا۔ کمرے کے چاروں دروازے بند تھے۔

تیوح اسٹیج پر بجلی کی طرح کڑک رہی تھی۔ اس کا سانولا حسین بدن تھرک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک تھی۔ اس کے بدن کی جنبش اس قدر تیز تھی کہ اس پر نظر جمانا مشکل ہو رہا تھا۔

یہ رقص کوئی ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ رقص کے اختتام پر تیوح اسٹیج سے اتری اور پرمان کے سامنے جھک گئی۔

''تیوح تیرا کوئی جواب نہیں۔'' پرمان نے خوش ہو کر کہا۔ ''جب تُو رقصاں ہوتی ہے تو ہمارے

اندر کی دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ بول کی مانگتی ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہئے پرمان۔ تیرے یہ میٹھے بول ہی میرے لئے کافی ہیں۔'' وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

اچانک کمرے کا ایک دروازہ کھلا اور نینی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔

پرمان اور تیوح دونوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''اسے کیا ہوا؟'' پرمان کے لہجے میں خفگی تھی۔

''پوچھتی ہوں۔'' تیوح جلدی سے ایک کالی چادر اپنے جسم پر ڈالتے ہوئے نینی کی طرف بڑھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے نینی کو درمیان میں روک لیا۔

''رنتارو نے ورشی کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ باہر کھڑی ہے۔ پرمان سے ملنا چاہتی ہے۔'' نینی نے مسئلہ بتایا۔

''اچھا...... تم یہیں ٹھہرو...... میں پرمان سے اجازت لیتی ہوں۔'' تیوح نے کہا اور پھر پلٹ کر پرمان کی طرف بڑھی۔

''پرمان...... ورشی آئی ہے...... اس کو فوراً بلا لے معاملہ سنگین ہے۔'' تیوح نے سفارش کی۔

''اچھا...... بلاؤ۔'' پرمان نے اجازت دے دی۔

چند لمحوں کے بعد ورشی پرمان کے سامنے تھی۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی لیکن بولنے کی منتظر۔

''ہاں، بولو...... کیا مسئلہ ہے۔'' پرمان نے پوچھا۔

''پرمان...... اب مجھ سے برہا کی حفاظت نہیں ہو پا رہی۔'' ورشی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''کیا......؟ کیا وہ سرکشی پر اُتر آئی ہے۔'' پرمان نے پوچھا۔

''وہ بے چاری کیا سرکشی پر اُترے گی...... سرکشی پر وہ اُترا ہوا ہے۔'' ورشی نے ہمت کر کے کہا۔

''رنتارو کی بات کرتی ہے۔'' پرمان نے بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔

''ہاں، پرمان تُو نے ٹھیک جانا۔'' ورشی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''غلطی ہماری ہے کہ ہم نے برہا کو قبل از وقت اس کے نام سے منسوب کر دیا اور دوسری غلطی یہ کی کہ اسے بتا بھی دیا کہ برہا تیری ہے۔ رنتارو ہمارا بیٹا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہماری بستی کی روایات سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ ورشی تُو فکر نہ کر، ہم کل ہی برہا کا کوئی انتظام کریں گے۔ ویسے بھی وہ اب پانچ سال کی ہو گئی ہے۔ اس بستی میں رہنا اس کا اب دُشوار ہے۔'' پرمان نے کہا۔

پر مان کے بول ورشی کو سکون میں ڈبو گئے۔ وہ سرشار ہو کر بولی۔ ''پر مان تُو بڑا انصاف والا ہے۔''
پھر وہ اس کے سامنے آدھے قد تک جھکی اور واپس دروازے کی طرف چلی گئی۔

☆......☆......☆

سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی پُراسرار قوتوں والے پر مان نے ہورا کو طلب کر لیا۔ یہ مجسموں والا کمرہ تھا۔ اس وقت پر مان سرخ اینٹوں کے فرش پر سیاہ چمکتی کھال پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔
ایک دروازہ کھلتے ہی لحیم شحیم ہورا نمودار ہوا، وہ جھومتا ہوا پر مان کی طرف بڑھا۔ پر مان اسے بڑی دلچسپی سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہورا نزدیک آ کر تھوڑا تعظیماً جھکا اور سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔ ''پر مان، حکم کر۔''

''ہورا...... تو کیسا ہے۔'' پر مان نے حکم دینے کے بجائے اس کی مزاج پرسی کی۔

''میں ٹھیک ہوں...... تُو اس بستی کا مالک ہے۔ میں تیرا غلام ہوں۔''

''تجھے میں ایک اہم کام سونپ رہا ہوں۔ تیری ذرا بھی کوتاہی تجھے مشکل میں ڈال سکتی ہے۔'' پر مان نے بات شروع کی۔

''پر مان...... میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی تُو مطمئن رہ۔'' اس نے اطمینان دلایا۔

''جانتا ہوں، اسی لئے یہ کام تجھے سونپ رہا ہوں۔'' پر مان نے کہا۔

''حکم کر...... مجھے کیا کرنا ہے۔'' ہورا نے پوچھا۔

اس بستی سے برہا کو لے کر جانا ہے...... رنسارو بغاوت پر آمادہ ہے۔ وہ کہیں برہا کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اس سے صبر نہیں ہو رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ برہا اس کی ہے لیکن اسے ابھی اس کے حوالے کرنے کا وقت نہیں آیا۔ تجھے برہا کو اس بستی سے دور لے جانا ہے۔ ویسے بھی اسے یہاں سے نکالنا ہی تھا۔ اس بستی کی آب و ہوا اسے راس نہیں۔ اس کا حسن ماند پڑنے لگا ہے۔ تُو اسے یہاں سے لے جا اور دیوانگ کے حوالے کر آ۔ بس تیرا کام اتنا ہی ہے۔'' پر مان نے حکم صادر کیا۔

اتنے میں دوسرا دروازہ کھلا اور تیوح، برہا کا ہاتھ پکڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ سنہری تاروں سے بنا ایک عجیب و غریب لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا معصوم حسن دیکھنے والا تھا۔

برہا اپنا ہاتھ چھڑا کر روتی ہوئی پر مان کی طرف بڑھی اور پھر بے تکلفی سے اس کے گھٹنے پر بیٹھ گئی۔ پر مان کے سر پر تاج کی طرح بیٹھے سانپ نے سر جھکا کر برہا کو سلامی دی اور پھر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

پر مان نے برہا کا ایک ہاتھ پکڑ کر چوما اور پھر اسے اُٹھا کر اپنے مقابل کھڑا کر لیا۔ اس نے غور سے برہا کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ فوراً ہی برہا پر غشی طاری ہونے لگی۔ پھر وہ ایک دم پر مان کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ پر مان نے تیوح کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے بے

ہوش برہا کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا۔

پھر وہ برہا کو ہاتھوں پر اُٹھائے ہورا کی طرف بڑھی۔

ہورا، برہا کے بجائے تیوح کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ تیوح نے اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر لیں لیکن اس نے ہورا کی طرف آنکھیں اُٹھا کر نہ دیکھا، وہ بدستور برہا کی طرف دیکھتی رہی۔ بے ہوش برہا ویسے بھی اس وقت بہت پیاری لگ رہی تھی۔

تیوح نے برہا کے پھول سے رخسار پر پیار کیا اور اسے ہورا کی جانب بڑھا دیا۔ ہورا نے بڑی احتیاط سے برہا کو اپنے ہاتھوں پر لے لیا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر واپسی کیلئے مڑ گیا۔

تیوح کے دل میں ایک کسک سی اُٹھی۔ وہ ہر ملاقات پر اس سے یہ ضرور پوچھا کرتا تھا۔ ''کیسی ہو تیوح؟'' آج اس نے کوئی بات نہ کی۔ تیوح کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ وہ اونچے لمبے ہورا کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر افسردگی سے مسکرائی اور اس کے ہونٹوں پر اب ایک آہ اُبھری۔ ''وحشی۔''

ہورا، تیوح کے ردعمل سے بے خبر کسی روبوٹ کی طرح پر مان کے حکم کی بجا آوری کیلئے دروازے کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ہورا کے باہر نکل جانے کے بعد جب دروازہ بند ہو گیا تو تیوح، پر مان کی طرف پلٹی۔ اس کے چہرے پر حزن کی جھلک تھی۔ پر مان نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا ہوا تیوح...... تُو اُداس کیوں ہو گئی۔''

اپنی چوری پکڑے جانے پر تیوح ایک دَم پریشان ہو گئی۔ وہ کیا جواب دے؟ کیا پر مان کو بتا دے کہ ہورا ہر ملاقات پر اس کی خیریت پوچھا کرتا تھا۔ آج اس نے اس کی مزاج پُرسی نہیں کی۔ اس لئے وہ اُداس ہے...... پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک بات آ گئی۔ وہ بولی۔ ''پر مان، برہا بستی سے چلی گئی۔ کیا یہ اُداسی کی بات نہیں؟''

''اچھا تو برہا کیلئے اُداس ہے۔'' پر مان نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تیوح، برہا ایسی ہی ہے کہ اس سے جدائی پر اُداس ہوا جائے۔ رنسارو، بہت خوش قسمت ہے کہ اس کی تقدیر میں برہا لکھ دی گئی۔ مگر وہ بے صبرا، صبر کرنے کیلئے تیار نہیں، اسے صبر کرنا ہو گا۔ تیوح تم اسے سمجھاؤ...... ورنہ میرے ہاتھوں سزا پائے گا۔''

''پر مان تُو فکر نہ کر...... میں سمجھاؤں گی...... ویسے بھی برہا اس بستی سے جا چکی ہے۔ اب کسی خطرے کی بات نہیں۔''

''ہاں تُو ٹھیک کہتی ہے۔'' یہ کہہ کر پر مان اُٹھ گیا اور تیز تیز چلتا مجسمے والے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

یہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا، برہا کو کندھے سے لگائے اپنے مخصوص انداز میں چلا جا رہا تھا۔ زنجیر سے لٹکی گھنٹی ٹن ٹن بول رہی تھی۔ وہ نہ دوڑ رہا تھا نہ تیز چل رہا تھا۔ اس کے باوجود زمین اس کے پیروں تلے سے تیزی سے کھسک رہی تھی۔

جلد ہی درخت دروازہ آ گیا۔ یہ اس بستی کی آخری حد تھی۔

یہ ایک بڑے چوڑے تنے کا درخت تھا۔ اس میں ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ یہ اتنی کھلی جگہ تھی کہ ہورا جیسا قد آور شخص بآسانی تنے کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔

درخت کے قریب پہنچ کر ہورا رکا۔ اس نے کندھے پر لٹکی زنجیر اُتاری۔ اس میں بندھی گھنٹی تیزی سے بجی۔ ہورا نے زنجیر گھما کر زور سے تنے پر ماری اور کڑک کر بولا۔ ''میں ہوں ہورا۔''

''ارے ہورا، تجھے کون نہیں جانتا۔ آ جا اندر آ جا۔'' اندر سے آواز آئی لیکن بولنے والا دکھائی نہ دیا۔

ہورا تھوڑا سا سر جھکا کر تنے میں داخل ہوا۔ اندر اندھیرا تھا لیکن ہورا کو معلوم تھا کہ اندر کس طرح کا راستہ ہے۔ ایک ڈھلوان راستہ تھا۔ وہ ریت پر تیزی سے نیچے اُترتا چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ روشنی میں آ گیا۔

اس کے سامنے ایک لق و دق صحرا تھا۔ وہ تیزی سے ریت پر دوڑنے لگا۔ اس کے پیچھے ریت کا بادل اُٹھتا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس ریت کے بادل میں گم ہو گیا۔

☆......☆......☆

دیوانگ دریا کے کنارے، ایک درخت کے نیچے ہورا کا منتظر تھا۔ اسے پرمان کا پیغام مل چکا تھا۔ پرمان نے جو ہدایات اسے بھیجی تھیں، اس کے مطابق اسے عمل کرنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اسے ہورا نظر آ گیا۔ وہ نہ دوڑ رہا تھا، نہ تیز چل رہا تھا۔ اس کے باوجود زمین اس کے پیروں کے نیچے سے تیزی سے کھسک رہی تھی۔ وہ چند لمحوں میں ہی دیوانگ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

برہا ابھی تک بے ہوش تھی اور اس کے کندھے سے لگی تھی۔ اس نے اسے کندھے سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھ میں سنبھالا اور اپنے ہاتھ آگے کرتا ہوا بولا۔ ''میں ہوں ہورا...... دیوانگ تیرے لئے میں پرمان کی امانت لایا ہوں۔ اسے وصول کر۔''

دیوانگ نے برہا کو اس کے ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنے کندھے سے لگا لیا اور بولا۔ ''ہورا، میں تجھے جانتا ہوں۔ میں نے پرمان کی امانت وصول کی۔ مجھے پرمان کا پیغام مل چکا ہے۔ اب تُو لوٹ جا......

میں جانوں اور میرا کام جانے۔''

''ٹھیک ہے دیوانگ میں جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کندھے سے زنجیر اُتاری اور پیتل کی گھنٹی کو زور سے زمین پر مارا اور ساتھ ہی نعرہ لگایا۔ ''میں ہوں ہورا۔''

گھنٹی زمین پر لگتے ہی زمین سے ریت کا بادل سا اُٹھا اور ہورا اس میں گم ہو گیا۔

ہورا کے جانے کے بعد دیوانگ دریا میں اُتر گیا اور پوری احتیاط سے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

شام ہونے کو تھی۔

کمال رائے بیڈ پر لیٹا غزلوں کا کیسٹ سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے سرہانے کوئی کھڑا ہے۔ کمال رائے نے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے مائرہ کو کھڑے پایا۔ وہ مائرہ کو دیکھ کر فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

مائرہ کا کمرہ میں آنا کوئی حیران کن مسئلہ نہ تھا۔ وہ روشن گوٹھ آتی رہتی تھی اور جب بھی وہ حویلی آتی کمال رائے سے ملے بغیر نہ جاتی۔ کمال رائے کو اس سے کوئی بیر نہ تھا۔ وہ آتی تو اس سے اچھی طرح بات کر لیا کرتا تھا۔

''اوہو...... غزلیں سنی جا رہی ہیں۔'' مائرہ نے مسکرا کر کہا۔ ''اس گلوکار کی میرے پاس بھی دو کیسٹیں ہیں۔''

''اچھا۔'' کمال رائے نے تعریفی نظروں سے مائرہ کو دیکھا اور ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ڈیک کی آواز کم کر دی۔

''یہ آپ ہر وقت کمرے میں کیوں گھسے رہتے ہیں۔'' مائرہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تنہائی پسند ہے۔'' کمال رائے نے صاف گوئی سے کہا۔

''تنہائی پسندی...... آہستہ آہستہ انسانوں سے دور لے جاتی ہے۔'' وہ بولی۔

''میں انسانوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''اس بیزاری کی وجہ؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' کمال رائے مزید بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے مختصر جواب دیا۔

''آیئے باہر چلیں۔'' مائرہ نے کہا۔

''کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''حویلی سے باہر...... اپنی جیپ نکالئے اور مجھے میرے گوٹھ تک چھوڑ آیئے۔'' مائرہ ہنس کر بولی۔

''اچھا، یہ مسئلہ ہے...... ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔'' کمال رائے خلاف توقع فوراً ہی راضی ہوگیا۔

پھر وہ دونوں حویلی سے پانچ چھ کلومیٹر ہی آئے تھے کہ کمال رائے نے سامنے سے ایک اونٹ آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی جیپ کی رفتار خاصی دھیمی کر دی۔ پھر جب وہ اونٹ اس کے نزدیک سے گزرنے لگا تو کمال رائے اونٹ پر بیٹھی عورت کو دیکھ کر چونک گیا۔

وہ ماروی تھی۔

وہ دو اونٹ تھے۔

دونوں سڑک کے کنارے آگے پیچھے چلے آرہے تھے۔ سڑک چھوٹی تھی۔ اس لئے ان اونٹوں کو دیکھ کر کمال رائے نے اپنی جیپ کی رفتار کم کرلی تھی۔ جب پہلا اونٹ اس کی گاڑی کے سامنے سے گزرا تو اس نے قیامت ڈھادی۔ محمل میں جو عورت بیٹھی تھی وہ سو فیصد ماروی تھی۔ اگرچہ اس کا لباس علاقائی تھا اور اس نے کہنیوں تک چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔

کمال رائے نے ماروی کو دیکھتے ہی گاڑی کو بریک لگائے لیکن تب تک ماروی کا اونٹ آگے بڑھ چکا تھا۔ اب دوسرا اونٹ اس کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس اونٹ پر ایک مرد سوار تھا۔ جس کی داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ ایک سفید چادر سے اس کا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔

یہ شخص بھی اسے کچھ جانا پہچانا لگا۔ وہ شخص واقعی جانا پہچانا تھا۔ کمال رائے کو یہ فقیر نما شخص اپنے آبائی قبرستان کے راستے میں ملا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''مورکھ قبرستان کیوں جاتا ہے۔ خالی قبروں میں کیا رکھا ہے۔ جانا ہے تو صحرا میں جا۔'' پھر وہ اس طرح کی بات کہہ کر درختوں کے جھنڈوں میں غائب ہوگیا تھا۔

''مائرہ تم نے دیکھا؟'' کمال رائے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''وہ پہلا اونٹ...... اس پر ماروی سوار ہے۔'' کمال رائے نے کہا۔

''میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں عام سے اونٹ سوار سمجھ کر توجہ نہیں دی لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ ماروی بھابھی کیسے ہوسکتی ہیں۔ وہ تو مر چکی ہیں۔'' مائرہ نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں اونٹ آہستہ روی سے چلے جارہے تھے۔

سڑک اتنی چھوٹی تھی کہ گاڑی بیک کرنے میں وقت لگتا۔ اس لئے کمال رائے جیپ سے اُتر گیا اور ان اونٹوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے چیخا۔ ''رکو...... میری بات سنو۔''

کمال رائے کو اپنے پیچھے آتے دیکھ کر اس اول جلول شخص نے جس کا نام اوگڑ ناتھ تھا ایک عجیب و غریب آواز نکالی اور اس آواز کے ساتھ ہی دونوں اونٹوں نے رفتار پکڑ لی...... کمال رائے نے جب اونٹوں کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو وہ فوراً رک گیا۔ وہ جلدی سے واپس پلٹا۔ اچھل کر اپنی جیپ میں بیٹھا۔ کوشش کر کے تیزی سے گاڑی بیک کی اور اسپیڈ بڑھا دی۔

آگے ایک موڑ تھا۔ وہ دونوں اونٹ موڑ کی وجہ سے نظر نہیں آرہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف باغات تھے۔ جب جیپ سڑک کا موڑ کاٹ کر سیدھی سڑک پر پہنچی تو وہ دونوں اونٹ غائب ہو چکے تھے۔ سڑک دور تک سنسان پڑی تھی۔ کمال رائے نے مائرہ کی طرف دیکھا۔ مائرہ حیرت زدہ تھی۔

''کہاں گئے...... وہ دونوں اونٹ...... اتنی جلدی تو وہ غائب نہیں ہوسکتے۔'' مائرہ نے کہا۔ ''کہیں وہ ان درختوں میں تو گم نہیں ہوگئے۔''

''مائرہ، تم سڑک کے اس طرف نظر رکھو۔ میں ادھر دیکھتا ہوں۔''

کمال رائے دو ڈھائی کلومیٹر واپس آگیا۔ اسے وہ دونوں اونٹ کہیں نظر نہ آئے۔ وہ حیرت ناک طریقے سے غائب ہوگئے تھے۔

اب آگے جانا بیکار تھا۔ مایوس ہو کر کمال رائے نے دوبارہ اپنی گاڑی بیک کی اور ارشاد گوٹھ کی طرف چل دیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ اس نے پہلے اونٹ پر بہت واضح طور پر ماروی کو دیکھا تھا۔ وہ علاقائی لباس میں ضرور تھی لیکن اس کا چہرہ سو فیصد ماروی کا تھا۔ وہ شخص بھی اسے یاد تھا جو پچھلے اونٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ اسے قبرستان جاتے ہوئے ملا تھا۔ کیا یہ سب اس کا وہم تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ فریب نظر تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا۔ پھر وہ دونوں اونٹ اتنی تیزی سے کہاں غائب ہوگئے؟

وہ انہی خیالات میں اُلجھا رہا۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ ارشاد گوٹھ آگیا۔

ماروی کی صورت کمال رائے کو تڑپا گئی تھی۔ بڑی مشکل سے تو اسے قرار آیا تھا لیکن وہ چند لمحوں میں اس کا قرار چھین کر لے گئی تھی۔ وہ بے چین ہوگیا تھا۔

ماروی کی موت پر قرار اس لئے بھی دیر سے آیا تھا کہ ماروی کی تجہیز و تکفین نہ ہوسکی تھی۔ روشن رائے نے اس کی لاش رولی کے ذریعے جانے کہاں پھنکوا دی تھی۔ سانپ کے حملے کے بعد روشن رائے نے ماروی اور اس کی بچی کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ پھر اس نے رولی سے ماروی کی لاش بازیاب کرنے کیلئے بھی کہا تھا۔ رولی نے اسے صحرا میں تلاش کیا تھا اور ڈھونڈتا ڈھانڈتا وہ اس جگہ پہنچ بھی گیا تھا جہاں اس نے ماروی کی لاش دفن کی تھی، لیکن اب وہاں لاش نہ تھی۔ ویسے بھی اتنے دن

گزر گئے تھے لاش کا وہاں ہونا ممکن نہ تھا۔ کیا پتہ ماروی کی لاش چیل کوے ہی کھا گئے ہوں۔

یہ بات روشن رائے بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ماروی کی لاش اب بازیاب نہیں ہو سکے گی۔ بس ایسے ہی نفیسہ بیگم کی تسلی کیلئے اس نے روبی کو لاش کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔

روبی کی لاش کیسے ملتی، لاش تو فوراً ہی ہورا اُٹھا کر لے گیا تھا۔

ہورا نے ماروی کی لاش دریا کے کنارے ایک مخصوص جگہ پر رکھ دی تھی اور خود وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔ اسے اس بات سے سروکار نہ تھا کہ اس لاش کو یہاں رکھنے کو کیوں کہا گیا اسے جو حکم دیا گیا تھا۔ اس نے اس کی بجا آوری احسن طریقے سے کر دی تھی۔ اب اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔

دریا کے کنارے نزدیک ہی شمشان گھاٹ تھا۔ ایک اونچی جگہ بنی جھونپڑی میں اوگڑ ناتھ موجود تھا۔ وہ آسن جمائے آنکھیں بند کئے گیان دھیان میں مصروف تھا جبکہ جھونپڑی کے باہر موجود تین سادھو چرس پینے میں مگن تھے۔

جیسے ہی دریا کے کنارے لاش پہنچی۔ اوگڑ ناتھ کی آنکھیں فوراً ہی کھل گئیں۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

"آ گئی...... آ گئی...... لاش آ گئی...... شو پوجا کا سامان ہو گیا...... جے کالی۔"

اس کی آواز سن کر تینوں چرس پیتے سادھو اندر گھس آئے۔ "کیا ہوا...... مہاراج۔"

"ارے جاؤ...... جلدی کرو...... ٹھکانے پر پہنچو...... شو پوجا کا سامان آ گیا۔ آج رات شو پوجا ہو گی۔" اوگڑ ناتھ نے ان تینوں سادھوؤں کو دیکھ کر کہا۔

چرس کا نشہ تو ان پر پہلے ہی سوار تھا۔ ایک عورت کی لاش کی نوید نے ان کے نشے کو دو آتشہ بنا دیا۔ وہ فوراً ہی "جائے واردات" کی طرف روانہ ہو گئے۔

دریا کے کنارے ایک مخصوص جگہ پر وہ لاش موجود تھی۔

ایک جوان اور خوبصورت عورت کی لاش دیکھ کر اوگڑ ناتھ کے تینوں چیلوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

وہ تینوں خوشی سے جھوم اُٹھے۔

ایک چیلے نے جو ان تینوں میں قد آور اور منحوس صورت تھا، ماروی کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتے جھونپڑی میں آ گئے۔

اوگڑ ناتھ کے اس چیلے نے ماروی کی لاش اس کے قدموں میں رکھ دی۔ اوگڑ ناتھ نے آنکھیں کھول کر لاش کا جائزہ لیا۔ وہ ایک خوبصورت اور نوجوان عورت کی لاش دیکھ کر کھل اُٹھا۔ اس نے زور سے ایک نعرہ مستانہ مارا۔ "جے کالی...... تیرا وار کبھی نہ جائے خالی...... او دل والی۔"

اوگھڑ ناتھ کے تینوں چیلے لاش کی پوجا کی تیاریوں میں لگ گئے۔

آج کی رات ایک خاص رات تھی۔ اماوس کی رات۔ اندھیری رات۔ یہ رات شو پوجا کیلئے بہت مناسب تھی۔ اتفاق کی بات کہ اس رات، انہیں ایک شو بھی دستیاب ہو گیا تھا۔

رات بارہ بجے شو پوجا شروع ہوئی...... لاش کی پوجا۔

تینوں چیلے ایک نیم دائرے کی شکل میں لاش کے پیروں کی طرف بیٹھ گئے۔ اوگھڑ ناتھ سرہانے کی طرف تھا۔ اس کے سامنے ہی آگ روشن تھی۔ وہ اس آگ میں شمشان گھاٹ سے جمع کی گئی، ادھ جلی لکڑی کے ٹکڑے کچھ پڑھ کر آگ میں جھونک رہا تھا۔

وہ تینوں چیلے باری باری لاش پر پانی کے چھینٹے مارتے جاتے تھے اور ساتھ ہی بیک زبان کچھ نہ سمجھ میں آنے والے الفاظ بولتے جاتے تھے۔ "شن شلا کی بھو بھلا بھو۔"

کوئی دو بجے کے قریب لاش میں حرکت ہونا شروع ہوئی۔ پہلے پاؤں کا انگوٹھا ہلا۔ اس کے بعد ہاتھ اُٹھا کر پھر لاش نے اپنی بند آنکھیں اچانک کھول دیں۔

آنکھیں کھلی دیکھ کر اوگھڑ ناتھ نے اپنا عمل تیز کر دیا۔ وہ جلدی جلدی لکڑی کے ٹکڑے اپنے سامنے جلتی آگ میں جھونکنے لگا۔ وہ تیزی سے کچھ نا فہم الفاظ بھی بولتا جا رہا تھا۔ "شن شلا کی بھو بھلا بھو۔"

ایک گھنٹے تک یہ عمل اسی طرح جاری رہا۔ ٹھیک تین بجے ماروی کی لاش اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ان چاروں شیطانوں کے چیلوں نے خوفزدہ ہونے کے بجائے نعرہ مستانہ لگایا۔ "جے کالی...... تیرا وار کبھی نہ جائے خالی...... او دل والی...... جلدی سے کر اس لاش کو خالی۔"

ان شیطانوں کے چیلوں کے خیال کے مطابق ماروی کی لاش میں کالی کی روح حلول کر گئی تھی اور وہ ان کے عمل کے مطابق اس لاش کی صفائی کر رہی تھی۔ صفائی سے ان کی کیا مراد تھی۔ یہ وہی سمجھتے تھے۔

کوئی آدھے گھنٹے تک وہ لاش بار بار اُٹھ کر بیٹھتی رہی۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ آرام سے لیٹ گئی۔ اس کے منہ سے دھواں سا نکلا۔ گویا لاش کی صفائی کی کارروائی مکمل ہو گئی تھی۔ کالی اس لاش کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔ یہی وقت تھا کہ اس لاش میں اپنی مرضی کی روح داخل کر دی جائے اور یہ کام چار بجے سے پہلے پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ بارہ بجے سے چار بجے تک شو پوجا ٹائم ہوتا تھا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد یہ عمل بے اثر ہو جاتا تھا۔

اوگھڑ ناتھ ماروی کی لاش کو دیکھتے ہی طے کر چکا تھا کہ شو پوجا کے بعد اس میں کس کی روح داخل کرے گا۔

وہ تھی شانتی!

شانتی اس کے من کی رانی تھی۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ وہ شمشان گھاٹ کی اسی جھونپڑی میں اوگھڑ ناتھ کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک رات اسے تیز بخار ہوا تھا۔ دوسرے دن وہ چل بسی تھی۔ اوگھڑ ناتھ تنہا رہ گیا تھا۔

اب وہ ایک لاش کی تلاش میں تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ لاش ایک جوان اور خوبصورت عورت کی تھی جیسے ہی اسے لاش دستیاب ہوئی اس نے شو پوجا شروع کر دی۔ بالآخر وہ لمحہ آ گیا جب اس خالی جسم میں کسی کی روح کو داخل کیا جانا تھا۔ اوگھڑ ناتھ نے بلاتاخیر روح کے حلول کرنے کا عمل شروع کیا۔

جب یہ عمل شروع ہوا تو دور کہیں سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بدروحیں چیخ رہی ہوں۔ پھر یہ آوازیں قریب آنے لگیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے جھونپڑی کے آس پاس سینکڑوں بدروحوں نے چیخ و پکار مچا رکھی ہو۔

اوگھڑ ناتھ نے اب اپنے ہاتھ میں چاقو اُٹھا لیا تھا۔ پٹرومیکس کی روشنی میں چاقو کی تیز دھار چمک رہی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے اس چاقو کی نوک کو آگ پر رکھ دیا اور جلدی جلدی نامانوس سے لفظ بولنے لگا۔ اس کے بعد اس نے چاقو کو آگ سے ہٹایا، سیدھا کیا۔ روحوں کی چیخ و پکار کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ پھر اس نے جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے چاقو کو ریوالور کی طرح تانا اور بڑے پُراسرار انداز میں بولا۔ ''چل آ جا۔''

اس کے ''چل آ جا'' کہتے ہی زرد رنگ کا ایک ہیولا سا اندر داخل ہوا۔ وہ دھواں دھواں سا تھا لیکن اس دھویں کی ایک شکل تھی۔ غور سے دیکھنے پر وہ ہیولا انسانی شکل کا محسوس ہوتا تھا۔ اوگھڑ ناتھ نے اس ہیولے کے اندر آتے ہی چاقو کی نوک سے ماروی کے انگوٹھے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''چل گھس جا...... بول جے کالی...... اودل والی...... تیرا وار کبھی نہ جائے خالی۔''

اسی وقت ایک زنانہ آواز آئی۔ ''جے کالی۔''

''چل شاباش...... جلدی کر۔'' اوگھڑ ناتھ نے بڑے پیار سے لاش کی طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ ہیولا، ماروی کے پیروں کے پاس جا کر رک گیا۔ اوگھڑ ناتھ چاقو سے برابر اس دھویں کو لاش میں داخل ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ساتھ میں بولتا بھی جاتا تھا۔ ''چل جلدی کر۔''

اتنے میں وہ ہیولا چھوٹا ہونا شروع ہوا اور چھوٹا ہوتے ہوتے غائب ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ دھواں انگوٹھے کے ذریعے ماروی کی لاش میں داخل ہو گیا ہو۔

ہیولے کے اندر داخل ہوتے ہی اوگھڑ ناتھ نے وہ چاقو زور سے زمین میں گاڑ دیا اور بولا۔ ''ہاں، شانتی...... تُو نے بسیرا کر لیا۔''

''ہاں کر لیا۔'' ماروی کے ہونٹ ہلے لیکن یہ ماروی کی آواز نہ تھی، کوئی اجنبی آواز تھی۔

''چل پھر اُٹھ کر بیٹھ جا۔'' اوگھڑ ناتھ نے کہا۔

یہ سنتے ہی ماروی کی لاش اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

اب وہ ماروی نہ رہی تھی، شانتی ہو گئی تھی۔ جسم ماروی کا اور روح شانتی کی۔

''دیکھ شانتی میں نے تجھے واپس بلا لیا ہے۔'' اوگھڑ ناتھ نے بڑے فخر سے کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔

''ہاں، اوگھڑ...... میں پریشان تھی، بھٹک رہی تھی۔ تیری جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔'' شانتی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''مہاراج، اب ہمیں آ گیا ہے۔'' ان تینوں چیلوں میں سے ایک نے جھونپڑی سے جانے کی اجازت چاہی۔

''ہاں، تم لوگ جاؤ...... موج میلہ کرو۔ میں کچھ دیر میں تمہاری جھونپڑی میں آتا ہوں۔'' اوگھڑ ناتھ نے کہا۔

''اچھا، مہاراج۔'' یہ کہہ کر اوگھڑ ناتھ کے تینوں چیلے اس کی جھونپڑی سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد اوگھڑ ناتھ نے شانتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ''میری شانتی۔''

اس طرح ماروی جی اُٹھی۔

کمال رائے نے اگر ماروی کو دیکھا تو غلط نہ دیکھا تھا...... وہ اس کی نظر کا دھوکا نہ تھا، وہ واقعی ماروی تھی۔

ماروی کو دیکھ کر کمال رائے تڑپ اُٹھا تھا۔ وہ ارشاد گوٹھ میں زیادہ نہیں رکا تھا۔ مائرہ کو چھوڑ کر فوراً ہی واپس چلا آیا تھا۔ مائرہ نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت اسے روکنا فضول ہے۔ ماروی کی شکل دیکھ کر اسے چپ لگ گئی تھی، وہ سارے راستے خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔

وہ اس بات پر حیران تھا کہ وہ دونوں اونٹ اچانک کس طرح غائب ہو گئے۔

وہ دونوں اونٹ غائب ہرگز نہیں ہوئے تھے۔ یہ سب اوگھڑ ناتھ کی کارستانی تھی۔ جس طرح کمال [illegible] نے ماروی کو پہچان لیا تھا، ویسے ہی اوگھڑ ناتھ نے بھی کمال رائے کو ایک نظر میں پہچان لیا تھا۔

کمال رائے کو اونٹوں کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر اوگھڑ ناتھ گھبرا گیا تھا۔ پہلے تو اس نے اپنے [illegible]ے ایک عجیب سی آواز نکال کر اونٹوں کو دوڑایا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ کمال رائے گاڑی میں بیٹھ کر پیچھے آ رہا ہے تو اس نے موڑ مڑتے ہی اونٹوں کو روکا اور انہیں سڑک سے اُتار کر

درختوں میں لے گیا۔

پھر اس نے فوری طور پر اپنے منہ سے نامانوس سے الفاظ نکالے۔ "شن شلا کی بھو بھلا بھو۔" اور پیچھے مڑ کر پھونک ماری۔

اگر چہ دونوں اونٹ سڑک کے نزدیک ہی درختوں میں کھڑے تھے جو سڑک سے صاف نظر آرہے تھے لیکن اوگھڑ ناتھ کیونکہ نظر بندی کا عمل کر چکا تھا اس لئے وہ دونوں اونٹ کمال رائے اور مائرہ کو نظر نہ آسکے۔

کمال رائے ان اونٹوں کو خاصا آگے جا کر دیکھ آیا۔ پھر وہ مایوس ہو کر واپس پلٹا۔ اوگھڑ ناتھ نے جب دیکھا کہ کمال رائے واپس چلا گیا ہے تو اس نے شانتی (ماروی) سے کہا۔ "اوری شانتی...... گھونگھٹ نکال لے ری۔"

"کیوں، تیری شکل دیکھ کر تیرا پتی رک گیا تھا۔ میں اگر عمل نہ کروں تو وہ تجھے ابھی لے اُڑا تھا۔"

"اوگھڑ تُو خواہ مخواہ ہی ڈر گیا تھا۔ ارے ارے اسے ذرا میرے پاس تو آنے دیتا...... میں جب بتاتی کہ میں شانتی ہوں تو وہ خود ہی واپس چلا جاتا۔" شانتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ایسا ہو سکتا تھا...... لیکن میں نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ چل اب اپنے اونٹ کو ہانک کر سڑک پر لے آ...... اب وہ بہت دور جا چکا ہے۔"

پھر وہ دونوں اونٹ درختوں سے نکل کر سڑک پر آگئے اور آہستہ روی سے اپنا سفر طے کرنے لگے۔

☆......☆......☆

دیوانگ دریا کے اس پار نکلا۔

وہ برہا کو کندھے سے لگائے تیزی سے شمال کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی آدھا میل چلنے کے بعد ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ یہ اس بستی کا سب سے بڑا اور پرانا گھر تھا۔

دیوانگ نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔

دروازہ کھولنے والی نوے برس سے کیا کم ہو گی۔ سفید ساڑھی جس کی کناری عنابی تھی۔ تھوڑی سی کمر جھکی ہوئی، سفید بال بھنویں تک سفید...... ہاتھ میں لاٹھی...... سانولی رنگت...... چہرے پر بے شمار جھریاں۔ وہ نوے برس کی ضرور تھی لیکن دیکھنے میں جاندار بڑھیا تھی۔

دروازہ کھول کر وہ ایک طرف ہٹی، اس نے دیوانگ کے کندھے پر کسی بچی کو دیکھا تو بڑی حیران ہوئی۔

"دیوانگ...... یہ کیا اُٹھا لایا تُو۔"

"ماتا...... یہ برہا ہے۔ پرمان کی امانت...... بہت قیمتی چیز...... ہمیں اسے اپنے پاس رکھنا ہے۔" دیوانگ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"پرمان کی امانت ہے تو پھر آپ ہی قیمتی چیز ہوئی۔" اس بڑھیا نے دروازے کو کنڈی لگاتے ہوئے کہا۔

"ماتا...... تم کیا کر رہی تھیں۔" دیوانگ صحن پار کر کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"بچوں کو دودھ دینے جا رہی تھی۔" دیوانگ کی ماں بولی۔

"اروشی...... کیا گھر میں نہیں ہے۔" دیوانگ کی ماں بولی۔

"اندر ہے...... وہ کہاں جائے گی؟" ماں نے بتایا۔

"میں یہاں ہوں۔" ایک ادھیڑ عمر کی عورت فوراً ہی دروازے پر آگئی۔

"اروشی...... لے سنبھال اسے...... دیکھ اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنا ہے۔" دیوانگ نے ہدایت کی۔

"تُو فکر مت کر دیوانگ...... میں اسے اپنے دل کا ٹکڑا سمجھ کر رکھوں گی۔" دیوانگ نے خوش ہوتے ہوئے برہا کو اس کی گود میں دے دیا۔

جب اروشی نے برہا کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ مبہوت سی رہ گئی۔

"ہائے...... اتنی سندر۔" وہ بے اختیار بولی۔

"سندر کیوں نہ ہو، یہ پرمان کا انتخاب ہے۔" دیوانگ نے تعریفی نظروں سے برہا کو دیکھا۔

اروشی نے برہا کا منہ چوما اور بولی۔ "ایسی پیاری بچی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

پھر وہ اسے اندر کمرے میں لے گئی اور اسے ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگی۔

دیوانگ کمرے سے نکل آیا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا کہ پیپل کے درخت کے نیچے دس بارہ مٹی کے پیالے رکھے تھے۔ ایک چھوٹی بالٹی سے دیوانگ کی ماں ان پیالوں میں دودھ ڈال رہی تھی۔

دیوانگ دروازے کی دہلیز پر بیٹھ گیا اور اپنی ماں کو ایک ایک کر کے پیالوں میں دودھ ڈالتے ہوئے دیکھنے لگا۔

جب سارے پیالوں میں دودھ بھر گیا تو دیوانگ کی ماں پاربتی نے دودھ کی خالی بالٹی رسوئی میں جا کر رکھی، پھر وہ واپس درخت کے نیچے آئی اور اس نے اپنی لاٹھی تین بار زور زور سے زمین پر ماری اور بڑے پیار سے بولی۔ "آؤ بچو۔"

"آؤ بچو۔" کہنا تھا کہ مختلف جگہوں سے چھوٹے بڑے سانپ نکل کر لہراتے ہوئے دودھ کے پیالوں کی طرف بڑھے اور پیالوں میں منہ ڈال کر دودھ پینے لگے۔

پاربتی ان سانپوں کو بڑی محبت سے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

ماروی کی ایک جھلک نے کمال رائے کے دل کی دنیا تہہ وبالا کر دی تھی۔ وہ ماروی کو بھولا نہیں تھا۔ اب بھی جب اس کی یاد آتی تو آتی چلی جاتی۔ اس کی یاد آتی تھی تو اس کا دل تڑپاتی تھی لیکن وہ جنون کی کیفیت جو اس کی لاش دیکھ کر اس پر طاری ہوئی تھی، ویسی کیفیت اب نہ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔

زندگی کی طرف لوٹتے لوٹتے زندگی کے ایک موڑ پر اچانک اسے اپنی زندگی دکھائی دے گئی۔ اس کا منتشر ہو جانا تو ایک فطری امر تھا۔ وہ دوسرے دن گھوڑے پر حویلی سے نکلا۔ اسے گھڑسواری کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ وہ گھوڑے پر اس لئے نکلا تھا کہ شاید ماروی پھر سے کہیں دکھائی دے جائے تو وہ گھوڑے پر اس کا باسانی تعاقب کر سکے گا۔ اس مرتبہ اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے گا۔

ماروی سے ملاقات کی آس میں اس نے میلوں لمبا چکر کاٹا لیکن وہ اسے کہیں دکھائی نہ دی۔ مایوس ہو کر وہ حویلی لوٹ آیا اور بغیر لباس تبدیل کئے بیڈ پر اوندھے منہ پڑ گیا۔

نفیسہ بیگم نے حسب معمول اس کے کمرے کا چکر لگایا تو کمال رائے کے کمرے میں اندھیرا پایا۔ اس نے اندر آ کر لائٹ جلائی تو کمال رائے کو بیڈ پر بے سدھ لیٹا ہوا پایا۔ اسے بیڈ پر اس طرح لیٹا دیکھ کر وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔

''کمال بیٹے...... کیا ہوا؟'' اس نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں، ماں!'' کمال رائے کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

کمال رائے کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ نفیسہ بیگم نے دیکھا تو بولی۔ ''تم رو رہے ہو؟''

''نہیں تو ماں۔'' کمال رائے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

''اب ماں سے اپنے آنسو بھی چھپائے گا۔'' نفیسہ بیگم اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں ماں، تم سے میرا کیا چھپا ہے۔''

اور یہ حقیقت بھی تھی کہ کمال رائے اپنی ماں کے بہت قریب تھا۔ وہ ہر چھوٹی بڑی بات جب تک اپنی ماں سے نہ کر لیتا چین سے نہ بیٹھتا تھا۔

''پھر یہ آنسو کیوں چھپائے؟'' نفیسہ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''ماں...... میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ میرا دل بے چین ہے۔ اسے کسی طور قرار نہیں۔''

''میں تیرے دل کا قرار واپس لاؤں گی...... تُو بات تو کر۔''

''ماں، میں نے کل ارشاد گوٹھ جاتے ہوئے راستے میں ماروی کو دیکھا تھا۔'' کمال رائے نے

انکشاف کیا۔

یہ انکشاف سا انکشاف تھا۔ نفیسہ بیگم تو سناٹے میں آ گئی۔ وہ فکرمند ہو گئی کہ کمال رائے مشکل سے تو ٹھیک ہوا تھا۔ بڑے جتنوں سے زندگی کی طرف واپس آیا تھا۔ اب اس نے پھر سے ماروی کا شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ جانے اس نے کس کو دیکھ لیا تھا۔

''کمال بیٹے...... کیا تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ماں نے پریشان ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''ہاں ماں...... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تمہیں یقین نہیں آیا نا...... اسی لئے ماں میں نے تمہیں ابھی تک یہ بات نہیں بتائی تھی۔''

''لیکن بیٹے...... ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟'' نفیسہ بیگم پریشان ہو کر بولی۔ ''وہ مر چکی ہے۔ تم نے اس کی لاش دیکھی ہے۔''

''ماں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... لیکن میں بھی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' کمال رائے نے بڑے یقین سے کہا۔

''ذرا تفصیل سے مجھے ساری بات بتا۔'' نفیسہ بیگم بولی۔

کمال رائے نے کل شام کا واقعہ پوری تفصیل سے ماں کے گوش گزار کر دیا۔

وہ ماروی کی کوئی ہم شکل ہو گی۔'' نفیسہ بیگم نے سارا قصہ سن کر اظہار خیال کیا۔

''نہیں ماں...... میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ میرا دل فریب نہیں کھا سکتا...... وہ سو فیصد ماروی تھی۔ وہ اسی لئے غائب ہو گئی۔ اگر وہ ماروی نہ ہوتی تو وہ ہرگز غائب نہ ہوتی۔''

''بیٹے کمال...... میری جان...... میں نے اس سلسلے میں خود رولی سے بات کی تھی۔ وہ ماروی کو کہیں صحرا میں ریت میں دبا آیا تھا۔ پھر وہ تیرے بابا کے حکم پر اسے بازیاب کرنے کے لئے نکلا تھا لیکن ماروی کی لاش اسے مقررہ جگہ پر نہیں مل سکی تھی۔ ظاہر ہے اتنا لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد اس کا وہاں ملنا ناممکنات میں سے تھا۔ لاش بے شک نہیں ملی لیکن تُو یہ بات تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مر چکی ہے۔'' نفیسہ بیگم نے اسے سمجھایا۔

''پتہ نہیں ماں!'' کمال رائے نے بے یقینی کی کیفیت میں کہا۔ ''جانے کیوں قرار نہیں آتا۔''

''کمال رائے...... میرے بیٹے...... وسوسوں میں نہ پڑ...... یقین کر لے کہ ماروی مر چکی ہے اور یہی بات تیرے حق میں بہتر ہے۔ میری جان، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تُو پھر بیمار نہ پڑ جائے۔''

''نہیں ماں...... تم ڈرو مت...... ایسا کچھ نہیں ہو گا...... لیکن ماں میں ماروی کی یاد سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ میں اس کی تلاش میں رہوں گا۔ میں اسے آج بھی تلاش کر کے آیا ہوں۔''

''اُف میرے خدا۔'' نفیسہ بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''تجھے مائرہ کیسی لگتی ہے؟''

''اس وقت مائرہ کا کیا ذکر؟'' کمال رائے نے بے نیازی سے کہا۔

''وہ ماروی سے کہیں خوبصورت ہے۔'' نفیسہ بیگم بولی۔

''ہوگی۔'' کمال رائے نے اختلاف کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ......''

''ماں جو سوچ رہی ہو، اسے سوچتی رہو۔ اس بات کو زبان پر مت لانا۔'' کمال رائے نے اپنی ماں کی بات کاٹی۔

''کمال بیٹے...... میں تمہاری ماں ہوں...... تم میری اکلوتی اولاد ہو...... میں تمہیں اب اس طرح بھٹکتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔

''ماں، مجھے سکون سے رہنے دو۔'' کمال رائے نے نفیسہ بیگم کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، بیٹے...... میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم سکون سے رہو۔'' نفیسہ بیگم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ماروی کا ذکر کر کے کمال رائے نے نفیسہ بیگم کا سکون لوٹ لیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ نارمل ہوا تھا۔ زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ خاندان کی کچھ لڑکیوں سے ہنسنے بولنے لگا تھا۔ ان لڑکیوں میں مائرہ سرفہرست تھی۔ مائرہ سے اس کی دوستی ہوتی جا رہی تھی۔ نفیسہ بیگم ان دونوں کو ساتھ بیٹھتا دیکھتی تو بہت خوش ہوتی تھی۔ اس نے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ مائرہ کو اپنی بہو بنائے گی لیکن کمال رائے نے ماروی کا ذکر کر کے نفیسہ بیگم کی ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے فکرمند ہو گئی تھی۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ مائرہ، اپنی ماں کے ساتھ حویلی آ گئی۔ نفیسہ بیگم ان دونوں کو دیکھ کر کھل اُٹھی۔ اس نے ان کا بڑھ کر استقبال کیا۔ اس نے اپنی بھابھی نجمہ سے اُداس لہجے میں کہا۔ ''بھابھی، میں کل سے بڑی پریشان ہوں۔''

''ہائے...... کیا ہوا؟'' نجمہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''کمال رائے کا دماغ پھر اُلٹنے لگا ہے۔ وہ ماروی کو کسی طرح بھولتا ہی نہیں۔'' نفیسہ بیگم نے بتایا۔

''اب کیا ہوا؟'' نجمہ نے پوچھا۔

''وہ اس دن مائرہ کو چھوڑنے گیا تھا تو راستے میں اسے کہیں ماروی نظر آ گئی۔''

''یہ بات مائرہ نے مجھے بتائی تھی۔'' نجمہ نے کہا۔

''تو کیا مائرہ نے بھی ماروی کو دیکھا تھا؟'' نفیسہ بیگم نے پوچھا۔

''نہیں، اس نے نہیں دیکھا تھا...... وہ کہہ رہی تھی کہ میں نے اونٹ پر بیٹھی عورت کو غور سے دیکھا ہی نہیں۔'' نجمہ نے بتایا۔

''بتاؤ جو لڑکی گاڑی میں بیٹھی تھی، اس نے تو دیکھا نہیں...... لیکن اس نے گاڑی چلاتے ہوئے اسے دیکھ لیا۔'' نفیسہ بیگم نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''نفیسہ آپا...... کمال کو کسی پیر فقیر کو کیوں نہیں دکھا لیتیں...... اس کی جھاڑ پھونک کروا لو...... ٹھیک ہو جائے گا۔'' نجمہ نے اپنی تجویز پیش کی۔

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' نفیسہ بیگم نے نجمہ سے اتفاق کیا۔ ''پر میں پیر فقیر لاؤں کہاں سے...... میں تو کسی کو جانتی نہیں......''

''آپا تم فکر مت کرو۔ میں جانتی ہوں، ایک لڑکی کو...... تمہیں میرے ساتھ حیدرآباد چلنا ہوگا۔''

''چلوں گی...... ضرور چلوں گی۔'' نفیسہ بیگم نے فوراً ہامی بھر لی۔ ''حیدرآباد جانا مشکل ہے...... پر تم تو کسی لڑکی کی بات کر رہی ہو۔ بھلا کوئی لڑکی اس معاملے میں کیا کر سکے گی۔''

''آپا بس تم میرے ساتھ چلو...... وہاں چل کر دیکھنا کہ وہ لڑکی کیا کر سکتی ہے کیا نہیں۔'' نجمہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ہاں بس تم کمال کی کوئی استعمال شدہ چیز ساتھ لے لینا۔ مثلاً اس کا رومال، کوئی قمیض...... اس کا قلم بھی لے سکتی ہو۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' نفیسہ بیگم نے زیادہ بحث میں اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔

☆......☆......☆

وہ ایک عام سا علاقہ تھا۔ عام سے علاقے کا عام سا گھر جہاں لاکھوں کی بھیر ور کی...... بھیرو سے نفیسہ بیگم، نجمہ، اس کی بہن شمسہ اور نفیسہ کی ملازمہ خاص بھاگ بھری اُتری۔

نجمہ نے اپنی بہن شمسہ کو حیدرآباد سے ساتھ لے لیا تھا۔ دراصل شمسہ ہی اس لڑکی سے واقف تھی۔

شمسہ نے آگے بڑھ کر بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے ان بڑے گھر کی عورتوں کو حیرت سے دیکھا اور بولی۔ ''جی؟''

''ہمیں نور بانو سے ملنا ہے۔'' شمسہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''اچھا میں ان سے پوچھتی ہوں، آپ چند لمحے انتظار کریں۔'' یہ کہہ کر وہ ادھیڑ عمر خاتون اندر چلی گئی۔ یہ نور بانو کی ماں تھی۔

نفیسہ بیگم نے پریشانی سے نجمہ کو دیکھا، اس کے دل کو دھڑکا لگا کہ کہیں وہ ملنے سے انکار نہ

کردے۔ نجمہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی۔

کچھ دیر کے بعد بند دروازہ پھر کھلا اور نور بانو کی ماں حور بانو نے دروازے کے دونوں پٹ کھول کر کہا۔ ''اندر آجائیں۔''

حور بانو نے ان خواتین کو سادہ سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر ان سے مخاطب ہو کر بولی۔

''میرے ساتھ صرف وہ آئے جسے مسئلہ درپیش ہے۔''

نجمہ نے فوراً نفیسہ بیگم کو اشارہ کیا۔ ''جاؤ۔''

''تم بھی چلو۔'' نفیسہ بیگم اُٹھتے ہوئے ذرا ہچکچائی۔ وہ آہستہ سے نجمہ سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں ...... آپا ...... یہ بات ان کی ناراضگی کا باعث بنے گی۔'' نجمہ کی بجائے شمسہ نے جواب دیا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے۔'' بالآخر نفیسہ بیگم اُٹھی اور حور بانو کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

پھر وہ جس کمرے میں نفیسہ بیگم کو لئے داخل ہوئی، اس میں سبز رنگ کا ایک سادہ سا قالین بچھا ہوا تھا اور سفید کور چڑھے دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ حور بانو نے نفیسہ بیگم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''آپ بیٹھیں۔ وہ ابھی آتی ہیں۔''

یہ کہہ کر حور بانو باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نفیسہ بیگم نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی اور گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں کھلے دروازے پر تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک چھوٹی سی لڑکی داخل ہوئی۔ اس کی عمر بمشکل چودہ پندرہ سال ہوگی۔ نفیسہ بیگم نے اسے دیکھا تو سمجھا کہ یہ کوئی پیغام وغیرہ لے کر آئی ہے۔ شاید وہ خاتون ابھی مصروف ہیں ...... لیکن ایسا نہ تھا۔ وہ لڑکی بذات خود نور بانو تھی۔ وہ پورے اطمینان سے کمرے میں رکھے دوسرے گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے گہری نظر سے نفیسہ بیگم کا جائزہ لیا اور پھر مسکرا کر بولی۔ ''روشن گوٹھ کی وڈیری کو آخر ہم سے کیا کام پڑ گیا۔''

یہ سن کر وہ حیران رہ گئی۔ اس لڑکی کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں۔ تب اسے نجمہ کا کہا جملہ یاد آیا کہ وہاں چل کر دیکھنا کہ وہ لڑکی کیا کر سکتی ہے کیا نہیں۔

اس لڑکی نے پہلا جملہ بول کر ہی نفیسہ بیگم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ آگے تو وہ نہ جانے کیا انکشافات کرنے والی تھی۔

''میں اپنے بیٹے کے سلسلے میں آئی تھی۔'' نفیسہ بیگم نے فوراً جواب دیا۔

''کیا ہوا آپ کے اکلوتے بیٹے کو۔'' نور بانو نے نفیسہ بیگم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نفیسہ بیگم اس انکشاف پر پھر حیران رہ گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ نجمہ اسے صحیح جگہ لے کر آئی

ہے۔ اس کا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔

تب نفیسہ بیگم نے کمال رائے کے بارے میں ہر وہ بات بتا دی جو ضروری تھی۔

وہ لڑکی نور بانو بڑے تحمل اور توجہ سے نفیسہ بیگم کی بات سنتی رہی۔ جب نفیسہ بیگم خاموش ہوئی تو نور بانو بولی۔ ''کمال رائے کا ہمیں قلم درکار ہے۔''

''میں لائی ہوں بی بی۔'' یہ کہہ کر نفیسہ بیگم نے کمال رائے کا پین اپنے بیگ سے نکالا اور اُٹھ کر نور بانو کے حوالے کر دیا۔

نور بانو نے اس بند قلم کو ایک نظر دیکھا اور پھر اپنے بائیں ہاتھ میں دبا لیا۔

''ایک سوال پوچھ سکتی ہوں بی بی؟'' نفیسہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جی، پوچھیے۔'' نور بانو نے اجازت دی۔

''کیا کمال رائے نے واقعی ماروی کو دیکھا ہے؟''

نور بانو نے ایک لحہ توقف کئے بغیر فوراً جواب دیا۔ ''جی ہاں، یہ سچ ہے۔''

''کیا ماروی زندہ ہے؟'' نفیسہ بیگم نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں، یہ غلط ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ماروی مر چکی ہے۔''

''یقیناً۔'' نور بانو نے بڑے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

''ماروی مر چکی ہے۔ اس کے باوجود دکھائی دے رہی ہے۔ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔''

''آپ اس بات کو سمجھ نہیں سکیں گی۔'' نور بانو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب آپ چاہتی کیا ہیں، یہ بتائیں۔''

''میں کمال کو ماروی کی یادوں سے الگ کرنا چاہتی ہوں۔''

''ایک بات بتائیے ...... کیا آپ کو اپنی پوتی یاد نہیں آتی۔'' نور بانو نے اچانک گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

''کیا وہ زندہ ہے؟'' نفیسہ بیگم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''ہاں، وہ زندہ ہے ...... ایسی خوبصورت بچی تو دور دور تک کہیں نہیں ہے، اسے آپ بھولے بیٹھی ہیں۔ پہلے ہم اس بچی کیلئے کچھ کرتے ہیں ...... پھر ماروی کا مسئلہ دیکھیں گے۔ ماروی کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ یوں اس بچی کو بھی بازیاب کرانا آسان نہیں۔ وہ بچی بڑے خبیثوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

"آج ہم نے آپ کو بہت کچھ بتا دیا۔ اب دو دن کے بعد آیئے گا۔ پھر آپ سے ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر نور بانو نے اپنے سر سے چادر اُتاری اور نفیسہ بیگم کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

دو دن کے بعد جب نفیسہ بیگم دوبارہ نور بانو کی خدمت میں حاضر ہوئی تو نور بانو نے کہا۔ "ہمیں چھ چاقو اور چھ لیموں درکار ہیں۔"

"کوئی مسئلہ نہیں مل جائیں گے۔" نفیسہ بیگم نے فوراً کہا۔

"لیکن یہ چیزیں ہمیں بچی کے باپ نے فراہم کرنی ہیں...... وہ چھ چاقو اور چھ لیموں خود اپنے ہاتھوں سے خریدے اور خود ہم تک پہنچائے۔" نور بانو نے مزید ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے...... میں کل کمال رائے کو لے کر آجاؤں گی۔"

"عصر اور مغرب کے درمیان یہاں آئیں...... نہ پہلے نہ بعد میں۔" نور بانو نے کہا۔

"بہتر...... ایسا ہی ہوگا۔" نفیسہ بیگم نے اقرار میں گردن ہلائی۔

"بس پھر آپ جائیں۔" نور بانو نے سنجیدگی سے کہا۔

نفیسہ بیگم اس کے پاس مزید بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ بچی اور ماروی کے بارے میں سوال کرنا چاہتی تھی لیکن نور بانو نے اس کا موقع نہ دیا۔ اس نے اپنی بات مکمل کر کے فوراً ہی اس کو اُٹھا دیا۔ نفیسہ بیگم دل میں حسرت لئے نور بانو کے کمرے سے باہر آگئی۔

ڈرائنگ روم میں بھاگ بھری بیٹھی تھی، وہ اپنی مالکن کو دیکھ کر فوراً کھڑی ہوگئی۔

پھر وہ دونوں باہر کھڑی پجیرو میں بیٹھ گئیں اور گاڑی روشن کوٹھ کی جانب چل دی۔

جہاں کمال رائے اپنی ماں کا بے قراری سے انتظار کر رہا تھا۔ جب سے اس نے اپنی ماں کی زبانی یہ سنا تھا کہ اس کی بچی زندہ ہے اور اسے مل سکتی ہے، تب سے اس کے اندر ایک نیا کمال رائے انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ اس کی بے قراری دیکھنے والی تھی۔ وہ تو اپنی ماں کے ساتھ حیدر آباد جانا چاہتا تھا لیکن نفیسہ بیگم نے اسے اپنے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ نور بانو لڑکی تھی، وہ کمال رائے کے سامنے آنا پسند کرے یا نہ کرے۔ ہوسکتا ہے وہ اس کی آمد کی خبر سن کر کہیں ناراض ہی نہ ہو جائے۔

بچی کے زندہ ہونے کی خبر نے اس کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ ماروی کو بھول گیا تھا۔ اب وہ اپنی بچی کیلئے بے قرار تھا۔ وہ بچی اس کی ماروی کی نشانی تھی۔ ماروی نہ رہی تو کم از کم اس کی نشانی تو مل جائے۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ اب نور بانو اس کی بچی کے بارے میں مزید کیا بتاتی ہے۔

جب نفیسہ بیگم حویلی پہنچی تو اس نے اس کے حویلی میں آتے ہی سوال کیا۔ "ماں کیا ہوا؟ نور بانو

نے کیا کہا؟"

نفیسہ بیگم نے اسے بتا دیا کہ نور بانو نے کیا چیزیں طلب کی ہیں۔ کمال رائے کیلئے ان چیزوں کا حصول کیا معنی رکھتا تھا۔ نور بانو نے چھ چاقوؤں کے بجائے اگر چھ سو چاقو بھی مانگے ہوتے تو وہ اس کی خدمت میں حاضر کر دیتا۔

بہر حال وہ اگلے دن وقت مقررہ پر چھ چاقو اور چھ لیموں لے کر نور بانو کے گھر پہنچ گیا۔ نفیسہ بیگم ساتھ تھی۔ نور بانو کی ماں حور بانو نے ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر اندر چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اندر سے آئی تو اس نے کمال رائے کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ کمال رائے فوراً اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی مطلوبہ چیزیں اُٹھائیں اور حور بانو کے پیچھے چل دیا۔ نفیسہ بیگم نے بھی اس کے ساتھ چلنا چاہا تو حور بانو نے رک کر اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے سے منع کر دیا۔

حور بانو نے کمال رائے کو سبز قالین والے کمرے میں بٹھایا۔ اس کے بیٹھتے ہی نور بانو کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ نور بانو کو دیکھ کر فوراً احتراماً کھڑا ہوگیا۔

نور بانو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی سامنے پڑے گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے چند لمحے بغور کمال رائے کا چہرہ دیکھا۔ کمال رائے نے اپنی نظریں نیچی کر رکھی تھیں۔ چہرہ دیکھنے کے بعد وہ بولی۔ "لایئے کمال صاحب...... چاقو اور لیموں۔"

کمال رائے نے چھ چاقو اور چھ لیموں اُٹھ کر اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔

نور بانو نے ایک چاقو اُٹھا کر اسے کھولا۔ اس چاقو کا پھل کوئی تین انچ کا تھا۔ وہ سارے چاقو سائز میں برابر تھے، نئے تھے، اس کی ہدایت کے مطابق تھے۔ نور بانو نے چاقو کا دستہ مٹھی میں دبا کر اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ کچھ اس انداز میں جیسے وہ چاقو کا پھل قالین میں گاڑ دے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس نے چاقو ہاتھ میں لئے کمال رائے کو حکم دیا۔ "ایک لیموں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر، ہتھیلی میرے سامنے پھیلا لو۔"

کمال رائے نے ڈرتے ڈرتے لیموں اپنے ہاتھ پر رکھا اور ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ جانے وہ کیا کرنے والی تھی۔

"کمال صاحب...... کیا آپ کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی؟" نور بانو نے اچانک سوال کیا۔

اس نے چاقو والا ہاتھ اوپر اُٹھایا ہوا تھا اور اس کے سامنے کمال رائے نے ہاتھ پھیلایا ہوا تھا جس پر لیموں رکھا تھا۔

"جی ہاں...... مجھے اس سے بہت محبت ہے؟" کمال رائے نے بڑی سادگی سے کہا۔

"کاش......آپ نے یہ محبت اپنی بیوی کی موت سے پہلے کی ہوتی......اس پر جو قیامت گزر گئی......شاید وہ نہ گزرتی۔"

"مجھے اپنی لاپروائی کا اچھی طرح احساس ہے......اب کیا کروں......گیا وقت واپس نہیں آ سکتا......اگر میں اسے اپنی زندگی دے کر واپس لا سکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔" کمال رائے نے بڑے خلوص سے کہا۔

"کمال صاحب......جس طرح گیا وقت واپس نہیں آتا...... بالکل ایسے ہی جانے والے بھی لوٹ کر نہیں آتے۔" نور بانو بولی۔

"ابھی چند دنوں پہلے میں نے ماروی کو دیکھا تھا......آخر وہ کون تھی؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"فی الحال اتنا سن لیں کہ آپ کی ماروی مر چکی ہے......اس بات پر یقین کر لیں......رہا یہ سوال کہ ماروی کے روپ میں آپ نے کس کو دیکھا......وقت آنے پر وہ بھی بتا دیا جائے گا......" نور بانو نے کہا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک ویسے ہی اٹھا ہوا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ "فی الحال آپ اپنی بچی کی فکر کریں۔"

"مجھے بتائیں......وہ کہاں ہے؟......اس کیلئے مجھے پاتال میں بھی جانا پڑا تو جاؤں گا۔"

"وہ بڑی خبیث مخلوق ہے......آپ ان کا کچھ نہ بگاڑ پائیں گے۔"

"پھر میری بچی کس طرح بازیاب ہوگی۔"

"ہم کریں گے اسے بازیاب......انشاء اللہ......آپ کی بچی دو دن کے اندر آپ کی حویلی پہنچ جائے گی۔" یہ بڑا عجیب دعویٰ تھا۔

کمال رائے نے اپنی بچی کی آمد کی نوید سنی تو خوشی میں کچھ کہنا چاہا لیکن نور بانو نے فوراً اسے روک دیا۔ وہ بولی۔ "بس اب کوئی سوال نہیں۔"

اس کے بعد نور بانو بھی خاموش ہوگئی......اب اس کی نظر چاقو کی نوک پر تھی اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن وہ کیا پڑھ رہی تھی، یہ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

جب کمال رائے کی ہتھیلی پر رکھے لیموں اور چاقو کی نوک کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رہ گیا تو اچانک لیموں اوپر اٹھا اور چاقو میں پیوست ہو گیا یا یوں کہنا چاہئے کہ چاقو لیموں میں گھس گیا۔

"دیکھو تم نے کمال صاحب کی بیٹی کو بازیاب کرانا ہے۔" نور بانو نے لیموں پر نظر جمائے بولی۔ وہ جانے کس سے مخاطب تھی۔

اسی وقت لیموں کے اندر سے دو قطرے خون کے نکلے وہ خون بہہ کر تھوڑا سا ہی نیچے آیا تھا

کہ جم گیا۔

"شاباش۔" نور بانو نے خوش ہو کر کہا اور پھر چاقو میں پیوست لیموں کو مع چاقو ایک بڑی پلیٹ میں رکھ دیا۔

پھر نور بانو نے تمام لیموؤں پر یہی عمل دہرایا......اس کے بعد اس چاقوؤں سے بھری پلیٹ کو اٹھایا اور کھڑی ہوگئی......اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر کمال رائے بھی کھڑا ہوگیا۔

"کمال صاحب......اب آپ اطمینان سے اپنے گھر جائیں......آج منگل ہے......دو دن کے بعد یعنی جمعہ کی صبح کو آپ کی بچی حویلی پہنچ جائے گی......اب آپ جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے کمال رائے کے جواب کا انتظار نہیں کیا، فوراً کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

کمال رائے کیلئے یہ دو دن قیامت بن گئے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ دو دن پلک جھپکتے میں گزر جائیں لیکن بھلا ایسے کیسے ہو سکتا تھا۔

وہ بار بار اپنی ماں سے سوال کرتا تھا۔ "ماں، کیا واقعی میری بیٹی آ جائے گی۔"

نفیسہ بیگم جواب دیتی۔ "کیوں نہیں بیٹے...... جب نور بانو نے کہہ دیا ہے تو وہ ضرور آ جائے گی۔"

لیکن اسے یقین نہ آتا تھا، نور بانو ایک چودہ پندرہ سال کی چھوٹی سی لڑکی تھی وہ آخر کس طرح کشف و کرامت والی بن گئی پھر چاقو اور لیموں کا معاملہ......لیموں کس طرح اٹھ کر چاقو میں پیوست ہوا تھا اور کس طرح خون کے دو قطرے نکلے تھے...... یہ سب تو اس کے سامنے ہوا تھا......وہ اسے جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔

پھر نور بانو کے بہت سے قصے سنے تھے۔ وہ واقعات بڑے معتبر ذرائع سے اس تک پہنچے تھے۔ یہ واقعات بھی نور بانو کو ایک انوکھی لڑکی ثابت کرتے تھے......اس چھوٹی سی لڑکی کے پاس جانے کیا چیز تھی...... کوئی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا......اس لڑکی کی شخصیت کتنی ہی پُراسرار سہی بہرحال وہ مخلوق خدا کی خدمت کر رہی تھی اور اس سلسلے میں وہ کسی سے ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرتی تھی۔

نور بانو کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس کی ماں حور بانو ایک ...ل میں ٹیچر تھی، معقول تنخواہ تھی، کچھ وہ ٹیوشن پڑھا لیتی تھی، ٹھیک ٹھاک گزارہ چل رہا تھا۔ نور بانو ...ٹ ایئر کی طالبہ تھی جب وہ کالج جاتی تو ایک نارمل لڑکی ہوتی۔ کالج میں اس کے بارے میں کوئی ...یں جانتا تھا کہ نور بانو روحانی طاقتوں کی مالک ہے۔ وہ اپنے بارے میں کوئی چرچا نہیں کرتی تھی ...ا لوگوں کو بھی وہ تاکید کرتی تھی کہ اس بات کو آگے نہ بڑھائیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایک بار بھی کسی کا ...مل ہو جاتا تو وہ پھر دو چار بندوں کو اپنے ساتھ لائے بنا نہ رہتا۔

نفیسہ بیگم بھی اسی طرح اس تک پہنچی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ نور بانو نے از خود دلچسپی لے کر کمال رائے کی بیٹی کو بازیاب کرانے کی نوید دی تھی ورنہ وہ کبھی آنے والے لوگوں کو کورا جواب بھی دے دیتی تھی۔

کمال رائے کے یہ دو دن بڑے مشکلوں سے کٹے تھے۔

پھر جمعہ کی صبح نمودار ہوئی۔ اس رات کمال رائے بے چینی سے پوری حویلی میں ٹہلتا رہا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری۔ آخر اس کی بیٹی آ رہی تھی۔ وہ بیٹی جس کے ملنے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی، کمال رائے نے اس کی موت کا یقین کر لیا تھا۔ ایک دن کی بچی جسے اونٹ پر لاد کر صحرا میں چھوڑ دیا جائے وہ بھلا کس طرح زندہ رہ سکتی تھی لیکن مارنے والے سے بچانے والے کی ذات بڑی ہوتی ہے، جسے اللہ زندہ رکھنا چاہے، اسے بھلا کون مار سکتا ہے۔

کمال رائے نے حویلی کا بیرونی دروازہ کھلوا دیا تھا۔ چوکیدار سے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی بچی نظر آئے تو وہ اسے اندر آنے دے...... روشنی نمودار ہوتے ہی وہ حویلی کی اصل عمارت کے گیٹ پر بیٹھ گیا۔ حویلی کا بیرونی دروازہ بالکل سامنے تھا۔ نفیسہ بیگم نے اسے دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تو اس کیلئے اندر سے کرسی منگوائی اور کمال رائے کو اس پر بیٹھنے کو کہا...... پھر نفیسہ بیگم خود بھی ایک کرسی پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

نور بانو نے وقت کا کوئی تعین نہیں کیا تھا بس اتنا کہا تھا کہ وہ جمعہ کی صبح کو حویلی پہنچ جائے گی۔

اس وقت پوری طرح صبح ہو چکی تھی، اچھا خاصا سورج نکل آیا تھا۔

ہر طرف اُجالا پھیلا تھا۔

کمال رائے ٹکٹکی باندھے حویلی کے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نفیسہ بیگم کی آنکھیں بھی اپنی پوتی کی دید کی منتظر تھیں۔

☆......☆......☆

برہا، پیپل کے درخت کے نیچے ایک پیڑھی پر بیٹھی تھی۔

دیوانگ کی ماں پاربتی، بالٹی سے خالی پیالوں میں دودھ ڈال رہی تھی۔ برہا بڑی دلچسپی سے پاربتی کو پیالوں میں دودھ ڈالتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا...... دھیرے دھیرے اندھیرا چھٹ رہا تھا۔

پاربتی جب سارے پیالوں میں دودھ بھر چکی تو اس نے خالی بالٹی رسوئی میں جا کر رکھی پھر وہ واپس درخت کے نیچے آئی۔ اس نے مسکرا کر برہا کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تماشا دیکھے گی۔''

''ہاں۔'' برہا نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے بڑھیا کی طرف دیکھ کر کہا۔

پاربتی نے فوراً اپنی لاٹھی زور زور سے تین بار زمین پر ماری اور بڑی پیار سے بولی۔ ''آؤ بچو۔''

اس کا یہ آواز لگانا تھا کہ مختلف جگہوں سے چھوٹے بڑے سانپ لہراتے ہوئے پیالوں کی طرف بڑھے۔

ان سانپوں کو دیکھ کر برہا کو جانے کیا شرارت سوجھی کہ اس نے پاربتی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بچو۔''

برہا کی آواز نے ان سانپوں کو چونکا دیا۔ وہ دودھ بھرے پیالوں کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئے...... سارے سانپوں نے برہا کو اپنی چمکتی آنکھوں سے دیکھا پھر وہ دودھ پینا بھول کر برہا کی طرف بڑھے اور اس کی پیڑھی کے گرد چکر لگانے لگے۔ پاربتی نے جب ان سانپوں کو برہا کے گرد چکر لگاتے دیکھا تو اسے خود چکر آ گئے۔

تب برہا کھل کھلا کر ہنسی اور اسی کے انداز میں بولی۔ ''دیکھا تماشا۔''

''ہاں، دیکھا......'' پاربتی نے مسکراتے ہوئے کہا، اس کی آنکھوں میں برہا کے لئے پیار تھا۔ ''تو واقعی پرمان کا انتخاب ہے...... تیرا کوئی جواب نہیں۔''

''جاؤ بچو...... دودھ پیو۔'' برہا نے ان سانپوں سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ لہراتے ہوئے اپنے پیالوں کی طرف بڑھ گئے۔

دیوانگ اس وقت گھر پر نہ تھا۔ وہ صبح تڑکے ہی گھر سے نکلا تھا۔ اروشی سبزی ترکاری لینے کیلئے بازار گئی ہوئی تھی۔ اس وقت گھر پر برہا اور پاربتی کے سوا کوئی نہ تھا۔

ابھی وہ سانپ پیالوں میں منہ ڈالے دودھ پی رہے تھے کہ کسی نے دروازے کی کنڈی بڑے زور سے بجائی۔

''برہا، دروازہ کھول...... دیکھ اروشی سبزی لے کر آئی ہوگی۔'' پاربتی نے کہا۔

''اچھا۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی اس نے دروازے کے درمیان لگی زنجیر کھولی۔ زنجیر کھلتے ہی کسی نے دروازے کو دھکا دیا اور دروازے کے سامنے کھڑی برہا کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

اچانک ہی دیوانگ کی ماں پاربتی کو خطرے کا احساس ہوا وہ جلدی جلدی لاٹھی ٹیکتی دروازے کی طرف بڑھی، وہ جب تک دروازے پر پہنچی اس وقت تک واردات ہو چکی تھی۔ کھیل ختم ہو چکا تھا، گلی سنسان پڑی تھی...... وہاں دور تک کوئی نہ تھا۔

پاربتی دھک سے رہ گئی...... یہ کیا ہوا؟...... برہا پرمان کا انتخاب تھی اور اسے دیوانگ بطور امانت یہاں لایا تھا۔ کوئی وہ امانت اس کے گھر کے دروازے سے اُٹھا لے گیا تھا...... آخر کون تھا وہ؟

یہ وہ نہ دیکھ پائی تھی۔

☆......☆......☆

وہ ایک مضبوط اور پھرتیلے جسم کا مالک تھا۔

سفید چمکتا ہوا چہرہ، کالی خوبصورت داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں...... سرخ لباس...... وہ مضبوط شخص برہا کو اپنے کندھے پر ڈالے بہت تیزی سے دوڑ رہا تھا یہاں تک کہ وہ بستی سے دور دریا کے کنارے آپہنچا۔

پھر وہ پُرنور چہرے والا سرخ پوش دریا میں اُتر گیا۔ برہا اس کے کندھے پر بے ہوش پڑی تھی، دریا میں زیادہ پانی نہ تھا، وہ تیز تیز چلتا دریا عبور کرنے لگا۔

جب وہ دوسرے کنارے پر پہنچا تو اچانک اس کی نظر سامنے کھڑے ایک شخص پر پڑی، اس کا استرا پھرا ہوا سر تھا، سفید چادر میں لپٹا تھا، ہاتھ میں ایک لوہے کی زنجیر تھی، وہ بڑی خونخوار نظروں سے اس سرخ پوش کو دیکھ رہا تھا جو برہا کو کندھے پر ڈالے دریا سے باہر نکلنے کو تھا۔

اس سے پہلے کہ سرخ پوش دریا سے باہر نکلتا، دیوانگ نے آگے بڑھ کر اس سرخ پوش پر اپنی زنجیر سے وار کیا، اگر وہ لوہے کی بھاری زنجیر اس سرخ پوش کے سر پر پڑ جاتی تو یقیناً اس کا سر پھٹ جاتا لیکن وہ سرخ پوش اسے دیکھتے ہی ہوشیار ہو چکا تھا...... نہ صرف روک لیا بلکہ اس نے زنجیر کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ دیوانگ کو اس کی توقع نہ تھی...... وہ اپنی زنجیر کے ساتھ دریا میں آگرا۔

وہ سرخ پوش بڑی پھرتی سے دریا سے نکلا اور اس سے پہلے کہ دیوانگ دریا سے نکل کر اس پر دوبارہ وار کرتا وہ تیزی سے جنگل کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ سرخ پوش کچھ اس رفتار سے دوڑ رہا تھا کہ اس کے مقابلے پر کوئی گھوڑا بھی ہوتا تو پیچھے رہ جاتا۔

دیوانگ دریا سے نکل کر اوپر کنارے پر آیا، تب تک وہ سرخ پوش جنگل میں روپوش ہو چکا تھا۔

یہ دیکھ کر دیوانگ کی جان نکل گئی...... پرنان کی امانت کی حفاظت وہ ٹھیک طرح نہ کر پایا تھا۔ اسے اُمید نہ تھی کہ کوئی برہا کو اس طرح اُٹھا کر لے جائے گا۔ یہ آخر کون شخص ہو سکتا ہے اور اس نے پرمان کے انتخاب پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے کی؟

بہرحال یہ سوچنے کا وقت نہ تھا...... وہ تیزی سے دوڑتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا، وہ برہا کو اس قدر آسانی سے تو نہیں لے جانے دے گا۔

دیوانگ نے جنگل میں داخل ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ جنگل سے باہر تھوڑی تھوڑی روشنی تھی لیکن یہاں تو تھوڑی روشنی بھی نہ تھی، گھنے درختوں کی وجہ سے فی الحال روشنی کے اندر آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ جنگل میں ابھی اندھیرا پھیلا ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے؟ کس طرف جائے؟

جنگل میں کوئی ایک راستہ تو نہ تھا، ہزار راستے تھے، آخر وہ کس راستے پر قدم رکھے۔ برہا کو اُٹھا کر لے جانے والا برق رفتاری سے جنگل میں داخل ہوا تھا۔ ابھی دیوانگ دریا سے نکلا بھی نہ تھا کہ وہ جنگل میں داخل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ جانے کتنا اندر جا چکا ہوگا...... کسی انجان سمت میں اس کا تعاقب کرنا فضول تھا۔

یہ وقت فوری طور پر فیصلہ کرنے کا تھا اسے پرمان کو مدد کیلئے پکار لینا چاہئے۔ اگر اس میں مزید دیر ہو گئی تو وہ برہا کو کبھی نہ پا سکے گا...... یہ سوچ کر وہ تیزی سے ایک درخت کے تنے کی طرف بڑھا۔

دیوانگ نے کچھ نامانوس سے الفاظ اپنے منہ سے نکالے اور زنجیر کو زور زور سے درخت کے تنے پر رگڑا۔ درخت سے فوراً چنگاریاں نکلنے لگیں۔

تب وہ بڑے درد بھرے لہجے میں چیخا۔ ''پرمان مدد، پرمان مدد۔''

ابھی کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ ہورا اس کے سامنے آکھڑا ہوا، دیوانگ کو ایسا لگا جیسے وہ درخت سے کودا ہو۔

''میں ہوں ہورا۔'' اس نے آتے ہی نعرہ لگایا۔

''ہورا، وہ سرخ کپڑوں والا برہا کو اُٹھا کر بھاگ رہا ہے۔'' دیوانگ نے بے قراری سے کہا۔

''او، دیوانگ تُو نے یہ کیا کیا؟'' ہورا نے اسے غضبناک نظروں سے دیکھا، پھر بولا۔ ''اچھا آ میرے ساتھ......'' اس نے دیوانگ کا ہاتھ پکڑ لیا...... ''کدھر گیا ہے وہ؟''

''میں نے اسے جنگل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔'' دیوانگ نے اسے بتایا۔

ہورا نے پھر اس سے کوئی سوال نہ کیا، اس نے اپنے کندھے پر لٹکی گھنٹی اُتاری، اسے تین بار بجایا اور پھر گھنٹی میں جھانکنے لگا۔ گھنٹی کے اندر اسے جانے کیا نظر آیا کہ اس نے دیوانگ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''بھاگ دیوانگ۔''

پھر ہورا اسے لے کر جنگل میں بھاگنے لگا۔

دو چار منٹ میں ہی دیوانگ ہانپنے لگا۔ ہورا اس قدر تیز رفتاری سے رواں دواں تھا کہ دیوانگ اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا حالانکہ نہ وہ دوڑ رہا تھا اور نہ تیز چل رہا تھا۔ اس کے باوجود زمین اس کے پیروں کے نیچے سے تیزی سے کھسک رہی تھی، ہورا نے اسے ہانپتے دیکھا تو اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''دیوانگ تُو میری گھنٹی کی آواز پر پیچھے آ...... میں آگے چلتا ہوں...... وہ سرخا بہت رفتار سے دوڑ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر ہورا نے زنجیر میں بندھی گھنٹی زور سے زمین پر ماری، ریت کا ایک بادل سا اُٹھا اور ہورا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ گھنٹی کی آواز دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھی۔

دیوانگ اس آواز پر سرپٹ دوڑنے لگا۔

☆......☆......☆

وہ سرخ پوش جو جنگل میں کافی اندر نکل آیا تھا، اچانک اسے خطرے کا احساس ہوا تو وہ ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے کرتے کے بٹن کھول کر گلے میں پڑا تعویذ اپنے ہاتھ میں لیا اور جلدی جلدی کچھ پڑھ کر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''خطرہ بڑھ رہا ہے...... دوستو! تم کہاں ہو؟''

''ہم یہاں ہیں تمہارے پاس۔'' یہ کہہ کر وہ ایک ایک کر کے اس کے سامنے آناً فاناً نمودار ہو گئے۔

وہ پانچ تھے اور ان کا حلیہ بھی وہی تھا جو اس سرخ پوش کا تھا، شکلیں بھی ملتی جلتی تھیں یوں لگتا تھا جیسے وہ سگے بھائی ہوں۔''

''دوستو! میں اس لڑکی کو لے کر نکلتا ہوں...... تم اس خبیث کا انتظام کرو...... دیکھو وہ میرے پیچھے نہ آنے پائے۔'' پہلے سرخ پوش نے جس کے کندھے سے برہا لگی ہوئی تھی، انہیں ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے...... تم جاؤ...... ہم دیکھتے ہیں اس منحوس کو...... وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل کر آگے نہیں جا سکے گا...... تم بے فکر ہو کر اپنا سفر جاری رکھو۔'' ان پانچ سرخ پوشوں میں سے ایک نے کہا۔

پھر پہلے سرخ پوش نے اپنا وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا وہ برہا کو لے کر برق رفتاری سے دوڑنے لگا۔

ابھی اسے آگے گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ منحوس وہاں آ پہنچا۔ ان پانچوں نے اس کی ناکہ بندی کر دی تھی، پہلے مرحلے پر ایک سرخ پوش نے اچانک درخت کی اوٹ سے ٹانگ نکال کر اڑائی۔

ہورا دھاڑ سے منہ کے بل زمین پر گرا۔

اسے اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا، کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس کے مقابلے پر آتا اگر کوئی اس کے منہ آنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اسے کسی مچھر کی طرح مسل دیا کرتا تھا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے ٹانگ اڑائی تھی اور اسے زمین بوس کر دیا تھا۔

دو گرتے ہی فوراً اُٹھا، بڑی تیزی سے پلٹا اور اس نے زنجیر اپنے ہاتھ میں لے لی جس میں گھنٹی بندھی ہوئی تھی اس نے زنجیر کو غصے میں کچھ اس طرح جھٹکا دیا کہ وہ بری طرح بج اُٹھی۔

''کون ہے؟...... کس نے اپنی موت کو دعوت دی ہے...... آؤ، سامنے آؤ۔''

تب وہ سرخ پوش جس نے اسے اُڑنگا مار کر گرایا تھا، درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔

دونوں نے مقابل ہو کر ایک دوسرے کو گھورا۔

''کس بستی کا ہے تُو؟'' ہورا نے اس کے حلیے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

''اللہ کی بستی کا۔'' سرخ پوش نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''برہا کو کس لئے اغوا کیا ہے؟'' ہورا نے غصے سے پوچھا، زنجیر میں لٹکی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔

''ہم نے اغوا نہیں کیا...... ہم نے تم خبیثوں سے اسے چھڑایا ہے۔ اس معصوم بچی کو نجات دلائی ہے۔ وہ کسی کی امانت ہے۔'' سرخ پوش نے بتایا، اس کی نظریں ہورا کے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی دیکھ رہی تھیں جو پیچھے سے اس کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔

''کیا بکتا ہے؟...... وہ صرف پرمان کی امانت ہے، اس کا انتخاب ہے، اسے پرمان سے کوئی نہیں چھین سکتا...... لاؤ...... فوراً برہا کو میرے حوالے کر دو...... ورنہ...... دیکھ لو موت تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' ہورا نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

''اچھا...... مجھے دھمکی دیتا ہے...... خبیث وہ بچی تو یہاں سے بہت دور جا چکی۔''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر ہورا نے زنجیر گھمائی۔

اس سے پہلے کہ وہ گھنٹی سامنے کھڑے سرخ پوش کے سر پر لگتی...... پیچھے کھڑے ایک سرخ پوش نے جھٹکا مار کر اس کے ہاتھ سے چھین لی اور ایک لمحہ ضائع کئے بنا اس کے سر پر گھما کر دے ماری۔

پیتل کی وزنی گھنٹی جب ہورا کے سر پر پڑی تو اس نے اپنے سر میں آگ بھرتی ہوئی محسوس کی، اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھا گیا۔

اس سرخ پوش نے ایک وار پر ہی اکتفا نہ کیا۔ اس نے دو تین گھنٹیاں اور سر پر ماریں...... ہورا کسی شہتیر کی طرح زمین پر آ رہا اور اپنے ہوش گنوا بیٹھا۔

پھر اس سرخ پوش نے جس نے اس سے گھنٹی چھینی تھی، گھنٹی اس کے چوڑے چکلے سینے پر ڈال دی اور سامنے کھڑے سرخ پوش کی طرف دیکھا جس نے اڑنگا مار کر ہورا کو گرایا تھا۔

وہ سرخ پوش خاموش کھڑا جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کوئی دوڑتا ہوا...... اس طرف آ رہا ہے...... اگرچہ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہے۔'' اس سرخ پوش نے کہا۔

''چلو...... پھر اسے بھی آ جانے دو...... اسے بھی ٹھکانے لگانے کے بعد واپس چلیں گے۔''

پھر وہ پانچوں سرخ پوش بے ہوش ہورا کے ارد گرد ہی درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے اور آنے والے کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ درختوں کی اوٹ سے دیوانگ باہر آیا، وہ بہت تیزی سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ جب اس کی نظر زمین پر پڑے ہورا پر گئی تو اس کی سٹی گم ہو گئی...... ہورا چاروں شانے چت بے ہوش پڑا تھا اور اس کی گھنٹی اس کے چوڑے چکلے سینے پر رکھی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر ٹھہر گیا اور یہ

دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے پھٹے ہوئے سر سے خون بہہ کر زمین کو نیلا کر رہا ہے۔ ایک خوف کی لہر اس کے اندر اُٹھی۔ اس نے چاروں طرف گھبرا کر دیکھا اسے آس پاس کوئی نظر نہ آیا تو وہ خوش ہوا پھر وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرے...... اُلٹے قدموں واپس اپنی بستی چلا جائے یا ہرا کو اُٹھا کر لے جانے والے کا تعاقب کرے؟

تعاقب کرنے کا نتیجہ تو اس کے سامنے زمین پر زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اب ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ واپس روانہ ہو جائے، ابھی وہ واپس جانے کیلئے مڑنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک سرخ پوش پر پڑی جو مسکراتے ہوئے تنے کے پیچھے سے نمودار ہو رہا تھا۔

پھر اس کی نظریں ایک جگہ نہ ٹھہر سکیں کیونکہ ایک سرخ پوش دائیں سے درخت کی اوٹ سے باہر آرہا تھا تو دوسرا سامنے سے چلا آرہا تھا، کوئی درخت سے کود رہا تھا تو کوئی بائیں جانب سے مسکراتا ہوا اس کے سامنے آرہا تھا، وہ کدھر کدھر دیکھتا۔

چند لمحوں میں وہ پانچوں کے پانچوں سرخ پوش اس کے سامنے آگئے۔ دیوانگ کے پسینے چھوٹ گئے، وہ ہورا کا انجام دیکھ چکا تھا۔ ہورا کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہ تھا، اس نے راہِ فرار کیلئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن ان پانچوں نے اس کے گرد کچھ اس طرح گھیرا تنگ کیا تھا کہ وہ ان کے نرغے سے نکل کر نہیں بھاگ سکتا تھا۔ البتہ ایک راستہ تھا کہ وہ کسی بندر کی طرح چھلانگ مار کر درخت پر چڑھ جائے...... اس کیلئے وہ مجبور تھا کہ وہ بندر کی نسل میں سے نہ تھا۔

''ہاں بھئی...... اب تُو کیا چاہتا ہے...... اس لبو کا تو تُو نے حشر دیکھ لیا۔'' ایک سرخ پوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں کچھ نہیں چاہتا...... میں واپس اپنی بستی جانا چاہتا ہوں۔'' دیوانگ نے گھگھیا کر کہا۔

''ٹھیک ہے اگر تُو واپس جانا چاہتا ہے تو ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے...... تُو واپس چلا جا...... جو ہمارے ساتھ سیدھا رہتا ہے ہم بھی اس کے ساتھ سیدھے رہتے ہیں...... تیرے اس لبو نے ہمارے ساتھ ٹیڑھا چلنے کی کوشش کی تھی...... تو ہم نے بھی اسے اپنا ہاتھ دکھا دیا، جا اسے اپنے کندھے پر ڈال کر لے جا...... یہاں پڑا پڑا...... یہ مر جائے گا۔'' ایک سرخ پوش نے کہا۔

''آؤ، دوستو چلو۔'' دوسرا سرخ پوش بولا۔

اور پھر وہ جس طرح نمودار ہوئے تھے، ویسے ہی چند لمحوں میں غائب ہو گئے۔ دیوانگ اُنہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

☆......☆......☆

بابا اور دادی اس بچی کے شدت سے منتظر تھے جس کے بارے میں نور بانو نے پیش گوئی کی تھی کہ

وہ جمعہ کی صبح کو حویلی پہنچ جائے گی...... اس وقت خاصا سورج چڑھ آیا تھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے، ان دونوں کو حویلی کے دروازے پر بیٹھے اور بیرونی دروازہ تکتے خاصی دیر ہو گئی تھی۔

جمعہ کی صبح تیزی سے گزر رہی تھی اور کمال رائے کے دل پر مایوسی کے بادل چھاتے جا رہے تھے...... کبھی وہ بیرونی گیٹ کو دیکھتا تھا تو کبھی اپنی ماں کے چہرے کو تکنے لگتا تھا۔

اس کی ماں پُرامید ہو کر مسکرا دیتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کمال رائے کو حوصلہ دیتی تھی...... آخر کب تک؟

''میرا خیال ہے...... ماں، ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں...... حویلی کے ملازم ہمارے بارے میں جانے کیا سوچ رہے ہوں گے۔'' کمال رائے نے بالآخر کہا۔

''نہیں کمال ایسا مت سوچو...... نور بانو نے کہا ہے تو تمہاری بچی، میری پوتی ضرور واپس آئے گی...... حوصلے سے کام لے، ملازموں کو سوچنے دو...... وہ جو چاہے سوچیں...... جب ہماری بچی آجائے گی...... تو سب کی سوچوں کو زبان مل جائے گی۔'' نفیسہ بیگم نے بڑے تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

ابھی وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک کمال رائے کی بیرونی گیٹ پر نظر پڑی...... ایک خوبصورت بچی بیرونی گیٹ میں داخل ہو چکی تھی۔

''ماں وہ دیکھو'' کمال رائے خوشی سے چیخ اُٹھا...... میری بچی آگئی...... ماں میری بچی آگئی...... ماں تمہاری پوتی آگئی......''

''ہاں، ہاں...... وہی ہے...... یہ یقیناً میری پوتی ہے، تمہاری بچی ہے...... اے اللہ! تیرا شکر ہے۔'' نفیسہ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

برہا بڑی تیزی سے ناک کی سیدھ میں دوڑی چلی آرہی تھی۔ کمال رائے بے اختیار سیڑھیاں اُتر کر اس کی طرف بڑھا، وہ تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ نفیسہ بیگم بھی سیڑھیاں اُتر کر ان دونوں کی طرف لپکی۔

برہا اچانک دوڑتے دوڑتے رک گئی اس نے اپنے سامنے ایک شخص کو دوڑتے پایا تو وہ رک کر غور سے اسے دیکھنے لگی، کمال رائے بھی دوڑتے دوڑتے اچانک رک گیا اب ان کے درمیان پانچ قدم کا فاصلہ تھا۔

''میری بچی...... تُو یقیناً میری بچی ہے...... آ میرے پاس۔'' کمال رائے اپنی باہیں پھیلائے اس کی جانب چلا۔

''آپ کون ہیں؟'' برہا نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

''میں تمہارا باپ ہوں......تمہارا بابا ہوں بیٹی۔'' اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اُٹھالیا اور بے تحاشا اسے چومنے لگا۔ برہا نے بھی اپنی ننھی بانہیں اس کی گردن کے گرد ڈال دی تھیں اور اب وہ نزدیک آتی، ایک بڑی عمر کی عورت کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ نفیسہ بیگم ہانپتی کانپتی ان دونوں کی طرف بڑھی چلی آرہی تھی۔

''یہ کون ہیں؟'' برہا نے پھر بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

''یہ تمہاری دادی ہیں، بیٹی۔'' کمال رائے نے اسے جلدی سے بتایا۔

''یہ دادی کیا ہوتا ہے؟'' برہا نے پھر ایک معصومانہ سوال کیا۔

''ہیں۔'' کمال رائے کو یہ سن کر جھٹکا سا لگا۔ ''میری جان، یہ میری ماں ہیں، تمہاری دادی۔''

''اچھا۔'' برہا نے بڑی سمجھداری سے گردن ہلائی جیسے فوراً ہی اس رشتے کو سمجھ گئی ہو۔ اتنے میں نفیسہ بیگم قریب آچکی تھی۔ اس نے برہا کو کمال رائے سے جھپٹ لیا۔ ''میری بچی، میری جان......آہ! ......آج میں کتنی خوش ہوں۔'' وہ خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔

پھر کمال رائے نے اپنی ماں سے اسے لے لیا اور اس کے پھول سے رخسار پر پیار کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟''

''برہا۔'' برہا نے اپنا نام بتایا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی، آواز میں ایک نغمگی سی تھی۔

''برہا!'' کمال رائے نے ذرا حیرت سے دُہرایا، اسے یہ نام عجیب سا لگا۔ ''تمہارا یہ نام کس نے رکھا؟''

''پرمان نے۔'' وہ بولی۔

''یہ پرمان کون ہے؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''وہ مجسموں کا راجہ ہے، سانپوں کا بادشاہ ہے۔'' برہا نے معلومات فراہم کیں۔

''سانپوں کا بادشاہ؟'' کمال رائے حیران ہوا۔

''ہاں، اس کے سر پر ایک سنہرا سانپ ہر وقت کنڈلی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے سر پر تاج کی طرح سجا رہتا ہے اور ایک گلے میں پڑا رہتا ہے اور پرمان ایک بہت بڑے کمرے میں مجسموں سے کھیلتا رہتا ہے۔'' برہا نے بتایا۔

''تم کہاں رہتی تھیں؟''

''مجھے جگہ کا نام معلوم نہیں، بس اتنا جانتی ہوں کہ وہاں سانپ بہت تھے۔''

''تمہاری پرورش کس نے کی؟''

''مجھے تیوج اور ورشی نے پالا۔ دونوں نے مجھے بہت پیار سے رکھا۔'' برہا نے بتایا۔

''اس وقت تمہیں یہاں تک کون لایا؟''

''مجھے چند دنوں قبل سانپوں کی بستی سے دیوانگ کے گھر منتقل کیا گیا تھا۔ دیوانگ کی ماں پاربتی نے بہت سے سانپ پال رکھے تھے۔ وہاں سے مجھے ایک سرخ کپڑوں والے شخص نے اُٹھایا اور اس نے یہاں گھر کے سامنے چھوڑ دیا۔ اس نے آپ کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں، تب مجھے معلوم ہوا کہ میں اصل میں آپ کی بیٹی ہوں۔'' برہا نے اس سے کہا۔

''ہاں، میری جان، تم میری بیٹی ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔'' کمال رائے نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر کہا۔

اتنی دیر میں جانے حویلی کے ملازموں کو کیسے پتہ چل گیا کہ کمال رائے کی بیٹی آگئی ہے، سارے ملازم حویلی کے دروازے پر اُمڈ آئے اور برہا کو دیکھ کر نعرے لگانے لگے۔ ''آہا چھوٹی مالکن آگئیں۔''

کمال رائے نے برہا کو بھاگ بھری کی گود میں دے دیا۔ بھاگ بھری نے اسے بے اختیار پیار کیا اور پھر حویلی کے ہر ملازم سے ملوایا......جس بچی کے بارے میں پیش گوئی کی گئی تھی، وہ یہاں رہی تو حویلی سنسان ہو جائے گی۔ اسی بچی کی آمد نے حویلی کی فضا میں رنگ بکھیر دیئے تھے، ہر سُو خوشی رقصاں تھی، میلے کا سا سماں تھا۔

☆......☆......☆

دیوانگ کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ہورا جیسے دیو کو اپنے کندھے پر اُٹھا کر ٹھکانے پر لے جاتا۔ اس نے اس کے سر کے زخم کو غور سے دیکھا، دو تین جگہ سے اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور نیلا خون سر سے بہہ کر زمین پر جم گیا تھا۔ اس نے ہورا کے بائیں پیر کے انگوٹھے کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے سے اس کا کھلا ہوا منہ مزید کھل گیا مگر وہ ہوش میں نہ آیا۔ منہ کھلنے سے دیوانگ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی مرا نہیں ہے۔

تب اس نے دونوں ہاتھوں میں ریت بھر کر اس کے سر کے زخموں پر برسائی۔ اس کے سر کے بڑے سخت گھنگھریالے بالوں میں ریت بھر گئی۔ چند لمحوں میں اس ریت نے اثر دکھایا، اس کے زخم بڑی تیزی سے مندمل ہو گئے۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اپنے سامنے دیوانگ کو پایا اور خود کو زمین بوس۔ اس کو بڑی ندامت کا احساس ہوا، وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اگلے لمحے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر پر اپنا بھاری ہاتھ پھیرا تو ریت جھڑنے لگی۔ ہورا نے اپنے سر کی ریت جھاڑ کر زنجیر سے بندھی گھنٹی زمین سے اُٹھائی اور کندھے پر لٹکا لی۔ اب اس نے دیوانگ کی طرف دیکھا اور بولا۔

''وہ کئی تھے، میں نے اسے اکیلا سمجھا۔ انہوں نے مجھ پر چھپ کر وار کیا ورنہ میں انہیں زندہ

نہ چھوڑتا۔"

"میں جانتا ہوں ہورا، وہ پانچ تھے جو میرے سامنے آئے اور پٹھا وہ تھا جو برہا کو لے اُڑا۔ میں بے بس تھا، میں کیا کرتا۔" دیوانگ نے مایوسی سے کہا۔

"دیوانگ تُو برہا کی حفاظت نہ کرسکا۔ یہ تیری بہت بڑی غلطی ہے۔ تجھے پرمان کے دربار میں چلنا ہوگا۔" ہورا نے اچانک رنگ بدلا۔

"ہورا میں بے قصور ہوں۔ میں اس وقت دریا پر نہانے آیا تھا، جب اس سرخے نے برہا کو بستی سے نکالا۔" دیوانگ نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"اب تُو نے جو کچھ کہنا ہے، پرمان کے سامنے کہنا ہے۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" ہورا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

پھر اس نے دیوانگ کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ اس نے اپنے کندھے سے زنجیر اُتاری اور اس کے دونوں ہاتھ زنجیر سے جکڑ دیئے اور زنجیر پکڑے پکڑے جھک کر اسے اپنے کندھے پر ڈالا اور پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں چلنے لگا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن کمال رائے اپنی ماں کے ساتھ برہا کو لے کر نور بانو کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے جاتے ہی نور بانو کی خدمت میں کئی قیمتی جوڑے اور مٹھائی پیش کی۔ ساتھ ہی پندرہ ہزار کی نقد رقم بھی تھی۔ نور بانو نے ان چیزوں کو بڑے غصے سے دیکھا اور بڑے پھیکے لہجے میں بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ اپنے علاقے کے بڑے زمیندار ہیں اور یہ سب کچھ آپ کیلئے بہت معمولی ہے لیکن شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ میں آپ سے بڑی زمیندارنی ہوں، میرے دل کی زمین اتنی بڑی ہے کہ آپ کا پورا علاقہ اس میں سما جائے...... یہ سب چیزیں یہاں سے اُٹھایئے اور اپنی بیٹی کی آمد پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔"

کمال رائے اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ نفیسہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تو نور بانو نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ "اس مسئلے پر میں کچھ نہیں سنوں گی۔ یہ چیزیں آپ کو واپس لے جانا ہوں گی۔ میں یہاں نذر و نیاز قبول کرنے نہیں بیٹھی ہوں۔"

تب کمال رائے نے بغیر کچھ کہے، وہ چیزیں اُٹھائیں اور باہر جا کر بھاگ بھری کے حوالے کر دیں اور دوبارہ کمرے میں واپس آ گیا۔ برہا کو نور بانو نے اپنی گود میں بٹھا لیا تھا اور اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ "نور بی بی، ہم آپ کے بہت شکرگزار ہیں آپ نے جیسا کہا، ویسا ہوگیا۔ ہماری کھوئی ہوئی بچی ہمیں مل گئی۔ اب ایک مسئلہ اور ہے۔" نفیسہ بیگم نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"وہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہم نے سوچ لیا ہے۔ کمال صاحب آپ تین دن کے بعد ہمارے پاس آیئے گا اور ایک ثابت ناریل لیتے آیئے گا لیکن آیئے گا تنہا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

نفیسہ بیگم نے مسرت بھری آنکھوں سے اپنے بیٹے کمال رائے کو دیکھا، انہیں پکا یقین تھا کہ نور بانو نے ماروی کی گتھی سلجھانے کا کہہ دیا ہے تو یہ گتھی ضرور سلجھ جائے گی۔ اس طرح اس کے بیٹے کی زندگی میں مکمل سکون پھیل جائے گا اور وہ پھر کمال رائے کی شادی کے بارے میں کچھ طے کرے گی۔

☆......☆......☆

ہورا چوتھے دروازے سے ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ پرمان کمرے میں موجود تھا۔ وہ حسب معمول مجسموں کو اِدھر سے اُدھر رکھ رہا تھا۔ گویا فیصلے کی گھڑی تھی۔ رانی ملائے کا اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

جب ہورا نے دیوانگ کو سرخ اینٹوں کے فرش پر پٹخا اور زنجیر میں بندھی گھنٹی زور سے بجی تو پرمان نے فوراً پلٹ کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیوانگ کے ہاتھ زنجیر میں بندھے ہیں اور وہ رحم طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

"ارے ہورا کیا ہوا اسے؟" پرمان نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"پرمان یہ تیری امانت کی حفاظت نہ کرسکا، اس نے برہا کو گنوا دیا۔" ہورا نے بتایا۔

"ارے۔" پرمان یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ "یہ کیسے ہوا؟"

"چل دیوانگ جلدی بول۔" ہورا نے اس کے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔

"پرمان، اس میں میرا کوئی قصور نہیں وہ جانے کون تھا؟ اس نے میرے گھر سے برہا کو اُٹھایا، مجھے اٹھا کر دریا میں پھینکا، جب میری مدد کو ہورا آیا تو وہ ایک کے چھ ہو گئے۔ انہوں نے ہورا کا سر پھاڑ دیا۔ یہ بے ہوش ہو گیا تو انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ جس نے برہا کو اُٹھایا تھا، وہ بہت آگے جا چکا تھا۔ میں بے بس تھا پرمان میں کیا کرتا۔" دیوانگ نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دہائی دی۔

"یہ تو بہت برا ہوا برہا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہماری ساری محنت برباد ہو گئی۔ رنتارو تو پاگل ہو جائے گا۔" پرمان نے رانی ملائے کا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آخر وہ کون لوگ تھے جنہوں نے راجہ پرمان کے انتخاب پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی؟" رانی ملائے کا نے دیوانگ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے آج تک ایسے لوگ نہیں دیکھے، وہ ہماری بستی کے نہ تھے۔" دیوانگ نے بتایا۔

"آخر وہ تھے کون؟" پرمان کو اب غصہ آنے لگا۔ "اور تُو بھی ہورا ان کے قابو میں آ گیا۔ ذرا مجھے ان کے بارے میں تفصیل سے بتا۔"

اس مرتبہ ہورا پر جو گزری تھی وہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دی۔

پرمان نے ساری بات سن کر ایک گہرا سانس لیا۔ ''یہ تو کوئی اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ دیوانگ تم واپس جاؤ اور اوگھڑ ناتھ سے رابطہ قائم کرو، اس کے ساتھ مل کر برہا کو تلاش کرو، اگر برہا نہیں ملی تو پھر تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔''

''جو پرمان کا حکم۔ میں فوراً جاتا ہوں۔'' دیوانگ جلدی سے دروازے کی طرف پلٹا وہ خوش تھا اسے امید نہ تھی کہ پرمان اس کا قصور معاف کر دے گا۔ معاف تو خیر اس نے نہیں کیا تھا، البتہ فی الحال جان بخشی ہو گئی تھی اور اس مہلت سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ جلدی میں اس سے ایک اور غلطی ہونے لگی ہے، اس نے جاتے ہوئے پرمان کے قدموں میں اپنا سر نہیں رکھا تھا۔ وہ فوراً مڑا، اس نے پرمان کے پیروں میں اپنا سر رکھا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''جاؤ دیوانگ، پرمان نے حکم دیا ہے، وقت مت ضائع کرو۔'' ہورا نے کہا۔

دیوانگ نے ایک نظر ہورا کو دیکھا اور خفیف سا مسکراتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

تین دن کے بعد کمال رائے ناریل لے کر نور بانو کے پاس تنہا پہنچ گیا۔ یہ شام کا وقت تھا، جیسے ہی اس نے بیل بجائی۔ چند سیکنڈوں کے بعد دروازہ کھلا۔ اس کا خیال تھا کہ نور بانو کی ماں دروازے پر آئے گی۔ وہی ہمیشہ دروازے پر آتی رہی تھی لیکن وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ نور بانو بہ نفسِ نفیس دروازے پر موجود تھی۔ اس نے مسکرا کر کمال رائے کو سلام کیا اور پھر اسے راستہ دیتے ہوئے بولی۔ ''آئیے۔''

کمال رائے کے اندر آنے کے بعد نور بانو نے دروازہ بند کرنا چاہا تو پیچھے سے حور بانو کی آواز آئی۔ ''تم چلو بیٹا۔ میں بند کرتی ہوں دروازہ۔''

''اچھا ای شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

سبز قالین پر وہ گاؤں تکیے سے کمر لگا کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''آپ کی بیٹی کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ حویلی میں آ کر خوش ہے۔'' کمال رائے نے بتایا۔

''ماشاءاللہ بہت پیاری بچی ہے۔ اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔'' نور بانو نے کہا۔

''میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ نے میری بیٹی بازیاب کروا دی۔'' کمال رائے شکر گزار ہوا۔

''میں کون ہوں کچھ کرنے والی۔ یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔''

''میں آپ کے حکم کے مطابق ناریل لے آیا ہوں۔'' کمال رائے نے شاپر اُٹھا کر اس کے سامنے رکھا جس میں ثابت ناریل موجود تھا۔

''یہ ناریل ہم پڑھ کر آپ کو دے دیں گے۔ ساتھ ہی بتا دیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' نور بانو بولی۔

''مجھے کب آنا ہو گا؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''تین دن کے بعد لیکن اندھیرا ہونے کے بعد آئیے گا۔ اس ناریل کو حوالے کرتے وقت سورج کی روشنی نہیں پڑنی چاہئے۔'' نور بانو نے بتایا۔

''کیا ماروی مل جائے گی مجھے۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ آپ کی بیوی مر چکی ہے۔'' نور بانو نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کی بیوی کی لاش ایک کتے کے منہ میں ہے۔ وہ اسے گھسیٹ رہا ہے اور اس کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد حاصل کر رہا ہے۔''

''مجھے میری بیوی کی لاش مل جائے تاکہ میں اسے اپنے ہاتھ سے دفنا کر سکون پاؤں۔'' کمال رائے نے بے قراری سے کہا۔

''لاش تو خیر مل جائے گی لیکن اس کیلئے آپ کو اس کتے کو زندہ جلانا ہو گا۔''

''جلاؤں گا ضرور جلاؤں گا۔'' کمال رائے نے بڑے یقین سے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا وہ واقعی کتا ہے؟''

''کتا تو نہیں لیکن آپ اسے کتا ہی سمجھیں بلکہ کتے سے بھی بدتر۔'' نور بانو نے تلخی سے کہا۔

''کہاں ہے وہ؟'' کمال رائے نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

''جب ہم آپ کو ناریل دیں گے تو اس کے بارے میں مکمل معلومات دیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔''

''نہیں۔ میں پریشان نہیں ہوں۔ بے چین ہوں۔ جلد از جلد ماروی کی لاش حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کمال صاحب۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ نہ ایک لمحہ ادھر اور نہ ایک لمحہ اُدھر۔ ہاں خوب یاد آیا۔ اپنی بچی کی حفاظت آپ نے پوری توجہ سے کرنی ہے۔ وہ اکیلی حویلی سے نہ نکلے اور ہاں ایک بات اور ہم آپ کو بتا دیں۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کیلئے خاموش ہوئی۔

کمال رائے سوچنے لگا جانے وہ اب کیا کہے گی۔

اس کے خاموش ہو جانے کی وجہ سے کمال رائے شبے میں پڑ گیا۔ وہ کچھ فکر مندی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنے والی ہے، وہ کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔ یہ لمحے کمال رائے پر

قیامت کے گزرے مگر وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔ بالآخر نور بانو نے لب کھولے اور یوں گویا ہوئی۔

"آپ کی بچی پر پندرھواں سال بہت بھاری ہوگا۔"

"اوہ۔" کمال رائے کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "کیا ہوگا؟"

لیکن اب وہاں جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ نور بانو خاموشی سے کمرے سے اُٹھ کر جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

جب دیوانگ جھونپڑی میں داخل ہوا تو اوگھڑ ناتھ بھنگ گھوٹنے میں مصروف تھا اور اس کے تینوں چیلے باری باری چرس بھری چلم پی رہے تھے۔

دیوانگ کو دیکھ کر اوگھڑ ناتھ نے خوشی سے نعرہ مارا۔ "آئے دیوانگ جی آئے۔"

"مہاراج نمستے۔" تینوں چیلوں نے باری باری اسے سلام کیا۔

دیوانگ نے ان کی گرمجوشی کا جواب خاموش رہ کر دیا۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اوگھڑ ناتھ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور اندازہ کرلیا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔

"آؤ، دیوانگ بابو...... بیٹھو...... پہلے چلم پیو...... پھر بھنگ کا نشہ کرنا۔ تیار کر رہا ہوں۔" اوگھڑ ناتھ نے خوش دلی سے دعوت دی۔

دیوانگ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ایک چیلے نے اسے چلم پیش کی۔ دیوانگ نے دَم لگایا اور چلم واپس کردی۔

"دیوانگ بابو کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو...... کیا معاملہ ہے؟" اوگھڑ ناتھ نے پوچھا۔

"اوگھڑ ناتھ میری جان خطرے میں ہے۔" دیوانگ فکر مند لہجے میں بولا۔

"ارے...... کیا ہوا؟" اوگھڑ ناتھ بھنگ گھوٹتے گھوٹتے ایک دَم رک گیا۔ پھر اس نے اپنے چیلوں کو ایک نظر دیکھا اور انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔

وہ تینوں آنکھ کا اشارہ پاتے ہی اُٹھ گئے اور خاموشی سے جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

"مجھ سے بڑی بھاری غلطی ہوگئی ہے اوگھڑ ناتھ۔" دیوانگ افسردگی سے بولا۔ "میں پرمان کی امانت کی حفاظت نہ کرسکا۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کرکے وہ امانت میرے حوالے کی تھی۔ پر میں کیا کروں...... اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ مجھے کیا وہ تو ہورا جیسے زبردست کو بھی زخمی کرکے نکل گئے۔"

"ارے...... ہورا بھی قابو آگیا...... حیرت ہے۔ دیوانگ بابو ذرا ساری بات کھل کر بتاؤ۔"

دیوانگ نے برہا کے اغوا سے لے کر پرمان کے دربار میں حاضری تک ساری روداد کہہ سنائی۔

ساری بات سن کر اوگھڑ ناتھ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر بولا۔ "دیوانگ بابو فکر مت کرو......

ابھی اوگھڑ ناتھ زندہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں ان سرخ پوشوں کو...... کالی دیوی کی سوگند، برہا کو ڈھونڈ کر دوں گا...... پرمان نے بھیجا ہے تو اس کا مان بھی رکھوں گا اور تمہاری جان بھی بچاؤں گا...... بس اب تم نشچنت ہوجاؤ۔"

کچھ دیر میں بھنگ تیار ہوگئی تو اس نے پیتل کے گلاس میں ڈال کر دیوانگ کو دی۔ دیوانگ نے بھنگ گھونٹ گھونٹ پی کر گلاس رکھا۔ اوگھڑ ناتھ نے بھنگ ایک سانس میں چڑھالی اور نعرہ لگایا۔ "جے کالی، تیرا وار کبھی نہ جائے خالی...... تو ہے بڑی دل والی۔ اوہ، اوہ، واہ...... اوہ واہ واہ۔"

پھر وہ اُٹھ کر جھونپڑی کے اندرونی حصے میں گیا۔ اس نے چٹائی پر سوئی ہوئی شانتی (ماروی) پر نظر ڈالی اور خاموشی سے ایک کونے میں رکھی کھوپڑی اُٹھائی اور باہر آگیا...... پھر اس نے کھوپڑی دیوانگ کے سامنے رکھی اور ایک چرس بھری سگریٹ اس کھوپڑی کے دانتوں میں پھنسا دی۔

"تمہیں پرمان نے میرے پاس بھیجا ہے تو کچھ سوچ کر ہی بھیجا ہوگا۔ دیکھتے جاؤ۔" اوگھڑ ناتھ نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے جھونپڑی کے دروازے کی طرف رخ کرکے زور سے آواز لگائی۔ "پرشوتم۔"

"جی مہاراج۔" ان تین چیلوں میں ایک چیلا بھاگتا ہوا دروازے میں داخل ہوا۔

"ایک کونڈا بھر کے دریا کا تازہ پانی لاؤ...... جلدی کرو۔" اوگھڑ ناتھ نے ہدایت کی۔

"اچھا، مہاراج۔" پرشوتم نے جھونپڑی کے ایک طرف رکھا کونڈا اُٹھایا اور باہر نکل گیا۔

اپنے چیلے کے باہر جانے کے بعد اوگھڑ ناتھ نے ماچس اُٹھائی۔ ایک تیلی نکال کر جلائی۔ اس کے شعلے کو غور سے دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ پھر "جے کالی" کا نعرہ لگایا اور تیلی سے کھوپڑی کے منہ میں دبی سگریٹ سلگا دی۔

دیوانگ کو اس وقت بڑی حیرت ہوئی، کھوپڑی نے سگریٹ کا کش لگایا اور اپنے منہ سے دھواں نکالا۔

اوگھڑ ناتھ کھوپڑی کو دیکھ کر بار بار نعرہ لگا رہا تھا۔ "مست ہوجا...... مست ہوجا۔"

اس کھوپڑی نے جب آدھی سگریٹ پی لی تو پرشوتم اسی اثناء میں کونڈے میں دریا کا تازہ پانی لے کر آگیا۔ اس نے پانی سے بھرا کونڈا کھوپڑی کے سامنے رکھا اور اگلے حکم کیلئے اوگھڑ ناتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ اوگھڑ ناتھ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر جانے کو کہا۔

اوگھڑ ناتھ بار بار بس یہی دہرائے جا رہا تھا۔ "مست ہوجا، مست ہوجا۔"

کھوپڑی کے منہ میں لگی سگریٹ چھوٹی ہوتی جارہی تھی۔ جب وہ سگریٹ آخری حدوں میں پہنچ گئی تو اوگھڑ ناتھ نے اس کے منہ سے جلتا ہوا ٹکڑا نکال کر پانی سے بھرے کونڈے میں ڈال دیا۔

سگریٹ کے پانی میں پڑتے ہی پانی اُبلنے لگا۔ پانی سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ چھوٹے بڑے بلبلے بن رہے تھے اور پانی بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

دیوانگ اُبلتے پانی کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ یہ سارا کھیل اس کیلئے نرالا تھا۔ اگرچہ وہ کئی چیزوں کا ماہر تھا لیکن اوگھڑ ناتھ کا ''علم'' ہی دوسرا تھا۔ وہ آگھوری سادھو تھا اور اس کا سارا کھیل مُردوں کے ساتھ تھا۔ وہ ایک انتہائی گھناؤنا شخص تھا۔ وہ اَدھ جلی لاش کا گوشت بھی کھایا کرتا تھا۔ ہر طرح کا نشہ کرتا تھا۔ لاشوں کی پوجا...... کھوپڑیوں کے ذریعے جادو کا عمل...... بھٹکتی روحوں کو کام میں لانا...... یہ تھا اوگھڑ ناتھ۔

''شن شلا کی بھو بھلا بھو۔'' اوگھڑ ناتھ نے نامانوس سے لفظ بولنے شروع کئے۔ کچھ دیر وہ ان لفظوں کو دہراتا رہا۔ پھر اچانک رک گیا۔ اب اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ دیوانگ سے بے خبر اپنے عمل میں مصروف تھا۔

تب اس نے زوردار نعرہ لگایا۔ ''جے کالی...... جے کالی۔''

اس کا نعرہ لگاتے ہی کونڈے کا اُبلتا پانی کم ہو کر دھویں کی صورت اوپر اُٹھنے لگا۔ پھر چند لمحوں میں ہی کونڈے کا سارا پانی خشک ہو گیا۔

اب ایک دھویں کا ہیولا کونڈے کے اوپر گھوم رہا تھا۔

''آ گیا...... مست ہو کر...... دیکھ میں نے تجھے کیا چیز پلائی۔'' اوگھڑ ناتھ نے دھویں کے ہیولے پر نظریں جما کر کہا۔ ''میری بات ذرا غور سے سن...... تُو نے ایک کام کرنا ہے...... برہا کو تلاش کرنا ہے، جا جلدی کر۔''

اوگھڑ ناتھ کی بات سن کر وہ دھواں کونڈے سے اوپر اُٹھا اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

''دیوانگ بابو...... برہا کا ابھی پتہ لگ جاتا ہے۔'' اوگھڑ ناتھ نے بڑے فخر سے دیوانگ کی طرف دیکھا۔

اس کی یہ بات سن کر دیوانگ کے چہرے پر اطمینان اور سکون پھیل گیا۔

☆......☆......☆

''یہ ناریل ہم نے پڑھ کر تیار کر دیا ہے...... آپ اسے کوئی عام ناریل نہ سمجھیں۔ اب یہ ایک طرح کا پٹرول بم ہے۔'' نور بانو ناریل کمال رائے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' کمال رائے نے ناریل اپنی گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس خبیث کو زندہ جلانا ہے جس نے نہ جانے اب تک کتنی لاشوں کی بے حرمتی کی ہے۔'' نور بانو کا لہجہ ایک دَم تلخ ہو گیا۔ ''ماروی کا جسم بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ ایک آگھوری سادھو ہے۔ لاش کا گوشت کھانے والا، لاش کو بری نظر سے دیکھنے والا، نشہ کرنے والا، گندے عمل کرنے والا، وہ اس زمین کا بوجھ ہے۔ جب تک زندہ نہیں جلے گا وہ اسی طرح اس دنیا میں خباثت پھیلاتا رہے گا۔''

''کون ہے وہ......؟ کہاں رہتا ہے؟'' کمال رائے نے تجسس سے پوچھا۔

''اس کتے کا نام اوگھڑ ناتھ ہے...... وہ دریا کنارے ایک شمشان گھاٹ میں رہتا ہے۔ اسے جتنا جلد ممکن ہو سکے، موت کے گھاٹ اُتار دیں۔'' نور بانو نے کہا۔

پھر کچھ توقف کر کے اس نے اوگھڑ ناتھ کا پورا پتہ بتایا۔ اس ناریل کے بارے میں اسے جانکاری دی۔ کس طرح اس ناریل کا استعمال کرنا ہے۔ یہ بتایا۔

سب کچھ بتا کر اس نے کمال رائے کو رخصت کر دیا۔

☆......☆......☆

اس ہیولے کو غائب ہوئے آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ جوں جوں دیر ہوتی جا رہی تھی۔ اوگھڑ ناتھ کے چہرے پر پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

دیوانگ خاموش بیٹھا تھا۔ اسے برہا کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔ اوگھڑ ناتھ کے عمل سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہیولا چند منٹوں میں برہا کا کھوج نکال کر اوگھڑ ناتھ کو بتا دے گا لیکن اوگھڑ ناتھ کا پریشان چہرہ دیکھ کر اس کے دل پر گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

''اوگھڑ ناتھ کیا ہوا؟'' بالآخر وہ خاموش نہ رہ سکا۔

''دیوانگ بابو کچھ سمجھ نہیں پڑ رہی۔'' اوگھڑ ناتھ نے خالی کونڈے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''کچھ کرو اوگھڑ ناتھ...... مجھے تو اس کی واپسی خطرے میں پڑتی نظر آ رہی ہے۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

''خیر ایسا نہیں ہو سکتا...... اوگھڑ ناتھ کے عمل کی کاٹ کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔'' ابھی کوئی مائی کا لال ایسا نہیں پیدا ہوا جو میرے کام میں ٹانگ اَڑائے۔'' اس نے اونچا بول بولا۔

''پھر اتنی دیر کیوں؟'' دیوانگ اُلجھ گیا۔

''ڈھونڈ رہا ہو گا۔'' اوگھڑ ناتھ نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی لیکن اندر سے اس کا سکون لٹ چکا تھا۔ اس نے کھوپڑی کو اُٹھا کر خالی کونڈے میں رکھا اور پھر نامانوس سے الفاظ بول کر ''جے کالی'' کا نعرہ لگایا اور پھر کھوپڑی پر نظریں جمائے بار بار دہرانے لگا۔

''ستیاناسی چل جلدی لوٹ کر آ...... ستیاناسی چل جلدی لوٹ کر آ۔''

ابھی اوگھڑ ناتھ اس جملے کو جھوم جھوم کر دہرا رہا تھا کہ اچانک کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ دیوانگ نے گھبرا کر کونڈے کی طرف دیکھا کیونکہ آواز وہیں سے آئی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ کھوپڑی دو ٹکڑے ہو چکی تھی اور کونڈے میں دوبارہ پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا۔

"ارے...... یہ کیا ہوا؟" اوگھڑ ناتھ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور زور سے چیخا۔ "پرشوتم۔"

پرشوتم اس کی چیخ سن کر فوراً جھونپڑی میں آیا۔ "ہاں، مہاراج۔"

"ارے، یہ دیکھ...... یہ کیا ہو رہا ہے۔" اوگھڑ ناتھ نے کونڈے کی طرف اشارہ کیا۔

"مہاراج...... یہ تو کالا ہو گیا۔" پرشوتم نے کونڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اب کونڈے میں پانی پوری طرح بھر چکا تھا اور وہ ٹوٹی ہوئی کھوپڑی پانی میں اس طرح پگھلتی جا رہی تھی جیسے وہ پانی نہ ہو، تیزاب ہو۔ چند سیکنڈوں میں کھوپڑی پانی میں تحلیل ہو گئی۔

"ارے...... پرشوتم...... اس ستیاناسی کو اُٹھا یہاں سے اور دریا میں پھینک آ...... اس ستیاناسی نے تو ہمیں شرمندہ کر دیا۔" اوگھڑ ناتھ نے غصے اور شرمساری کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

"اچھا...... مہاراج اُٹھاتا ہوں۔" پرشوتم اس کونڈے کو اُٹھانے کیلئے جھکا۔

"دیکھ احتیاط سے...... اگر ایک بوند پانی بھی تیرے اوپر گر گیا تو کوڑھی ہو جائے گا۔" اوگھڑ ناتھ نے تنبیہہ کی۔

"اچھا...... مہاراج۔" پرشوتم نے بڑی احتیاط سے کونڈا اُٹھایا اور احتیاط سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

"دیوانگ بابو...... اپنی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ یہ آخر ہوا کیا؟" اوگھڑ ناتھ اپنی جگہ دھم سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ کمینہ تو کالا ہو گیا۔"

"میں کیا کہوں۔ اب میں کیا کہوں۔" دیوانگ افسردگی سے بولا۔ "میری جان تو پھر سے خطرے میں پڑ گئی۔"

"نہیں دیوانگ بابو...... تم پریشان مت ہو...... ابھی ایک عمل اور ہے میرے پاس...... لیکن اس عمل میں دو تین دن لگیں گے...... تمہیں میرے پاس رہنا ہوگا۔"

"برہا کا پتہ معلوم کرنے کیلئے میں یہاں تین مہینے بھی رہ سکتا ہوں۔"

"بس، بس...... پھر فکر کی کوئی بات نہیں...... تم یہاں سے برہا کا پتہ نشان لے کر ہی جاؤ گے۔" اوگھڑ ناتھ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کے بعد پرشوتم خالی کونڈا لئے جھونپڑی میں داخل ہوا اور بولا۔ "مہاراج، کالی کو دریا میں بہا دیا۔"

"اچھا کیا...... وہ ستیاناسی تو بڑا ہی کمینہ نکلا...... دیکھ تُو نے کونڈا اچھی طرح دھو دیا ہے نا۔" اوگھڑ ناتھ نے پوچھا۔

"ہاں، مہاراج۔" پرشوتم نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... پھر تم جاؤ۔" اوگھڑ ناتھ نے حکم دیا۔

"مہاراج ایک خوشی کی خبر ہے۔" پرشوتم جاتے جاتے رک کر بولا۔

"ہیں، وہ کیا؟" اوگھڑ ناتھ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج، شمشان گھاٹ میں ایک چتا تیار ہو رہی ہے۔ کوئی ارتھی آنے والی ہے؟"

"ارے واہ...... یہ تو واقعی خوشی کی خبر ہے۔" اوگھڑ ناتھ خوش ہو کر بولا۔ "پتہ کیا، کون مرا ہے عورت کہ مرد۔"

"پتہ کر کے آیا ہوں مہاراج...... عورت کی ارتھی ہے۔" پرشوتم نے اپنی چمکتی آنکھوں سے اوگھڑ ناتھ کو دیکھا۔

"بس بن گیا کام۔" اوگھڑ ناتھ نے دیوانگ کو دیکھا۔ "دیوانگ بابو، تم بڑے خوش قسمت ہو۔ جس کی ضرورت تھی وہ بھی فوراً ہی مل گئی، اب دیکھتا ہوں برہا کو کوئی کیسے چھپا کر رکھتا ہے۔"

"اب تو تین دن نہیں لگیں گے۔" دیوانگ نے فوراً پوچھا۔

"نہیں، اب جلدی کام ہو جائے گا۔" اوگھڑ ناتھ نے کہا پھر وہ پرشوتم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جب وہ لوگ چلے جائیں تو مجھے آ کر بتانا۔"

"ٹھیک مہاراج۔" یہ کہہ کر پرشوتم شمشان گھاٹ کی طرف چلا گیا اور پیپل کے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

اندھیرا پھیلتے ہی پندرہ بیس آدمی ایک ارتھی اُٹھا کر شمشان گھاٹ میں داخل ہوئے۔ لاش کو چتا پر رکھ کر آگ لگائی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چتا بھڑک اُٹھی۔ جلتی ہوئی لاش کی بو چاروں طرف پھیلنے لگی۔ چتا سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے لوگ جلتی چتا کا منظر دیکھتے رہے۔ پھر وہ سب اُٹھ کر چل دیئے۔ انہیں اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ لاش آدھی سے زیادہ جل چکی ہے۔ عام طور سے یہی ہوتا تھا کہ ارتھی کے ساتھ آنے والے لوگ جب یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ لاش کافی حد تک جل چکی ہے تو وہ واپس چلے جاتے۔ پوری لاش کے جل جانے کا انتظار بہت کم لوگ کرتے تھے۔

اوگھڑ ناتھ کو ایسی ہی لاش کی ضرورت رہتی تھی اور وہ ادھ جلی لاشوں کے ساتھ جو کچھ کرتا تھا، اسے دیکھ کر ایک اچھا بھلا آدمی بے ہوش ہو سکتا تھا۔ بہر حال جب ارتھی کے ساتھ آنے والے لوگ چلے گئے تو پرشوتم جلدی سے درخت سے نیچے اُترا اور دوڑ لگا کر اوگھڑ ناتھ کی جھونپڑی میں پہنچا۔

"چلیں مہاراج۔" پرشوتم نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"آؤ...... دیوانگ بابو...... ہمارے ساتھ چلو گے یا یہیں بیٹھو گے۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ ہم مردہ خور لوگ ہیں۔ ادھ جلے گوشت کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے...... آؤ، تمہیں دکھائیں۔" اوگھڑ ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دیوانگ تو ادھ جلے گوشت کا ذکر سن کر ہی تھرا گیا اور وہ بھی انسانی لاش کا...... اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اوگھڑ ناتھ تم ہو آؤ، میں یہاں بیٹھا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے...... دیوانگ بابو...... تم ذرا آرام کرو۔ تھوڑی سی بھنگ اور پیو۔ اتنی دیر میں ہم آتے ہیں۔ جے کالی۔'' وہ یہ کہہ کر اُٹھا اور کندھے پر ایک کلہاڑی رکھ کر جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

اوگھڑ ناتھ کے بدن پر اس وقت ایک لنگوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ کندھے پر کلہاڑی رکھے پرشوتم کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا لیکن اوگھڑ ناتھ اور پرشوتم کو چلنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ وہ راستہ ان کے پیروں کو لگا ہوا تھا۔ انہیں ایک ایک پتھر اور ایک ایک گڑھے کا معلوم تھا۔ لہٰذا وہ پورے اطمینان سے چلے جا رہے تھے۔

چتا ابھی روشن تھی۔ کچھ لکڑیاں جل چکی تھیں، کچھ لکڑیاں ابھی پوری نہیں جلی تھیں۔ اوگھڑ ناتھ نے ایک لمبی سی لکڑی سے لاش کو کرید کر کوئی جلا ہوا ٹکڑا منہ میں رکھنے کو تھا کہ اچانک ایک تیز روشنی اس کی آنکھوں پر پڑی اور ساتھ ہی کوئی لوہے کی چیز اس کی کنپٹی سے آ لگی۔

یہی عمل پرشوتم کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔

اوگھڑ ناتھ کیلئے۔ یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔ اس کی پوری زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ نہ آیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ پھر جب ان لوگوں نے سمجھایا تو وہ سمجھا کہ اس کی کنپٹی سے کلاشنکوف لگی ہوئی ہے جس کا ٹریگر دباتے ہی دھڑا دھڑ گولیاں نکل کر اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو جائیں گی۔

''مہاراج...... تم لوگ چاہتے کیا ہو؟'' اوگھڑ ناتھ گھگھیا کر بولا۔

''او، خبیث...... کھڑا ہو اور ہمارے ساتھ چل۔'' آنے والے نے سخت غصے سے کہا۔

''کہاں جانا ہے؟'' اوگھڑ ناتھ نے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں...... اسی شمشان گھاٹ کے ایک کونے میں۔'' آنے والے نے بتایا۔

''وہاں کیا ہے؟''

''وہاں تیرا کوئی منتظر ہے۔''

''کون مہاراج؟''

''اب سارے سوال یہیں بیٹھے بیٹھے کرلے گا۔ چل اُٹھ او خبیث۔'' یہ کہہ کر کلاشنکوف بردار شخص نے ایک لات ماری۔

اوگھڑ ناتھ اس لات کو برداشت کر گیا۔ پھر وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، کلاشنکوف بردار نے کلاشنکوف اس کی کمر سے لگا دی اور دھکا دیتا ہوا بولا۔ ''چل آگے بڑھ۔''

''نادر، میں اس کا کیا کروں؟'' اندھیرے میں سے آواز آئی۔ اس کا اشارہ پرشوتم کی طرف تھا۔

''تم اس گدھ کو لے کر جھونپڑی کی طرف چلو۔'' نادر نے جواب دیا۔

پھر نادر، اوگھڑ ناتھ کو لے کر شمشان گھاٹ کے ایک مخصوص گوشے کی طرف بڑھا اور نادر کا ساتھی پرشوتم کو جھونپڑی کی طرف لے چلا۔

اوگھڑ ناتھ نے راستے میں کئی مرتبہ نادر سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے مگر نادر نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب اوگھڑ ناتھ کی کسی طرح زبان بند ہی نہ ہوئی تو نادر نے کلاشنکوف اس کی کمر سے ہٹا کر اس کے کندھے پر زور سے بٹ ماری۔ وہ بلبلا گیا۔ پھر وہ کچھ نہ بولا۔

کچھ دور چلنے کے بعد ایک درخت کے پیچھے سے ایک ٹارچ چمکی اور آواز سنائی دی۔ ''نادر لے آئے اس خبیث کو۔''

''جی مالک...... لے آیا ہوں۔'' نادر نے فوراً جواب دیا۔

''اسے بٹھاؤ، زمین پر۔'' درخت کے پیچھے سے پھر آواز آئی، یہ آواز کمال رائے کی تھی۔

''اچھا مالک۔'' نادر نے کہا۔ پھر وہ اوگھڑ ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چل بھئی بیٹھ جا۔''

اوگھڑ ناتھ کی سٹی گم تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال وہ خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔

''نادر، اس کے چہرے پر روشنی ڈالو۔'' یہ کہہ کر کمال رائے درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے پیچھے دو اسلحہ سے لیس بندے موجود تھے اور وہ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کیلئے تیار تھے۔

نادر نے پاور فل ٹارچ کا بٹن دبا کر اس کا رخ اوگھڑ ناتھ کی طرف کر دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا بھیانک چہرہ مزید بھیانک نظر آ رہا تھا۔

کمال رائے نے نور بانو کا دیا ہوا ناریل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور نادر کے قریب ہو کر ٹارچ کی روشنی کی طرف ہاتھ بڑھا کر چاقو کے ذریعے ناریل سے ایک چھوٹا ٹکڑا کاٹا۔

وہ ایک پکا ہوا خشک ناریل تھا۔ اس میں پانی ہونے کا امکان نہ تھا۔ کمال رائے پہلے کئی بار اپنے کان کے پاس ہلا کر اس بات کی تصدیق کر چکا تھا...... لیکن جیسے ہی اس نے ناریل سے ٹکڑا الگ کیا تو یکایک اسے ناریل کے بھاری ہونے کا احساس ہوا، اسے لگا جیسے وہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ نور بانو نے اسے پٹرول بم کہا تھا۔

کمال رائے نے تھوڑا آگے بڑھ کر اور اپنا ہاتھ لمبا کر کے اس کے اوپر ناریل الٹنا چاہا لیکن پھر فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے سوچا اگر اسی طرح اس کے اوپر ناریل کا پانی ڈال دیا تو وہ اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر جانے کیا صورتحال بنے؟ اس لئے کام کو پکا کرنا چاہئے۔ اس کا ایک حل تو یہ تھا

کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زمین پر لٹا دیا جائے۔ دوسرا حل یہ تھا کہ کلاشنکوف کا بٹ مار کر اسے بے ہوش کر دیا جائے۔ پہلا حل زیادہ محفوظ تھا۔

تب کمال رائے نے اپنے پیچھے کھڑے ایک بندے سے کہا۔ ''ارے، مشتاق...... رسی بھی ساتھ لایا ہے کہ نہیں۔''

''ہاں مالک...... کیوں نہیں۔'' فوراً آواز آئی۔

''تو پھر اس کتے کے ہاتھ پاؤں باندھ...... جلدی کر۔''

مشتاق اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آیا۔ نادر نے کلاشنکوف کی نال اس کے سر میں ماری اور بولا۔ ''اپنے ہاتھ پاؤں آرام سے بندھوالے ورنہ......''

''مہاراج لو باندھ لو ہاتھ۔'' اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

مشتاق نے بڑی مہارت سے اس کے ہاتھ باندھ کر زمین پر دھکا دے دیا۔

اب کمال رائے آگے بڑھا۔ اس نے جلدی سے ناریل اس کے سر کے اوپر رکھ کر اُلٹ دیا۔ ناریل سے حیرت انگیز طریقے پر غٹ غٹ کر کے پانی نکلنے لگا۔ جب وہ پانی میں اچھی طرح بھیگ گیا اور ناریل کا پانی بھی ختم ہو گیا تو کمال رائے پیچھے ہٹا۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے نادر سے آہستہ سے کہا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔''

نادر ٹارچ کا رخ اس کی طرف کیے تیزی سے پیچھے ہٹا۔ کمال رائے بھی آٹھ دس قدم پیچھے ہٹ کر رک گیا۔ پھر اس نے اوگھڑ ناتھ کا نشانہ لے کر ناریل زور سے اس کے جسم پر مارا۔ ناریل کا جسم سے لگنا تھا کہ ایک تیز روشنی سی ہوئی اور اوگھڑ ناتھ کا پورا جسم شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

اچانک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یہ اوگھڑ ناتھ کی چیخیں نہ تھیں۔ اوگھڑ ناتھ کو تو چیخنے کا موقع ہی نہ ملا۔ آگ لگتے ہی اس کا دل بند ہو گیا۔ یہ آوازیں تو کہیں دور سے آ رہی تھیں جیسے بھٹکی ہوئی روحیں چیخ رہی ہوں۔

سنسان اور ویران شمشان گھاٹ میں روحوں کے چیخنے کی آوازیں ایک بھیانک سماں پیش کر رہی تھیں۔ سامنے اوگھڑ ناتھ شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور کسی سوکھی لکڑی کی طرح دھڑ ادھڑ جل رہا تھا۔

☆......☆......☆

دیوانگ ابھی اس کی واپسی کا منتظر تھا کہ اچانک بہت سی بلیوں کے رونے اور لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بلیاں بالکل انسانی آواز میں رو رہی تھیں۔ یہ آوازیں بہت قریب سے آ رہی تھیں۔ شمشان گھاٹ میں اس طرح کی آوازوں کا آنا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اس طرح کی ویران اور سنسان جگہوں پر اچھی آوازوں کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ ابھی وہ ان آوازوں پر غور کر رہا تھا

کہ اندر سے شانتی (ماروی) نکلی۔

وہ چیختی ہوئی باہر آئی تھی جیسے کسی نے اس کے گلے پر چھری رکھ دی ہو۔ ابھی دیوانگ بلیوں کے رونے اور چیخنے کی آوازوں سے نہ نمٹ پایا تھا کہ اندرونی حصے سے شانتی نکل کر اس کے پیروں میں اوندھے منہ گری اور ساکت ہو گئی۔

دیوانگ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں اس عورت کو دیکھا جو چیختی ہوئی اس کے قدموں میں آ گری تھی۔ وہ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت تھی۔ دیوانگ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئی ہو۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ جھونپڑی میں بیٹھے یا اُٹھ کر باہر نکل جائے کہ اندر دو لمبے چوڑے لوگ داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں اسلحہ تھا۔ ایک بندے نے جلدی سے آگے بڑھ کر کلاشنکوف کی نال دیوانگ کے سینے پر رکھ دی اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''خبردار...... حرکت مت کرنا۔''

دیوانگ ان نئی مصیبتوں کو دیکھ کر بالکل ہی نیم جاں ہو گیا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر جلدی سے ہاتھ اوپر اُٹھا لئے۔

''شاباش۔'' کلاشنکوف بردار نے کہا۔ ''اب ذرا اپنا منہ ادھر کر لو۔''

دیوانگ نے فوراً ان کی طرف سے پیٹھ کر لی۔ ماروی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اوگھڑ ناتھ کے مرتے ہی اس کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ شانتی کی روح بے چین ہو کر ماروی کا جسم چھوڑ گئی تھی۔

نادر نے زمین پر پڑی ہوئی ماروی کی لاش کو اُٹھا کر کندھے پر ڈالا اور پھر وہ دونوں جھونپڑی سے نکل گئے۔

نادر ٹارچ روشن کیے ماروی کو کندھے پر ڈالے تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی شمشان گھاٹ کی حدود سے نکل آیا اور وہاں پہنچ گیا جہاں کمال رائے اپنی جیپ میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

نادر نے ماروی کی لاش جیپ کی پچھلی سیٹوں پر ڈالی اور کمال رائے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مالک آپ چلیں میں ذرا ان خبیثوں کو بھون کر آتا ہوں۔''

''اب چھوڑ دو نادر...... ہمیں ان سے کیا لینا۔ جس نے میری ماروی کو قبضے میں کر رکھا تھا اس کا باب تو چکا دیا۔'' کمال رائے نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے، وہاں کتنے آدمی ہیں۔''

''چار آدمی ہیں مالک۔'' نادر فوراً بولا۔

''چھوڑو نادر۔ کیوں خون ناحق اپنی گردن پر لیتے ہو۔ میں چلتا ہوں تم اپنے بندوں کے ساتھ فوراً میرے پیچھے آؤ۔'' کمال رائے نے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی، مالک۔" نادر نے اپنا جوش دباتے ہوئے کہا۔ "آپ دو منٹ ٹھہریں، میں گاڑی لے کر ادھر ہی آتا ہوں۔"

پھر کچھ دیر کے بعد دونوں گاڑیاں روشن گوٹھ کی جانب رواں دواں ہو گئیں۔

☆......☆......☆

بڑی عجیب بات تھی۔ اگرچہ ماروی کو مرے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس کی لاش ابھی تک تروتازہ تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اس کی موت کو اتنا لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا انتقال ابھی چند گھنٹوں قبل ہوا ہو۔ اسے نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا گیا تھا۔ اس کی میت کو ایک بڑے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ لوگ صبح ہی سے اس کے دیدار کو آ رہے تھے۔ سارے رشتہ دار جمع ہو گئے تھے۔ سب کو بتا دیا گیا تھا کہ ماروی پر اب تک کیا گزری۔

برہا کو اس حویلی میں آئے پندرہ دن کے قریب ہو گئے تھے۔ وہ بہت جلد سب سے مانوس ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں بار بار پوچھتی تھی لیکن اس کے بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تھا۔ کمال رائے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس کی ماں کے بارے میں کیا بتائے؟

بالآخر اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ برہا کو اس کی ماں کا چہرہ دکھا سکتا تھا اور یہ بتا سکتا تھا کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔

کمال رائے برہا کو اپنی گود میں اُٹھائے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں میت رکھی تھی۔ باپ بیٹی کو دیکھ کر وہاں موجود عورتوں نے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔

"خدا کے واسطے...... روئیں نہ...... میرے صبر کا امتحان نہ لیں۔" کمال رائے نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

اس کی بات سن کر رونے والی عورتوں نے فوراً اپنے منہ میں دوپٹے ٹھونس لئے۔

کمال رائے دھیرے دھیرے میت کی طرف بڑھا۔ ماروی کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں کچھ اس طرح بند تھیں جیسے ابھی سوئی ہو۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کمال رائے کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے نکلتے آنسوؤں پر قابو پایا۔ اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔ وہ بڑی گلوگیر آواز میں برہا سے مخاطب ہوا۔ "بیٹا...... یہ تمہاری ماں ہیں۔ انہیں غور سے دیکھ لو۔ یہ پہلا اور آخری دیدار ہے۔ اس کے بعد تم انہیں کبھی نہ دیکھ پاؤ گی۔ میری بچی...... اپنی آنکھوں میں ان کا عکس اُتار لو۔"

پھر جانے کیا ہوا؟ کمال رائے جو اب تک بڑے حوصلے سے کام لے رہا تھا اور ہر ایک کو نہ رونے کی تلقین کر رہا تھا خود ہی حوصلہ ہار بیٹھا۔ بے اختیار اس کے منہ سے سسکی نکلی اور پھر یہ سسکی چیخ میں

بدل گئی اور وہ بے اختیار چیخ چیخ کر رونے لگا۔

برہا نے اپنے باپ کو اس طرح روتا دیکھا تو اپنے ننھے ننھے خوبصورت ہاتھوں میں کمال رائے کا چہرہ لیتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔ "بابا، نہ روئیں...... کیوں روتے ہیں...... میں آ گئی ہوں نا اب آپ کے پاس۔"

کمال رائے نے اس کی بات سن کر اسے کلیجے سے بھینچ لیا اور روتے ہوئے بولا۔ "ہاں، بیٹی اب تُو ہی سب کچھ ہے میرے لئے۔"

نفیسہ بیگم فوراً آگے بڑھی اس نے برہا کو کمال رائے کی بانہوں سے کھینچ کر اپنی گود میں لے لیا اور کمال رائے کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "آؤ بیٹا۔"

کمال رائے نے خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے اور اپنی ماں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے آبائی قبرستان میں کمال رائے نے خود جا کر ماروی کے لئے بہترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ماروی کو قبر میں اُتارا۔ آخری مرتبہ اس نے چہرہ کھول کر دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں جھک کر بولا۔ "ماروی میں تمہارا مجرم ہوں، میں تمہیں تحفظ نہ دے سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

اب تک کمال رائے نے جس بے قراری اور بے چینی سے دن کاٹے تھے۔ ماروی کو اپنے ہاتھوں دفنا کر اس کے دل کو قرار آیا۔ اس نے ماروی کی سنگ مرمر کی قبر بنوائی۔ یہ قبر چاروں طرف سے قبروں میں گھری ہوئی تھی۔ اس نے قبر کے گرد پھولدار پودے لگوائے۔ وہ روز ہی اس کی قبر پر آتا، فاتحہ پڑھتا اور پھر حویلی کی طرف چلا جاتا۔

وہاں اس کی حسین ترین بیٹی اس کی منتظر ہوتی۔ وہ برہا کا چہرہ دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا۔

☆......☆......☆

دیوانگ دریا پار کر کے جب اپنی بستی کی طرف بڑھا تو اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ پرمان نے اسے اوگھڑ ناتھ کے پاس بھیجا تھا۔ اسے بڑی توقع تھی کہ اوگھڑ ناتھ برہا کی تلاش میں ضرور مدد کرے گا لیکن اوگھڑ ناتھ کی جھونپڑی میں جس طرح کے واقعات پیش آئے اس نے دیوانگ کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے۔

اسے یاد آیا کہ اوگھڑ ناتھ کے جانے کے بعد کوئی عورت اندر سے نکل کر اس کے قدموں میں گری تھی اور ابھی وہ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ معاملہ کیا ہے کہ دو اسلحہ بردار شخص اندر داخل ہوئے تھے اور اسے ان کے حکم پر ہاتھ اُٹھا کر دوسری طرف منہ کرنا پڑا تھا۔ وہ خاصی دیر اسی طرح ہاتھ اُٹھائے

دوسری طرف منہ کیے کھڑا رہا۔ جب اسے کوئی آواز نہ آئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا رخ پھیرا ...... جھونپڑی خالی تھی نہ وہ اسلحہ بردار لوگ وہاں موجود تھے اور نہ اس کے قدموں میں گرنے والی عورت کا کوئی وجود تھا۔

پھر کچھ دیر بعد پرشوتم گھبرایا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا، اس نے جو کچھ بتایا وہ اور بھی پریشان کن تھا۔ اتنے میں اوگھڑ ناتھ کے دونوں چیلے بھی آ گئے۔ چاروں مل کر سوچنے لگے کہ اب کیا کریں؟ پرشوتم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس نے باہر نکل کر اوگھڑ ناتھ کو تلاش کیا تو وہ اسلحہ بردار اسے جیتا نہ چھوڑیں گے۔

جب ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور اوگھڑ ناتھ واپس نہ آیا اور نہ کوئی اسلحہ بردار جھونپڑی میں داخل ہوا تو پرشوتم جو اپنے گرو کیلئے بہت بے چین تھا، اس نے جھونپڑی سے باہر نکل کر اوگھڑ ناتھ کو تلاش کرنے کی تجویز پیش کی۔ دیوانگ بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے فوراً تلاش کیا جائے کیونکہ برہا کی وجہ سے اس کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔

دیوانگ اور پرشوتم اسے باہر ڈھونڈنے کیلئے تیار ہو گئے۔ جب وہ دونوں تیار ہو گئے تھے تو وہ باقی دو چیلے جھونپڑی میں بیٹھ کر کیا کرتے وہ بھی ساتھ ہو لئے۔

وہ چاروں باہر نکل کر دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر اوگھڑ ناتھ کی تلاش میں نکل گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد انہوں نے اوگھڑ ناتھ کی جلی ہوئی لاش ڈھونڈ نکالی۔

تینوں چیلے مل کر اوگھڑ ناتھ کی لاش کو جھونپڑی میں لے آئے۔ جب انہوں نے جھونپڑی میں جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں اوگھڑ ناتھ کے وجود کو دیکھا تو وہ لرز اُٹھے۔ اوگھڑ ناتھ کی لاش جل کر کوئلہ ہو گئی تھی اور کسی لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اوگھڑ ناتھ کو بغیر چتا کے اس طرح کس نے جلایا تھا۔

تینوں چیلوں نے اوگھڑ ناتھ کی جلی ہوئی لاش کو جھونپڑی میں رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ ان تینوں نے اسے اپنے کندھوں پر رکھا اور ''رام نام ست ہے'' بولتے اسے دریا میں پھینک آئے۔ آتے ہی پرشوتم نے اوگھڑ ناتھ کی گدی سنبھال لی۔

دیوانگ کا اب یہاں رکنا فضول تھا۔ وہ صبح ہوتے ہی اپنی راہ لگا۔

اب وہ اپنی بستی کی طرف بڑھ رہا تھا اور جوں جوں اس کے قدم بستی کی طرف اُٹھ رہے تھے اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ اس کا گھر قریب آ رہا تھا۔ اس گھر ہی سے تو برہا کو اُٹھایا گیا تھا۔ وہ کیسے زبردست لوگ تھے؟ انہوں نے ہورا کو زخمی کر دیا تھا اور شاید انہی لوگوں نے اوگھڑ ناتھ کو بھی جلا ڈالا تھا۔

اب وہ کیا کرے؟ کیا بستی چھوڑ کر بھاگ جائے؟ گھر میں اس کی ماں پاربتی تھی۔ وہ اس کے بغیر

جیتے جی مر جائے گی۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر کس طرح فرار ہو سکتا تھا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں چلا جا رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے؟

وہ اچانک کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ دیوانگ اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا۔ اپنی ناکامی کے خوف سے اس کی آنکھیں بند ہوئیں تو وہ اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

وہ ہورا تھا۔

''دیکھ کر چلو دیوانگ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کہو کیا خبر ہے؟''

''ناکام لوٹا ہوں۔ اوگھڑ ناتھ کچھ نہیں کر سکا۔ وہ خود جل مرا۔''

''جل مرا۔'' ہورا نے حیرت سے کہا۔ ''کیسے؟''

''اسے کسی نے جلا دیا اور کچھ اس طرح جلایا کہ وہ جلی ہوئی لکڑی کی طرح ہو گیا۔'' دیوانگ نے بتایا۔

''کہاں جا رہے تھے؟'' ہورا نے اپنے سفید دانت چمکاتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی بستی...... اپنے گھر۔'' دیوانگ نے دھیرے سے کہا۔

''اب تم اپنے گھر کو بھول جاؤ۔'' ہورا نے سفاکی سے کہا۔

''کیوں بھول جاؤں میں اپنے گھر کو۔'' دیوانگ نے احتجاجاً کہا۔ ''وہاں میری ماں ہے؟''

''تمہیں اب سزا کاٹنی ہوگی۔ پرمان نے تمہیں اوگھڑ ناتھ کے پاس بھیج کر ایک موقع دیا تھا لیکن تم اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔'' ہورا نے فردِ جرم عائد کی۔

''اوگھڑ ناتھ برہا کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا اور جب اس نے دوسرا عمل کرنے کا منصوبہ بنایا تو اسے کچھ نامعلوم لوگوں نے جلا دیا۔ اس میں میرا کیا قصور؟'' دیوانگ نے اپنی صفائی پیش کی۔

''قصور تو پرمان کا ہے جس نے تم جیسے بے وقوف شخص پر بھروسہ کر کے برہا تمہارے حوالے کر دی۔ اب تم میرے ساتھ چلو اور یہ الٹی سیدھی باتیں اس کے سامنے چل کر کرنا۔'' ہورا نے سخت انداز میں کہا۔

''ہورا کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔''

''میں تو معاف کر سکتا ہوں مگر پرمان نہیں۔''

''تم مجھے معاف کر دو۔ پرمان سے جا کر کہہ دو کہ دیوانگ تمہیں نہیں ملا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔'' دیوانگ نے اسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے استدعا کی۔

''تُو نے مجھے بے وقوف سمجھا ہے...... مجھے غلط مشورے دیتا ہے۔ اگر میں یہ گھنٹہ گھما کر تیرے سر پہ ماردوں تو ابھی تیرے سر کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ بس اب تُو سیدھا کھڑا ہو جا اور میرے ساتھ

چل۔'' یہ کہہ کر ہورا نے دیوانگ کے جواب کا انتظار نہ کیا۔
اس نے اپنے کندھے سے اُتار کر زنجیر میں بندھی گھنٹی زور سے زمین پر ماری اور بولا۔ ''میں ہوں ہورا۔''
اسی وقت ریت کا بادل سا اُٹھا اور وہ دونوں اس میں گم ہو گئے۔

☆......☆......☆

جب ہورا نے دیوانگ کو پرمان کے حضور پیش کیا تو وہ اپنی مسند پر جلوہ افروز تھا۔ رانی ملائے کا اس کے برابر ایک چھوٹی مسند پر بیٹھی تھی اور دو خادمائیں دائیں بائیں کھڑی تھیں۔
ہورا، دیوانگ کی کلائی پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کے فرش پر سات سانپ اپنے پھن پھیلائے نیم دائرے کی شکل میں پرمان کے سامنے موجود تھے۔ دیوانگ کو دیکھ کر پرمان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
''پرمان، تیرا مجرم حاضر ہے۔'' ہورا نے دیوانگ کو پرمان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔
''کہاں ہے برہا؟'' پرمان ایک دم غصے میں آ گیا اور وہ چیخ کر بولا۔
دیوانگ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ہورا نے پھر اسے آگے کر دیا۔ اس کی زبان پر جیسے تالا پڑ گیا تھا۔
''بولتا کیوں نہیں؟'' پرمان گرجا۔
''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔
''کیا برہا تیرے حوالے نہیں کی گئی تھی، کیا تجھ سے اس کی حفاظت کیلئے نہیں کہا گیا تھا؟''
کہا گیا تھا۔'' دیوانگ نے اقرار کیا۔
''پھر لا اسے پیش کر میرے سامنے ...... میری امانت واپس کر۔'' پرمان کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔
''میں مجبور ہوں ۔ بے قصور ہوں۔ وہ جانے کون لوگ تھے ...... انہوں نے اوگھڑ ناتھ کو بھی جلا دیا۔''
''اب پھر تیرے جلنے کی باری ہے۔''
''پرمان مجھے معاف کر دے۔''
''میں نے تجھے ایک موقع دیا جو میں کبھی کسی کو نہیں دیتا ...... تو ناکام رہا ...... اب تو سزا کیلئے تیار ہو جا۔'' پرمان نے یہ کہہ کر اپنے سر پر تاج کی طرح بیٹھے سانپ کی طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ ''چلو اس کو ٹھکانے لگاؤ۔''

''نہیں۔'' دیوانگ نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔
پرمان کے سر پر تاج کی طرح سجے سنہرے سانپ نے اپنی زبان تیزی سے لپلپائی اور پھر وہ کسی اسپرنگ کی طرح کھلا اور پانچ قدم دور کھڑے دیوانگ پر تیر کی طرح چلا۔ ایک لمحے میں وہ پرمان کے سر سے اُڑ کر دیوانگ کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اس نے دیوانگ کی گردن میں ایک خاص جگہ کاٹا اور پھر اس نے اس کی گردن کو جکڑنا شروع کیا۔
ایک لمحے میں دیوانگ کی آنکھیں اُبل آئیں۔ زبان باہر آ گئی اور وہ کھڑا کھڑا کسی شہتیر کی طرح زمین پر گرا۔ زمین پر گرتے ہی اس کے جسم کا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ یہ ایک انتہائی بھیانک موت تھی۔
دیوانگ کے زمین پر گرنے سے پہلے وہ سانپ پھر کسی اسپرنگ کی طرح کھلا اور تیر کی طرح اُڑتا ہوا پرمان کے سر پر آ جما۔ اب وہ جلاد پھر سے پرمان کے سر کا تاج تھا۔
''ہورا، اُٹھاؤ ...... اس کوڑے کو۔'' پرمان نے ہورا کو حکم دیا۔
ہورا نے دیوانگ کے جسم کے حصے لکڑیوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں پر جمائے اور خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔
''چلو سات ستارو تم بھی جاؤ۔'' پرمان نے اپنے سامنے نیم دائرے میں پھن اُٹھائے سانپوں سے کہا۔ وہ فوراً ہی زمین پر رینگنے لگے۔
''رانی ملائے کا ...... تم بھی چلو۔'' رانی ملائے کا بغیر کچھ بولے مسند سے اُٹھ گئی اور جب وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی تو اس نے پرمان کا ایک اور حکم سنا۔
اس حکم کو سن کر رانی ملائے کا سلگ اُٹھی۔
وہ حکم ہی ایسا تھا۔
پرمان نے اپنے دائیں کھڑی خادمہ سے کہا تھا۔ ''تیوح کو بلاؤ۔''
رانی ملائے کا کیلئے تیوح کا نام کسی شعلے سے کم نہیں تھا۔ اس کا نام سنتے ہی اس کے وجود میں آگ لگ جاتی تھی۔ مگر پرمان کو کسی بات کی پروا نہ تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ رانی ملائے کا اس سے حسد کرتی ہے۔ پھر بھی وہ جب چاہتا اور جہاں چاہتا اسے طلب کر لیتا تھا اور رانی ملائے کا حسد کی آگ میں جلتی رہ جاتی تھی۔
آج بھی یہی ہوا تھا کہ سب کو نکال کر تیوح کو طلب کر لیا گیا تھا۔ رانی ملائے کا نے اپنی سخت توہین محسوس کی تھی۔ وہ تیوح کے بلاوے پر بل کھا کر رہ گئی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب تیوح کو پرمان سے دور کر کے رہے گی۔

رانی ملائے کا کے جانے کے بعد کمرے میں ایک خادمہ رہ گئی۔ اس نے اسے بھی رخصت کر دیا۔ اب وہ تنہا رہ گیا۔ پرمان اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ برہا کی گمشدگی اس کیلئے سوہانِ روح تھی۔ اپنی پریشانی کم کرنے کیلئے اس نے تیوح کو طلب کیا تھا۔ وہ راج نرتکی ہی نہیں، اس کی مشیر خاص بھی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں تیوح پرتمکنت چال چلتی پرمان کے حضور آ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں لگاوٹ تھی۔ وہ پرمان کے سامنے گردن خم کر کے گویا ہوئی۔

''پرمان کیسے یاد کیا؟''

''تیوح اس وقت ہم بہت پریشان ہیں۔'' پرمان نے کہا۔

''تیوح کو بتا...... کیا پریشانی ہے۔ شاید میں تجھے کوئی مشورہ دے سکوں۔''

''تیوح تجھے میں نے اسی لئے طلب کیا ہے۔ اس بستی میں اگر کوئی ہے تو وہ تُو ہے۔ پرمان بس تیرے ہی مشورے سنتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے...... پرمان کو آج پھر تیری ضرورت ہے۔''

''ایسی کیا بات ہوئی...... آخر تُو کیوں پریشان ہے؟'' تیوح نے پرمان کو چونک کر دیکھا۔

''برہا نہیں ملی۔'' پرمان نے بڑے تاسف سے بتایا۔

''دیوانگ کو تُو نے اوگھڑ ناتھ کے پاس بھیجا تھا۔ کیا اس نے کوئی مدد نہ کی۔'' تیوح نے پوچھا۔

''اس نے مدد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ برہا تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ جل کر کوئلہ ہو گیا۔''

''جل کر کوئلہ ہو گیا؟'' تیوح نے بڑی حیرانی اور پریشانی سے کہا۔ ''اوگھڑ ناتھ اس بستی کا ایک زبردست بندہ تھا اگر وہ ناکام ہو گیا تو اس کا مطلب ہے کہ برہا کو کسی بہت ہی خطرناک شخص نے غائب کیا ہے۔''

''اب میں کیا کروں تیوح رنتاروتو کسی صورت نہ مانے گا۔'' پرمان نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''دیوانگ کہاں گیا؟'' تیوح نے پوچھا۔

''دیوانگ کو تو میں نے ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اپنی لاپروائی کی سزا پا گیا۔'' پرمان بولا۔

''اچھا...... اچھا کیا...... تُو نے بہت اچھا کیا۔'' تیوح کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''اب میں برہا کو کہاں تلاش کروں۔'' پریشانی اپنی جگہ برقرار تھی۔

''پرمان، یہ تیرا کام نہیں...... تو اب ہورا کو بھیج۔''

''ہورا، ان لوگوں کے ہاتھوں خود چوٹ کھا چکا ہے۔ یہ اب اس کے بس کا معاملہ نہیں۔''

''پھر اب مجھے آزما۔'' تیوح نے ایک ادائے خاص سے پرمان کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... تیوح میں تجھے بھیج کر کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا...... میں تجھے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔ تُو میرے لئے بہت قیمتی ہے۔'' پرمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ان مہربان لفظوں کیلئے میں تیری ممنون ہوں۔ اس طرح کی بات کرتے ہوئے ذرا احتیاط رہا کر، اگر یہ بات رانی ملائے کا کے کانوں میں پڑ جائے تو وہ تجھے زندہ نہ چھوڑے۔'' تیوح نے مسکرا کر کہا۔

''وہ ایک بے وقوف عورت ہے۔'' پرمان نے بے نیازی سے کہا۔

''ایک عورت، دوسری عورت کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے۔'' تیوح نے پرمان کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' پرمان نے سخت لہجے میں کہا۔

''لیکن میرا تو بگاڑ سکتی ہے۔'' تیوح مسکرائی۔

''اگر کبھی اس نے اس کی جرأت کی تو سمجھنا وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔'' پرمان نے انکشاف کیا۔

''مجھے اتنا مان دینے کا ایک مرتبہ پھر شکریہ...... اب مجھے جانے کی اجازت دے۔''

''کہاں؟'' پرمان نے چونک کر پوچھا۔

''برہا کی تلاش میں۔''

''میں تجھے کس طرح بھیج دوں؟''

''مجھ پر یقین کر...... میں دیوانگ نہیں ہوں۔ نہ ہی اوگھڑ ناتھ ہوں۔ اس بستی میں جاؤں گی تو کچھ کر کے ہی آؤں گی۔ وقت لگ سکتا ہے لیکن تیوح کو کوئی برہا کے پاس پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔'' تیوح نے دعویٰ کیا۔

''جانتا ہوں۔'' پرمان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر اجازت دے۔'' تیوح نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اکیلی مت جا...... یہاں سے کسی کو ساتھ لے جا۔'' پرمان نے تجویز پیش کی۔

''ٹھیک ہے پرمان...... تیرا حکم سر آنکھوں پر...... لیکن یہاں ایسا کون ہے جو میرے ساتھ جا سکے؟''

''تیرے ساتھ جانے کو تو...... ہر کوئی تیار ہو جائے گا لیکن میں کسی کام کے بندے کو تیرے ساتھ بھیجنا چاہتا ہوں...... اور میری نظر میں سب سے اچھا آدمی اس وقت ہورا ہے۔''

''ہورا۔'' تیوح نے اس کا نام بے اختیار دہرایا۔

اس کا نام سن کر اس کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ پرمان نے یہ کیا نام لے دیا۔ اس

"وحشی" نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ وہ اب اس کے تصور میں رہنے لگی تھی۔

اگر ہورا کا ساتھ مل جائے پھر تو اس سفر کا مزہ ہی آجائے گا۔ پھر برہا کی تلاش میں صدیاں ہی کیوں نہ گزر جائیں۔

وہ یہ سوچ کر مسکرا دی۔

"کیوں مسکراتی ہے؟" پرمان نے پوچھا۔

"ہورا کے نام پر۔" تیوح نے صاف گوئی سے کہا لیکن مسکرانے کی وجہ نہ بتائی، وہ چالاکی سے بولی۔ "پرمان تُو جانتا ہے کہ وہ ایک ایسا جنگلی گھوڑا ہے جس کے منہ میں لگام نہیں۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں لیکن تُو فکر نہ کر، وہ تجھے پریشان نہیں کرے گا، میں اس کی لگام تیرے ہاتھ میں دے کر اسے تیرے ساتھ روانہ کردوں گا۔" پرمان نے کہا۔

"ارے نہیں...... پرمان تو اسے کچھ نہ کہنا...... میں اس جنگلی گھوڑے کو سنبھال لوں گی۔ میں جانتی ہوں سنبھالنا۔"

"چل ٹھیک ہے۔ جیسی تیری مرضی...... جا پھر اسے لے جا۔" پرمان یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تیوح کو سمجھاتا رہا تھا کہ کسی مشکل میں کیا کرنا ہے۔

☆......☆......☆

درخت دروازے پر پہنچ کر زنجیر میں بندھی گھنٹی ہورا نے زور سے درخت کے تنے میں ماری اور بولا۔ "میں ہوں ہورا۔"

"آجا ہورا...... اندر آجا۔" فوراً ہی اندر سے آواز آئی لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔

"میرے ساتھ تیوح بھی ہے۔" ہورا نے اندر داخل ہونے سے پہلے کہا۔

"یہ کون ہے...... یہ کہاں جا رہی ہے؟ اسے میں نہیں جانتا۔" اندر سے آواز آئی۔

"تُو پرمان کو تو جانتا ہے؟" ہورا نے سوال کیا۔

"ہورا کیا بات کرتا ہے...... میں اسے کیسے نہیں جانوں گا۔ میں اس کا غلام ہوں۔" آواز میں فرمانبرداری تھی۔

"تیرے اسی آقا نے اسے میرے ساتھ بھیجا ہے۔" ہورا نے تیوح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا...... کچھ دیر انتظار کر۔"

"ٹھیک ہے...... کر لیتا ہوں۔" ہورا نے اطمینان سے کہا۔ پھر اس نے آہستہ سے تیوح کے کان میں کہا۔ "پرمان سے تصدیق کرے گا۔"

"اچھا...... چلو ٹھیک ہے، کر لے تصدیق...... ہم کون سا بلا اجازت جا رہے ہیں۔" تیوح نے کہا۔

تھوڑی دیر میں اندر سے آواز آئی۔ "آجا رے ہورا...... تیوح کو بھی لے آ۔"

پھر وہ دونوں درخت میں بنے دروازے میں داخل ہو گئے۔ ہورا نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اندر کس طرح کا راستہ ہے لہٰذا تیوح کو اندھیرے کے باوجود کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ دونوں ڈھلوان پر دوڑتے چلے گئے۔ پھر وہ ایک دم روشنی میں نہا گئے۔ اب ان کے سامنے لق و دق صحرا تھا۔

"اب کدھر چلنا ہے؟" ہورا نے زنجیر میں بندھی گھنٹی اپنے کندھے پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے ریت پر کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنا شروع کیں۔ ہورا جھک کر اس کے اس عمل کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد تیوح نے مشرق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس طرف۔"

"کیسے چلوگی؟" ہورا نے پوچھا۔

"اونٹ پر۔" تیوح نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" ہورا نے یہ کہہ کر زنجیر میں بندھی گھنٹی زور سے ریت پر ماری۔ ایک دم ریت کا بادل اُٹھا اور جب یہ ریت چھٹی تو دو خوبصورت اونٹ سامنے موجود تھے۔ ہورا اور تیوح اونٹوں پر سوار ہو گئے اور چند لمحوں بعد ہی وہ دونوں صحرا میں ریت اُڑاتے بگولوں کی طرح غائب ہو گئے۔

☆......☆......☆

اس شام بڑی عجیب بات ہوئی۔

برہا جس کا نام اب کمال نے آرزو رکھ دیا تھا، وہ اپنی دادی کی گود میں چڑھی ہوئی تھی۔ نفیسہ بیگم کے سامنے کمال رائے بیٹھا تھا اور نفیسہ بیگم کی ملازمہ خاص بھاگ بھری آرزو کیلئے سیب کاٹ رہی تھی۔

اس وقت بھی خاموش بیٹھے تھے کہ آرزو نے چونک کر کہا۔ "ہاں۔"

یہ "ہاں" اس نے کچھ اس طرح جیسے کسی نے اسے آواز دی ہو۔

نفیسہ بیگم نے حیرت سے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "کیا ہاں؟"

"دادی کسی نے ابھی مجھے برہا کہہ کر پکارا ہے...... کیا آپ نے نہیں سنا؟"

"نہیں...... میں نے تو نہیں سنا...... لیکن بیٹا، تمہارا نام اب آرزو ہے۔ آرزو کمال...... تم کمال کی آرزو ہو۔" نفیسہ بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جی، دادی۔" آرزو نے فوراً کہا۔ "میں جانتی ہوں، میرا نام اب آرزو ہے...... یہ نام مجھے بہت پسند ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ نام میرے بابا نے رکھا ہے۔"

"تم میری جان ہو...... میری آرزو ہو۔" کمال رائے والہانہ انداز میں بولا۔

"ارے۔" آرزو پھر چونک گئی۔ "پھر آواز آئی، جیسے کسی نے پکارا ہو...... برہا۔"

"ہیں۔" کمال رائے پریشان ہو کر بولا۔ "آرزو...... ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔"

"بابا...... کسی عورت کی آواز ہے...... آواز بھی جانی پہچانی لگتی ہے...... لیکن اس وقت سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کس کی آواز ہے؟" آرزو نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اِدھر آؤ...... میرے پاس۔" کمال رائے نے کہا۔

وہ دادی کی گود سے اُتر کر سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے کمال رائے کے پاس چلی گئی۔ کمال رائے نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اسے پیار کر کے بولا۔ "میری آرزو...... کچھ نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔"

اتنی دیر میں بھاگ بھری نے سیب کاٹ کر پلیٹ میز پر رکھ دی۔ "لیں بی بی سیب کھائیں۔"

"بھاگ بھری...... پلیٹ مجھے دے دو، میں اپنی آرزو کو خود کھلاؤں گا۔" کمال رائے نے کہا۔

"اچھا مالک۔" یہ کہہ کر بھاگ بھری نے پلیٹ اُٹھا کر کمال رائے کے ہاتھ میں دے دی۔

کمال رائے نے سیب کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں دیتے ہوئے کہا۔ "لو آرزو۔"

آرزو نے اپنا چھوٹا سا منہ کھول کر سیب لے لیا اور بڑی نفاست سے کھانے لگی۔

ابھی اس نے تھوڑا ہی سیب کھایا تھا کہ وہ اچانک کمال رائے کی گود سے اُتری اور تیزی سے باہر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "بابا، میں ابھی آتی ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔" کمال رائے نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے دروازے سے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔

"ارے، کمال...... یہ کہاں گئی ہے؟" نفیسہ بیگم کو جانے کیا خیال آیا۔

"ماں، باہر گئی ہے۔" کمال رائے نے سادگی سے کہا۔ "آ جائے گی۔"

"اری او...... بھاگ بھری...... جا آرزو کے پیچھے جا۔ دیکھ تو وہ کہاں گئی ہے؟" نفیسہ بیگم کو چین نہ آیا۔

بھاگ بھری کو نفیسہ بیگم کے کہنے پر کچھ خطرے کا احساس ہوا، آرزو کا باہر جانا اسے خالی از علت نہ معلوم ہوا۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ پھر چند لمحوں بعد ہی وہ جو خبر لائی، وہ کمال رائے کیلئے پریشانی کا باعث تھی۔

بھاگ بھری نے کمرے میں داخل ہو کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مالک...... بی بی حویلی سے باہر جا رہی ہے۔"

"ہیں۔" اچانک کمال رائے کو کرنٹ لگا۔ اسے فوراً ہی نور بانو کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی سخت حفاظت کرنا، اسے اکیلی حویلی سے باہر نہ جانے دینا...... پھر اسے یاد آیا کہ

آرزو کو کوئی نادیدہ شخصیت نام لے کر پکار رہی تھی...... اوہ، ضرور کوئی گڑبڑ ہے...... وہ بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر بھاگا۔

"بتاؤ، کدھر گئی ہے۔" وہ کمرے سے باہر نکل کر بولا۔

بھاگ بھری اس کے ساتھ دوڑی۔ کمال رائے جب حویلی کے دروازے پر آیا تو آرزو حویلی اور حویلی کے بڑے گیٹ کے درمیان کا فاصلہ عبور کر چکی تھی۔ وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر۔

کمال رائے نے حویلی کے بڑے دروازے پر کھڑے دو مسلح چوکیداروں کو آرزو کے بارے میں سختی سے ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ کسی قیمت پر اکیلی باہر نہ نکلے۔

آرزو کو گیٹ کی طرف آتا دیکھ کر دونوں چوکیدار الرٹ ہو گئے تھے۔ دونوں چوکیداروں نے کمال رائے کو حویلی کی عمارت سے باہر آتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے زور سے ہاتھ ہلا کر آرزو کو روکنے کا اشارہ کیا اور سیڑھیاں اُتر کر بڑے دروازے کی طرف دوڑا۔ کمال رائے اگر آرزو کو روکنے کا اشارہ نہ بھی کرتا تب بھی دونوں چوکیدار ہوشیار ہو چکے تھے۔ وہ آرزو کو ہرگز باہر نہ نکلنے دیتے۔

جیسے ہی آرزو چوکیدار کے نزدیک آئی۔ وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "بی بی، کدھر جاتی ہو۔"

"میں باہر جا رہی ہوں۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" آرزو نے انتہائی غصے میں کہا۔ اس کا غصہ قابل دید تھا۔

"بی بی، میری بات سنیں۔" یہ کہہ کر قد آور چوکیدار نے اسے جھک کر پکڑنا چاہا تو وہ بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگوں کے درمیان سے گزر گئی۔

چوکیدار کو آرزو سے اس پھرتی کی توقع نہ تھی۔ وہ ایک دَم پریشان ہو گیا۔ پھر دونوں چوکیدار اپنی بندوقیں کندھوں پر سنبھالتے آرزو کے پیچھے بھاگے۔ وہ بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی اور ابھی وہ گیٹ سے نکلنا ہی چاہتی تھی کہ ان دونوں نے مل کر اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ پھر ایک چوکیدار نے اسے گود میں اُٹھا لیا۔

"مجھے چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو۔" وہ ایک دَم چیخ کر بولی اور اپنے خوبصورت ہاتھوں کے مکے بنا کر اس پر برسانے لگی۔

چند ہی لمحوں بعد کمال رائے دوڑتا ہوا گیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے آرزو کو اپنی گود میں سمیٹ لیا لیکن آرزو قابو میں نہ آئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ وہ بری طرح مچلنے لگی، بس ایک ہی بات بار بار دہرا رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

"بیٹا کہاں جاؤ گی؟" کمال رائے نے حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں باہر جاؤں گی...... وہ مجھے بلا رہی ہے۔" آرزو نے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کون ہے وہ؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" آرزو نے غصے سے کمال رائے کو دیکھا۔ "آپ مجھے چھوڑ دیں۔"

وہ پھر مچلنے لگی اور کچھ اس طرح مچلی کہ کمال رائے کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ بمشکل اسے اپنے کمرے تک لایا۔ اس نے اسے بیڈ پر لٹایا۔ نفیسہ بیگم اور بھاگ بھری ساتھ ساتھ تھیں۔

آرزو بیڈ پر لیٹ کر بری طرح تڑپنے لگی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہ تھی۔ وہ خوابیدہ سے لہجے میں بول رہی تھی۔ "مجھے جانے دو، وہ مجھے بلا رہی ہے۔"

نفیسہ بیگم نے اس کی یہ حالت دیکھی تو فوراً اپنا کلیجہ تھام لیا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"کچھ پتہ نہیں ماں...... تم ذرا کمرے کا دروازہ لاک کر دو۔" کمال رائے نے کہا۔

بھاگ بھری نے آگے بڑھ کر بڑی تیزی سے کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا۔ نفیسہ بیگم جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دَم کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ آرزو کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہونے لگے اور اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالکل ٹھیک ہو گئی۔ وہ سو گئی یا بے ہوش ہو گئی۔

اسے پُرسکون دیکھ کر کمال رائے نے اطمینان بھرا سانس لیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ماں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" نفیسہ بیگم پریشان ہو کر بولی۔

"ماں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" کمال رائے خود مشکل میں تھا۔

"مجھے لگتا ہے...... اس پر کوئی اثر ہونے لگا ہے۔" نفیسہ بیگم نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں بیگم صاحبہ...... آپ ٹھیک بول رہی ہیں۔" بھاگ بھری نے بھی اپنی رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

"اسے اب تالے میں بند رکھنا پڑے گا۔" کمال رائے نے کہا۔

"لیکن بیٹا...... ایسا ہم کب تک کریں گے؟" نفیسہ بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ماں، میں ابھی حیدرآباد جا رہا ہوں...... نور بانو سے اس سلسلے میں معلوم کرتا ہوں۔" کمال رائے نے ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے جاگنے تو دو...... پتہ نہیں یہ اُٹھ کر کیا کرے۔" نفیسہ بیگم خوفزدہ سے لہجے میں بولی۔

"یہ جتنی دیر سوئے اسے سونے دینا...... بس اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ کمرے سے باہر نہ جانے پائے۔"

"اچھا بیٹا جاؤ...... اللہ مالک ہے۔ بس تم جلدی آ جانا...... اور اپنے ساتھ دو بندے ضرور لے جانا۔" نفیسہ بیگم نے اسے ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے ماں، تم فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر کمال رائے نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی نفیسہ بیگم نے فوراً دروازہ مقفل کر لیا اور بیڈ پر بیٹھ کر آرزو کو دیکھنے لگی۔ اس وقت وہ گہری نیند میں تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔ نفیسہ بیگم سے رہا نہ گیا۔ اس نے اسے جھک کر پیار کیا اور بے اختیار بولی۔ "اللہ، تجھے ایسی ویسی نظروں سے بچائے۔"

☆......☆......☆

سبز قالین والے کمرے میں جب نور بانو گاؤ تکیہ لگا کر اور چادر سر پر لے کر بیٹھ گئی تو کمال رائے گویا ہوا۔

"میں بہت پریشان ہوں۔"

نور بانو نے گہری نظر سے کمال رائے کا چہرہ دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولی۔ "کیا ہوا؟"

کمال رائے نے اس واقعہ کی تفصیل بتائی۔ جس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ خبیث اس بچی کا آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اسی لئے میں نے اس کے تنہا حویلی سے نکلنے کی تنبیہ کی تھی۔ آپ نے اچھا کیا جو اسے باہر جانے سے روک لیا اور یہ بھی اچھا کیا کہ فوراً میرے پاس چلے آئے۔" نور بانو نے پورا واقعہ سن کر کہا۔

"بس مجھے اندھیرے میں آپ ہی روشنی کی کرن کی طرح نظر آئیں۔ میں یہاں چلا آیا۔"

"اپنی حویلی کے چاروں طرف آدھا میل کے فاصلے تک ان خبیثوں کو تلاش کرنا۔ وہ حویلی کے قریب ہی کہیں چھپے ہوئے ہیں...... اور جب وہ نظر آ جائیں تو میں آپ کو بتاؤں گی، کیا کرنا ہے...... میں ابھی آپ کو ایک ناریل دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور باہر نکل گئی۔

پھر چند لمحوں بعد ہی وہ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ثابت ناریل تھا۔ وہ ناریل کمال رائے کے ہاتھ میں دے کر اسے چند ہدایات دیں اور پھر بولی۔ "آرزو کی ابھی آپ نے سخت نگرانی کرنی ہے۔ وہ بس تنہا حویلی سے باہر نہ جائے۔ اس بات کا ہر قیمت پر خیال رکھنا ہے۔"

"جیسا آپ نے کہا، ویسا ہی کروں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔" کمال رائے نے نور بانو کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"بس پھر آپ جائیں...... اللہ مالک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سر سے چادر اُتار دی اور کمرے سے نکل گئی۔

اب کمال رائے کے لئے یہاں بیٹھنا بیکار تھا، وہ ناریل کو مضبوطی سے پکڑے نور بانو کے گھر

سے باہر آ گیا۔

☆......☆......☆

جب کمال رائے اپنی جیپ میں حویلی میں داخل ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ جیپ سے اُتر کر تقریباً بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ دروازہ اب بھی باہر سے بند تھا۔ اسے تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور بھاگ بھری کو آواز لگائی۔ ”بھاگ بھری دروازہ کھولو۔“

بھاگ بھری نے جلدی سے دروازہ کھولا تو کمال رائے نے اپنی ملازمہ کا چہرہ دیکھا، وہاں کوئی پریشانی نہ تھی۔ اسے مزید اطمینان ہوا، اس نے دروازے پر کھڑے رہ کر ہی پوچھا۔

”آرزو کیسی ہے؟“

”بی بی اندر ہیں...... کھیل رہی ہیں۔“ بھاگ بھری نے جواب دیا۔

وہ جلدی سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ آرزو بیڈ پر بہت سے کھلونے پھیلائے کھیل میں مگن تھی۔ اس نے جاتے ہی اسے گود میں اُٹھالیا اور اپنے سینے سے لگا کر کئی بار اسے چوما۔ آرزو اپنے باپ کی بانہوں میں جھولنے لگی۔

جب نفیسہ اور کمال کی آنکھیں ملیں تو نفیسہ نے اشارے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

کمال رائے نے اشارے کا جواب اشارے سے دیا۔ ابھی بتاتا ہوں۔

پھر وہ اپنی ماں کو کمرے سے باہر نکال لایا۔ نفیسہ بیگم کے کمرے میں بیٹھ کر کمال رائے نے نور بانو سے ہونے والی گفتگو دہرا دی۔ اس کی بات سن کر نفیسہ بیگم کے چہرے پر فکرمندی پھیل گئی۔

”اب کیا ہوگا؟“ نفیسہ بیگم بولی۔ ”بیٹا تم ان خبیثوں کو کیسے تلاش کرو گے؟“

”کام ذرا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں...... میں دو دو بندوں کی ٹولیاں بنا کر چاروں طرف پھیلائے دیتا ہوں۔ خود بھی جیپ لے کر نکلوں گا۔ یہ کام میں صبح ہوتے ہی شروع کروں گا۔ بس ماں تم اس اثناء میں آرزو کا خیال رکھنا۔ اگر اسے روکنے کیلئے مارنا بھی پڑے تو گریز نہ کرنا۔“

”تم بے فکر رہو۔ میں آرزو کو تالے میں بند رکھوں گی اور خود بھی اس کے ساتھ رہوں گی۔“ نفیسہ بیگم نے یقین دلایا۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی کمال رائے نے ہوشیار اور سمجھدار بندوں کو دو دو ٹولیاں بنائیں اور انہیں اچھی طرح سمجھا کر مختلف سمتوں کی طرف روانہ کر دیا۔

یہ بات تو خود کمال رائے کو بھی معلوم نہ تھی کہ وہ کون لوگ ہیں؟ کیسے ہیں اور کس شکل میں سامنے آئیں گے۔ بس اس نے اپنے بندوں کو یہی ہدایت کی تھی کہ کوئی غیر معمولی بندہ نظر آئے اور وہ اپنے

علاقے کا محسوس نہ ہو تو اس سے کچھ نہ کہا جائے...... وہاں ایک بندہ اس کی نگرانی کیلئے رہ جائے اور ایک بندہ حویلی میں دوڑتا ہوا آجائے۔

حویلی کی مغرب کی جانب کھیت تھے اور مشرق کی طرف آموں کے باغات تھے۔ آموں کا موسم نہ تھا، اس لئے یہ باغات آدمیوں سے خالی تھے۔ جنوب کی طرف آبادی تھی اور شمال کی طرف بھی مزارعوں کی رہائش تھی۔

کمال رائے نے اندازہ لگایا تھا کہ شمال جنوب کی طرف تو کسی غیر آدمی کا چھپنا آسان نہ تھا۔ بستی کے باہر کا آدمی فوراً ہی نظروں میں آجانے کا امکان تھا۔ مشرق کی جانب دور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ گھوڑے پر بیٹھ کر آدھا میل کیا، ایک میل تک نظر دوڑائی جاسکتی تھی اور چھپے ہوئے بندوں کو تلاش کیا جاسکتا تھا۔ البتہ جس طرف باغات تھے، وہاں معاملہ ذرا مشکل تھا۔ گھنے باغات تھے، اندر اندھیرا تھا۔ جب تک باغات کے اندر جا کر ایک ایک چپہ نہ چھانا جائے کسی کو تلاش کر لینا آسان نہ تھا۔

یوں تو کمال رائے نے اپنے بندے چاروں طرف روانہ کر دیئے تھے لیکن اس کا دھیان بار بار باغات کی طرف جاتا تھا۔ وہ دشمن جاں انہی باغات میں ہو سکتے تھے۔ آموں کا ایک باغ جس میں ایک لاکھ درخت تھے اور جو لکھی باغ کہلاتا تھا۔ اس باغ میں دشمنوں کا موجود ہونا کسی حد تک یقینی تھا۔

کمال رائے نے لکھی باغ کی چھان بین کیلئے دو ٹولیاں بھیجی تھیں۔

دوپہر تک ہر سمت سے ٹولیاں واپس آگئی تھیں، انہیں آدھے میل کے رقبے میں کوئی باہر کا یا مشکوک آدمی نظر نہ آیا تھا لیکن ابھی لکھی باغ سے دونوں ٹولیاں واپس نہیں آئی تھیں۔

کمال رائے نے بھی کھیتوں کی جانب دوربین کے ذریعے میلوں تک کا جائزہ لیا تھا۔ پھر اس نے اپنی جیپ میں آبادیوں کی طرف بھی چکر لگائے تھے لیکن نتیجہ وہی نکلا تھا جو دوسری ٹولیوں نے آکر بتایا تھا۔

کمال رائے کو اب لکھی باغ کی ٹولیوں کا انتظار تھا۔

وہ جانے ان ٹولیوں کی طرف سے اتنا پُراُمید کیوں تھا۔

اسی وقت بھاگ بھری کمال رائے کے کمرے میں داخل ہوئی اور پھولی ہوئی سانس کے دوران بمشکل گویا ہوئی۔ ”مالک، باہر کوئی آدمی آیا ہے۔“

آدمی کا ذکر سن کر کمال رائے ایک دَم اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ حویلی کے برآمدے میں لکھی باغ جانے والی ٹولی میں سے ایک آدمی موجود تھا۔ اس کا نام رحیمو تھا۔

رحیمو نے کمال رائے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھا اور بے قراری سے بولا۔ ”مالک جلدی چلیں، وہ لوگ لکھی باغ میں موجود ہیں۔ میں گُنل کو وہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

"ٹھیک ہے......ایک منٹ رکو......میں چلتا ہوں۔" کمال رائے نے کہا اور پھر اپنے کمرے میں واپس آیا۔ کمرے سے نور بانو کا دیا ہوا ناریل احتیاط سے اُٹھایا اور پھر اس نے برآمدے میں کھڑے رحیمو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ جیپ حویلی کے دروازے پر موجود تھی۔ اس نے رحیمو کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جیپ کو کسی راکٹ کی طرح چلاتا، حویلی کے بڑے گیٹ پر آیا۔ وہاں سے اس نے دو مزید اسلحہ بردار اپنی جیپ میں بٹھائے اور پھر لکھی باغ کی طرف چل پڑا۔

راستے میں رحیمو نے جلدی جلدی جو کچھ بتایا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ دونوں لکھی باغ کا ایک ایک چپہ چھانتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک لمبے چوڑے شخص پر پڑی۔ ان کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ ایک سفید چادر میں تھا اور اس کا بدن بالکل کالا تھا۔ ایک گھنٹی اس کے کندھے سے لٹکی تھی۔ اس دیو کو دیکھ کر وہ دونوں درخت کی اوٹ میں ہو گئے اور چھپ کر اسے دیکھنے لگے۔

وہ دیو قامت شخص تھوڑا سا آگے جا کر درختوں میں گم ہو گیا لیکن گھنٹی کی ٹن ٹن کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دونوں چھپتے چھپاتے بالآخر اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک کالے لباس میں ملبوس بڑی پُرکشش عورت بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے سامنے ایک گڑیا رکھی ہوئی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ دیو قامت شخص اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ عورت سامنے تھی لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر رحیمو نے کنل کو اشارہ کیا کہ وہ خاموشی سے درخت پر چڑھ جائے اور وہ مالک کو بلانے جاتا ہے۔

کمال رائے جیپ کو آندھی طوفان کی طرح دوڑاتا لکھی باغ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رحیمو نے اسے بتا دیا تھا کہ باغ میں داخل ہونے کی صحیح جگہ کون سی ہے۔ کمال رائے نے اس جگہ سے کافی پہلے جیپ چھوڑ دی تاکہ وہ پراسرار لوگ چوکنے نہ ہو جائیں۔

پھر وہ بہت محتاط انداز میں باغ میں داخل ہوئے۔ اسلحہ بردار بندوں کو اس نے اپنے دائیں بائیں مگر ذرا فاصلے پر رکھا۔ خود اس کے پاس بھی ریوالور موجود تھا۔ رحیمو ان سب سے آگے تھا۔

تھوڑا سا اندر جانے کے بعد رحیمو نے اپنے منہ سے کالے تیتر کی آواز نکالی۔ چند لمحوں بعد ایک درخت کی اونچائی سے اس کا جواب آیا۔ رحیمو نے جان لیا کہ کنل اپنی جگہ موجود اور محفوظ ہے اور کنل نے بھی جان لیا کہ رحیمو مالک کو لے کر آ گیا ہے۔

رحیمو بڑا تیز بندہ تھا۔ وہ روشن رائے کے ساتھ اکثر شکار پر جایا کرتا تھا۔ وہ تیتر گھیرنے کا ماہر تھا۔ وہ بڑی خاموشی اور مہارت سے تیتروں کے جھنڈ کے سروں پر پہنچ جایا کرتا تھا۔

آج بھی یہی ہوا، وہ بڑی مہارت سے ان پراسرار لوگوں کے ٹھکانے پر کمال رائے کو لے کر

پہنچ گیا۔

کنل جس درخت پر بیٹھا ہوا تھا، کمال رائے اور رحیمو اس سے بھی آگے پہنچ چکے تھے۔ وہ دونوں ان کے بالکل سامنے اور نزدیک تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا خیمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ پراسرار عورت خیمے کے دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سامنے ایک گڑیا رکھی تھی اور وہ دیو قامت شخص اسے بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ عورت کوئی دیوی ہو اور وہ اس کا پجاری۔

کمال رائے نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ اس وقت بڑے بہترین نشانے پر تھا۔

کمال رائے وقت ضائع کیے بغیر ناریل اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھوڑا سا جھکا اور اس ناریل کو پوری قوت سے ان دونوں کی جانب لڑھکا دیا۔

جس طرح نور بانو نے کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کمال رائے نے وہ ناریل پوری قوت سے ان کی طرف پھینکا تھا لیکن زمین ناہموار تھی۔ عام حالت میں وہ ناریل پانچ سات قدم زمین پر لڑھک کر رک جاتا لیکن کمال رائے یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ناریل کہیں رکے بغیر بہت رفتار سے ان دونوں کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

ناریل کے نزدیک پہنچتے ہی تیوح کی ایک دم آنکھ کھل گئی لیکن وقت اتنا کم تھا کہ وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ ناریل میں چھپی آگ اسے واضح طور پر نظر آ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہورا کو ہوشیار کرتی، وہ ناریل پوری قوت سے ہورا کی کمر میں لگا۔ کمر میں لگتے ہی وہ چار ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

اور پھر کمال رائے کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، وہ اسے حیران کرنے کیلئے بہت تھا۔ ناریل پھٹتے ہی آگ کچھ اس طرح پھیل گئی تھی جیسے وہ دونوں پٹرول کے دریا میں بیٹھے ہوں۔ آناً فاناً ان کے چاروں طرف آگ پھیل گئی۔ وہ دونوں بہت بلند شعلوں میں گھر گئے۔

پھر یہ آگ جس تیزی سے لگی تھی، اسی تیزی سے بجھ گئی۔ کمال رائے تیزی سے دوڑ کر اس جگہ پہنچا۔ اس کے پیچھے اس کے بندے بھی تھے۔

اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

اس کا خیال تھا کہ ان کی جلی ہوئی چیزیں ملیں گی لیکن اس جگہ تو جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اب سے کچھ دیر پہلے یہاں آگ لگی تھی۔ ان کا جلا ہوا خیمہ تھا نہ جلی ہوئی گڑیا۔ وہاں کوئی چیز نہ تھی۔

بہر حال کمال رائے خوش تھا کہ اس نے ان پراسرار لوگوں کو جلا دیا تھا جو اس کی بیٹی کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ خوشی خوشی حویلی پہنچا۔ اس نے اپنی ماں کو ساری روداد سنائی۔ نفیسہ بیگم ساری بات سننے کے بعد بولی۔ "عجیب واقعہ ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر وہ کون لوگ تھے؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے...... یہ سب کیا معاملہ تھا...... میں تو خود حیران رہ گیا تھا۔" کمال رائے نے آرزو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس پر تو کوئی اثر نہیں ہوا۔"

"ہاں ہوا کیوں نہیں...... ایک مرتبہ تو اس میں اتنی قوت آ گئی تھی کہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف بھاگی تھی...... لیکن وہ تو خیر تھی کہ دروازہ لاک تھا۔ ورنہ اس وقت شاید اسے روکنا مشکل ہو جاتا۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔

"ماں وہاں باغ میں بیٹھی وہ عورت کوئی عمل کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سامنے ایک کپڑے کی گڑیا رکھی تھی۔ ویسے ماں وہ عورت بڑی دلکش تھی۔ سانولی تھی لیکن اس کے چہرے میں کوئی ایسی بات تھی کہ آدمی اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔" کمال رائے نے بتایا۔

"ہائے پتہ نہیں کوئی چڑیل تھی؟" نفیسہ بیگم نے فوراً کہا۔

"ماں کیا چڑیلیں اتنی خوبصورت ہوتی ہیں؟" کمال رائے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ارے، مجھے کیا پتہ...... میں نے کون سی چڑیلیں دیکھی ہیں۔" نفیسہ بیگم نے کہا۔

☆......☆......☆

وقت نے بہت تیزی سے کروٹ لی۔ وقت کا رخش سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ سے چٹکیاں بجاتے گزر رہا تھا۔ دس سال بیت گئے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دس ماہ گزرے ہوں۔ دس دن گزرے ہوں، دس گھنٹے گزرے ہوں۔

وقت گزرنے کا کسی کو احساس نہ ہوا تھا۔

آرزو دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہو گئی تھی۔

اسے پندرھواں برس لگنے کو تھا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے بھرے تھے۔ چہرے پر آفتاب روشن تھا۔ جسم جیسے روپہلی چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ وہ تو ویسے ہی بہت حسین تھی۔ اب وہ قیامت ہو گئی تھی۔ جدھر سے گزرتی تھی حشر برپا کر دیتی تھی۔

جب وہ اپنی گاڑی سے اُتر کر کالج کے گیٹ میں داخل ہوتی تو ایک حشر سا اُٹھتا۔ ہر طرف شور مچ جاتا۔

"وہ دیکھو...... آرزو آ گئی۔"

لڑکیاں اس پر اس طرح گرتیں جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔

وہ جتنی حسین تھی، اندر سے اتنی ہی معصوم تھی۔ اس کی صورت ہی بھولی بھالی نہ تھی۔ دل بھی بھولا بھالا تھا۔ اسے اپنے حسن پر ناز نہ تھا۔ نہ اسے بڑے باپ کی بیٹی ہونے پر فخر تھا۔

وہ ہر لڑکی سے بے تکلف ہو جاتی تھی، بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔ اگر اسے احساس ہو جاتا کہ

کوئی لڑکی اسے حسرت سے دیکھ رہی ہے، بات کرنا چاہتی ہے مگر بات کرنے سے جھجک رہی ہے تو ایسی لڑکی سے وہ خود آگے بڑھ کر بات کر لیتی تھی۔ پھر لڑکیاں اس کی دیوانی کیوں کر نہ ہوتیں۔ سب لڑکیاں اس پر جان دیتی تھیں۔ پورا گرلز کالج اس پر فدا تھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں کالج کی لیکچرار تک اس کی گرویدہ تھیں۔ وہ پڑھاتے پڑھاتے اس کے چہرے میں کھو جاتیں۔

کمال رائے تو جیسے اسے دیکھ کر جیتا تھا۔ نفیسہ بیگم اس پر صدقے واری جاتی تھی۔

دس سال گزر گئے تھے لیکن کمال رائے نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ کمال، مائرہ سے شادی کر لے...... وہ مائرہ کو پسند بھی کرتا تھا۔ اس سے بات بھی کر لیا کرتا تھا۔ وہ حویلی آ جاتی تو اس کے ساتھ وقت بھی گزار لیا کرتا تھا...... لیکن نفیسہ بیگم جب موقع محل دیکھ کر کمال رائے سے شادی کا ذکر کرتی تو وہ کسی نئے گھوڑے کی طرح بدک جاتا تھا۔ ماں اصرار کرتی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔

"ماں مجھے معاف کر دو...... مجھ سے انکار کروا کے کیوں مجھے گناہ گار بناتی ہو۔ ماں تم میری جنت ہو میرے ہاتھ سے کیوں نکلنا چاہتی ہو۔" وہ منت آمیز لہجے میں کہتا۔

"میں کب کہتی ہوں تُو انکار کر...... میں کب چاہتی ہوں کہ تیری جنت تیرے ہاتھ سے نکلے۔" نفیسہ بیگم بھی بحث پر اُتر آتی۔ "تُو آخر کب تک تنہا رہے گا۔"

"میں تنہا کب ہوں ماں...... تم ہو میرے ساتھ...... آرزو ہے میرے پاس۔"

"میں کب تک زندہ رہوں گی۔ میں سوچتی ہوں میرے بعد کون کرے گا تیری شادی، کون کرے گا تیری فکر۔" نفیسہ بیگم فکر مند ہو جاتی۔

"ماں تم سلامت رہو...... مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ میں سچ کہتا ہوں ماں۔"

"لیکن مجھے تو اس حویلی میں ایک دلہن چاہئے۔" نفیسہ بیگم ضد پر اُتر آتی۔

"ماں، میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔" وہ ایک دم پینترا بدلتا۔

"چلو...... اب ایک نیا ہی چکر چلا لیا۔" نفیسہ بیگم حیرت سے آنکھیں پھاڑتیں۔ "شادی نہ کرنے کے بہانے بنا لو مگر خبردار آئندہ اپنے آپ کو بوڑھا نہ کہنا۔"

"کیوں ماں؟" وہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتا۔

"تُو خود کو بوڑھا کہے گا جس کی عمر چالیس اکتالیس سال ہے تو پھر میں خود کو کیا کہوں گی۔ دیکھ میں بوڑھی کہنے سے رہی۔" نفیسہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"اچھا ماں اگر تم بوڑھی نہ ہو تو پھر مجھے ایک ابا لا دو۔" کمال رائے بڑا مسکین سا منہ بنا کر کہتا۔

"ٹھہر جا...... میں ابھی لاتا ہوں تیرے لئے ابا۔" نفیسہ بیگم اس کا کان پکڑنے کو اُٹھتی تو وہ اُٹھ کر

بھاگ لیتا۔

اس طرح سنجیدہ بات بالآخر مسخرے پن کی نذر ہو جاتی۔ یہ مسخرہ پن کمال رائے دس سال سے کر رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کی سنجیدہ خواہش کو اسی طرح ہنس کر ٹال جاتا تھا۔

لیکن مائرہ نے یہ بات دل پر لکھ لی تھی۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ جب بھی اس کی شادی کی بات چلتی تو وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی۔ "ماں، میں شادی نہیں کروں گی۔"

"آخر میں تجھے کب تک بٹھا کے رکھوں...... کس کی آس لئے بیٹھی ہے تُو بدبخت۔"

"ماں، مجھے کسی کی آس نہیں...... بس میں نے نہیں کرنی شادی...... اگر تم نے زبردستی کی ماں تو خدا کی قسم میں زہر کھا لوں گی۔" وہ روتے روتے ایک دَم آنسو پونچھ لیتی جیسے زہر کھانے کا پختہ ارادہ کر لیا ہو۔

کمال رائے کو مائرہ کے مسلسل انکار کا احساس تھا لیکن وہ کیا کرتا...... اس کے پاس اتنا کچھ نہ تھا۔ وہ سب کچھ ماروی کے نام کر چکا تھا۔ وہ بالکل خالی دامن تھا۔ وہ کسی سے شادی کر کے اسے کیا دیتا۔

اسے اب اپنی آرزو کی فکر تھی۔

آرزو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے چراغ روشن ہوئے تھے۔ آرزو اس کی آنکھوں کی روشنی تھی۔ اس کے دل کا اطمینان تھی۔

وہ ہر وقت اس کی سوچوں میں رہتی تھی۔

جب ان پراسرار لوگوں نے آرزو پر دوبارہ قابض ہونا چاہا تو وہ اندر سے لرز کر رہ گیا۔ اگرچہ وقتی طور پر اس نے ان پر فتح پالی تھی لیکن ہر وقت کا دھڑکا تو اس کے ساتھ لگ گیا تھا۔

اس نے فوراً روشن گوٹھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ آرزو کو لے کر مستقل طور پر کراچی آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے ڈیفنس کا بنگلہ آباد کیا۔ چھانٹ چھانٹ کر ملازم رکھے۔ سیکورٹی کا بہترین نظام قائم کیا۔

پھر اس نے آرزو کو ایک اچھے اسکول میں داخل کروا دیا۔

وہ خود اسے اسکول چھوڑنے اور دوپہر کو لینے جاتا تھا۔

نفیسہ بیگم کا گوٹھ میں رہنا ضروری تھا کیونکہ حویلی کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ زمینوں اور جائیداد کے سو جھگڑے تھے۔ انہیں دیکھنے والا بھی کوئی چاہئے تھا۔

آرزو ایک بار جو روشن گوٹھ گئی تھی تو پھر پلٹ کر حویلی نہیں گئی تھی۔ نفیسہ بیگم البتہ آتی جاتی رہتی تھی۔

اور یوں وقت گزرتے دیر نہ لگی تھی۔

دس سال اس طرح گزر گئے تھے جیسے دس ماہ ہوں، دس دن ہوں، دس گھنٹے ہوں۔

اب آرزو کو پندرھواں سال لگنے والا تھا...... قیامت خیز سال۔

☆......☆......☆

بہت پہلے تقریباً دس سال پہلے نور بانو نے آرزو کے بارے میں کمال رائے سے کہا تھا کہ اس لڑکی پر پندرھواں سال بہت بھاری ہوگا۔ بس اتنا ہی کہا تھا، یہ نہیں بتایا تھا کہ کیا ہوگا؟ پھر اس کے بعد نور بانو سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن اس سلسلے میں نور بانو نے مزید کچھ بتایا تھا اور نہ ہی کمال رائے نے اس سے کوئی استفسار کیا تھا۔

اور قیامت کا سال آ پہنچا تھا۔ یہ بات اب کمال رائے کے حافظے سے محو ہو چکی تھی۔ اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ پندرھواں سال اس حسین لڑکی پر کیا قیامت ڈھائے گا۔

کمال رائے آرزو کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے کیا کرتا تھا۔ آرزو کی ڈھیر ساری سہیلیوں کے ساتھ نفیسہ بیگم اور مائرہ ضرور شریک ہوا کرتی تھیں۔ دیگر خاندان کے لوگ بھی آتے تھے۔

آرزو کی پندرھویں سالگرہ اب زیادہ دور نہ تھی۔

ایک دن کیا ہوا؟ یہ سالگرہ سے بہت پہلے کی بات ہے۔

اردو ایڈوانس کا پیریڈ تھا۔ میڈیم بڑے انہماک سے غالب کی غزل پڑھا رہی تھیں کہ کلاس کے دروازے پر ایک دَم شور سا ہوا، کوئی لڑکی "سانپ، سانپ" کہتی ہوئی بھاگی۔

جب سانپ کی آواز آرزو کے کان میں پڑی تو ایک دَم اس کی کیفیت بدل گئی۔ اس کے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے غالب کے اشعار کی تشریح سن رہی تھی کہ اب وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے اُٹھی اور میڈم سے باہر جانے کی اجازت لئے بغیر دوڑتی ہوئی کلاس سے باہر نکل گئی۔

پھر اس نے جلد ہی برآمدے میں بھاگتی لڑکی کو جا لیا۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا؟ مجھے بتاؤ، کہاں ہے سانپ؟"

"وہ لائبریری میں۔" اس لڑکی نے بتایا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" آرزو نے پوچھا۔

"میں پرنسپل کو بتانے جا رہی ہوں۔" وہ بولی۔

آرزو نے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور اسے لائبریری کی طرف گھسیٹتی ہوئی بولی۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

پھر جب وہ لائبریری میں پہنچی تو اچھا خاصا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ لڑکیاں دروازے پر کھڑی چیخ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ خبر کالج کی ہر کلاس تک پہنچ گئی کہ لائبریری میں سانپ نکل آیا ہے...... دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار لڑکیاں لائبریری کے سامنے اکٹھی ہو گئیں۔

"کہاں ہے سانپ مجھے بتاؤ۔" آرزو لائبریری میں گھستے ہوئے بولی۔

"تم کیا کرو گی...... پرنسپل صاحبہ کو آنے دو، آفس سے کسی مرد کو بلاؤ۔" کئی لڑکیوں نے اسے اندر جانے سے روکا۔

"ارے ہٹو۔" آرزو نے جھٹکا دے کر لڑکیوں کو پرے کیا اور اندر گھس گئی۔

لائبریری میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ پوری لائبریری خالی تھی۔

لائبریرین بھی اندر موجود نہ تھی۔ لائبریری کے دروازے سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔

"سانپ ناولوں والے شیلف میں تھا۔"

"اب بھی اسی شیلف کے پیچھے ہے۔"

کوئی کہہ رہا تھا۔ "میز پر تھا۔"

کوئی بول رہا تھا۔ "نہیں کرسی کے نیچے تھا۔"

غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں......

آرزو نے لائبریری کے درمیان کھڑے ہو کر ایک جائزہ لیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی گردن کو اس طرح آہستہ آہستہ گھما رہی تھی جیسے کتابوں اور الماریوں میں چھپے سانپ کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

پھر وہ اچانک ہی اسے نظر آ گیا۔ وہ آرزو کے لائبریری میں آتے ہی شیلف کے پیچھے سے باہر نکل آیا تھا اور فرش پر تیزی سے رینگتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دروازے پر کھڑی لڑکیوں کی نظر جب آرزو کی طرف بڑھتے ہوئے سانپ پر پڑی تو سب کی چیخیں نکل گئیں، وہ بلند آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"آرزو...... بھاگ کر واپس آ جاؤ۔ وہ تمہیں کاٹ لے گا۔"

لیکن آرزو کو اب کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ سانپ کو دیکھ کر اس پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ اچانک اس کا بچپن اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ سرخ اینٹوں کے فرش پر دوڑتی پھر رہی تھی اور چھوٹے بڑے سانپ اس کے آس پاس گھوم رہے تھے۔ وہ جس سانپ کو چاہتی ہاتھ میں پکڑ لیتی۔

پھر وہ سانپ رینگتے رینگتے رک گیا۔ اس نے اپنا رخ تبدیل کر کے کنڈلی بنائی اور پھن پھیلا کر آرزو کو دیکھنے لگا۔ وہ آرزو سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

آرزو نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کی طرف بڑھی اور ڈانٹ کر بولی۔

"شرم نہیں آتی......لڑکیوں کو ڈراتا ہے۔"

وہ ایک کالے رنگ کا دو ڈھائی فٹ کا عام سانپ تھا۔ نہ جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا اس طرف آ نکلا تھا۔ آرزو کو دیکھ کر وہ جھومنے سا لگا تھا۔ اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے آرزو

کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنا پھن زمین پر رکھا اور بڑی تیزی سے سرسراتا ہوا ایک طرف چلا۔

یہی وقت تھا جب اس سانپ پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آرزو ایسا کر گزرے گی۔ اس بات کا اس سانپ کو بھی اندازہ نہ تھا کہ آرزو کسی چیل کی طرح اس پر جھپٹے گی اور اسے دُم سے پکڑ کر اُٹھا لے گی اور اس کو اتنا موقع بھی نہ دے گی کہ وہ پلٹ کر اس کے ہاتھ پر کاٹ سکے۔

آرزو نے پلک جھپکتے ہی اس کی دُم پکڑ کر اُٹھایا اور ایک خاص انداز سے اسے جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے نے اس کا جوڑ جوڑ کھول دیا۔ وہ پلٹ کر حملہ کرنے کے قابل نہ رہا۔ پھر اس نے بڑی سرعت سے سانپ کو زمین پر پٹخا اور اپنا جوتا اس کے پھن پر رکھ کر اسے اچھی طرح رگڑ دیا۔

اس سانپ میں جوڑ جوڑ ٹوٹنے کے بعد جو رہی سہی جان تھی، وہ پھن کچلنے کے ساتھ ہی نکل گئی۔ پھر آرزو نے اس مردہ سانپ کو دُم سے پکڑ کر اُٹھا لیا اور بڑے اطمینان سے دروازے کی طرف بڑھی۔

لڑکیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں جب وہ دروازے کے نزدیک آئی تو لڑکیاں چیختی ہوئی بھاگیں۔ اس اثناء میں پورا کالج کلاسیں چھوڑ کر میدان میں جمع ہو گیا تھا۔

پرنسپل صاحبہ بھی ہانپتی کانپتی پہنچ گئی تھیں۔ جب انہوں نے آرزو کے ہاتھ میں سانپ دیکھا جسے وہ رسی کی طرح لہراتی ہوئی لا رہی تھی، تو وہ سکتے میں رہ گئیں۔ آرزو کے اس کارنامے پر انہیں یقین نہ آیا لیکن جو کچھ تھا ان کے سامنے تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس واقعے کی چشم دید گواہ تھیں...... پھر کوئی کیونکر انکار کرتا۔

آرزو پہلے ہی پورے کالج میں چاہی جانے والی لڑکی تھی۔ اس واقعے نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ کچھ لڑکیاں اس سے ڈرنے بھی لگیں...... بعض وقت اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار سی چمک پیدا ہو جاتی۔

پھر ایک اور واقعہ پیش آیا۔ یہ آرزو کی سالگرہ سے چند روز قبل کی بات ہے۔

دلدار اور سروری اس بنگلے کے پرانے ملازمین تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی ستارہ...... اور بھی کئی بچے تھے لیکن ستارہ تقریباً آرزو کی ہم عمر تھی۔ وہ ایک نفاست پسند لڑکی تھی۔ آرزو اسے بہت پسند کرتی تھی۔ وہ اسے ملازمہ کم سہیلی زیادہ سمجھتی تھی۔

اسے بنگلے میں پچھلی جانب دیوار پر رات کی رانی کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ وہ خاصی گھنی تھی۔ رات کو اس کی خوشبو پورے بنگلے میں پھیل جاتی تھی۔ بنگلے کے پچھلی جانب ایک خوبصورت لان اور اس

کے اطراف میں پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔اس لان پر مخملی گھاس اُگی ہوئی تھی۔

چاندنی رات میں اس گھاس پر آرزو کو ٹہلنے کا بڑا شوق تھا۔اس کے ساتھ ستارہ بھی ہوتی تھی۔ دونوں ٹہلتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ستارہ آٹھویں پاس کر کے گھر بیٹھ گئی تھی جبکہ آرزو کا تعلیمی سفر جاری تھا۔آرزو چاہتی تھی کہ ستارہ آگے پڑھے لیکن اس کے والدین کا خیال تھا کہ اگر لڑکی زیادہ پڑھ لکھ گئی تو برادری میں اس کیلئے بَر تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ایک طرح سے وہ ٹھیک سوچتے تھے۔پھر آرزو نے ان کیلئے مسائل بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ستارہ گھر بیٹھ گئی اور اس نے آرزو کا کام کاج سنبھال لیا۔

اس شام ستارہ اپنے کوارٹر سے نکل کر بنگلے کی طرف بڑھی تو اچانک اس کی نظر رات کی رانی پر پڑی۔اس کی جڑ میں اسے ایک سنہرا چمکیلا سانپ نظر آیا۔وہ سرسراتا بیل پر چڑھ رہا تھا۔

سانپ دیکھ کر وہ سرپٹ بھاگی۔اس کی ماں کچن میں چائے تیار کر رہی تھی۔وہ بھاگتی ہوئی کچن میں پہنچی اور سروری کو بتایا۔''اماں، اماں......رات کی رانی پر سانپ۔''

''ہیں......سانپ۔'' سروری جو چولہے پر سے چائے کی کیتلی اُتار رہی تھی۔اس کا ہاتھ کپکپا گیا۔

''اری کیا کہہ رہی ہے تُو۔''

''اماں، اماں سانپ...... میں نے خود دیکھا ہے۔''

''اچھا، چل آ...... میرے ساتھ۔'' سروری چائے چھوڑ کر باہر جانے لگی۔

''اماں......ابا کو ساتھ لے چلو...... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''اری آ تو...... تیرا باپ کون سا بہادر ہے۔اسے تو کتے کی شکل دیکھ کر کپکپی چھوٹ جاتی ہے۔''

سروری اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔''آ تو میرے ساتھ۔''

جب وہ دونوں ماں بیٹی بنگلے سے باہر نکل کر پچھلی جانب گئیں اور انہوں نے رات کی رانی پر نظر دوڑائی تو وہاں کوئی سانپ نظر نہ آیا۔البتہ ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور یہ رات کی رانی کی خوشبو کے سوا تھی۔

پھر وہی سانپ سروری کو دکھائی دیا۔وہ رات کی رانی کے پتوں میں سرسرا رہا تھا۔سانپ دیکھ کر وہ بنگلے میں کسی کو بلانے آئی۔سامنے دلدار نظر آیا۔وہ اس کے ساتھ فوراً واپس گئی لیکن اب وہ سانپ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔البتہ وہاں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس طرح وہ سانپ مختلف ملازمین کو مختلف وقتوں میں دکھائی دیتا رہا۔ڈرائیور لعل محمد اسے دیکھ کر اپنے کوارٹر سے لاٹھی نکال کر لایا لیکن وہاں سانپ نہ تھا۔لعل محمد نے اس سانپ کو اِدھر اُدھر تلاش کیا۔پودوں اور پھولوں میں دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔البتہ ایک تیز خوشبو ضرور پھیلی ہوئی تھی جسے ڈرائیور

نے رات کی رانی کی خوشبو سے تعبیر کیا۔

رات کی رانی کے پودے کے سامنے آرزو کا کمرہ تھا۔اگر اس کے کمرے کے پردے ہٹے ہوتے تو اسے وہاں سے واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا......ابھی تک سانپ دکھائی دینے کی خبر آرزو کو نہیں بتائی گئی تھی۔اس کے پیچھے کوئی خاص حکمت عملی نہ تھی۔بس لڑکی سمجھ کر اسے اس خبر سے بچایا گیا تھا کہ کہیں سانپ نمودار ہونے کی خبر سن کر ڈر نہ جائے۔ان ملازمین کو یہ بات بھلا کہاں معلوم تھی کہ وہ سانپوں سے ڈرنے والی نہیں ڈرانے والی تھی۔

ایک شام اس سانپ پر کمال رائے کی بھی نظر پڑی۔اس نے گیٹ پر موجود گارڈوں کو بلوا بھیجا۔خود اس سنہرے سانپ پر نظر رکھی۔جیسے ہی گارڈ پچھلی جانب آئے اور انہیں بتانے کیلئے کہ اس نے کیا دیکھا ہے، ذرا نظر ہٹائی اور گارڈوں کو سمجھا کر جب اس نے دوبارہ رات کی رانی پر نظر کی تو وہ سانپ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

ان گارڈوں نے دیگر ملازمین کے ساتھ مل کر پورا گارڈن چھان مارا۔ایک ایک پتا ٹٹول لیا مگر وہ سنہرا سانپ پھر کہیں نہ ملا۔وہ غائب تھا اور ایک عجیب سی خوشبو موجود تھی۔

گھر کے ہر فرد نے اس سنہرے سانپ کو دیکھا تھا اگر نہیں دیکھا تھا تو وہ آرزو تھی۔

جب وہ سنہرا سانپ مسلسل نظر آیا حتیٰ کہ کمال رائے نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو یہ واقعہ اس کیلئے باعث تشویش بن گیا۔وہ آرزو کے بچپن کے پس منظر سے واقف تھا۔آرزو نے وہ تمام باتیں جو اس کے حافظے میں محفوظ تھیں، سب اپنے باپ کے گوش گزار کر دی تھیں۔آرزو جہاں ایک خوبصورت لڑکی تھی، وہاں وہ ذہین بھی تھی۔اس کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ایک نظر میں بہت سی چیزوں کو سمجھ لیا کرتی تھی۔

کمال رائے نے اب ضروری سمجھا کہ سانپ نظر آنے والے واقعہ کو آرزو کے گوش گزار کر دے۔وہ سانپ مغرب سے کچھ پہلے نظر آتا تھا۔شام کو آرزو گھر پر نہیں ہوتی تھی، اس نے ایک ٹیوشن اکیڈمی جوائن کی ہوئی تھی۔وہاں سے وہ مغرب کے بعد آتی تھی۔یہی وجہ تھی کہ رات کی رانی پر سرسراتے سنہری سانپ پر اس کی نظر نہیں پڑی تھی اور کسی ملازم کی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ کمال رائے کی اجازت کے بغیر آرزو کو کچھ بتا دے۔ستارہ کو اس کی ماں نے خصوصی ہدایت کی تھی کہ وہ اس واقعے پر آرزو سے ہرگز بات نہ کرے۔ستارہ نے اس مسئلے پر بات کرنے سے خود کو بڑی مشکل سے روکا۔

اس سانپ کی مسلسل آمد نے کمال رائے کو فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔اب وہ اپنی بیٹی سے اس موضوع پر بات کرنا ضروری سمجھتا تھا۔وہ اسے ہوشیار بھی کرنا چاہتا تھا اور اس کے دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ ممکن ہے آرزو اس سلسلے میں کچھ جانتی ہو۔

بہر حال اس رات کھانا کھانے کے بعد کمال رائے نے آرزو سے کہا۔ ”آؤ، بیٹا......اوپر چلو، وہاں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔“

”چلیے بابا۔“ آرزو فوراً ہی راضی ہو گئی۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے باپ پر ڈالی۔ باپ کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا لیکن اوپر چل کر کافی پینے کی فرمائش خود ایک تاثر تھی۔ اتنا بڑا بنگلہ تھا۔ نیچے کئی کمرے تھے۔ کمال رائے کا اپنا بیڈ روم بھی تھا۔ اوپر کا بیڈ روم بھی کمال رائے کے استعمال میں تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق کبھی اوپر اور کبھی نیچے ہوتا تھا۔

”بابا، کوئی خاص بات ہے؟“ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آرزو نے پوچھا۔

”اس بات کا احساس تمہیں کیسے ہوا؟“

”کبھی آپ نے اوپر والے کمرے میں کافی پینے کی بات نہیں کی۔“

”بھئی واہ......تمہاری ذہانت کو مان گئے۔“ کمال رائے نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ واقعی کوئی خاص بات ہے۔“ آرزو نے کمال رائے کی طرف شوخی سے دیکھا۔

”ارے نہیں بیٹا......تمہاری سالگرہ قریب ہے، سوچا اس پر بات کی جائے۔ تم کن کن کو بلانا چاہو گی۔ ذرا اوپر بیٹھ کر مہمانوں کی فہرست پر بات کریں گے۔“ کمال رائے نے بات بنائی۔

”بابا......بات کچھ ہی نہیں۔“ آرزو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹا تم نے ٹھیک کہا......مجھے اصل میں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔ آؤ، تمہیں سچ بتاؤں۔“ کمال رائے نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”سچ؟“ آرزو نے متعجب ہو کر پوچھا اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”بیٹا......بنگلے کی پچھلی دیوار پر رات کی رانی کی جو بیل چڑھی ہوئی ہے......“ کمال رائے کہتے کہتے رک گیا۔

”ہاں......اسے کیا ہوا؟“ آرزو نے چونک کر کمال رائے کی طرف دیکھا۔ ”بڑی زبردست بیل ہے رات کو بڑی مسحور کن خوشبو پھیلتی ہے......میں رات کو اکثر وہاں ٹہلتی ہوں۔ چاندنی رات میں تو اس خوشبو کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم وہاں ٹہلتی ہو......اس لئے یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے۔“

”کیا بابا......؟ وہاں آپ نے کوئی جن وِن دیکھ لیا۔“ آرزو ہنسی۔

”جن تو نہیں......لیکن ایک سانپ ضرور دیکھا ہے۔“

”سانپ۔“ آرزو جو صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی، ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”کیسا سانپ؟“

”وہ ایک دم سنہرا سانپ ہے۔ چمکتا ہوا......ایسا سانپ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔“ کمال رائے نے بتایا۔

”بابا آپ نے کب دیکھا؟“ آرزو نے پوچھا۔

”یہ کل شام کی بات ہے۔“ کمال رائے نے کہا۔

”تو آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔“

”پہلے سوچا تھا کہ نہ بتاؤ......لیکن وہ مسلسل نظر آ رہا ہے۔ گھر کے کئی ملازم اسے دیکھ چکے ہیں اور خطرناک بات یہ ہے کہ وہ فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں، کہیں تم ڈر نہ جانا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں بابا......میں سانپوں سے بالکل نہیں ڈرتی۔ آپ کو تو بتا چکی ہوں کہ میرا بچپن سانپوں سے کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔ میں ابھی نیچے جا کر رات کی رانی کا جائزہ لیتی ہوں۔“ آرزو نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اب وہاں جانا بیکار ہے۔ وہ مغرب سے ذرا پہلے ملگجے اندھیرے میں نظر آتا ہے۔“

”اوہ......اس وقت میں اکیڈمی میں ہوتی ہوں......کل چھٹی ہے، میں شام کو دیکھوں گی۔“

”بیٹا......پتہ نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ کمال رائے نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

”آخر کیوں بابا؟“ آرزو نے اپنے باپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ اس رات کی رانی کو کٹوا دوں......نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔“

”ہرگز نہیں بابا۔ ایسے خوشبو بکھیرنے والے پودے کو میں کبھی نہیں کٹنے دوں گی۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ ذرا میں ایک نظر اس سانپ کو دیکھ لوں......پھر آپ کو بتاؤں گی کہ کیا کرنا ہے۔ اس وقت تک آپ صبر کریں۔“ آرزو نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوگا......آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ کمال رائے نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اگلے دن اکیڈمی کی چھٹی تھی۔ وہ شام کو گھر پر ہی رہی۔ شام کو ستارہ جب اس کے کمرے میں چائے لے کر آئی تو اس نے ایک انگلی کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ ”اِدھر آ۔“

اس کے بلانے کا انداز ایسا تھا کہ ستارہ ٹھٹک گئی۔ اس نے آرزو کے چہرے پر خفگی کے آثار تلاش کئے لیکن کہیں نظر نہ آئے۔ بہر حال ایک انگلی کے ذریعے بلانے کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے ستارہ سے کوئی قصور ہو گیا ہے۔

وہ چائے کی ٹرے شیشے کی میز پر رکھ کر ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھی۔ ”جی بی بی۔“

"جی بی بی جی کی بچی...... تجھے شرم نہیں آتی۔" آرزو نے خفگی سے کہا۔

"ہائے...... بی بی کیا ہوا...... مجھ سے کیا قصور ہوا۔"

"ویسے تو مجھ سے دنیا بھر کی باتیں کرتی ہے لیکن جو بات مجھے بتانے کی تھی، وہ چھپا گئی۔ تجھے شرم نہیں آتی۔"

"آتی ہے بی بی بی...... کیوں نہیں آتی۔"

"تو پھر سانپ والی بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔"

"بی بی...... ماں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔"

"کیوں؟" آرزو نے پوچھا۔

"مالک کا یہی حکم تھا جی...... انہوں نے ماں کو ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔" ستارہ نے کہا۔

"اب انہوں نے ہی سارا قصہ مجھے بتایا ہے۔" آرزو نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"وہ بتا سکتے ہیں...... وہ مالک ہیں۔" ستارہ بولی۔

"تُو بھی مجھے بتا سکتی تھی...... میں بھی تو تیری مالکن ہوں۔" آرزو نے کہا۔

"آپ کا تو جواب ہی نہیں...... آپ تو بڑی پیاری سی مالکن ہیں۔ ایسی مالکن اللہ سب کو دے۔" ستارہ نے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے۔

"اچھا...... اب زیادہ بک بک نہ کر...... لا مجھے چائے دے اور پھر چل میرے ساتھ۔"

"کہاں بی بی؟" وہ حیران ہوئی۔

"ذرا باہر چل کر بیٹھیں گے۔ رات کی رانی کا نظارہ کریں گے۔ آرزو نے بتایا۔

"ہائے بی بی نہیں...... مجھے تو اب اِدھر سے گزرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔" ستارہ نے اس کی طرف چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں چلوں گی...... تیرے ساتھ ڈر کا ہے کا۔" آرزو کپ پکڑتے ہوئے بولی۔

"ہائے بی بی...... آپ کیا سپیرن ہو؟"

"ہاں اور کیا...... مجھے دیکھ کر بڑے بڑے سانپوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔"

"ہو جاتی ہو گی...... اتنی پیاری جو ہو۔" ستارہ نے اس کی طرف بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ستارہ کچھ دیر اسے بڑی محویت سے دیکھتی رہی۔ آرزو چائے پیتی رہی، وہ کچھ نہ بولی۔

"بی بی...... ایک بات پوچھوں؟" ستارہ بولی۔

"ہاں پوچھو۔" آرزو نے کہا۔

"بی بی...... آپ اتنی خوبصورت کیوں ہو؟" ستارہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"بے وقوف تُو کب بڑی ہو گی۔" آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

چائے پی کر وہ ستارہ کے ساتھ پچھلے لان میں آ گئی۔ سورج بنگلوں کے پیچھے جا چھپا تھا۔ دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھ رہا تھا، پہلے تو آرزو نے دور سے رات کی رانی کا جائزہ لیا۔ پھر ذرا قریب ہو کر اسے دیکھا۔ ستارہ اس کے پیچھے اس کی اوٹ میں رہی۔ اس کے دل پر سانپ کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر آرزو اندھیرا ہونے تک وہاں رہی۔ ٹہلتی رہی بیٹھی رہی لیکن اسے وہاں کوئی سانپ نظر نہ آیا۔

☆......☆......☆

آج کی شام بہت حسین تھی۔

اور کیوں نہ ہوتی۔ آج آرزو کی سالگرہ تھی۔ آج اسے پندرھواں سال لگ گیا تھا۔

کمال رائے آرزو کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے مناتا تھا۔ وہ اپنے تمام لوگوں کو اس خوشی میں شریک کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پورا بنگلہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ روشن گوٹھ کے آس پاس کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔

پورا بنگلہ روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف رنگ و نور کی بارش تھی۔ کھنکتے قہقہے تھے۔ من موہنی مسکراہٹیں تھیں۔ کمال رائے تھری پیس سوٹ میں تھا۔ وہ ایک خوبصورت آدمی تھا۔ سوٹ میں اور بھی خوبصورت لگا کرتا تھا۔

نفیسہ بیگم اپنی پوتی کی سالگرہ میں اِدھر اُدھر مگن گھوم رہی تھی۔ وہ آج بھی چاق و چوبند تھی جیسی وہ دس سال پہلے تھی، ویسی ہی آج بھی نظر آتی تھی۔ وقت کی گردش نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

ماموں ممانی سب تھے تو مائرہ بھی موجود تھی۔ وہ کالے لباس میں تھی اور خوب نکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ صوفے پر آرام سے بیٹھی تھی۔ کئی مرتبہ کمال رائے اس کے سامنے سے گزرا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ نگاہیں ملیں تو دونوں دھیرے سے مسکرا دیئے تھے...... جانے کیوں؟

آج کی شام جس کے نام تھی جو وجۂ شام تھی، اس کی دید تو پتھر کر دینے والی تھی۔

آج کی تقریب کیلئے آرزو نے ایک خصوصی لباس سلوایا تھا۔ وہ اس گولڈن لباس میں کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ اس قدر حسین تھی کہ اس دنیا کی لگتی ہی نہ تھی۔ وہ تو کوہ قاف کی معلوم ہوتی تھی۔

وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بنگلے کے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ خوب نقرئی قہقہے بکھر رہے تھے۔ لطیفے

سنائے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے پر فقرے بازی کی جا رہی تھی۔

آرزو کے برابر مہرالنساء بیٹھی تھی۔ وہ اس کے کالج کی دوست تھی۔ سب سہیلیوں میں وہ مہرالنساء کے زیادہ قریب تھی۔ وہ اسے پیار سے ''میری مہرو'' کہا کرتی تھی۔

مہرو کو جب آرزو نے اپنی سالگرہ کی دعوت دی تو وہ ذرا سا ہچکچائی۔

''کیسے آؤں؟''

''کیا مسئلہ ہے؟'' آرزو نے فوراً وضاحت چاہی۔

''یار..... رات ہو جائے گی..... اکیلے میں کیسے واپس جاؤں گی۔''

''تم اپنی گاڑی کے بجائے ٹیکسی میں آ جانا..... ادھر سے میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دوں گی۔''

''میری قسمت میں کیا ڈرائیور ہی رہ گیا ہے۔'' مہرالنساء نے اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا کروں..... میرا کوئی بھائی نہیں ہے نا..... ورنہ تیرے ساتھ اپنا بھائی کر دیتی۔'' آرزو نے ہنس کر کہا پھر ایک دم اسے خیال آیا۔ ''پر تیرا بھائی ہے..... مہرو تو اُس کے ساتھ کیوں نہیں آ جاتی۔''

''حدِ ادب..... وہ میرے بڑے بھائی ہیں اُن کے کہو۔''

''سوری یار..... ہاں اُن کے ساتھ آ جاؤ۔ رات کو اُن کے ساتھ ہی چلی جانا۔''

''سالگرہ میں بلاوا میرا ہے..... بھلا وہ کیوں آنے لگے۔ جانتی نہیں..... میرے بھائی بڑی ناک والے ہیں۔'' وہ ہنسی۔

''میں کون سی ان کی ناک کاٹ رہی ہوں۔'' آرزو شوخی سے بولی۔

''تمہیں انہیں بلاوا دینا ہوگا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں..... تجھے بلانے کیلئے تو میں کسی دیو کو بھی دعوت دے سکتی ہوں۔''

''خبردار..... جو میرے بھائی کو دیو کہا۔ وہ تو راج کمار ہیں راج کمار..... دیکھے گی تو اپنی انگلی کاٹ بیٹھے گی۔''

''یوسف ثانی ہیں کیا؟'' آرزو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ۔'' مہرو نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''اچھا..... تو دیکھنا ہی پڑے گا..... بول کس طرح بلاوا دوں۔''

''فون پر درخواست کر لینا۔''

''چل منظور۔''

پھر آرزو نے وعدے کے مطابق فون پر بات کی تو اس نے تھوڑا سا تکلف دکھانے کے بعد آنے

کی ہامی بھر لی لیکن آج شام کو اسے کہیں ضروری جانا تھا اس لئے وہ مہرو کو چھوڑ کر جلد از جلد واپسی کا کہہ کر چلا گیا تھا۔

آرزو سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

جب سارے مہمان آ چکے اور ساری تیاریاں ہو چکیں تو کمال رائے نے آرزو کو باہر بلوایا...... وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ لان پر آئی۔ شیشے کی ایک خوبصورت میز پر بڑا سا کیک رکھا تھا۔ آرزو نے کیک کاٹا تو ہر طرف ''ہیپی برتھ ڈے'' کا شور مچ گیا۔

پر تکلف کھانے کے بعد میوزک پروگرام رکھا گیا تھا۔ کمال رائے غزلیں سننے کا ہمیشہ سے شوقین تھا اس نے ایک نامور گلوکار کو مدعو کیا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد جب منتخب لوگ رہ گئے تو اس گلوکار نے اپنی خوبصورت آواز میں ایک غزل چھیڑ دی۔ اس گلوکار کی جہاں آواز اچھی تھی، وہاں اس کا انتخاب بھی لاجواب تھا۔

جب اس نے پہلی غزل چھیڑی۔

''جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔''

تو اس کا زوردار تالیوں کی گونج میں سواگت کیا گیا۔

غزلیں گائی جاتی رہیں۔ رات بھیگتی رہی۔ کیف انگیز لمحے وقت کے پہاڑ سے ٹوٹ ٹوٹ کر برستے رہے۔

ایسی موسیقی بھری شاموں میں کمال رائے کی جان تھی۔ انہی موسیقی کی شاموں نے اسے لوٹا تھا۔

انہی کیف آگیں لمحوں نے ماروی کو اس سے چھین لیا تھا۔ اس دنیا سے گئے ماروی کو چودہ پندرہ سال ہو گئے تھے لیکن وہ اسے ابھی تک بھلا نہ پایا تھا۔ ایسی شامیں ماروی کی یاد کو اور گہرا کر دیا کرتی تھیں۔

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی میری جان تجھے چاہوں گا

گلوکار گا رہا تھا اور کمال رائے کے دل پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ پھر وہ ضبط نہ کر پایا۔ بڑی احتیاط سے بڑے نارمل انداز میں اُٹھا جیسے کسی ضرورت کے تحت اُٹھا ہو لیکن مائرہ جانتی تھی کہ وہ غزل چھوڑ کر اس محفل سے کیوں اُٹھا ہے..... اس نے اسے بنگلے کی عمارت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے تعاقب میں چلی آئی۔

مائرہ نے اسے ڈھونڈ لیا۔ وہ اپنے بیڈروم میں اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھے جانے کس دنیا میں کھویا ہوا تھا۔

بیڈروم میں ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ سرخ رنگ کے شیڈ کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ مائرہ،

کمال رائے کو چند لمحے یوں ہی دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی کہ اسے اپنی آمد کا احساس دلائے یا جس طرح آئی ہے ویسے ہی خاموشی سے واپس چلی جائے...... لیکن وہ یہاں خود سے کب آئی تھی۔ پھر وہ خود سے کیسے چلی جاتی۔ اسے اپنے آپ پر اختیار کب تھا۔

وہ بہت دھیرے سے اس کے بیڈ پر بیٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے ہٹایا۔

ہاتھ ہٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں اشکوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے کمال رائے نے بیڈ پر بیٹھ کر ہاتھ ہٹانے والی کو دیکھا، کچھ نظر نہ آیا، ایک تو روشنی کم تھی، دوسرے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں پھر بھی اس نے جان لیا کہ وہ کون ہے۔

''جب غزلیں سننے کا شوق ہے تو اپنے اندر سننے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔'' مائرہ کا لہجہ دکھ سے بھرا ہوا تھا۔

''مائرہ...... میں اس وقت تنہا رہنا چاہتا ہوں، مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' کمال رائے نے بمشکل کہا۔

''میں نہیں چھوڑوں گی تمہیں تنہا۔'' مائرہ نے بااختیار لہجے میں کہا۔ ''تم کیسے مرد ہو؟ ارے تمہاری کلاس کے مرد تو چار چار شادیاں کرتے ہیں اور کورم کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیتے...... ایک مرتی ہے تو فوراً دوسری کر لیتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ پندرہ سال سے ایک کو روئے جا رہے ہو...... آخر کب تک روؤ گے اسے۔''

''مائرہ، میں ماروی کو نہیں بھول سکتا۔'' اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''تم اسے بھلانا نہیں چاہتے۔ تمہیں اپنے غم سے عشق ہو گیا ہے۔'' مائرہ نے اسے آئینہ دکھایا۔

''چلو ایسا سمجھ لو۔'' اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔

''لیکن میں تمہیں سسک سسک کر مرنے نہیں دوں گی۔''

''تم کون ہو؟'' کمال رائے نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں کوئی نہیں ہوں...... میں جانتی ہوں کہ میں کوئی نہیں ہوں۔ میں اگر کوئی ہوتی تو تمہیں ٹھیک کر دیتی۔'' مائرہ اندر سے سلگ اُٹھی۔

''تم حدود پھلانگ رہی ہو مائرہ۔'' کمال رائے نے اپنی تیوری پر بَل ڈال کر کہا۔ ''تم یہاں سے جا سکتی ہو۔''

''جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گئی۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں اگر کبھی سچ مچ چلی گئی تو بہت پچھتاؤ گے۔''

وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، جب وہ دروازے پر پہنچ گئی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''سنو۔''

مائرہ جاتے جاتے دروازے پر رک گئی۔ واپس پلٹی اور نہ کچھ بولی۔

''تم آخر کیا کہنا چاہتی ہو۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' مائرہ نے ایک جھٹکے سے کہا اور پھر فوراً باہر نکل گئی۔

کمال رائے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ اس کی آمد سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ اپنا غم بھول گیا تھا۔ شاید وہ یہی چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

آرزو نے بھی اپنے باپ کو اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس طرح کی غزل گائی جا رہی تھی، اس کے پس منظر میں وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا باپ کیوں اُٹھا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں نکلا ہے۔ وہ اپنے باپ کے دُکھ سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔

کمال رائے اکثر یہ بات کہا کرتا تھا کہ آرزو نے اس کی زندگی بچالی ورنہ وہ جانے کب کا مر چکا ہوتا۔

ابھی وہ اُٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مہرالنساء نے اچانک کہا۔ ''اچھا، آرزو میں اب چلوں۔''

''کیوں نہیں...... اپنے بھائی کو تو آنے دو۔'' آرزو نے کہا۔

''وہ آ گئے ہیں...... مجھے نظر آ رہے ہیں۔'' مہرالنساء بولی۔

''اچھا کہاں ہیں...... ذرا مجھے تو ملوا...... میں ان سے پوچھوں تو کہ اس طرح کسی کی سالگرہ میں آیا جاتا ہے۔'' آرزو ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''چل، چل کر پوچھ لے۔'' مہرالنساء نے یہ کہہ کر آگے قدم بڑھایا۔

آرزو اس کے ساتھ چلنے لگی۔

اس وقت مہمانوں کی تعداد خاصی کم ہو گئی تھی۔ اب یہاں وہ مہمان تھے جو اندرون سندھ سے آئے تھے یا وہ لوگ تھے جنہیں غزل سے شغف تھا۔ جب وہ مہمانوں کے درمیان سے سوئمنگ پول کی طرف بڑھی تو اسے وہاں کھڑا ہوا نوجوان دور ہی سے نظر آ گیا۔ وہ سوئمنگ پول کے کنارے کھڑا اپنا عکس ساکت پانی میں دیکھ رہا تھا۔

پھر اسی پانی میں اس نے ایک سنہری جل پری کو دیکھا۔ جب اس نے نظریں اُٹھائیں تو وہ دونوں بالکل اس کے نزدیک پہنچ چکی تھیں۔

''بھائی...... یہ ہے میری سہیلی آرزو۔'' مہرالنساء نے اس کا تعارف کرایا۔ ''اور آرزو یہ ہیں......''

آرزو نے بہت دھیرے سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یوسف ثانی۔''

''کیا میں نے غلط کہا تھا...... دیکھ لیا تُو نے۔'' وہ بھی دھیرے سے بولی۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ یوں لگا جیسے گمشدہ چیزیں اچانک سامنے آ گئی ہوں۔

دونوں کی نظریں ملیں تو پھر ہٹ نہ سکیں...... نظر سے نظر کی بات چلی۔

ڈھونڈتی تھی جسے نظر وہ تم ہی تو ہو
وقت کی دھند میں تھے جو گم
وہ تم ہی تو ہو۔

☆......☆......☆

کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمین پر بلایا گیا ہے میرے لئے

☆......☆......☆

کون آیا کہ نگاہوں میں چمک جاگ اُٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اُٹھی

☆......☆......☆

میری آنکھوں پر جھکی رہتی پلکیں جس کی
تم وہی میرے خیالوں کی پری ہو کہ نہیں
کہیں پہلے کی طرح پھر تو نہ کھو جاؤ گی
جو ہمیشہ کے لئے ہو، وہ خوشی ہو کہ نہیں
میں نے شاید پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے

☆......☆......☆

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور مہرالنساء ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

پھر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ زور سے کھنکاری اور بولی۔ ''ارے بھئی...... یہ بتائیں کیا آپ لوگ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں...... کسی زمانے کے بچھڑے ہوئے ملے ہیں۔ آخر کیا معاملہ ہے؟ کچھ بتائیں تو۔''

تب اچانک دونوں کو ہوش آیا۔ محویت ٹوٹی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اجنبی نگاہوں سے دیکھا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' آرزو نے کہا۔

''مجھے بھی۔'' اس نے تائید کی۔

''لیکن آپ دونوں کو ملا کر میں مشکل میں پڑ گئی۔'' مہرالنساء ہنسی۔

''وہ کیوں؟'' وہ دونوں بیک وقت بولے۔

''اس لئے کہ دوست، دوست نہ رہا...... بھائی، بھائی نہ رہا۔'' مہرالنساء نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مہرو کی بات سن کر دونوں کی نگاہیں بیک وقت جھک گئیں۔

شاید دلوں کا چور پکڑا جانے کی وجہ سے یا حجاب کی وجہ سے۔

''اچھا ہم چلتے ہیں۔'' اس نے آرزو کی طرف دیکھا۔

''اچھا۔'' آرزو نے بہت سادگی سے کہا۔

''ارے واہ...... بڑے آرام سے جانے کی اجازت دے دی۔ تُو تو بھائی سے لڑنے کیلئے آئی تھی۔'' مہرو نے اس کے بازو پر چٹکی بھری۔

''ہاں...... آرزو صاحبہ...... میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔'' اسے جیسے اب ہوش آیا۔

''آپ نے کھانا کھایا؟'' اب آرزو کو بھی ہوش آیا۔

''جی ہاں...... میں کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔''

''آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑا سا کیک چکھ لیں۔'' آرزو نے مہرو کی طرف دیکھا۔

''ارے مجھے کیا دیکھتی ہے۔'' مہرو چہک کر بولی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی نامناسب بات بھی نہیں ہے...... کیوں مہرو۔''

''ہاں بھائی...... اس میں بھلا نامناسب بات کون سی ہے۔'' وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

''آئیں پھر۔'' آرزو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ دونوں بہن بھائی کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ستارہ سے کیک اور کافی لانے کو کہا۔

ڈرائنگ روم کے صوفے پر آرزو اور مہرو بیٹھ گئیں اور سامنے والے صوفے پر وہ بیٹھ گیا۔

آرزو نے نگاہ اُٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تجھے زمیں پر بلایا گیا ہے میرے لئے''

باہر سے آواز آ رہی تھی۔ گلوکار دل پر اثر کرنے والے انداز میں گا رہا تھا۔

دونوں کے نیناں ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے تھے۔

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ پہلی نظر ہی آخری نظر ثابت ہوتی ہے۔ کسی کو دیکھ کر دل ایک دم پکار اُٹھتا ہے۔

''ڈھونڈتی تھی جسے نظر وہ تم ہی تو ہو۔''...... شاید یہاں بھی ایسا ہی تھا۔

پندرھویں برس کی یہ پہلی رات تھی۔

نور بانو نے کہا تھا کہ اس لڑکی پر پندرھواں سال بہت بھاری ہوگا۔ پندرھواں برس آ پہنچا تھا۔
قیامت کی رات سر پر تھی۔

آرزو اپنے بیڈ روم میں محوِ خواب تھی۔ نرم ملائم تکیے پر اس کے ریشمی بال پھیلے ہوئے تھے۔ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ پرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں نیلے رنگ کا نائٹ بلب روشن تھا۔ نیلگوں روشنی میں اس کا خوابیدہ حسن جلوے بکھیر رہا تھا۔

وہ خوابوں کی وادی میں کسی تتلی کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آج کی رات کیا ہونے والا ہے۔ وقت کیسی کروٹ لینے والا ہے، قسمت کیا گل کھلانے والی ہے۔

اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ دور تک کوئی آواز، کوئی شور نہ تھا۔ رات کا پر ہیبت سناٹا طاری تھا۔

پھر وہ اچانک ہی پردے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

وہ ایک سنہری سانپ تھا۔

اس کا جسم چمکیلا تھا اور جسم پر چھوٹے چھوٹے گول نشان تھے، یہ نشان رنگین اور چمکیلے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے سنہرے جسم پر مختلف رنگ کے پتھر جڑے ہوں، اس کے سر پر بھی ایک چمکیلا پتھر رکھا تھا، اس سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے سر کا تاج ہو، کالی زبان جو دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، بار بار باہر نکل رہی تھی۔

وہ پردے سے اُتر کر آرزو کے بیڈ کی طرف بڑھ رہا تھا، کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو پھیل گئی، یہ خوشبو بڑی مسحور کن تھی۔

آرزو کی گھنی ریشمی زلفیں تکیے سے ہوتی ہوئی بیڈ کے کنارے تک چلی گئی تھیں، وہ سنہرا سانپ انہی زلفوں کے پیچ وخم میں گھومتا ہوا اوپر آیا پھر وہ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور اپنا پھن پھیلا کر اپنی کالی اور چمکیلی آنکھوں سے آرزو کے خوابیدہ حسن کو دیکھنے لگا۔

وہ اس کے حسن میں محو تھا اور وہ حسین وادیوں میں گھوم رہی تھی۔ مہرو کا بھائی اس کے ساتھ تھا، وہ اس کا ہاتھ پکڑے بھاگتی چلی جارہی تھی، دونوں بہت خوش تھے، فضا میں قہقہے بکھر رہے تھے، اچانک ایک بادل کے ٹکڑے نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ دونوں گڑبڑا گئے، ہاتھ چھوٹ گیا، چند لمحوں بعد جب بادل چھٹا تو وہ پہاڑی پر تنہا رہ گئی۔

اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر تھی اور اس کے سامنے ایک سانپ پھن پھیلائے اسے بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا، پہلے تو وہ سمجھ نہ پائی کہ خواب کون سا تھا، وہ جہاں حسین وادیوں میں وہ دونوں گھوم

رہے تھے اور ایک بادل کے ٹکڑے نے انہیں جدا کر دیا تھا یا خواب یہ ہے کہ ایک سنہرا سانپ اس کے چہرے کے بالکل نزدیک پھن پھیلائے کھڑا ہے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ فیصلہ کر پاتی، اس سانپ کی آنکھوں سے لہریں سی نکلیں اور آرزو کی آنکھوں میں جذب ہوگئیں۔

آرزو پر فوراً ہی ایک نیم غشی سی طاری ہوگئی، اس کی آنکھیں کھلی تھیں، وہ ایک سنہرے سانپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کرے، اس کے دماغ میں جیسے دھواں سا بھرتا جا رہا تھا، اس کے ہاتھ پیروں میں جنبش کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔

پھر وہ سانپ اس کے مرمریں جسم پر پھسلنے لگا، اس کی گرفت سخت سے سخت ہوتی جارہی تھی اور آرزو اپنے آپ سے بےخبر ہوتی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

ستارہ اس کے کمرے کا کئی مرتبہ چکر لگا کر جا چکی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج بی بی کو کیا ہوگیا ہے، کالج کی آج چھٹی تھی۔ یہ بات وہ جانتی تھی کہ چھٹی والے دن آرزو ذرا دیر سے سو کر اُٹھتی تھی لیکن اتنی دیر سے نہیں، آج تو حد ہوگئی تھی۔

آرزو کے کمرے کا اندر سے دروازہ بند تھا نہیں تو وہ اندر جا کر اسے جگا دیتی، پہلے تو وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرتی رہی جب دروازہ نہیں کھلا تو اس نے آہستہ سے دستک دی، آہستہ سے دستک دینے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی آواز بھی لگائی۔ ''بی بی دروازہ کھولیں۔''

لیکن آرزر کے کان پر جوں تک نہ رینگی پھر وہ پریشان ہو کر اپنی ماں سروری کے پاس کچن میں پہنچی اور پرتشویش لہجے میں بولی۔ ''اماں، بی بی ابھی تک نہیں جاگیں۔''

''اری سونے دے رات دیر سے سوئی ہوگی۔'' سروری نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

''کتنی ہی دیر سے سوئی ہوں لیکن اتنی دیر سے تو وہ کبھی نہیں اُٹھتیں...... اماں تجھے پتہ بھی ہے، اس وقت کیا بجا ہے؟''

''کیا بجا ہے؟'' سروری نے سبزی کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''اماں! ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔''

''ہیں......!'' سروری کو اچانک ہوش آیا۔ ''تو نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔''

''ہاں، ٹھہر میں چلتی ہوں۔'' سروری نے کٹی ہوئی سبزی کو ایک طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''اماں، دروازہ پیٹنے سے کچھ نہیں ہوگا...... تو وہاں جا کر کیا کرے گی۔''

''اری تو آ تو۔'' سروری کچن سے نکلتے ہوئے بولی۔

"اماں ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔" ستارہ چٹکی بجا کر بولی۔

"وہ کیا......؟" سروری نے پوچھا۔

"اماں لاؤنج سے ان کے کمرے میں فون کرتے ہیں، فون کی آواز سن کر وہ ضرور اُٹھ جائیں گی۔" ستارہ نے تجویز پیش کی۔

"اچھا چل......فون کر کے دیکھ لے۔" سروری نے اسے اجازت دے دی۔

ستارہ نے لاؤنج میں رکھے فون پر آرزو کے ٹیلیفون کا نمبر ملایا اور ریسیور کان سے لگا کر سروری کو دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "اماں، گھنٹی بج رہی ہے۔"

تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد بھی آرزو نے فون نہ اُٹھایا تو ستارہ بولی۔ "اماں وہ تو فون بھی نہیں اُٹھا رہیں......وہ کمرے میں ہیں بھی؟"

"گھنٹی بجنے دے۔" سروری نے اس سے کہا۔ "کمرے سے وہ آخر کہاں جائیں گی؟"

ستارہ ریسیور کان سے لگائے ہونے والی گھنٹیوں کو بڑے انہماک سے گن رہی تھی کہ اچانک ادھر سے کسی نے ریسیور اُٹھالیا۔

ستارہ کے چہرے پر خوشی کی لہر پھیل گئی۔ اس نے اپنی چمکتی آنکھوں سے سروری کو دیکھا۔

"اُٹھالیا۔"

"چلو شکر ہے۔"

"ہاں، ہیلو۔" ستارہ، آرزو کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔

"ہیلو۔" آرزو کی خوابیدہ سی آواز آئی۔

"بی بی......بی بی......میں ستارہ بول رہی ہوں......دروازہ کھولیں نا، کیا آج اُٹھنے کا ارادہ نہیں ہے، ذرا ٹائم تو دیکھیں......ساڑھے بارہ بج رہے ہیں، آپ خیریت سے تو ہیں۔"

"اچھا......ستارہ، ٹھہرو، میں کھولتی ہوں دروازہ۔" اُدھر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ پھر ریسیور رکھ دیا گیا۔

"اماں، بی بی جاگ گئی ہیں، میں ان کے پاس جاتی ہوں، ناشتے کے بارے میں پوچھتی ہوں۔" ستارہ ٹیلیفون بند کر کے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں، جا کر پوچھ لے ویسے تو اب کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔" سروری یہ کہتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

اور ستارہ بھاگتی ہوئی آرزو کے کمرے کے سامنے پہنچی، اتنی دیر میں وہ دروازہ کھول چکی تھی، جب ستارہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو وہ تکیے اونچے کئے نڈھال سی لیٹی تھی۔

"ارے بی بی کیا ہوا؟" ستارہ بیڈ کی طرف لپکی۔

آرزو نے آنکھیں کھول دیں اور ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ اس طرح دیکھنے پر ستارہ سہم سی گئی، آرزو کا کچھ انداز ہی ایسا تھا، وہ کھوئے کھوئے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہائے......بی بی......ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"تم ستارہ ہو؟" آرزو نے جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہ بی بی......ایسی باتیں نہ کریں......میں بہت ڈرتی ہوں، ایسی باتوں سے......"

آرزو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، دھیرے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"بی بی......بی بی......آنکھیں کھولیں۔"

"ہاں......کیا۔" آرزو نے آنکھیں کھولنے کی کوشش میں آنکھیں پھاڑیں لیکن اندرونی کیفیت کی وجہ سے وہ زیادہ دیر آنکھیں کھلی نہ رکھ سکی۔

"بی بی......کیا ہوا آپ کو......" ستارہ نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"مجھے متلی کی سی کیفیت ہو رہی ہے تو ایک گلاس پانی میں دو لیموں نچوڑ کر لا دے۔" آرزو نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"اچھا لاتی ہوں......ابھی لائی......کیا اس میں چینی بھی ڈالوں؟" ستارہ نے جاتے جاتے پوچھا۔

"نا......" آرزو نے ذرا تیز لہجے میں جواب دیا جیسے اسے غصہ آ گیا ہو۔

ستارہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی، اس نے جلدی جلدی دو لیموں گلاس میں نچوڑے اور پانی بھر کر تیزی سے آرزو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ سروری اس وقت کچن میں نہ تھی، وہ کمال رائے کا کمرہ صاف کر کے نکلی تو اس نے ستارہ کو عجلت میں گلاس تھامے آرزو کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا، اس کا ماتھا ٹھنکا، وہ فوراً ہی اس کے پیچھے چل دی۔

جب سروری کمرے میں داخل ہوئی تو آرزو جلدی جلدی گلاس سے منہ لگائے سکنجبین پی رہی تھی۔

"کیا ہوا بی بی؟" سروری نے ستارہ سے پوچھا اور دوڑ کر آرزو کا ماتھا چھوا۔

آرزو نے گلاس آگے بڑھا کر سروری کو انجان نظروں سے دیکھا۔

"اماں، بی بی......اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں......مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اری چپ ہو......تجھے ہر وقت ڈر ہی لگتا رہتا ہے۔" سروری نے اپنی بیٹی کو ڈانٹا پھر وہ آرزو کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیا ہوا بی بی......جی مالش کر رہا ہے؟"

آرزو نے اثبات میں گردن ہلائی......منہ سے کچھ نہ بولی۔

"آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟" سروری پر تشویش لہجے میں بولی۔

"نہیں...... میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔" آرزو آنکھیں بند کیے بولی۔

اور پھر حیرت انگیز طور پر لیموں کا پانی پی کر اس کی طبیعت سنبھل گئی تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی، کچھ دیر وہ خاموشی سے بیٹھی رہی، اس نے کمرے میں چاروں طرف نظریں گھمائیں، کچھ اس انداز سے جیسے کمرے میں کوئی چیز تلاش کر رہی ہو، ستارہ اس کے نزدیک بیٹھی تھی، سروری ناشتے کا انتظام کرنے جا چکی تھی۔

ستارہ، آرزو کے گورے پاؤں اپنی گود میں رکھے بہت آہستگی سے دبا رہی تھی تھوڑی دیر بعد آرزو نے اپنے پاؤں کھینچ لیے "بس...... اب میں ذرا نہا لوں۔"

"ہاں، بی بی نہائیں...... اب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، کافی حد تک۔"

"آپ کو کیا ہوا تھا؟"

"مجھے خود نہیں معلوم...... لیکن کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" وہ بستر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر انگڑائی لی اور پھر ایک ٹھنڈے سانس کے ساتھ ہاتھ چھوڑ دیئے۔

"ہائے بی بی...... انگڑائی لیتے ہوئے آپ کتنی پیاری لگتی ہیں، ذرا ایک بار تو اور لیں۔" ستارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زیادہ بک بک نہیں کرتے۔" آرزو نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

اس کا واش روم خاصا بڑا اور جدید سہولتوں سے آراستہ تھا، وہ دیواروں پر آمنے سامنے بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے، واش روم میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کیا اور بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا چہرہ دیکھا، اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی خطرناک بیماری سے اُٹھی ہو۔

ایک ہی رات میں آخر اس پر کیا بیت گئی۔

تب اسے اپنے دو خواب یاد آئے۔ وہ مہرو کے بھائی کے ساتھ وادیوں میں اُڑتی پھر رہی تھی کہ ایک بادل نے انہیں ڈھک لیا اور جب وہ بادل اُڑا تو وہاں مہرو کا بھائی نہ تھا، گھبرا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی پھر اسے اپنے بیڈ پر ایک سنہری سانپ پھن اُٹھائے نظر آیا، اس سانپ کی آنکھوں سے لہریں سی نکلیں پھر آرزو کو کچھ ہوش نہ رہا، اس نے بڑی مشکل سے اُٹھ کر دروازہ

کھولا، اس کی طبیعت بوجھل تھی، شدید نقاہت تھی، جی مالش کر رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے۔

اور اب یہی کیفیت اسے اپنا چہرہ دیکھ کر ہوئی تھی، وہ اپنا چہرہ دیکھ کر فکر مند ہو گئی تھی۔

اس کا چہرہ سرخی مائل تھا لیکن اب وہی چہرہ سفید پڑا ہوا تھا، وہ کچھ دیر اپنے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس نے نلکا کھول کر اپنے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے۔

وہ دونوں واقعات کیونکہ بیک وقت پیش آئے تھے، اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا واقعہ خواب ہے اور کون سا حقیقت...... پھر اسے خیال آیا کہ مہرو کے بھائی کے ساتھ وادیوں میں ہاتھ پکڑ کر گھومنے کا واقعہ تو کسی طور حقیقت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے تو آج ہی رات کو ملاقات ہوئی تھی، ہاں وہ اس کا خواب ضرور دیکھ سکتی تھی لیکن سانپ والا واقعہ بھی اسے حقیقت محسوس نہیں ہوتا تھا اگر حقیقت ہوتا تو وہ اُٹھ کر سانپ کو مارنے کی کوشش کرتی کیونکہ اسے سانپوں سے قطعاً ڈر نہیں لگتا تھا لیکن وہ تو سانپ دیکھتے ہی ہوش گنوا بیٹھی تھی، اس کا مطلب ہے کہ سنہرے سانپ کو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔

ابھی وہ شاور کے نیچے کھڑی ہوئی تھی اور شاور کو کھولنا ہی چاہتی تھی کہ سامنے بڑے آئینے پر اس کی نظر ٹھہر گئی، وہ بے دھیانی میں آئینے کی طرف بڑھی تا کہ اس نے جو کچھ دیکھا، اسے روشنی میں اچھی طرح دیکھ سکے، اسے اپنے پیٹ پر دو ننھے سوراخ نظر آئے۔

اس نے گھبرا کر اپنے پیٹ پر نظر ڈالی، وہاں قریب قریب دو ننھے سوراخ موجود تھے جو نیلاہٹ لئے ہوئے تھے اور یہ واضح طور پر کسی سانپ کے کاٹنے کے نشان تھے تو کیا رات کو اسے کسی سانپ نے ڈسا تھا۔

وہ یہ سوچ کر ہی سراسیمہ ہو گئی۔

☆......☆......☆

آرزو ایک دو دن کالج نہ جا سکی۔

پہلے دن جب کالج نہ گئی تو مہر النساء کالج میں بہت بور ہوئی، آرزو کے بغیر اسے کالج سونا لگتا تھا، وہ دونوں ہر وقت ساتھ ہی رہتی تھی۔ کلاس میں بھی پاس پاس بیٹھتی تھیں، آرزو کالج بہت پابندی سے آتی تھی، آج وہ نہ آئی تو مہر النساء کا کالج میں بہت برا دن گزرا پھر وہ تشویش میں بھی مبتلا ہو گئی۔

کالج سے آ کر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ بیڈ پر بیٹھ کر ٹیلیفون کے دھڑا دھڑ بٹن دبائے فوراً ہی لائن مل گئی۔ ادھر سے دوسری گھنٹی پر کسی نے فون اُٹھا لیا۔

''ہاں جی......کون؟'' یہ سروری کی آواز تھی۔

''بی بی ہیں......ذرا ان سے بات کرا دو......میں مہر النساء بول رہی ہوں۔''

''اچھا بی بی۔'' سروری نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر آرزو کی طرف دیکھا۔ آرزو ناشتے سے فارغ ہو کر ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

''کون ہے؟'' آرزو نے پوچھا۔

''مہر النساء بی بی ہیں۔'' سروری نے ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی۔'' آرزو ذرا اپنی آواز میں شگفتگی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں جی کی خالہ......آج کالج کیوں نہیں آئی؟'' مہرو غصہ ہوئی۔

''جاگتی آنکھوں سے رات بھر تیرے بھائی کے خواب دیکھتی رہی، صبح ہوئی تو دوپہر کو آنکھ کھلی اسی لئے کالج نہیں آئی۔'' آرزو نے اپنی مخصوص بے تکلفی سے کہا۔

''لو بھئی......ایک ملاقات میں یہ حال ہو گیا۔'' مہرو نے پوچھا۔

''میں کیا کروں تیرا بھائی ہے ہی ایسا......جو دیکھے وہ اپنی نیندیں گنوا بیٹھے۔''

''تیرا بھائی......تیرا بھائی کیا کر رہی ہے......میرے بھائی کا کوئی نام بھی ہے آخر؟''

''ہاں......کتنی عجیب بات ہے کہ اتنی دیر ملاقات رہی لیکن میں نام نہ پوچھ سکی اور تو بھی کمینی ایسی ہے کہ بھائی بھائی کرتی رہی، یہ نہ ہوا کہ ایک مرتبہ اس کا نام ہی لے لیتی۔'' آرزو نے گلہ کیا۔

''میرے بھائی کا نام رامش خیال ہے۔'' مہر النساء نے بتایا۔

''کیا شاعر ہیں؟......یہ تو شاعروں والا نام ہے۔''

''باقاعدہ شاعر تو نہیں البتہ کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے ہیں، چھپواتے نہیں، کہہ کر رکھ لیتے ہیں، کسی کو سناتے بھی نہیں۔'' مہر النساء نے بتایا۔

''کوئی سننے والا نہ ہوگا۔'' آرزو نے چھیڑا۔

''سننے والے بہت......بلکہ سننے والیاں......'' مہر النساء نے ہنس کر کہا۔

''خبردار جو کسی سننے والی کا ذکر کیا تو قتل کر دوں گی۔'' آرزو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ارے آرزو......کیا تو سنجیدہ ہے؟'' مہرو اس کے لہجے سے متاثر ہوئی۔

''ہاں، میں سنجیدہ ہوں......دیکھ مہرو......رامش خیال کا اب خیال رکھنا، کوئی لڑکی ان کے نزدیک نہ آنے پائے۔'' آرزو نے تنبیہ کی۔

''ہائے آرزو......اگر یہ بات میرا بھائی سن لے تو پاگل ہو جائے۔''

''تو سنا دینا ان کو......پاگل کر دینا۔'' آرزو نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا تو یہ بتا کہ آج کالج کیوں نہیں آئی۔'' مہر النساء نے موضوع بدلا۔ وہ اس کا مسخرہ پن اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

''یار طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔'' آرزو نے صحیح صورتحال بتائی۔

''ارے کیا ہوا؟'' مہر النساء پریشان ہوئی۔

''بس یہی تو معلوم نہیں ہے کہ کیا ہوا......تو دیکھے گی تو دیکھ کر حیران رہ جائے گی بلکہ پریشان ہو جائے گی۔''

''ارے ایسا کیا ہوا......ایک رات میں......''

''یوں لگتا ہے جیسے جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہے......پیلی پڑ گئی ہوں......دل پر عجیب وحشت سی طاری ہے غنودگی کی سی کیفیت ہے، نیند آئے جا رہی ہے، ساڑھے بارہ بجے سو کر اٹھی ہوں، ستارہ بے چاری دروازہ پیٹ پیٹ کر ہلکان ہو گئی پھر اس نے ٹیلیفون کی گھنٹی بجا کر مجھے اٹھایا، وہ تو اچھا ہوا بابا گھر میں نہیں تھے ورنہ مصیبت آ جاتی، اب تک چھ ڈاکٹر سر پر کھڑے ہوتے۔'' آرزو نے بتایا۔

''اچھا......یہ بتا کل کالج آئے گی؟''

''ہمت رہی تو ضرور آؤں گی۔'' آرزو نے بتایا۔

لیکن دوسرے دن وہ پھر کالج نہ جا سکی، مہر النساء فکر مند سی گھر پہنچی، اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا، تھکی ہوئی تھی، کچھ دیر آرام کیا، سو کر اٹھی تو رامش کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس نے اپنے بھائی کو آرزو کے بارے میں بتایا کہ وہ دو دن سے کالج نہیں آ رہی، بیمار ہے تو رامش خیال یہ سن کر سوچ میں ڈوب گیا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی بہن سے کہے کہ چلو اس کی عیادت کو چلتے ہیں لیکن وہ کہہ نہ سکا محض اپنی بہن کو دیکھتا رہ گیا۔

''مجھے کیوں گھور رہے ہیں، میں نے تھوڑا ہی اس کو بیمار کیا ہے۔'' مہر النساء نے اپنے بھائی کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے لگتا ہے تم نے ہی اسے نظر لگائی ہے......سالگرہ والے دن اس کی تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔'' رامش نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ......میں اسے کیوں نظر لگاتی......نظر اسے آپ کی لگی ہوگی......ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔'' اس نے جوابی حملہ کیا۔

''آرزو کو ہوا کیا ہے؟'' رامش نے پوچھا۔

''ٹیلیفون پر بات ہوئی تھی......کہہ رہی تھی بہت طبیعت خراب ہے۔''

''تم پھر بھی اسے دیکھنے نہیں گئیں۔''

''کس کے ساتھ جاتی ...... بھائی آپ کہاں جا رہے ہیں ...... آپ چلیں نا میرے ساتھ۔'' مہرالنساء نے استدعا کی۔

''بھئی میں تو اپنے ایک دوست کے گھر جا رہا تھا...... خیر چلو تمہارے ساتھ چلتا ہوں...... دوست کو فون کر دیتا ہوں۔''

بھائی کا جواب سن کر مہرالنساء حیران رہ گئی، اسے ہرگز توقع نہ تھی کہ رامش اس قدر جلد جانے کیلئے تیار ہو جائے گا، وہ سوچ رہی تھی جانے کا ذکر سن کر وہ چھ بہانے بنائے گا اور گاڑی کی چابی گھماتا ہوا پورے اطمینان سے اس کے سامنے سے گزر جائے گا۔

''بھائی! آپ ایک دو دن میں کچھ زیادہ اچھے نہیں ہو گئے۔'' مہرالنساء نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' رامش خیال نے گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے دیکھا۔ ''ایک تو تمہیں تمہاری دوست کے پاس لے جا رہا ہوں اوپر سے تم باتیں بنا رہی ہو...... نہ جاؤں۔''

''ارے نہیں بھائی...... ناراض نہ ہوں۔'' وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

بنگلے کے اونچے گیٹ پر گاڑی رکی تو ایک گارڈ بڑی مستعدی سے چلتا ہوا ان کے نزدیک آیا جبکہ دوسرا گارڈ گیٹ پر کھڑا رہا۔

''جی سر!'' گاڑی کے نزدیک آنے والے گارڈ نے مؤدبانہ آواز میں کہا۔

''آرزو بی بی سے ملنا ہے۔'' رامش کے بجائے مہرالنساء نے جواب دیا۔ ''میرا نام مہرو ہے، میں ان کی دوست ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے...... ایک منٹ ٹھہریئے۔'' گارڈ یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔

اس بڑے گیٹ میں بنے چھوٹے گیٹ سے وہ اندر داخل ہو گیا۔

''بڑا حفاظتی پہرہ ہے خیر تو ہے۔'' رامش نے پوچھا۔

''یہ سب آرزو کیلئے ہے۔'' مہرالنساء نے بتایا۔

''اچھا...... کیا وہ کالج بھی گارڈ کے ساتھ جاتی ہے۔''

''جی بھائی۔'' مہرالنساء نے جواب دیا۔ ''بھائی، آرزو کی امی نہیں ہیں، خود آرزو بھی بچپن میں گم ہو گئی تھی۔''

''اچھا...... کیا ہوا تھا۔'' رامش نے پوچھا۔

مہرالنساء اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، اتنے میں گارڈ اندر سے برآمد ہوا اور اس نے گیٹ کے

دونوں پٹ کھول دیئے۔ رامش خیال اپنی گاڑی اندر لے گیا۔

گارڈ نے انٹرکام پر مہرالنساء کے آنے کی اطلاع دی تھی، اس کو اندر آنے کی اجازت دے کر وہ خود بھی بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئی تھی وہ دونوں گاڑی سے اترے تو آرزو سامنے ہی کھڑی تھی۔

اس نے دونوں کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ مہرالنساء اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی جبکہ رامش خیال ان دونوں کے سامنے براجمان ہو گیا۔

رامش خیال نے اس کا چہرہ دیکھا تو کچھ پریشان سا ہو گیا، اس کا چہرہ پھیکا سا ہو رہا تھا، وہ خاصی کمزور دکھائی دے رہی تھی، اس سے پہلے کہ مہرالنساء اس سے حال احوال پوچھتی، رامش بے اختیار بول پڑا۔ ''کیا ہوا آپ کو......؟''

''کچھ پتہ نہیں۔'' آرزو نے رامش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اچانک ہی ہوا، سالگرہ کی رات اچھی بھلی تھی، صبح سو کر اٹھی تو حالت خراب تھی۔''

''ڈاکٹر کو دکھایا۔''

''بابا صبح شام ڈاکٹر تبدیل کر رہے ہیں، ان کا بس نہیں چل رہا ورنہ ہر گھنٹے میں ڈاکٹر بدل دیں۔''

''ہاں، ظاہر ہے وہ پریشان ہو گئے ہوں گے، تو ان کی زندگی کا اثاثہ ہے۔'' مہرالنساء نے کہا۔

''آخر بیماری کیا ہے؟'' رامش بولا۔

''کچھ نہیں...... ابھی تک کوئی ڈاکٹر بیماری نہیں بتا سکا...... بس ہر ڈاکٹر اپنا ایک نسخہ پکڑا دیتا ہے۔''

''اری تجھے محبت تو نہیں ہو گئی۔'' مہرالنساء نے بہت دھیرے سے کہا، اتنے دھیرے سے کہ رامش باوجود کوشش کے کچھ نہیں سن سکا۔

''ہاں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔'' آرزو نے یہ کہتے ہوئے رامش خیال کو دیکھا۔

رامش خیال ان نظروں کی تاب نہ لا سکا، اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

پھر ستارہ چائے لے کر آ گئی۔

ابھی وہ چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ کمال رائے، آرزو کو ڈھونڈتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''اچھا، تم یہاں بیٹھی ہو۔'' کمال رائے نے ایک نظر مہرالنساء اور رامش خیال پر ڈالی۔

''بابا...... ان سے ملیں...... یہ میری پکی سہیلی ہے مہرالنساء اور یہ ان کے بھائی ہیں رامش خیال۔'' آرزو نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

''اچھا ماشاءاللہ......'' کمال رائے کی نگاہیں رامش خیال پر ٹک گئیں، وہ اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔

''اور مہرو...... یہ میرے بابا ہیں...... کمال رائے۔'' آرزو نے اپنے باپ کا تعارف کرایا۔ ''موسیقی میں ان کی جان ہے۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر...... واقعی بہت خوشی ہوئی...... یہ کوئی رسمی جملہ نہیں۔'' رامش خیال نے آگے بڑھ کر کمال رائے سے ہاتھ ملایا۔

رامش خیال کو دیکھ کر جانے کیوں کمال رائے کو اپنی جوانی یاد آ گئی۔

''میں بھی بہت خوش ہوا ہوں تمہیں دیکھ کر۔'' کمال رائے نے بڑی محبت سے کہا۔

''اور انکل کیا مجھے دیکھ کر آپ کو کچھ نہیں ہوا۔'' مہر النساء نے ہنس کر کہا۔

اس کی بات سن کر کمال رائے بے ساختہ ہنسا اور اس کے نزدیک پہنچ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''بھئی تمہارا تو کوئی جواب ہی نہیں...... تم تو بہت پیاری سی ہو۔''

''ہاں اب ہوئی نہ بات۔'' مہر النساء اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بیٹھو بچو۔'' اس نے مہر النساء اور رامش خیال کی طرف دیکھ کر کہا۔

''شکریہ۔'' وہ دونوں بیٹھ گئے۔

پھر کمال رائے اپنی بیٹی سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی، اب تمہارا کیا حال ہے؟''

''بابا...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' آرزو نے بڑے یقین سے کہا۔

''ٹھیک کیوں نہ ہوگی...... سہیلی کی شکل جو نظر آ گئی۔'' کمال رائے نے کہا۔ پھر وہ مہر النساء سے مخاطب ہوا۔ ''بھئی تم روز آ جایا کرو۔''

''بابا، آپ کا کیا خیال ہے...... کیا میں گھر پر ہی بیٹھی رہوں گی، کل میں کالج جاؤں گی، میری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔''

''کالج چلی جانا بیٹا...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہو۔'' کمال رائے فکر مندی سے بولا۔

''بابا...... آپ بیٹھیں...... کھڑے کیوں ہیں۔'' آرزو نے اسے کھڑے دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... میں اب چلتا ہوں...... تم یاد کر کے دوا ضرور کھا لینا۔''

''جی بابا...... آپ پریشان نہ ہوں...... میں کھا لوں گی۔'' آرزو نے اپنے باپ کو اطمینان دلایا۔

''اچھا جی رامش صاحب۔'' کمال رائے نے اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''پھر ملیں گے۔'' اس کے بعد اس نے مہر النساء کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''بیٹا...... آتی رہا کرو۔''

''جی انکل...... ضرور۔'' مہر النساء نے بڑی خوشدلی سے کہا۔

کمال رائے کے جانے کے بعد مہر النساء اس کے قریب بیٹھ کر شوخی سے بولی۔ ''یار، تمہارے بابا تو بڑے شاندار ہیں۔''

''اور بہت مہربان بھی۔'' رامش خیال نے ٹکڑا لگایا۔

''میرے بابا...... ایک آئیڈیل آدمی ہیں۔'' آرزو نے بڑے فخر سے کہا۔ ''میری ماں سے انہیں اس قدر محبت ہے کہ آج تک دوسری شادی نہیں...... دادی نے بہت دباؤ ڈالا مگر یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے...... خود میں نے بھی کہا جب میں اپنے بابا کو تنہا دیکھتی ہوں تو میرا دل کڑھتا ہے مگر وہ ہنس کر ٹال جاتے ہیں۔''

''کوئی جواب نہیں دیتے۔''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' آرزو نے کہا۔ ''کہتے ہیں تم کیسی بیٹی ہو جو سوتیلی ماں کیلئے اس قدر پریشان ہو۔''

یہ سن کر رامش خیال ہنس پڑا۔ ''ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔''

اس دن وہ دونوں آرزو کے پاس خاصی دیر بیٹھے، رامش خیال نے اپنے موبائل فون سے دوست کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ نہیں آ سکے گا لہٰذا اطمینان تھا، وہ دونوں اس کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے، آرزو کا بھی دل لگا رہا۔

☆......☆......☆

رات کو مہر النساء اپنے بیڈ پر لیٹی کورس کی کتاب پڑھ رہی تھی کہ رامش خیال اس کے کمرے میں آ گیا، مہر النساء نے کتاب بند کر کے اپنے بھائی کے چہرے کو بغور دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

''خیریت......؟''

''ہاں سب خیریت ہے۔'' رامش خیال نے ایک کرسی اُٹھا کر بیڈ کے نزدیک رکھی اور اطمینان سے بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''کیا ہو رہا تھا؟''

''بھائی ایجوکیشن کی کتاب دیکھ رہی تھی۔'' مہر النساء نے کتاب اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''مہرو ایک بات بتاؤ۔'' رامش خیال نے بڑی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی آپ تو بڑے سیریس ہو رہے ہیں آخر معاملہ کیا ہے۔'' وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''مہرو تجھے آرزو کیسی لگتی ہے؟'' رامش خیال نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

''بھائی وہ میری دوست ہے، کالج میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، شوخ ہے، ہنس مکھ ہے، لاکھوں میں ایک ہے، وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔'' مہر النساء نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''پر بھائی آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''مہرو...... اس کا مطلب ہے کہ ہم آئندہ ایک دوسرے کے رقیب بن جائیں گے۔''

''رقیب......'' پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا، اس نے معصومیت سے اس لفظ کو دہرایا۔ جب اس کی

سمجھ میں آیا تو وہ ایک انگلی اسے دکھا کر بولی۔ ''اچھا تو آپ بھی میری صف میں کھڑے ہو گئے بھائی، یہ کتنی بری بات ہے۔''

''کوئی کسی کو اچھا لگے تو اس میں بھلا برائی کی کیا بات ہے۔'' رامش خیال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہرو، میں اسے پسند کرنے لگا ہوں...... میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' مہرالنساء کے چہرے پر اُداسی پھیل گئی۔

''ہاں، میں نے جو کچھ کہا، بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''آپ نے سوچا ہی تو نہیں اگر سوچا ہوتا تو ایسی بات ہرگز زبان پر نہ لاتے۔''

''کسی کو پسند کرنا گناہ ہے کیا؟''

''پسند کرنا تو گناہ نہیں...... لیکن شادی کی بات کرنا گناہ ہے۔''

''کیا لوگ اپنی پسند سے شادی نہیں کرتے۔''

''شادی کرتے ہیں لیکن صرف وہ لوگ جن کی منگنی نہ ہوئی ہو۔'' مہرالنساء نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''میں اس منگنی کو نہیں مانتا۔''

''آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوگا، یہ منگنی ہمارے بڑوں نے طے کی ہے، اس منگنی سے انحراف ممکن نہیں، آخر شکیلہ کا کیا قصور ہے، وہ آپ کے تایا کی بیٹی ہے اور ایک عرصے سے آپ کے نام پر بیٹھی ہے۔'' مہرالنساء نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ مجھ سے دو سال بڑی ہے۔'' رامش خیال نے اعتراض اُٹھایا۔

''تو اس سے کیا ہوتا ہے، ہمارے یہاں بڑا چھوٹا کب دیکھا جاتا ہے، ہمارے بڑے جو رشتہ طے کر دیتے ہیں، وہ اٹل ہو جاتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ رشتہ ہمارے دادا نے طے کیا تھا، آپ یہ بات جانتے ہیں کہ نہیں۔''

''ہاں مہرو جانتا ہوں، میں سب جانتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں کمزوری آنے لگی۔

''پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے دادا کیسے تھے؟'' مہرالنساء نے ماضی یاد دلایا۔

''ویسے ہی جیسے چوہدری، ملک، خان اور وڈیرے ہوتے ہیں۔'' رامش خیال نے فوراً جواب دیا۔

''ان کے لئے کوئی جرم، جرم نہیں ہوتا؟'' مہرالنساء نے اس کے جملے کی وضاحت چاہی۔

''ہاں بالکل!'' رامش خیال نے فوراً کہا۔

''پھر یہ سمجھ لیں کہ تایا بھی انہی دادا کے بیٹے ہیں، منگنی توڑنے کی سزا جانے آپ کو کس صورت میں

ملے۔'' مہرالنساء نے اسے روشنی دکھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن مہرو، میں یہ بات سو فیصد طے کر چکا ہوں کہ آرزو سے شادی کر کے رہوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کتنے ہی دُکھ جھیلنے پڑیں۔'' اس نے اندھیرے قبول کرنے کا عہد کیا۔

''بھائی کیا...... یہ یکطرفہ فیصلہ نہیں۔'' مہرالنساء نے اب گفتگو کا رخ تبدیل کیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' رامش خیال نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''آپ آرزو سے شادی اسی وقت کریں گے جب وہ اور اس کے والد اس شادی پر رضامند ہوں گے، آج آپ نے اس کے بابا کو بھی دیکھ لیا، مجھے تو وہ راجہ، مہاراجہ سے کم نظر نہیں آتے۔''

''مہرو، میری بہن...... پھر میں کیا کروں...... آرزو مجھے نہ ملی تو پھر مجھے کوئی نہ پا سکے گا۔'' رامش خیال کی آواز میں چیلنج بھی تھا اور مایوسی بھی۔

''یہ دو ملاقاتوں میں آخر اس نے ایسا کیا جادو کر دیا۔'' وہ حیران تھی۔

''کچھ ہونے کیلئے مہرو ایک لمحہ بہت ہوتا ہے، کبھی اس لمحے کا ہمیں فوراً ادراک ہو جاتا ہے اور کبھی اس لمحے کا چند دن بعد پتہ چلتا ہے، یہ کھیل ہوتا ایک لمحے کا ہی ہے۔''

''بھائی، آرزو نے دو ملاقاتوں میں ہی آپ کو فلسفی بنا دیا...... آئندہ ملاقاتیں خدا جانے کیا رنگ لائیں، بھائی میں اب آپ کو اس کے گھر لے کر نہیں جاؤں گی۔'' مہرالنساء نے فیصلہ سنایا۔

''ایسے ہی وقتوں کیلئے مائیں ہوتی ہیں، اگر آج میری ماں ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کہتی۔''

''اور ایسے ہی وقتوں کیلئے باپ ہوتے ہیں، اگر آج ہمارے بابا ہوتے تو وہ آپ کو اونچ نیچ سمجھاتے، آپ کو ہرگز بھٹکنے نہ دیتے۔'' مہرالنساء نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''برا ہو، اس خبیث کا جس نے ہمارے والدین کی جان لی۔'' رامش خیال ایک دم سلگ اُٹھا۔

''جی چاہتا ہے کہ اسے زندہ کروں اور پھر گن گن کر اس سے اپنے والدین کے قتل کا حساب لوں۔''

''تایا بتاتے ہیں کہ اس کا بہت برا انجام ہوا۔ پہلے وہ اندھا ہوا، پھر مفلوج ہوا اور مفلوج بھی ایسا کہ مہینوں بستر پر پڑا سسکتا رہا، سزا تو وہ اپنی زندگی میں ہی پا گیا۔''

''لیکن اس کی موت سے ہمارے ماں باپ تو واپس نہیں آئے۔''

''بس بھائی، یہی وہ نکتہ ہے جسے ہم سمجھ لیں تو انتقام کی آگ میں جل کر کبھی اندھے نہ ہوں، قاتل کو مار کر خود قاتل بننا نری حماقت ہے اس لئے کہ مقتول کبھی واپس نہیں آتا۔''

''قاتل کو مار کر دل کی آگ تو ٹھنڈی ہوتی ہے۔'' رامش خیال نے دلیل دی۔

''میں نہیں سمجھتی کہ کبھی ایسا ہوتا ہوگا، کسی کی جان لینا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے البتہ قاتل کو معاف کر دینا یا صبر کرنا ضرور دل کی آگ ٹھنڈا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ

ہوتا ہے اور ظلم کرنے والوں کو وہ کبھی نہیں بخشتا......اب دیکھ لیں نا کہ روشن گوٹھ کے روشن رائے کا کیا حشر ہوا، اس انجام کو سب نے دیکھا۔"

"چلو چھوڑو......ان پرانی باتوں کو......بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، گڑے مردے اُکھاڑنے سے کیا فائدہ، ہاں تو میں بات کر رہا تھا......" وہ کہتے کہتے رک گیا اور اپنی بہن کو ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

مہر النساء کے اختیار میں ہوتا تو وہ کل ہی ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیتی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کیا مانگ رہا ہے۔

وہ اپنے بھائی کو آگ سے کھیلنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی تھی لیکن وہ اسے صاف طور پر انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اس لئے اس نے دھیرے سے کہا۔ "اچھا بھائی! میں اس موضوع پر آرزو سے بات کرنے کی کوشش کروں گی، اس کی رضامندی کے بغیر تو یہ بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

"مہر النساء! اس سے کہہ دینا کہ اگر وہ مجھ سے شادی کرنے کیلئے راضی نہ ہوئی تو پھر اس کی شادی کسی سے نہ ہو سکے گی۔" رامش خیال نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا اور پھر ایک لمحہ بھی اس کے کمرے میں نہ رکا۔

بھائی کا یہ رویہ اس کیلئے بالکل نیا تھا، وہ تو اسے بڑا نرم خو، حلیم الطبع اور شاعرانہ مزاج رکھنے والا لڑکا سمجھتی تھی لیکن......

رامش خیال تو اندر سے وڈیرا نکلا، آخر وہ ایک بڑے زمیندار کا پوتا جو تھا، خون نے بالآخر رنگ دکھایا۔

☆......☆......☆

آرزو نے دو دن بعد کالج جانا شروع کر دیا، اس کی طبیعت بحال ہو گئی، چہرے کی سرخی آہستہ آہستہ واپس آئی، اس میں چند دن لگے لیکن نقاہت دو دن میں دور ہو گئی، نشے کی سی کیفیت بھی نہ رہی، وہ پھر سے نارمل ہو گئی۔

پیٹ پر سانپ کے ڈسنے کے نشان اب بھی موجود تھے، پہلے وہ دو ننھے گڑھے سے تھے جن کی رنگت نیلی سی تھی، اب وہ دونوں گڑھے بھر کر دانوں کی شکل اختیار کر گئے تھے اور سرخی مائل ہو گئے تھے۔

وہ اس معاملے کو باوجود کوشش کے سمجھ نہیں پائی تھی، سنہری سانپ کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس نے اسے ڈسا بھی تھا کہ پیٹ پر اس کی نشانی موجود تھی لیکن اُس ڈسنے کا اثر کسی خطرناک صورت میں نہیں نکلا تھا۔ اس نے اس معاملے کو اپنے تک محدود رکھا تھا کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، اگر یہ

بات کسی طرح کمال رائے کو معلوم ہو جاتی تو جانے اس پر کیا گزرتی......؟ آرزو میں اس کی جان تھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب وہ آرزو کو لے کر کراچی منتقل ہوا تھا تو اس نے آرزو کو سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ وہ کسی کو اپنی فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ نہ بتائے، اس نے اسے اپنا نام بھی بتانے کیلئے منع کر رکھا تھا پھر کچھ عرصے کے بعد صرف کمال بتانے کی اجازت دی۔

اس کی وجہ صاف تھی کہ ایک تو روشن گوٹھ میں کچھ پراسرار قوتیں آرزو کے پیچھے لگ گئی تھیں، وہ اسے اپنے ساتھ اُڑا لے جانا چاہتی تھیں پھر کنگن پور والوں سے دشمنی کا شاخسانہ بھی تھا اگرچہ راجہ سلیم صفحہ ہستی سے مٹ چکا تھا پھر بھی احتیاط لازمی تھی۔

اب ان واقعات کو دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا، کمال رائے کو آرزو کی طرف سے قدرے سکون مل گیا تھا، وہ خوش تھا کہ روشن گوٹھ سے اس کا منتقل ہونا بڑا مفید ثابت ہوا۔

آرزو اگرچہ پندرھویں سال میں لگی تھی لیکن اس نے قد و کاٹھ خوب نکالا تھا، وہ دیکھنے میں سولہ سترہ برس کی لگتی تھی، کمال رائے چاہتا تھا کہ کوئی اچھا سا بَر تلاش کر کے رکھے، وہ اس کی شادی جلدی کرنا چاہتا تھا، وہ اپنے آس پاس کے لڑکوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

ایک رات روشن گوٹھ سے نفیسہ بیگم کا فون آیا۔ بیگم کا فون آنا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا، وہ کمال رائے اور آرزو کی خیریت معلوم کرنے کیلئے فون کیا ہی کرتی تھی لیکن یہ فون قیامت کی خبر لایا۔ نفیسہ بیگم بڑے آرام سے فرما رہی تھیں۔

"بیٹا میں......آرزو کی بات پکی کر رہی ہوں......تم کل روشن گوٹھ آجاؤ۔"

"کیا......؟" کمال رائے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

یہ ایک بے آواز دھماکہ تھا، ایسا دھماکہ کہ جس نے کمال رائے کے جسم کی بجائے روح میں شگاف ڈال دیئے تھے۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماں کو اچانک ہوا کیا۔ آرزو کون سی اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اس کے رشتے آنے بند ہونے والے تھے۔ بے شک وہ سن بلوغ کو پہنچ چکی تھی لیکن ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی اس نے زندگی کی پندرھویں سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ پھر وہ اتنی حسین لڑکی تھی کہ راہ چلتے اس کے رشتے ملتے تھے۔ اسے رشتوں کی کیا کمی تھی۔

یہ ماں نے نہ جانے کہاں بات پکی کرنے کی ہامی بھر لی۔ اسے یقین تھا کہ آٹھ بھائیوں کی اولاد میں سے ہی کوئی لڑکا آرزو کے لئے منتخب کیا گیا ہوگا۔ ماں نے بھی حد کر دی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ لڑکی کی دادی تھیں، وہ اس کے لئے کسی لڑکے کا انتخاب کر سکتی تھیں لیکن وہ بھی تو آخر لڑکی کا باپ تھا اور ایسی لڑکی کا باپ جس کی وجہ سے اس نے اب تک دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اسے ماں

نے یکسر نظرانداز کر دیا تھا۔

کمال رائے نے فون پر زیادہ بات نہ کی۔ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''ماں، میں کل آ رہا ہوں۔ میرے آنے کا انتظار کریں۔ آرزو کا ہاتھ میں ذرا سوچ سمجھ کر کسی کے ہاتھ میں دوں گا۔''

نفیسہ بیگم کو کمال رائے کی یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ اس کا خیال تھا کہ کمال رائے بات پکی ہونے کا ذکر سن کر کھل اُٹھے گا۔ اپنی ماں کی اس دانش مندی پر داد دے گا لیکن یہاں تو داد دور کی بات تھی، اس نے تو یہ بھی نہ پوچھا کہ ماں لڑکے کا نام کیا ہے۔

جب وہ دوسرے دن روشن گوٹھ پہنچا تو وہ لڑکا حویلی میں آیا بیٹھا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ بھی تھے۔ کمال رائے نے بڑا صحیح اندازہ کیا تھا۔ وہ ساتویں ماموں کا آٹھواں بیٹا تھا...... عمر تو خیر اس کی ٹھیک تھی، وہ اکیس بائیس سال کا ہو گا...... باقی کچھ ٹھیک نہ تھا۔ لڑکے کو دیکھ کر اسے اپنی ماں کی عقل پر رونا آیا۔ لڑکا بمشکل میٹرک پاس تھا۔ سیاہ چمکتا ہوا رنگ...... پہلوانوں جیسا قد و کاٹھ...... بغل میں ریوالور، کندھے پر گولیوں کی پیٹی...... کلف لگے سفید کپڑے۔

کمال رائے اپنی ماں کو ڈرائنگ روم سے اپنے بیڈ روم میں لے آیا اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ماں، تم نے یہ لڑکا منتخب کیا ہے...... اپنی آرزو کے لئے...... ماں کیا وہ تمہاری پوتی نہیں؟''

''ارے تبھی تو اس کیلئے فتح محمد کو پسند کیا ہے۔ یہ بھائی فیض محمد کا سب سے لائق بیٹا ہے۔'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''ماں، ایم اے کئے ہوئے ہے؟'' کمال رائے کے لہجے میں طنز تھا۔

''ارے ایم اے پاس کیا کرنا ہے...... کون سی اس نے نوکری کرنی ہے۔ ارے زمینداری ہی تو کرنا ہے۔ اس کیلئے میٹرک پاس بھی بہت ہے۔'' نفیسہ بیگم نے اس کے طنز کی کوئی پرواہ نہ کی۔

''اور ماں شکل و صورت...... تم نے اپنی آرزو کو تو دیکھا ہو گا۔'' کمال رائے نے پھر وار کیا۔

''لے اپنی آرزو کے لئے بہت اچھا ہے...... اور پھر مرد کی شکل و صورت کب دیکھی جاتی ہے۔ زمیندار باپ کا زمیندار بیٹا ہے۔ چھ فٹ کا جوان ہے اور ہمیں کیا چاہئے۔''

''ماں، مجھے اس لنگور کو نہیں دینی اپنی بیٹی...... اور ماں اب ایک بات اور غور سے سن لو۔ تمہیں اب آرزو کا رشتہ ڈھونڈنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔'' کمال رائے کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

''ارے تو کیا زندگی بھر بٹھا کر رکھے گا اپنی بیٹی کو۔''

''ماں...... ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پندرھویں میں لگی ہے...... میں بھی لڑکیوں کی شادی جلدی

کرنے کے حق میں ہوں لیکن اب اتنی جلدی میں بھی نہیں ہوں کہ کسی لنگور کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑا دوں۔''

''لیکن بیٹا...... میں نے تو بھائی فیض محمد کو زبان دے دی ہے۔''

''ماں...... یہ تو تم نے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا۔'' کمال رائے تیز لہجے میں بولا۔ ''اب آپ اپنے بھائی سے کہہ دو کہ آرزو ابھی پڑھ رہی ہے...... میں اس کی شادی سات آٹھ سال سے پہلے نہیں کروں گا۔''

''اگر وہ اس بات پر بھی راضی ہو گئے تو......؟'' نفیسہ بیگم نے خدشہ ظاہر کیا۔

''پھر مجھے خودکشی کرنا ہو گی؟'' کمال رائے نے جھنجھلا کر کہا۔

''اچھا چل...... میں انہیں کسی طرح ٹالتی ہوں...... اب تو ان کے سامنے نہ پڑنا۔ بہتر یہ ہے کہ فوراً کراچی واپس چلا جا۔'' نفیسہ بیگم نے راہ دکھائی۔

''ٹھیک ہے ماں...... میں واپس جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر کمال رائے حویلی سے اس طرح بھاگا جیسے اس کے پیچھے ڈاکو لگے ہوں۔

پتہ نہیں نفیسہ بیگم نے اپنے بھائی فیض محمد کو کیا پٹی پڑھائی کہ وہ خاموشی سے اپنے بیٹے کو لے کر حویلی سے چلا گیا۔ وہ بات نہ نفیسہ بیگم نے کمال رائے کو بتائی اور نہ کمال رائے نے اپنی ماں سے پوچھی۔

☆......☆......☆

کمال رائے ایک باپ تھا اور ایک روشن خیال باپ تھا۔ آرزو میں اس کی جان تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیٹی کیلئے کیسا لڑکا ہونا چاہئے۔ وہ ایک آئیڈیل لڑکی تھی۔ خوابوں کی شہزادی...... وہ اس کیلئے بر بھی ایسا ہی تلاش کرنا چاہتا تھا۔ کوئی آئیڈیل لڑکا...... کوئی خوابوں کا شہزادہ۔

اس کی ماں نے رشتے کی بات چھیڑ کر اس چھپے گوشے کو اُجاگر کر دیا تھا۔ اس کا ذہن جاگ گیا تھا۔ کمال رائے اپنی حویلی میں جس کالے دیو کو دیکھ کر آیا تھا، ایسے کالے دیو روشن گوٹھ کے قرب و جوار میں بے شمار تھے۔ اس کے آٹھ ماموں تھے۔ ان کی اولادوں کی اولادیں تھیں۔ بے شمار لوگ تھے...... ماموؤں کی سسرالیں تھیں۔ ممانیوں کے اپنے خاندان تھے۔ آرزو چاند کی طرح روشن تھی۔ وہ کسی سے نہ چھپی تھی۔ اگرچہ وہ روشن گوٹھ بہت کم جاتی تھی اور یہ آنا جانا بھی آرزو نے ایک دو سال سے ہی شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے کمال رائے نے کراچی سے باہر والوں کو اپنی بیٹی کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی لیکن اب چڑھتے چاند کو سب دیکھ رہے تھے اور حویلیوں میں لاڈلے بہت تھے جو اپنی شکلیں آئینے میں نہیں دیکھتے تھے لیکن چاند مانگتے تھے۔

کمال رائے جانتا تھا کہ یہ سلسلہ اب شروع ہوا ہے تو بڑھے گا، بیری پر پہلا پتھر آیا ہے، آئندہ نہ جانے کتنے اور آئیں گے۔ وہ اپنی بیری کو ان پتھروں سے محفوظ کر دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اچھا لڑکا مل جائے تو وہ فوراً منگنی کا اعلان کر کے آنے والے فضول رشتوں کا راستہ روک دے۔

کمال رائے ایک سوشل شخص تھا۔ کراچی میں اس کے وسیع تعلقات تھے۔ ابھی تک اس نے اس نظر سے گھرانوں کو نہیں دیکھا تھا لیکن اب وہ جہاں جاتا آرزو کو اپنے سامنے رکھتا۔ لڑکے ایک سے ایک تھے لیکن جو مثالی پیکر اس کے اپنے ذہن میں موجود تھا اس سانچے میں ابھی تک کوئی فٹ نہیں بیٹھا تھا۔

پھر ایک دن جب آرزو نے اپنی سہیلی مہر النساء کے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو وہ بیٹھے بیٹھے چونک گیا۔ اپنی بیٹی کو مسکرا کر دیکھنے لگا۔

آرزو چوری بن گئی۔ بابا نے نہ جانے اس کی کیا چوری پکڑ لی..... لیکن وہ تو اپنے خیالوں میں ہی مگن تھا۔ مہر النساء کا نام سن کر اچانک رامش خیال اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔

''بابا..... کیوں مسکرا رہے ہیں۔'' آرزو نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خیر تو ہے۔''

''خیر ہی خیر ہے..... میری جان.....'' کمال رائے نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ''تم ایسا کرو..... ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ بتاؤ..... وہاں کتنی دیر لگاؤ گی۔''

''بابا..... اس کے ہاں پہلی بار جا رہی ہوں۔ وہ اتنی جلدی تو جان نہیں چھوڑے گی۔ دو ڈھائی گھنٹے تو ضرور لگیں گے۔'' آرزو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں کمال رائے منع نہ کر دے۔

''اچھا..... پھر ایسا کرتے ہیں..... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر آگے اپنے دوست کے پاس چلا جاؤں گا۔ پھر واپسی میں تمہیں اپنے ساتھ لے لوں گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔''

''بابا زندہ باد۔'' آرزو نے بچوں کی طرح تالیاں بجائیں۔ ''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، مہر النساء آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ وہ آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔''

آرزو نے پھر دیر نہ لگائی اس نے فوراً مہر النساء کو فون کر دیا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ وہ اپنے بابا کے ساتھ آ رہی ہے۔ یہ سن کر مہر النساء واقعی خوش ہو گئی۔

''آرزو۔ پھر رات کا کھانا کھا کر جانا۔''

''ارے نہیں، مہرو..... بابا، اتنی دیر نہیں رکیں گے۔ بس تم اچھی سی چائے پلا دینا۔''

''اچھا چلو..... تم آؤ تو۔''

''بابا کو اپنے کسی دوست کی طرف جانا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ پھر واپسی میں

مجھے پک کر لیں گے۔ میں نے ان سے دو ڈھائی گھنٹے کی اجازت لی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا..... دو ڈھائی گھنٹے میں تو ہم دو ڈھائی سو باتیں کر لیں گے۔ کیوں میری مہرو۔'' آرزو نے اسے ساری صورتحال سمجھائی۔

''آج تو مجھے ایک ہی بات کرنی ہے۔'' مہر النساء ہنس کر بولی۔

''اتنی لمبی بات ہے کہ وہ دو ڈھائی گھنٹے تک چلے گی۔'' آرزو نے پوچھا۔

''دو ڈھائی گھنٹے کیا..... ہو سکتا ہے ساری عمر چلے۔'' مہر النساء نے کہا۔

''تو تو اب شاعری پر اُتر آئی ہے۔ آخر ایک شاعر کی بہن ہے نا۔'' آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ شاعر صاحب..... گھر پر ہیں۔'' مہر النساء نے مطلع کیا۔

''کہیں تُو نے میرے آنے کا تو نہیں بتا دیا۔'' آرزو زور سے ہنسی۔

''بتایا تو نہیں۔ تُو کہے تو بتا دوں۔'' مہر النساء نے چھیڑا۔

''بتا دے..... مجھے کیا؟'' آرزو نے یہ بات ایک خاص لگاوٹ سے کہی۔

''بھائی، وہ آ رہی ہے۔'' مہر النساء نے چلا کر کہا۔

''او، بے وقوف کیا کر رہی ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔'' آرزو نے اسے ڈانٹ کر کہا۔

''بس ہمت دے گئی جواب۔'' مہر النساء بولی۔

''ہاں، بھئی..... ایسی بہادری میں کیا رکھا ہے۔ اچھا مہرو..... میں پھر آ رہی ہوں۔''

''جلدی آ..... ہم تیرا انتظار کر رہے ہیں۔'' مہر النساء کے لہجے میں شرارت تھی۔

آرزو نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھا اور واش روم میں گھس گئی۔ آج وہ خاص توجہ سے تیار ہوئی۔ جب وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو اسے ستارہ راہداری میں آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔

پہلے تو ستارہ نے بڑے انہماک سے آرزو کو دیکھا پھر مصنوعی انداز میں کھانسی، پھر بولی۔ ''ماشاء اللہ..... آج کیا ارادے ہیں؟''

''میں ذرا مہر النساء کے گھر جا رہی ہوں۔'' آرزو نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اور اس چائے کا کیا ہوگا؟'' ستارہ بولی۔

''تُو پی لے..... میں اب چائے مہرو کے ہاں جا کر پیئوں گی۔''

''اچھا۔'' ستارہ نے اسے ایک ٹک دیکھتے ہوئے کہا پھر بولی۔ ''بی بی، ذرا ایک منٹ رک جائیں۔ میں اماں کو بلا لاؤں۔''

''کیا مطلب!'' آرزو کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ ''سروری کیا کرے گی۔''

"آپ کے اوپر سے مرچیں اُتروا دوں...... اللہ، اتنی سوہنی لگ رہی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔"

"چل بے وقوف۔" آرزو یہ کہتی ہوئی کمال رائے کے کمرے کی طرف چل دی۔ "ستارہ، ٹیلیفون کا خیال رکھنا۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں بی بی۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "میں سب کے نام نوٹ کرلوں گی۔"

پھر وہ جلدی جلدی چلتی ہوئی کمال رائے کے کمرے میں پہنچی۔ اسے ڈر تھا کہ بابا تیار ہو کر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

کمال رائے واقعی اس کا منتظر تھا۔ جب اس نے آرزو کو دیکھا تو جانے کیوں...... یکا یک اس کے دل میں یہ احساس جاگا کہ آرزو بڑی ہوگئی ہے پھر اسے یوں لگا جیسے آرزو چند دنوں میں ہی بڑی ہوگئی ہے۔

"تمہاری سہیلی کے والد کیا کرتے ہیں۔" گاڑی چلاتے ہوئے کمال رائے نے پوچھا۔

"والد نہیں ہیں۔" آرزو نے بتایا۔

"اوہ۔" کمال رائے کو افسوس ہوا۔ "یہاں پھر گھر میں کون کون ہے۔"

"کوئی نہیں ہے۔ دونوں بھائی بہن اکیلے رہتے ہیں۔ ان کی امی بھی نہیں ہیں۔ اس گھر میں وہ اپنے ماموں کے ساتھ رہتے ہیں۔" آرزو نے کہا۔

"ماموں کیا کرتے ہیں؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بابا...... پتہ نہیں۔ اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی اس سے۔" آرزو نے بے نیازی سے کہا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بابا، مہرالنساء کے گھر والوں کے بارے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ وہ اپنے باپ کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ انہیں جتنا بتا دیا جاتا اس پر وہ قناعت کر لیتے تھے۔

پھر وہ اس موضوع کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں ماروی کا ذکر نکل آیا تو وہ اس کا ذکر لے بیٹھا۔ کمال رائے اکثر اس سے اس کی ماں کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ بے چاری آرزو کو تو اپنی ماں کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ اس نے تو اسے دیکھا تک نہ تھا۔ البتہ اس نے ماروی کی تصویریں ضرور دیکھی تھیں۔ ایک بہت بڑی تصویر کمال رائے کے کمرے میں لگی تھی۔ وہ اکثر اس تصویر کو کھڑے ہو کر دیکھتی رہتی تھی۔ اسے اپنی ماں کے بارے میں باتیں کرنے اور سننے کا بہت شوق تھا۔ زیادہ تر باتیں کمال رائے ہی کرتا تھا، اور یہ وہ باتیں تھیں جنہیں بے شمار مرتبہ سن

چکی تھی لیکن ان باتوں کو بار بار سن کر وہ بور نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنی ماں کی باتیں اس طرح سنتی تھی جیسے پہلی مرتبہ سن رہی ہو۔

یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار ماروی کا ذکر کرتا رہتا تھا تاکہ وہ اپنی ماں کو اچھی طرح جان لے اور وہ اپنی ماں کا ذکر سن سن کر اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ وہ کس طرح رہتی تھی، کیسے مسکراتی تھی، کس طرح اُٹھتی بیٹھتی تھی، کیا کھاتی اور کیا پہنتی تھی۔ اس کے مشاغل کیا تھے، دلچسپیاں کیا تھیں۔ وہ اتنا کچھ جان گئی تھی کہ اسے اپنی ماں آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آنے لگتی تھی۔

ماں کی باتیں کرتے کرتے راستے کا پتہ بھی نہ چلا۔ گلشن آ گیا۔ مہرالنساء نے بڑی تفصیل سے اپنے گھر کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ بہت آسانی سے اس کے گھر پر پہنچ گئے۔

کمال رائے نے گیٹ پر گاڑی کھڑی کر کے کال بیل بجائی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اصل میں مہرالنساء نے اوپر سے گاڑی رکتے دیکھ لی تھی۔ اس نے فوراً رامش خیال کو گیٹ پر بھیج دیا تھا۔

رامش خیال کو گیٹ پر دیکھ کر کمال رائے کو خوشی ہوئی۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "کیسے ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آیئے تشریف لایئے۔"

رامش خیال کو دیکھ کر آرزو گاڑی سے اُتر کر گیٹ کی طرف بڑھی۔

"بھئی میں تو مہرالنساء کی مہمان کو چھوڑنے آیا ہوں۔ مجھے اپنے دوست کے یہاں جانا ہے۔" کمال رائے نے کہا۔

"نہیں انکل...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" اتنے میں مہرالنساء بھی گیٹ پر پہنچ گئی۔ "اندر تو آئیں، پھر چلے جایئے گا۔"

"اچھا۔" کمال رائے نے مہرالنساء کی طرف دیکھ کر کہا۔

پھر وہ چاروں گھر میں داخل ہوئے۔ یہ ایک خاصا بڑا گھر تھا۔ خوبصورت بنا ہوا تھا۔ اوپر کا پورشن ان دونوں بہن بھائی کے پاس تھا۔ ان دونوں کو بڑی عزت اور مسرت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔

آرزو کے پاس مہرالنساء بیٹھ گئی اور رامش خیال، کمال رائے کے قریب بیٹھ گیا۔

"ابھی راستے میں آرزو سے بات ہو رہی تھی کہ آپ لوگ اپنے ماموں کے ساتھ رہتے ہیں۔" کمال رائے نے بات چھیڑی۔

"جی۔" رامش خیال نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کے والد کا انتقال کب ہوا؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"دس گیارہ سال ہو گئے ہوں گے۔"

"اور امی؟"

"وہ بابا جان سے بھی پہلے چلی گئی تھیں۔" رامش خیال نے بتایا۔

"آپ کے ماموں کیا کرتے ہیں؟"

"بزنس کرتے ہیں...... میں ان کے ساتھ ہوں۔ کنسٹرکشن کا کاروبار ہے۔"

"اچھا بھئی...... میں چلتا ہوں...... پھر آؤں گا۔ اطمینان سے بیٹھوں گا۔ آپ کے ماموں سے بھی ملوں گا۔" یہ کہہ کر کمال رائے کھڑا ہو گیا۔

"انکل چائے آ رہی ہے۔ دو منٹ اور ٹھہر جائیں۔" مہر النساء نے درخواست کی۔

"اچھا...... لیکن دو منٹ کا مطلب دو منٹ ہی ہونا چاہئے۔" کمال رائے پھر بیٹھ گیا۔

"آپ تشریف رکھئے...... میں دیکھتا ہوں، چائے کس مرحلے میں ہے۔" یہ کہہ کر رامش خیال ڈرائنگ روم سے نکل گیا اور پھر فوراً ہی واپس آ گیا اور بولا۔ "چائے بالکل تیار ہے...... آ رہی ہے۔"

دو تین منٹ کے بعد ایک ملازم لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ یہ ایک پُر تکلف چائے تھی۔

چائے پینے کے بعد کمال رائے نے اجازت چاہی۔ رامش خیال اسے گاڑی تک چھوڑنے گیا اور جب وہ واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ مہر النساء آرزو کو اپنے بیڈروم میں لے گئی تھی اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ رامش خیال کو اپنی بہن پر بہت غصہ آیا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھ گیا۔

مہر النساء کے کمرے میں ٹیلی ویژن نہ تھا۔ اسے ٹیلی ویژن دیکھنا ہوتا تو وہ لاؤنج میں بیٹھ کر دیکھ لیتی تھی۔

اس وقت انہیں ٹیلی ویژن کی ضرورت نہ تھی لہٰذا وہ دونوں کمرے میں بند محو گفتگو تھیں۔

"چل میری مہرو...... ہاں، اب کر بات...... کیا کرنے والی تھی۔" آرزو نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے...... آرزو دیکھ تو میری بہت اچھی دوست ہے...... میں تجھے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی۔" مہر النساء نے بات شروع کی۔ "اگر تجھے میری بات بری محسوس ہو تو فوراً کہہ دینا۔ میں تیری بات کا ذرا بھی برا نہیں مانوں گی۔"

"اچھا بات تو کر۔" آرزو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"بات یہ ہے کہ میرا بھائی تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب سے اس نے تجھے دیکھا ہے، تیرا دیوانہ ہو گیا ہے۔" مہر النساء نے اپنی بات واضح طور پر کہہ دی۔

یہ سن کر آرزو کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ مہر النساء کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کا ردعمل ہے۔

وہ کھسیانی سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ جب آرزو کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ پریشان ہو کر بولی۔ "آخر تجھے ہوا کیا؟ کیوں پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہی ہے۔"

"کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

"چل تُو اچھی طرح ہنس لے۔ جب تک میں نیچے ہو کر آتی ہوں۔" مہر النساء اُٹھتے ہوئے بولی۔

تب آرزو ہنستے ہنستے ایک دم رک گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولی۔ "یہ تو تُو نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔"

"تُو میرے بھائی رامش خیال سے شادی کرنا چاہتی ہے۔" مہر النساء اس کا غیر متوقع جواب سن کر بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ لہٰذا اس نے تصدیق چاہی۔

آرزو نے بڑے پیار سے اثبات میں گردن ہلائی اور زبان سے کچھ نہ بولی۔

"اوہ، میری آرزو۔" مہر النساء نے دیوانوں کی طرح خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔

"اوئے...... تیری نہیں۔" آرزو نے اس کے بازو پر چٹکی بھری۔ "کسی اور کی آرزو۔"

"اچھا، اچھا...... چل رامش بھائی کی آرزو سہی۔" مہر النساء مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ "تیرا جواب سن کر میرے سینے سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ میں اپنے بھائی کی چھوٹی بہن ضرور ہوں لیکن جو کچھ ہوں، میں ہی ہوں۔ جو محبت بھائی کیلئے میرے دل میں ہو سکتی ہے۔ وہ کسی اور کے دل میں نہیں ہو سکتی۔ میں ان کیلئے بہت پریشان تھی۔ اگرچہ تو نے ٹیلی فون پر بھائی کے بارے میں کافی بے تکلف گفتگو کی تھی لیکن میں اسے تیرا مذاق ہی سمجھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تُو بھی بھائی کے معاملے میں سنجیدہ ہو گئی ہے۔ خیر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ تیرے جواب نے میرے دل میں برف سی بھر دی ہے...... لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟" آرزو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایک ہی ملاقات میں تم دونوں ایک دوسرے پر مر مٹے...... نہ تم بھائی کے بارے میں کچھ جانتی ہو اور نہ بھائی تمہارے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں نے ایک دوسرے کو منتخب کر لیا۔"

"میری مہرو...... بعض اوقات جاننے کیلئے ایک لمحہ بھی بہت ہوتا ہے اور بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ صدیاں گزر جاتی ہیں ساتھ رہتے ہوئے، پھر بھی لوگ ایک دوسرے کو نہیں جان پاتے۔" آرزو نے مسکرا کر کہا۔

"ہائے...... یہ محبت بھی کیا چیز ہے...... بندے کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اِدھر میرا بھائی بھی اسی طرح کی باتیں کرنے لگا ہے اور اُدھر تیرا بھی یہی حال ہے کہ فلسفہ بول رہی ہے۔"

''ارے، ہم کیا جانیں...... محبت کیا ہے...... محبت کا مفہوم تو کوئی بابا سے پوچھے، جنہوں نے ممی کی خاطر اپنی بھرپور جوانی ان کی یاد میں بتا دی۔ مہرو، میرا بابا ایک آئیڈیل شخص ہے۔''

''آرزو ایک بات بتا...... کیا تو اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں نہیں کرتی۔'' مہرالنساء نے سوال کیا۔

''ہاں، شاید مہرو۔'' آرزو نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ یہ میں تکبر کی بات نہیں کر رہی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میں بہت حساس لڑکی ہوں، ذہین ہوں، میرا مشاہدہ بہت تیز ہے، میرا بچپن ایک غیر معمولی ماحول میں گزرا ہے۔ بچپن سے جوانی کا سفر بھی کوئی عام سا سفر نہیں...... آج بھی غیر معمولی حالات سے دوچار ہوں...... اور سچی بات یہ ہے کہ سب ہی مجھے میری بڑی بڑی باتوں پر ٹوکتے رہتے ہیں۔ میری دادی جان، مجھے دادی اماں کہہ کر پکارتی رہی ہیں۔ میرے بابا نے بھی کئی مرتبہ مجھے ٹوکا ہے۔ میری کوئی بات سن کر انہوں نے کہا ہے کہ ہماری آرزو کچھ زیادہ بڑی نہیں ہو گئی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں کیا کروں۔ میرا شعور پختہ ہو چکا ہے تو میں اب بچوں جیسی باتیں تو نہیں کروں گی نا۔''

''نہ تجھے بچہ بننے کی کیا ضرورت ہے...... تو دادی اماں بن...... بھلا تجھے کون روک سکتا ہے۔'' مہرالنساء نے اس کے ایک تھپڑ لگایا۔

''اوئے...... حد ادب...... دیکھتی نہیں ہے کہ اب معاملات کس نہج پر پہنچ گئے ہیں۔''

''معاملات کسی نہج پر پہنچ جائیں پر اتنا یاد رکھ کہ میں تجھ سے عمر میں بڑی ہوں۔'' مہرالنساء نے اپنا رعب جمایا۔

''لو بھئی...... یہ کیا بات ہوئی...... کل کوئی بھینس میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے اور کہے آرزو بی بی میں تم سے بہت بڑی ہوں، میرا ادب کرو، تو تیرا کیا خیال ہے کہ میں اس کے رعب میں آ جاؤں گی۔'' آرزو نے سنجیدہ فضا کو ایک دم شگفتہ کر دیا۔

''آرزو...... تیرا جواب نہیں...... اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔'' مہرالنساء نے جذباتی انداز میں کہا۔

''واہ، دادی اماں...... اتنی جلدی ہمارا اثر ہو گیا۔''

''ہاں اور کیا۔'' مہرالنساء نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آؤ، نیچے چلو...... تمہیں اپنی ممانی اور ان کے بچوں سے ملاؤں۔''

''ہاں چلو۔'' آرزو فوراً کھڑی ہو گئی۔

رامش خیال اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کے دروازے کے نزدیک قدموں کی

آواز گونجی تو اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے سے گزریں۔

آرزو نے ایک لمحے کے لئے گردن گھمائی۔ رامش ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنی گردن سیدھی کر لی۔

''مہرو۔'' جب وہ دونوں دروازہ کراس کر گئیں تو پیچھے سے آواز آئی۔

''جی بھائی۔'' مہرالنساء نے پلٹ کر اس کے کمرے میں جھانکا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' رامش خیال نے پوچھا۔

''بھائی نیچے جا رہی ہوں، ممانی سے ملانے۔''

''ارے...... انہیں پہلے ہمارا کمرہ تو دکھاؤ۔'' رامش خیال نے اتنے زور سے کہا کہ آرزو تک اس کی آواز پہنچ گئی۔

''میں لڑکوں کے کمرے میں نہیں جاتی۔ مجھے الرجی ہو جاتی ہے۔'' آرزو نے ہنس کر کہا۔

''سن لیا بھائی۔'' مہرالنساء شوخی سے بولی۔

''نہیں، میں نے نہیں سنا...... کیا کہہ رہی ہیں۔'' رامش خیال فوراً اپنے کمرے کے دروازے پر آ گیا۔

''آرزو...... اب بول۔'' مہرالنساء نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں نے کچھ نہیں کہا۔'' وہ صاف مکر گئی۔

''تو پھر آیئے نا...... کچھ دیر ہمارے کمرے میں بیٹھئے۔'' رامش خیال براہِ راست مخاطب ہوا۔

اس سے پہلے کہ آرزو کوئی جواب دیتی وہ جھٹ سے بولی۔ ''چل آرزو آ جا۔ بھائی کا کمرہ دیکھ لے۔''

''ناک پر ہاتھ رکھ کر جانا پڑے گا۔'' آرزو نے بہت آہستہ سے مہرالنساء کے کان میں کہا۔ اس کی یہ بات سن کر مہرالنساء کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' رامش خیال پریشان ہو کر اپنی بہن کو دیکھنے لگا۔

''کچھ نہیں بھائی۔'' مہرالنساء نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔ پھر آرزو سے مخاطب ہوئی۔

''آؤ، آرزو۔''

آرزو کمرے میں داخل ہوئی تو اسے خوشگوار حیرت ہوئی، رامش خیال کا کمرہ بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی تھی اور ہر شو پیس اس کے اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کر رہا تھا۔ رامش خیال کی طرح اس کا کمرہ بھی خوبصورت تھا۔ ایک طرف پوری دیوار میں شیلف بنا ہوا تھا اور اس میں بے شمار کتابیں بڑے قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ آرزو کو کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ کتابوں کا شیلف

دیکھ کر وہ سیدھی کتابوں کی طرف بڑھی۔

"آپ کو بھی شغف ہے کتابوں سے۔" رامش خیال اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔ "کیا پڑھتی ہیں۔"

"میں کھانے پکانے کی ترکیبیں پڑھتی ہوں۔" آرزو نے یہ بات اس قدر سنجیدگی سے کہی کہ رامش خیال اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔اور مہرالنساء کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہوگئی۔مہرالنساء نے اس کے قریب ہو کر زور سے بازو میں چٹکی لی اور بولی۔ "شرارتی باز آ جا۔"

یہ سن کر رامش خیال کو حوصلہ ہوا۔اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ورنہ وہ اس کا جواب سن کر پریشان ہوگیا تھا۔پھر رامش نے شیلف سے ایک کتاب نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔وہ کتاب دیکھنے لگی۔

وہ رومانوی افسانوں کا مجموعہ تھا......نام تھا "تم میری ہو۔"

کتاب کا نام پڑھ کر آرزو نے ترچھی نظر سے رامش خیال کو دیکھا۔بغیر کچھ کہے کتاب اس کے ہاتھ میں تھمائی اور پھر مہرالنساء کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل آئی۔ "آؤ، مہرو نیچے چلو۔"

☆......☆......☆

ایک مرحلہ بخیر وخوبی گزر گیا تھا۔

وہ دونوں ہی راضی تھے۔آرزو اور رامش دونوں ایک دوسرے کے لئے بے قرار تھے۔شادی کرنا چاہتے تھے لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہ تھا۔رامش خیال اپنے تایا کی لڑکی شکیلہ سے منسوب تھا۔منگنی ہو چکی تھی اور اس منگنی کا ٹوٹنا آسان نہ تھا۔

پھر ابھی آرزو ہی تیار ہوئی تھی۔ابھی کمال رائے کے راضی ہونے کا بھی مسئلہ تھا۔مہرالنساء کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ممانی ایک ہمدرد قسم کی خاتون تھیں۔انہوں نے اپنے شوہر کے بھانجے بھانجی کو بڑے مان سے رکھا تھا۔ماموں کے بچے بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔مہرالنساء نے سوچا پہلے اس مسئلے پر ممانی سے بات کرے۔

ممانی سے جب مہرالنساء نے بات کی تو ثمینہ ممانی ایک دم چونک اُٹھیں۔ "مہرو، یہ تُو کیا کہہ رہی ہے۔"

"بھائی آرزو سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ رہی ہوں میں۔" مہرالنساء نے اپنی بات دہرائی۔

"یہ ناممکن ہے......تمہارے تایا کے کانوں میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ رامش اس رشتے سے انکاری ہے اور وہ کہیں اور شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔"

"جانتی ہوں ممانی......اسی لئے تو آپ سے مشورہ کر رہی ہوں۔"

"رامش کو آرزو کا خیال چھوڑنا ہوگا۔" ممانی نے مشورہ دیا۔

"یہ ناممکن ہے۔" اس مشورے پر عمل مشکل تھا۔

"یہ ناممکن ہے تو پھر اپنے ماموں سے بات کرو۔" ممانی ثمینہ سے اپنی جان بچانے کیلئے گیند ماموں کے کورٹ میں اُچھال دی۔

"ممانی میں ماموں سے بات نہیں کر سکتی۔آپ بات کر کے دیکھیں۔" مہرالنساء نے گیند درمیان میں پکڑ لی۔

"اچھا......میں کوشش کروں گی بات کرنے کی۔" ممانی ثمینہ نے تسلی دی۔

ممانی ثمینہ نے رات کو جب یہ بات چھیڑی تو ان کا ردعمل بھی شدید تھا۔

"یہ کیا بکواس ہے۔میں بھائی راجہ وقار کو کیا جواب دوں گا۔کہیں اس طرح منگنیاں ٹوٹتی ہیں۔ثمینہ تم جانتی نہیں ہو۔قیامت آ جائے گی۔"

"میں تو جانتی ہوں......اپنے بھانجے کو سمجھاؤ۔" ممانی ثمینہ بولیں۔

رامش ان کے ساتھ ہی دفتر میں ہوتا تھا۔وہ اس کنسٹرکشن کمپنی میں ماموں کا پارٹنر تھا۔انہوں نے صبح ہی صبح اسے اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔رامش خیال کو اس بات کا خیال بھی نہیں تھا کہ ماموں رشید اس سے کیا بات کرنے والے ہیں،اس نے سمجھا کہ کسی کام کے سلسلے میں بلایا ہوگا۔

رامش خیال کے بیٹھتے ہی ماموں رشید بولے۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"ماموں جان کیا سن رہے ہیں؟" رامش خیال نے حیران ہو کر پوچھا۔

ماموں رشید نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔انہوں نے ایک نئی بات شروع کر دی۔ "میں کل کنگن پور جا رہا ہوں، بھائی راجہ وقار سے تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنی ہے۔"

"ماموں جان...... میں یہ شادی نہیں کروں گا۔" رامش خیال نے پرزور لہجے میں کہا۔ "اور ماموں جان ایک بات اور آپ کو بتا دوں۔ مجھے کسی بھیانک انجام سے ڈرانے کی کوشش مت کیجئے گا۔میں نے جو ارادہ دل میں باندھ لیا ہے اسے ہر قیمت پر پورا کر کے رہوں گا۔"

"آرزو کا باپ راضی ہے اس شادی پر۔" ماموں رشید نے پینترا بدلا۔

"مجھے نہیں معلوم......لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ لڑکی راضی ہے۔" رامش خیال نے بتایا۔

"بس تو پھر کیا ہے۔میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" ماموں نے اسے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ماموں جان......لیکن مسئلہ یہ ہے کہ رشتہ کوئی گھر کا بڑا ہی ڈالتا ہے۔"

"ٹھیک ہے رشتہ میں ڈال دوں گا لیکن لڑکی کے باپ کو یہ ضرور بتاؤں گا کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔"

"پھر تو وہ فوراً انکار کر دیں گے۔" رامش خیال نے کہا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو کہ میں اس بات کو چھپا کر رکھوں۔ لڑکی والوں کو دھوکا دوں۔"

"ماموں جان...... آپ جانتے ہیں کہ نہ میری ماں ہے اور نہ باپ...... آپ ہی میری ماں ہیں اور آپ ہی میرے باپ ...... میں آپ کی اکلوتی بہن کی نشانی ہوں۔ اگر آپ بھی میری حمایت نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا۔ ماموں جان جواب دیجئے۔"

"زیادہ فلمی ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے۔" ماموں رشید نے تیور بدل کر کہا۔

"اچھا...... ماموں جان...... پھر میں خود ہی کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ گیا اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔

"رامش!" اچانک انہوں نے آواز دی۔

"جی۔ ماموں جان۔" وہ رک گیا۔

"آرزو کے بابا سے کل شام کا کوئی وقت لے لو۔ ان سے ملنے چلیں گے۔" انہوں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ہیں...... ماموں جان...... کیا فرمایا آپ نے۔" رامش خیال کو بالکل توقع نہ تھی کہ ماموں جان ایسی بات کہیں گے۔

"کل ہم لڑکی کے گھر چلیں گے...... جو ہوگا...... وہ دیکھا جائے گا۔" ماموں جان نے سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

"ماموں جان زندہ باد۔" رامش خیال پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ "اب معلوم ہوا کہ میرا بھی کوئی ہے۔"

"بیٹا! ویسے تم نے بڑے پرخطر راستے کا انتخاب کرلیا ہے۔ اللہ مالک ہے۔" ماموں رشید نے کہا۔ "دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

"ماموں جان ...... کچھ حاصل کرنے کیلئے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔" رامش خیال پرعزم انداز میں بولا۔ "ماموں جان آج شام کا وقت لے لوں۔"

"ہاں...... لے لو۔" ماموں رشید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ٹائم لینا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

رامش خیال نے دفتر ہی سے فون کیا۔ اتفاق سے کمال رائے نے خود فون اُٹھایا۔ رامش خیال نے اسے بتایا کہ وہ اپنے ماموں کو لے کر ملاقات کیلئے آنا چاہتا ہے۔ کمال رائے کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا

تھا۔ اس نے شام کی ملاقات پر فوراً ہی اوکے کر دیا۔

فون رکھنے کے بعد اس نے آرزو کو بلایا۔ وہ ابھی کالج سے آئی تھی۔ ابھی ڈریس بھی تبدیل نہ کیا تھا۔ باپ کی طلبی پر وہ فوراً ہی اس کے کمرے میں آ گئی۔

"جی بابا...... خیر ہے۔"

"بھئی، وہ رامش اپنے ماموں کو لے کر آ رہا ہے آج شام۔" کمال رائے نے اسے مطلع کیا۔

"اچھا بابا۔" آرزو نے اندر ہی اندر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "کوئی خاص معاملہ ہے۔"

"اب وہ آئیں گے تو پتہ چلے گا۔ ابھی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" کمال رائے نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

رامش خیال کے اپنے ماموں کے ساتھ آنے کی خبر نے اسے لاشعوری طور پر خوشی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر فوراً مہر النساء کو فون کیا۔

"اری، یہ کیا چکر ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" مہر النساء کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"تمہارے بھائی صاحب، اپنے ماموں کو لے کر آ رہے ہیں۔ بابا سے فون پر شام کا ٹائم لیا ہے۔ آخر معاملہ کیا ہے کچھ تو بتا۔" آرزو نے پوچھا۔

"آرزو اس کا مطلب ہے کہ دفتر میں کوئی بات ہوئی ہے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں بھائی کو فون کر کے پتہ کرتی ہوں۔ ویسے اتنا اندازہ تو مجھے ہے کہ وہ اگر آ رہے ہیں تو کیوں آ رہے ہوں گے۔"

"ہاں...... کیوں؟" آرزو نے ٹہلتے ہوئے کہا۔

"تجھے مانگنے کیلئے۔" مہر النساء نے صاف لہجے میں کہا۔

"ہائے...... میں مر جاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے فوراً سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

اس شام بڑا غضب ہوا۔

ماموں رشید نے بطور تمہید جو بات کہی اس نے کمال رائے کی روح میں سناٹا اُتار دیا۔ رامش خیال کو اس نے اپنے طور پر پسند کر لیا تھا۔ وہ رامش کے گھر گیا بھی اسی لئے تھا کہ ذرا گھر بار دیکھ لے۔ اس دن اس کے ماموں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کہیں نکلے ہوئے تھے۔ کمال رائے سوچ ہی رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح آگے بڑھائے۔ وہ جلد از جلد آرزو کو کسی سے منسوب کر دینا چاہتا تھا تاکہ اس کی ماں اور سارے ماموں ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں۔ شادی وہ ابھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ آرزو بی اے کر لے تو پھر اس کی شادی کر دے گا۔

اس کی خواہش کے مطابق بات خود بخود آگے بڑھ گئی تھی۔ رامش اپنے ماموں کو لے کر آ گیا تھا اور ماموں نے رسمی علیک سلیک کے بعد رامش خیال کے ماں باپ کا پس منظر بتانے کے لئے اپنی بات کا آغاز کیا۔

''کمال رائے صاحب! میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ پہلے میں چاہوں گا کہ رامش خیال کے والدین کے پس منظر سے آگاہ کر دوں۔ اس کی فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤں۔ اس کے بعد اپنے مقصد پر آؤں اور آپ سے استدعا کروں گا۔'' ماموں رشید نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''رامش خیال کے والد اور میرے بہنوئی کے دادا ایک مشہور شخصیت تھے۔ ان کا نام راجہ سلیم تھا۔ وہ کنگن پور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ رامش کی والدہ یعنی میری بہن ارجمند کو اغوا کر کے قتل کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد راجہ نسیم کو اغوا کر کے قتل کیا گیا۔ اصل میں رامش کے دادا راجہ سلیم کی روشن گوٹھ کے روشن رائے سے دشمنی ہو گئی تھی۔ اس کے والدین کا قتل روشن رائے نے کروایا......''

اس کے بعد ماموں رشید جانے اور کیا کیا کہتے رہے لیکن ان چند جملوں نے کمال رائے کی روح میں سناٹا اتار دیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ ساعت ختم ہو گئی ہے۔ وہ ماموں رشید کے ہونٹ تو ہلتے دیکھ رہا تھا لیکن اسے سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ دل پر آری سی چل رہی تھی۔ جن عذابوں سے بچ کر وہ کراچی آیا تھا، وہی عذاب اس کی بیٹی کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

اس کا مطلب ہے کہ رامش راجہ سلیم کا پوتا ہے۔ اس راجہ سلیم کا جس نے اس کی ماروی کو قتل کروا دیا تھا اور پھر وہ اس کی جان کے درپے ہو گیا تھا۔ وہ تو اللہ نے اس کی زندگی بچائی تھی کہ راجہ سلیم اپنے بندے کے ہاتھوں غلطی سے مارا گیا تھا۔ ورنہ آج کمال رائے کا وجود نہ ہوتا۔

اس کی ماروی کے قاتل راجہ سلیم کا پوتا، آج اس کے سامنے سوالی بنا بیٹھا تھا۔

ہائے کیا قیامت کی شام تھی۔

کمال رائے کے حواس ایک دم منتشر ہو گئے تھے لیکن یہ وقت خود کو سنبھالنے کا تھا۔ وہ اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ماموں رشید سارا پس منظر بیان کرنے کے بعد اب عرض مدعا پر آ چکے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''کمال صاحب...... میں چاہتا ہوں کہ آپ رامش کو اپنا بیٹا بنا لیں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔''

''جی۔'' کمال رائے نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''مجھے کچھ وقت دیں۔ میں آپ کو سوچ کر جواب دے دوں گا۔''

''بالکل، بالکل...... آپ آرام سے غور کریں...... لیکن یہ غور رامش کے حق میں ہو تو بہت اچھا ہوگا۔'' یہ کہہ کر ماموں رشید اُٹھ گئے۔

کمال رائے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے انہیں رخصت کر دیا۔

☆......☆......☆

جب ماموں رشید اور رامش خیال گلشن پہنچے اور اپنے گھر کی سڑک کی جانب مڑے تو انہیں دور ہی سے گھر کے گیٹ پر ایک پجیرو نظر آئی۔

''ارے...... مارے گئے۔'' رامش خیال ایک دم بوکھلا اُٹھا۔

''کیا ہوا؟'' ماموں رشید اپنے کسی خیال میں تھے۔ ان کی نظر ابھی پجیرو پر نہیں پڑی تھی۔

''وہ...... تایا۔'' رامش خیال نے پریشان ہو کر ماموں رشید کو دیکھا۔

تب ماموں رشید نے سامنے نگاہ کی تو انہیں اپنے گھر کے گیٹ پر پجیرو کھڑی دکھائی دی۔

''رامش...... یہ تو سر منڈاتے ہی اولے پڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔'' وہ بولے۔

''یہ اچانک آ کس طرح گئے۔ یہ تو اطلاع کر کے آتے ہیں۔'' رامش خیال نے گاڑی روکی۔

''یار، یہ من موجی آدمی ہیں۔ انہیں اپنے ہونے والے داماد کی یاد آ گئی ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔'' ماموں رشید نے گاڑی سے اُترتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا۔

''ماموں...... کچھ خدا کا خوف کریں۔'' رامش خیال گھبرا کر بولا۔

''میں تو خدا کا خوف کر لوں گا۔ مگر راجہ وقار سے تم خوفِ خدا کی توقع مت رکھنا۔''

''یہ اس وقت آئے کیوں ہیں؟'' رامش خیال نے گاڑی ایک طرف لگا کر لاک کی۔

''انہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ ہم ان کی بیٹی کا مستقبل تاریک کرنے کی کوشش میں ہیں۔''

''ماموں...... انہیں اس بات کی بھنک بھی نہ پڑے۔'' رامش خیال نے کال بیل دباتے ہوئے کہا۔

''کوشش کروں گا...... ویسے تم جانتے ہو کہ میں خاصا جذباتی آدمی ہوں۔'' ماموں نے ہنس کر کہا۔

گیٹ میں داخل ہو کر رامش خیال نے اوپر کا رخ کیا۔ اس نے سوچا کہ تایا کے سامنے فوراً جانے سے احتراز کرنا چاہئے لیکن ماموں رشید تو ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ راجہ وقار آخر ان کا مہمان تھا۔ ماموں احتیاطی تدابیر پر غور کرتے ہوئے ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم

کے دروازے پر انہیں دو مسلح بندے دکھائی دیئے۔ یہ راجہ وقار کے گارڈ تھے۔ انہوں نے ماموں رشید کو دیکھا تو مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔

ماموں رشید انہیں سلام کا جواب دیتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو انہیں اپنی بیوی اور مہرالنساء محوِ گفتگو دکھائی دی۔ ان کے سامنے ہی راجہ وقار بیٹھا تھا اور کسی بات پر اپنا بے ہنگم منہ کھولے ہنس رہا تھا۔ ماموں رشید کو دیکھتے ہی اس نے اپنا قہقہہ روکا اور ان سے مصافحہ کرنے کیلئے کھڑا ہوگیا۔

''کیسے ہو رشید۔'' راجہ وقار نے ہنس کر خوشی سے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بھائی..... آپ کب آئے؟''

''ابھی کوئی آدھ گھنٹہ ہوا ہے۔ تم کہیں سیر وغیرہ کو نکلے تھے کیا؟''

''اوہ نہیں بھائی..... میں ذرا بزنس کے سلسلے میں ایک بندے سے ملنے گیا تھا۔'' ماموں رشید نے اسے بتایا۔

ماموں رشید کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ثمینہ اور مہرو اُٹھ کر جانے لگیں تو راجہ وقار ثمینہ کی طرف متوجہ ہوگیا اور بولا۔ ''ارے ثمینہ تم کہاں جا رہی ہو؟''

''بھائی آپ بیٹھیں..... ان سے باتیں کریں۔ میں ذرا آپ کے کھانے کا بندوبست کروں۔'' وہ بولی۔

''ارے نہیں ثمینہ..... میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی کہ آپ ابھی آئے اور ابھی چلے جائیں۔''

''بھئی میں صبح کا آیا ہوا ہوں۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں وکیل سے مشورہ کرنا تھا۔ پھر ایک دو کام اور بھی تھے، انہیں نمٹا کر سوچا کہ تم لوگوں سے ملتا چلوں۔ شکیلہ کی ماں نے بھی تائید کی تھی کہ ملے بغیر نہ آؤں۔ سو چلا آیا۔ رات تک کنگن پور پہنچنا ضروری ہے۔ کچھ لوگوں کو شکار پر بلایا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ رامش راجہ کہاں ہے بھئی اسے کچھ بزنس مزنس کی سمجھ آئی ہے کہ نہیں..... یا اسے واپس کنگن پور لے جاؤں۔ شکیلہ کی ماں تو اس کے شہر میں رہنے کے حق میں نہیں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کنگن پور آئے اور اپنی زمینیں سنبھالے۔ پر میں زور زبردستی نہیں چاہتا۔ اگر شہر میں رہ کر دو چار پیسے کمانے کے لائق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے وہ ہے کہاں؟ سنا تھا کہ تمہارے ساتھ ہی گیا تھا۔''

''جی بھائی جی..... میرے ساتھ ہی گیا تھا۔ اوپر کپڑے بدلنے گیا ہے..... آتا ہوگا۔'' انہوں نے بہانہ تراشا۔

''اوہ..... اچھا اچھا..... بھئی شہر والوں کو کپڑے بدلنے سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ گھر کے کپڑے اور..... باہر جانے کے کپڑے اور..... بھئی ہم تو جیسے بیٹھے ہوتے ہیں ویسے ہی چل دیتے ہیں۔'' راجہ

وقار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب تم نے بھی کپڑے بدلنے ہوں گے؟''

''ہاں بھائی جی..... بدلنے تو ہیں..... پینٹ میں آدمی ایزی نہیں رہتا۔''

''السلام علیکم تایا ابو۔'' رامش خیال نے آتے ہی زوردار سلام کیا اور پھر سر جھکا کر ان کے آگے کھڑا ہوگیا۔

راجہ وقار نے بیٹھے بیٹھے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور خوش ہو کر بولا۔ ''جیتے رہو، بیٹا خوش رہو۔''

''تایا جی..... حویلی میں تو سب خیر ہے۔''

''ہاں بیٹا..... سب خیر ہے..... پر تیری تائی تجھے بڑا یاد کرتی تھی۔ اس نے ہی مجھے ادھر بھیجا ہے۔'' راجہ وقار نے اسے بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا..... ذرا جلدی جلدی حویلی کا چکر لگا لیا کرو۔''

''اچھا..... تایا ابو..... میں موقع ملتے ہی آؤں گا۔''

راجہ وقار تو فوراً ہی واپس چلا جانا چاہتا تھا لیکن ثمینہ نے اسے بغیر کھانا کھائے نہ جانے دیا۔ جب وہ کھانا کھا کر جانے کیلئے تیار ہوا تو اس نے ماموں رشید سے علیحدگی میں بات کی۔

''بھئی بات یہ ہے کہ شکیلہ کی ماں، شکیلہ کی جلد رخصتی چاہتی ہے۔ ابھی تک تو رامش پڑھ رہا تھا اس لئے میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی لیکن اب تو وہ پڑھ لکھ کر بزنس میں آ گیا ہے۔ اب شادی میں بھلا کیا رکاوٹ ہے..... میں تمہیں اس کا سرپرست سمجھتا ہوں۔ میرا بھائی زندہ ہوتا تو یہ بات اس سے کرتا مگر اب تو تم ہی سے کرنا ہوگی۔ تم ذرا رامش سے بات کر کے بتاؤ کہ وہ کب شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں آخر اور کب تک اپنی بیٹی کو بٹھا کے رکھوں۔'' راجہ وقار آخری جملہ کہتے کہتے خاصا سنجیدہ ہوگیا۔

ماموں رشید، راجہ وقار کی گمبھیرتا دیکھ کر اندر ہی اندر پریشان ہونے لگے۔ اگر درمیان میں رامش کی پسند کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کھڑے کھڑے شادی کی تاریخ دے دیتے لیکن یہ تو سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ وہ آج ہی شام کو رامش کا رشتہ لے کر گئے تھے اور آج ہی شام راجہ وقار اس کی شادی کی بات لے بیٹھا تھا۔ وہ جلد از جلد رخصتی چاہتا تھا۔

''اچھا بھائی میں اس سے بات کروں گا۔'' ماموں رشید نے پہلے تو تسلی دی پھر بولے۔ ''ویسے وہ اپنا کاروبار کرنے کے چکر میں ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ کنگن پور کی زمینیں بیچ کر بڑے پیمانے پر کنسٹرکشن کا کاروبار کرے۔ وہ کسی بڑے پروجیکٹ پر کام کرنا چاہتا ہے۔''

''ارے نہیں، رشید..... اسے منع کرنا زمینیں ہرگز نہ بیچے۔ تھوڑا بہت سرمایہ چاہئے تو وہ میں دے دوں گا۔ اس سے کہو کہ یہاں چھوٹا موٹا کاروبار ہی رکھے۔ آخر لوٹ کر اس نے زمینوں پر ہی جانا

ہے۔ یہاں شہر میں کیا رکھا ہے۔ یہاں تو ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے۔ میرا تو یہاں آ کر دَم گھٹنے لگتا ہے۔ راجہ وقار نے برا سا منہ بنا کر کہا اور پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر آ گیا۔

ماموں رشید اور رامش خیال نے اسے گیٹ تک چھوڑا۔

جاتے جاتے راجہ وقار نے ماموں رشید کو تاکید کی۔ ''رشید مجھے بات کر کے جلدی بتانا۔ اچھا...... پھر میں دو تین دن میں فون کروں گا۔''

''ٹھیک ہے بھائی جی۔'' ماموں رشید نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

جب پجیرو گلی کا موڑ مڑ کر غائب ہوگئی تو رامش خیال پریشان ہوکر ماموں سے مخاطب ہوا۔ ''کس سے کیا بات کرنی ہے؟''

''رامش صاحب...... آپ سے شادی کی بات کرنی ہے۔ آپ کے تایا ابو شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ اب وہ آپ کو کوئی مہلت دینے کیلئے تیار نہیں۔'' ماموں رشید نے اسے چھیڑا۔

''ماموں ڈرائیں نہیں۔'' وہ خوفزدہ ہوگیا۔

''تم اپنے تایا ابو کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر نہیں ڈرتے تو اب کس چیز سے ڈرو گے۔'' وہ ہنسے۔

''ماموں صحیح بتائیں نا...... آخر بات کیا ہے۔'' وہ الجھ گیا۔

''بات یہی ہے جو ابھی میں نے بتائی۔ وہ اپنی بیٹی شکیلہ کی رخصتی چاہتے ہیں۔''

''تو کر دیں...... اپنی بیٹی کو رخصت، میں نے روکا ہے کیا؟''

''ٹھیک ہے...... میں پھر کل انہیں فون پر مطلع کئے دیتا ہوں کہ رامش راضی ہے۔ بولیں ہم کب بارات لائیں۔''

''ماموں، میں خودکشی کرلوں گا۔''

''بیٹا...... خودکشی بزدل لوگ کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھانجا بزدل ہرگز نہیں۔''

''پھر ماموں، میں اس رشتے سے انکار کردوں؟''

''ابھی تھوڑا انتظار کرو، آرزو کا رشتہ تو اد کے ہو جائے۔''

''ماموں، وہ رشتہ منظور ہو یا نامنظور...... لیکن اب میں نے شکیلہ سے شادی ہرگز نہیں کرنی۔''

''اچھا...... ساری بات گیٹ پر کھڑے ہوکر ہی طے کرلو گے...... چلو اندر چلو...... سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔'' ماموں نے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

سوچ میں تو اب کمال رائے پڑ گیا تھا۔

رامش خیال اسے پسند آ گیا تھا۔ اس رشتے کو وہ آنکھ بند کر کے منظور کرنے کے موڈ میں تھا لیکن

وہاں تو بات ہی کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔

رامش خیال اس شخص کا پوتا تھا جس نے اس کی ماروی کو زندگی سے محروم کیا تھا۔ ایسے قاتل گھرانے میں وہ اپنی بیٹی کیسے بیاہ دے۔ وہ آخر کیا کرے؟ کس سے مشورہ کرے؟ رامش ختم مزاج آدمی نہ تھا، ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اس میں رامش خیال کا کیا قصور ہے۔ اسے اپنے دادا کے جرم کا ذمہ دار کس طرح ٹھہرایا جائے۔ آخر اس کا اپنا باپ بھی تو قاتل تھا۔ اسے یاد آیا کہ رامش کے ماں باپ کو روشن رائے نے ہی قتل کروایا تھا۔ ایک طرف یہ خدشہ بھی تھا کہ جب رامش خیال کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے ماں باپ کو کمال رائے کے باپ نے قتل کروایا تھا تو اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ وہ کس طرح ایسی پوتی کو قبول کرے گا جس کا دادا اس کے والدین کا قاتل تھا۔ اب معاملہ یکطرفہ نہیں دوطرفہ تھا۔ ابھی تو اسے ہی رامش خیال کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ جب یہ راز فاش ہوگا کہ کمال رائے کا باپ کون ہے...... تو اس وقت کیا ہوگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح سلجھائے۔ ایسے لڑکے کو وہ کسی طرح ہاتھ سے نکلنے دینے نہیں چاہتا تھا۔

اس موضوع پر سوچتے ہوئے کمال رائے کو کئی دن ہو گئے تھے۔ وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا۔

اُدھر مہرو کے فون پر فون آتے چلے جا رہے تھے۔

آرزو اِدھر سے ریسیور اُٹھاتی تو اُدھر سے ایک ہی سوال کیا جاتا۔ ''اری، کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' آرزو ایک ہی جواب دیتی۔

''تمہارے بابا...... آخر کیا چاہ رہے ہیں۔'' پھر سوال ہوتا۔

''میں کیا جانوں...... ابھی تو انہوں نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ میرا کوئی رشتہ زیرِ غور ہے۔'' جواب ملتا۔

''تیرا کیا خیال ہے۔ وہ اس رشتے پر تجھ سے بات کریں گے؟'' پوچھا جاتا۔

''ہاں تو تُو نے میرے بابا کو کیا سمجھا ہے۔ وہ زمیندار ضرور ہیں اور ساتھ میں باپ بھی ہیں لیکن وہ نہ تو روایتی زمیندار ہیں اور نہ ہی اَنا پرست باپ...... میرے بابا، میری شادی مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اگر میں اس رشتے سے انکار کردوں تو وہ ہرگز اصرار نہیں کریں گے۔ ایسے ہیں میرے بابا۔'' جواب دیا جاتا۔

''بابا تو تیرے زبردست ہیں لیکن ابھی تک انہوں نے تجھ سے بات کیوں نہیں کی؟'' پھر سوال اُٹھتا۔

''میں خود حیران ہوں...... میرا خیال ہے کہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔''

"کیسی گڑبڑ؟" مہرو پوچھتی۔

"اب یہ تو مجھے نہیں معلوم...... لیکن ان کی خاموشی یہی بتا رہی ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔" مہرو کہتی۔ "دیکھ جیسے ہی کوئی بات ہو، مجھے بتانا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

لیکن بات کوئی سامنے نہیں آ رہی تھی اور مہرو کے صبح و شام فون چلے آ رہے تھے۔

"اری...... کچھ ہوا...... اری کوئی خبر ہے۔"

اب وہ اسے کیا خبر سناتی...... اس کے پاس کوئی خبر ہوتی تو وہ کچھ کہتی۔

اِدھر مہرو، آرزو کو فون کر رہی تھی تو اُدھر راجہ وقار نے ماموں رشید کا قافیہ تنگ کیا ہوا تھا۔ وہ کئی روز سے فون کر رہا تھا۔ فون پر علیک سلیک کے بعد اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا۔

"ہاں بھئی...... رامش سے ہوئی بات؟"

ماموں رشید کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ راجہ وقار کو کن الفاظ میں کیا کہیں...... وہ روز ہی کوئی بہانہ تلاش کر اپنی جان بچا جاتے تھے لیکن آخر وہ کب تک بہانے بناتے...... ایک دن تو انہیں جواب دینا ہی تھا۔

جب راجہ وقار نے محسوس کیا کہ فون پر صاف جواب نہیں مل رہا ہے تو وہ ایک دن خود ہی کراچی آ گیا۔

ماموں رشید اور رامش خیال دونوں ہی راجہ وقار کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے اور راجہ وقار باری باری دونوں کو گھور رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی خاموشی سے یہ تو سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ معاملہ فیصلہ کن حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ رامش خیال اپنا بزنس جمانے کی خاطر سال دو سال کی مہلت مانگے گا۔ وہ سوچ کر آیا تھا کہ ہرگز اسے مہلت نہیں دے گا۔

"ہاں...... بھئی...... بولو۔" راجہ وقار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس مرتبہ اپنی نظریں رامش خیال پر گاڑ دیں۔

تب رامش خیال نے اپنی جھکی ہوئی گردن اُٹھائی۔ ایک نظر اپنے ماموں کو دیکھا۔ ماموں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ جو کہنا ہے کہہ دو...... دیکھا جائے گا۔

"تایا ابو...... بات یہ ہے کہ......" اس نے بات شروع کی لیکن زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ رک گیا۔

"دیکھ بھئی رامش...... تجھے اگر مہلت چاہیے تو میری بات کان کھول کر سن لے۔ اب میں کوئی مہلت دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ میں اگلے مہینے ہر قیمت پر شکیلہ کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔" راجہ وقار نے کسی قدر غصیلے انداز میں کہا۔

"تایا ابو...... بات یہ ہے کہ میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"دیکھ بھئی رامش...... میں مڈل فیل بندہ ہوں۔ یہ معذرت وازرت اپنی سمجھ سے باہر ہے جو بات کہنی ہے، وہ کھل کر کہو۔" راجہ وقار پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں شکیلہ سے شادی نہیں کر سکوں گا۔" رامش خیال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیا کہا۔" راجہ وقار ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ رامش خیال اس طرح کی بات بھی اپنے منہ سے نکال سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے تصدیق چاہتے ہوئے اس کی بات دہرائی۔ "تُو شکیلہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ یہی کہا ہے نا تو نے۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"معذرت کو چھوڑ...... پہلے بتا، یہی کہا ہے نا تُو نے کہ تُو شکیلہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہاں جی...... وہ دیکھیں تایا......" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

"اوئے بھاڑ میں گیا تایا ابو۔" راجہ وقار ایک دم غصے سے پھنکارا۔ "تُو نے یہ بات کیا سوچ کر کہی ہے۔ کیا تو اس فضول بات کا انجام نہیں جانتا...... رشید تُو نے اسے بتایا نہیں۔"

"بھائی جی بات یہ ہے......"

"اوئے...... اب تُو بھی معذرت وازرت کرے گا۔ یہ شہر والے ایک تو معذرت بہت کرتے ہیں۔ اب تُو میری بات سن اور یہ بات دونوں کان کھول کر سن لو۔ اگر تُو نے میری بیٹی کو چھوڑا تو پھر یاد رکھ تجھے زندگی بھر کنوارہ رہنا پڑے گا۔ اگر تُو یہ سوچ رہا ہے کہ میری بیٹی کو ٹھکرا کر کہیں اور شادی کر لے گا تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔" یہ کہہ کر راجہ وقار اُٹھ گیا۔ پھر جاتے جاتے ماموں رشید سے بولا۔ "یہ بات اسے اچھی طرح سمجھا دینا...... اور تم خود بھی سمجھ لینا۔ میں چلتا ہوں۔"

ماموں رشید نے اسے لاکھ روکنا چاہا لیکن وہ کسی قیمت پر نہیں رُکا۔

راجہ وقار کے جانے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے اس گھر میں موت ہو گئی ہو۔

☆......☆......☆

جب کئی دن تک مسلسل سوچنے کے باوجود کمال رائے کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو بالآخر اس نے آرزو سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رات کو کھانے کے بعد وہ آرزو کو گھر کے پچھلے لان میں لے گیا۔ پھر وہ دونوں ٹہلنے لگے۔ آرزو سمجھ گئی کہ بابا کچھ بات کرنے کی تیاری میں ہیں۔ لہٰذا اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ٹہلنے لگی۔

"بیٹا...... تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ دو تین روز پہلے رامش اور اس کے ماموں مجھ سے ملنے آئے تھے۔" کمال رائے ٹہلتے ٹہلتے اچانک بولا۔

"جی بابا۔" آرزو نے آہستہ سے کہا۔ "معلوم ہے۔"

"آرزو، مجھے نہیں معلوم کہ ان کی آمد کی وجہ کا تمہیں اندازہ ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے تم جانتی ہو، ہوسکتا ہے تم نہ جانتی ہو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کیوں آئے تھے۔ ویسے یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس رشتے کے آنے سے پہلے ہی میں رامش خیال کو تمہارے لئے منتخب کر چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس موضوع پر تم سے بات کر کے تمہارا فیصلہ اپنی یادداشت میں محفوظ کرلوں تا کہ جب بھی کوئی صورت سامنے آئے تو مجھے فیصلہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو..... یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے عندیہ لئے بغیر کوئی رشتہ فائنل نہیں کروں گا۔ جب یہ رشتہ آیا تو میں بہت خوش ہوا۔ جو بات میرے دل میں تھی وہ فوراً ہی اُدھر منتقل ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ تم سے بات کر کے اس رشتے کو منظور کرلوں گا لیکن شاید یہ رشتہ تمہاری قسمت میں نہیں۔" اتنا کہہ کر کمال رائے نے گہرا سانس لیا۔

"کیوں بابا؟" آرزو نے فکرمندی سے پوچھا۔

"رامش کے ماموں نے رامش کی فیملی بیک گراؤنڈ بتاتے ہوئے جو کچھ کہا..... وہ بس میں ایک حد تک ہی سن سکا۔ میں ان کی بات سنتے ہی سکتے میں آگیا۔"

"ایسا کیا کہہ دیا انہوں نے۔"

"آرزو..... رامش کا دادا تمہاری ماں کا قاتل ہے۔" کمال رائے نے انکشاف کیا۔

"اوہ۔" آرزو کے جذبات پر ایک دم اوس سی پڑگئی۔ "لیکن بابا ان لوگوں نے قتل کا الزام اپنے سر کس طرح لے لیا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں کرتا۔"

"انہوں نے رامش کے دادا کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ انہوں نے تو تمہارے دادا روشن رائے کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جس روشن رائے کا وہ ذکر کر رہے ہیں، وہ میرا باپ تھا، اگر انہیں یہ معلوم ہوتا تو شاید وہ یہ رشتہ ڈالنے کی ہمت ہی نہ کرتے۔ خیر انہوں نے تذکرۃً کہا کہ رامش کے والدین کو روشن رائے نے قتل کروایا اور بیٹا یہ بات بالکل صحیح ہے۔"

"اچھا بابا۔" آرزو یہ سن کر مزید پریشان ہوگئی۔ "لیکن آپ کہہ رہے تھے کہ میری ماں کو رامش کے دادا نے قتل کروایا؟"

"یہ بات بھی بالکل صحیح ہے۔" کمال رائے نے بڑے وثوق سے کہا۔

"بابا..... اس سے پہلے آپ میری ماں کے بارے میں کوئی اور کہانی سنا چکے ہیں۔"

"یہ کہ تمہارے دادا نے تمہیں اور تمہاری ماں کو صحرا میں چھڑوا دیا تھا تا کہ تم دونوں مر جاؤ۔"

"جی بابا۔" آرزو نے تائید کی۔

"یہ بات بھی صحیح ہے۔ تمہارے دادا اور میرے باپ نے تم دونوں کے قتل کی سازش کی۔"

"پھر رامش کا دادا بیچ میں کس طرح آگیا۔ میری ماں کو اس نے کس طرح قتل کرایا۔"

"بیٹا..... بہت سی باتیں میں نے تم کو بتا دی ہیں۔ کچھ غیر ضروری قصے میں نے تمہیں نہیں سنائے ہیں۔ تمہارے دادا اصل میں کیا تھے۔ یہ بات میں نے کھل کر تمہیں نہیں بتائی ہے۔ فی الحال بات کو سمجھنے کیلئے اتنا سن لو آئندہ کبھی میں تفصیل سے بتا دوں گا۔ تمہارے دادا ایک انتہائی سفاک شخص تھے۔ اپنی انا کے پیچھے اگر انہیں میرے قتل کی بھی ضرورت پڑتی تو مجھے یقین ہے کہ وہ کر گزرتے..... رامش کے دادا راجہ سلیم اور تمہارے دادا روشن رائے ایک زمانے میں بہت اچھے دوست تھے..... پھر ایک گھوڑی کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان ناچاقی ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہوگئے۔ قصہ مختصر دشمنی مول لینے میں تمہارے دادا نے پہل کی۔ راجہ سلیم کی گھوڑی کو مروایا۔ پھر راجہ سلیم کی بہو یعنی رامش کی ماں کو قتل کروایا۔ جواب میں راجہ سلیم نے تمہاری ماں کو ٹھکانے لگوایا جو اونٹ پر بھٹکتی ہوئی کنگن پور پہنچ گئی تھی۔ اس کے جواب میں تمہارے دادا نے رامش کے والد راجہ نسیم کو قتل کروا دیا۔ پھر راجہ سلیم میری جان کا دشمن ہوگیا۔ مجھ پر کئی قاتلانہ حملے ہوئے۔ جب اس کے بندے مجھے قتل کرنے میں ناکام رہے تو راجہ سلیم بہ نفسِ نفیس میرے قتل کیلئے نکلا۔ اس نے بڑے منظم طریقے سے میرے قتل کی منصوبہ بندی کی لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ وہ مجھے قتل کرنے کے بجائے غلطی سے اپنے ملازم کے ہاتھوں مارا گیا۔ تب جا کر یہ سلسلہ رکا۔ تمہارے دادا نے جو عبرت ناک اور اذیت ناک موت پائی اس کے بارے میں، میں تمہیں بڑی تفصیل سے بتا چکا ہوں۔" کمال رائے بڑی افسردگی سے بولا۔

"بابا..... یہ انسان اس قدر سفاک کس طرح بن جاتا ہے؟" آرزو نے پرفکر لہجے میں کہا۔ "اگر دولت، جائیداد اور زمین انسان کو سفاک بنا دیتی ہے تو بابا آپ ایسے کیوں نہیں ہیں..... آپ بھی تو اپنے علاقے کے ایک بڑے وڈیرے ہیں۔"

"آرزو، دولت بڑا خطرناک نشہ ہے۔ اس نشے میں انسان بدمست ہو کر غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو دنیا کا طاقتور ترین آدمی سمجھنے لگتا ہے۔ جب کسی کو طاقت کا نشہ ہو جائے تو پھر وہ نشہ کبھی نہیں اُترتا۔ بس موت ہی اس نشے کو اُتارتی ہے۔" کمال رائے نے اسے سمجھایا۔

"اچھا بابا۔ اس مسئلے کو چھوڑیں۔ اب آگے بات کریں۔ آپ نے کیا سوچا۔"

"آرزو، میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ قسمت نے ہمارے ساتھ عجیب کھیل کھیلا ہے۔ جس ماحول سے میں تمہیں بچا کر اور خود بچ کر یہاں آیا..... اس پس منظر نے ہمارا ابھی تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ بیٹا آدمی اچھا بھی بننا چاہئے تو برا ماضی اسے اچھا بننے نہیں دیتا۔ ابھی تو رامش کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ جب معلوم ہوگا تو وہ اس رشتے سے یقیناً دستبردار ہو جائیں گے۔ آخر اس پوتی سے کون

شادی کرے گا جس کے دادا لڑکے کے والدین کا قتل ہو۔"

"لیکن بابا...... ہم تو قاتل نہیں۔ آپ نے تو کسی کا قتل نہیں کیا۔ رامش کے والد تو کسی کے قاتل نہیں تھے۔" آرزو پر جوش لہجے میں بولی۔ "پھر ہم کیوں ڈریں۔"

"میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں اپنا بھیانک ماضی بھولنا ہوگا۔"

"بابا۔ آپ اگر میری مانیں تو رامش کے ماموں کو سب کچھ صاف صاف جا کر بتا دیں۔ اگر ان لوگوں میں انسانیت ہوگی۔ ماضی کو بھولنے کی صلاحیت ہوگی اور دوسروں کو معاف کرنے کی خصوصیت ہوگی تو ٹھیک ہے۔ ورنہ وہ اپنے گھر خوش اور ہم اپنے۔" آرزو نے اپنا فیصلہ سنایا۔

کمال رائے اسے بڑی خوشگوار حیرت سے دیکھنے لگا۔ جو فیصلہ وہ تین دن میں نہیں کر پایا تھا۔ وہ فیصلہ آرزو نے چند لمحوں میں کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

پھر وہ رات آئی۔

وہ قیامت کی گھڑی جس کے بارے میں پیش گوئی کی گئی تھی کہ وہ آ کے رہے گی۔ پندرھواں سال آرزو پر بہت بھاری ہوگا۔ وہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

اس شام ستارہ نے آرزو کو پکڑ کر زبردستی اس کے سر پر تیل تھوپ دیا تھا۔ بس وہ غلطی سے ستارہ کے سامنے یہ کہہ بیٹھی تھی کہ آج اس کا سر بھاری ہو رہا ہے۔ وہ فوراً ہی کچن سے تیل کی شیشی اُٹھا لائی اور اس کے "نہ، نہ" کرنے کے باوجود اس نے تیل کی شیشی اس کے سر پر اُلٹ دی۔

ویسے ستارہ مالش بہت اچھی کرتی تھی۔ بالآخر وہ بھی لالچ آ گئی اور اس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

چکنا سر آرزو کو بہت برا لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ تیل لگوائے اور ادھر جا کر نہا لے مگر ستارہ نے اس پر پابندی عائد کر دی کہ کم از کم تین گھنٹے تک سر نہیں دھونا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آرزو کے بال کمزور ہو رہے ہیں اس طرح وہ تندرست اور توانا رہیں گے۔ آرزو جانتی تھی کہ ستارہ اس سے بہت محبت کرتی ہے لہٰذا وہ کبھی کبھی اس کا دل رکھنے کیلئے اس کی بات مان لیتی تھی۔

ان چکنے بالوں کے ساتھ وہ سو نہیں سکتی تھی، لہٰذا وہ واش روم میں نہانے کیلئے گھس گئی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ پندرہ بیس منٹ میں وہ شاور لے کر باہر نکلی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ڈرائیر سے بال سکھانے لگی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ پردے پوری طرح گرے ہوئے تھے، لہٰذا وہ جسم پر محض ایک گاؤن ڈالتی ہوئی واش روم سے باہر آ گئی تھی۔

بال سکھاتے سکھاتے اچانک اس کی نظر اپنے پیٹ پر پڑی۔ وہ تھوڑا سا پریشان ہوئی اور ڈرائیر

بند کر کے ایک طرف رکھا اور آئینے کے نزدیک ہوئی۔ پیٹ پر جو ننھے ننھے گڑھے تھے، وہ دانے بننے کے بعد سرخ ہوئے اور پھر سیاہ پڑ گئے تھے لیکن اس وقت وہ ننھے زخم ہرے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سرخ دانے نیلے ہونے کے ساتھ اندر دب گئے تھے اور اب ننھے گڑھوں میں کچھ پانی سا ابھرا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تولیہ لے کر اس زخم پر دھیرے سے رکھ کر اُٹھا لیا۔ وہ گڑھے چند لمحوں کیلئے خشک ہو گئے لیکن صرف چند لمحوں کیلئے۔ اس کے بعد پھر ان میں پانی سا ابھر گیا۔

وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ یہ کیا معاملہ ہے۔

ابھی وہ ان زخموں کے ہرے ہونے کی وجہ سمجھ نہ پائی تھی کہ اچانک ہی صورتحال سنگین ہو گئی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کے بیڈ کا ایک کونا نظر آتا تھا۔ اس کی نظر جونہی بیڈ پر پڑی، وہ ایک دم چونک اُٹھی۔

اسی وقت ایک عجیب سی خوشبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔

اس نے فوراً اپنے گاؤن کو سمیٹ کر اس کی ڈوریاں کس لیں اور پھر بیڈ کی طرف پلٹی۔

اس کے بیڈ کے کونے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور دو حصوں میں بٹی زبان بڑی تیزی سے اندر باہر ہو رہی تھی۔ اس کی تیز چمکتی آنکھیں آرزو پر جمی ہوئی تھیں۔

آرزو نے دو قدم آگے بڑھائے...... پھر رک گئی وہ اس سانپ کو پہچان گئی۔ وہ اسے اس سے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ اس رات کو جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو یہی سانپ اس کے سامنے پھن پھیلائے ہوئے تھا۔ نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں اس کے خدوخال اس طرح روشن تو نہ تھے جس طرح وہ اب دیکھ رہی تھی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہ تھا کہ اسے کچھ دکھائی ہی نہ دیتا۔ اس کے سر پر ایک چمکیلا پتھر رکھا تھا جس سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ بات اس نے واضح طور پر نوٹ کی تھی۔

اس وقت اس کے سامنے جو سانپ تھا اس کے سر پر بھی ایک چمکیلا پتھر موجود تھا جو کسی ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس سانپ کی رنگت سنہری تھی۔ اس کے جسم کے اوپری حصے پر چھوٹے چھوٹے گول نشان تھے۔ یہ نشان رنگین اور چمکیلے تھے جیسے اس کے سنہرے جسم پر مختلف رنگ کے پتھر جڑے ہوں۔ ایسے ہی نشان کے اس پھن کے اوپر بھی تھے۔ کمرے کی روشنی میں وہ سنہرا سانپ جگمگا رہا تھا۔

ایسا خوبصورت سانپ آرزو نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ بے اختیار اپنے بچپن میں پہنچ گئی۔ مجسمے والا بڑا کمرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ سرخ اینٹوں کا فرش جہاں وہ سانپوں سے کھیلتی تھی۔ پھر اسے اپنی آیا یاد آئی۔ کبھی کبھی وہ خوفزدہ ہو کر ایک دم پکارتی تھی۔ "رنتارو۔"

یہ کسی سانپ کا نام تھا جس سے اس کی حفاظت کی جا رہی تھی۔ آج اس سانپ کو دیکھ کر بے اختیار

اس کے ہونٹوں پر اس کا نام آ گیا۔ وہ بے اختیار پکار اُٹھی۔

''رنتارو۔''

اپنا نام سنتے ہی وہ سانپ ایک دَم جھوم اُٹھا۔ اس نے دائیں بائیں اپنے پھن کو لہرایا جیسے کہتا ہو۔

''ہاں میں رنتارو ہوں، تمہارا رنتارو۔''

اوہ...... تو یہ مجھ تک آ پہنچا۔ اس نے مجھے تلاش کر لیا۔ مجھے اسی کے لئے منتخب کیا گیا۔ یہ انتخاب اس کے باپ پرمان نے کیا تھا۔ ایک خاص وقت تک کے لئے اس سے مجھے دور رکھا جا رہا تھا۔ اب شاید وہ وقت آ گیا تھا۔ وہ مدت پوری ہو گئی تھی۔ وہ اب آزاد تھا۔

آرزو ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ اتنے میں وہ بڑی تیزی سے بیڈ سے پھسلا اور بڑی تیزی سے اس کی ٹانگ سے لپٹ کر گھومتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔

آرزو اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ لڑکھڑا کر اپنے بیڈ پر گری۔ اس کے حواس ایک دَم مختل ہونے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھی لیکن ہاتھ پاؤں چلانے کی سکت اس میں نہ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی چیز اس کے ریشمی بدن پر پھسل رہی ہے۔ اس کے دماغ میں دھواں سا بھرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے سے جگمگانے لگے تھے۔ اس پر خمار کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نیند میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ بالآخر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گئی۔

☆......☆......☆

صبح پھر وہی مسئلہ ہوا، آرزو کا کمرہ بند تھا اور ستارہ دروازہ بجا بجا کر تنگ آ چکی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ فون بھی کر رہی تھی لیکن آرزو پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

پھر کوئی بارہ بجے کے قریب اس نے ریسیور اُٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل بولی۔ ''ہیلو۔''

''بی بی۔ دروازہ کھولیں۔'' ستارہ نے جلدی سے کہا۔ وہ بہت بے چین تھی۔

''کہاں کا دروازہ کھولوں؟'' آرزو کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

''ارے بی بی۔ اپنے کمرے کا اور کہاں کا۔'' ستارہ نے زور دے کر کہا۔

''اچھا۔'' یہ کہہ کر آرزو نے ریسیور رکھا اور بمشکل تمام ہمت جمع کر کے دروازہ کھولا اور پھر دَھم سے بستر پر آ گری۔

جب ستارہ کمرے میں داخل ہوئی تو آرزو بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے اسے ہلایا اور گھبرا کر بولی۔ ''ہائے بی بی کیا ہوا؟...... کیا آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''ہاں۔'' آرزو نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں پھر فوراً ہی بند کر لیں۔ ''متلی کی سی کیفیت

ہو رہی ہے۔''

''پانی میں لیموں ڈال کر لاؤں؟''

''ہاں جلدی۔'' وہ آنکھیں بند کئے کئے بولی۔

ستارہ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ وہ بھاگم بھاگ کچن میں پہنچی۔ اس نے ایک گلاس پانی میں دو لیموں نچوڑے اور بڑی پھرتی سے آرزو کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ وہ اسی طرح بے سدھ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔

ستارہ نے اس کے سر کے نیچے دو تکیے رکھے۔ پھر اس کا سر اپنے ہاتھ سے مزید اونچا کر کے پانی پلایا۔

وہ غٹ غٹ کر کے سارا پانی پی گئی۔ جیسے جنم جنم کی پیاسی ہو۔

''بی بی...... اماں کوارٹر میں ہے کیا اسے بلا کر لاؤں۔'' ستارہ تشویش سے بولی۔

''نہیں ستارہ...... تُو میرے پاس بیٹھ...... میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

پھر وہ واقعی حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہو گئی۔ لیموں کے پانی نے اس کے ہوش و حواس بحال کر دیئے۔ اس نے مسکرا کر ستارہ کی طرف دیکھا۔ ''تُو پریشان مت ہو۔ میں اب ٹھیک ہوں۔''

''آپ کا چہرہ...... پیلا زرد ہو رہا ہے بی بی...... یہ آپ کو آخر کیا ہو جاتا ہے؟''

''پتہ نہیں ستارہ۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ستارہ نے اس کی کمر کے پیچھے تکیے لگا دیئے تو اس نے ٹیک لگا لی۔

پھر اس نے اپنے کمرے کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز تلاش کر رہی ہو، کمرے میں ایک ہلکی ہلکی خوشبو اب بھی پھیلی ہوئی تھی۔ باقی سب جوں کا توں تھا۔

''بی بی...... کیا دیکھ رہی ہیں...... آپ کو کچھ چاہئے۔'' ستارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں دیکھ رہی...... مجھے کچھ نہیں چاہئے...... بس تُو میرے پاس بیٹھی رہ۔'' آرزو نے اس کی طرف بڑی محبت سے دیکھا۔

''میں بیٹھی ہوں بی بی...... میں آپ کو چھوڑ کر کیوں جاؤں گی۔''

''کیا وقت ہو رہا ہے؟'' اس نے گردن گھما کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھڑی دیکھنے کی کوشش کی۔

''بارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ آج تو آپ کالج بھی نہیں گئیں۔''

''ہاں۔'' آرزو نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''کیسے جاتی آنکھ ہی نہیں کھلی۔ بابا ہیں گھر پر۔''

''نہیں کہیں گئے ہوئے ہیں۔''

''چلو...... یہ بھی اچھا ہے۔ ورنہ میری حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتے۔''

''چلیں......اب جلدی سے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھولیں اور باہر آجائیں۔''

''منہ ہاتھ نہیں دھوؤں گی، نہاؤں گی اور ناشتہ باہر نہیں کروں گی، یہیں اپنے کمرے میں کروں گی۔'' آرزو نے کہا۔

''ٹھیک ہے بی بی......جیسی آپ کی مرضی۔'' یہ کہہ کر ستارہ اُٹھ گئی۔ ''آپ نہا کر فریش ہوں تب تک میں آپ کے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

ستارہ کے جانے کے بعد وہ بیڈ سے اُٹھی۔ اسے کمزوری سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی آئینے کے سامنے پہنچی۔ اس کے کھلے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بال سمیٹ کر پیچھے کئے۔

گاؤن کی ڈوریاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی نظر اپنے پیٹ پر گئی۔ اب وہاں دو ننھے ننھے زخم اور موجود تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ان گڑھوں کو دیکھا۔ یہ نیلے رنگ کے تھے اور اندر سے سرخی مائل تھے۔ یہ ننھے نشان پہلے والے زخموں کے نزدیک ہی تھے۔ اب آرزو کو کوئی شبہ نہ رہا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اسے رات کو رنتارو نے ڈسا ہے۔

اس خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے اپنا چہرہ دیکھا، اس کا گلابی چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پھر اسے رات کی کیفیت یاد آئی۔ رنتارو کا ٹانگ سے لپٹنا، اس کا لڑکھڑانا اور بیڈ پر گرنا، ریشمی بدن پر اس کا پھسلنا۔

اس نے یکدم خوفزدہ ہو کر اپنے خوبصورت جسم کو دیکھا۔ اس کا جسم صحیح سلامت تھا۔ پیٹ پر کاٹنے کے نشان کے علاوہ اور کہیں کوئی نشان نہ تھا۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچتی ہوئی واش روم میں چلی گئی اور اس نے پورا شاور اپنے سر پر کھول دیا۔

☆......☆......☆

کھانا کھانے کے بعد کمال رائے اور آرزو لان پر ٹہل رہے تھے۔ رات کی رانی کی مسحور کن خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

''آرزو......آج میں رامش کی طرف گیا تھا۔'' کمال رائے نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''میں نے تمہارے مشورے کے مطابق ساری صورتحال ان دونوں کے سامنے رکھ دی۔ ہر وہ بات بتا دی جس کا بتانا ضروری تھا۔''

''پھر......پھر کیا ہوا بابا؟'' آرزو بے قراری سے بولی۔

''جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ روشن رائے میرا باپ تھا تو دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ گئیں۔''

''وہ غصے میں نہیں آئے؟'' آرزو نے پوچھا۔

''نہیں غصے میں نہیں۔ یہ بات سن کر پریشان ہو گئے۔''

''کیا آپ نے انہیں میری ماں کے بارے میں نہیں بتایا کہ راجہ سلیم میری ماں کا قاتل تھا۔''

''ہاں، پھر میں نے یہ بھی بتایا؟'' کمال رائے بولا۔ ''یہ سن کر تو ان کے ہوش ہی اُڑ گئے۔''

''صاف ظاہر ہے۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔'' آرزو بولی۔

''لیکن بیٹا رامش نے تو مجھے حیران کر دیا۔ مجھے نئی نسل کے نمائندے سے ایسی توقع نہ تھی۔''

''کیا کہا۔ انہوں نے؟'' آرزو نے پوچھا۔

وہ بولا ''میں اپنے دادا کے اس بھیانک جرم کی معافی مانگتا ہوں، میں شرمندہ ہوں کہ میں ایسے دادا کا پوتا ہوں۔'' کمال رائے نے بتایا۔ ''بیٹا، اس کی اس بات سے میں بہت متاثر ہوں جو بات مجھے پہلے کہنی چاہئے تھی، وہ اس نے کہہ دی تب میں نے اس سے کہا کہ اب میں کیا کہوں......میرے باپ کے جرائم اتنے بھیانک ہیں کہ میں تم سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا۔ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ روشن رائے کا جرم ناقابل معافی ہے اور میں اس کا بیٹا کمال رائے اس کے ہر جرم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ میری بات سن کر وہ بولا کہ آپ اپنے باپ کے کئے کی سزا کیوں پائیں۔ میرے ماں باپ تو اب واپس آنہیں سکتے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب ہمیں اپنے ماضی کو بھلا کر ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہوگا......بیٹا......رامش خیال ایسا باشعور اور روشن خیال لڑکا ہے، میرے تصور میں بھی نہ تھا۔ اس نے مجھے پہلی ملاقات میں ہی متاثر کیا تھا اور میں نے اسے دیکھ کر ایک فیصلہ کرلیا تھا جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اس کی باتیں سن کر مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہوا......جب ماضی کے سارے قصے بیان ہوگئے، دل کی کدورتیں نکل گئیں اور یہ طے ہوگیا کہ ماضی کو بھلا کر ایک نئے دور کا آغاز کرنا چاہئے۔ تب ایک اور اُلجھن سامنے آئی۔'' کمال رائے یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''وہ کیا بابا؟'' آرزو نے پوچھا۔

''رامش خیال کی اس کے تایا راجہ وقار کی بیٹی سے کافی عرصہ پہلے منگنی ہو چکی ہے۔''

''ارے......لیکن مہرو نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''نہیں بتایا ہوگا......پہلے میری بات سن لو......پریشان مت ہو......رامش خیال نے اپنے طور پر ہی اس معاملے کو صاف کر دیا ہے۔ اس نے اپنے تایا سے جو شادی کی تاریخ طے کرنے آئے تھے۔ شادی سے انکار کر دیا ہے اور تایا راجہ وقار اسے دھمکی دے کر جا چکے ہیں۔''

''پھر بابا۔'' آرزو نے کمال رائے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''پھر بابا......یہ کہ ایک نئی دشمنی کا آغاز ہوگیا ہے۔ راجہ وقار ایک روایتی وڈیرا ہے۔ وہ رامش

خیال کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرنے کا...... مجھے اپنا باپ یاد آ گیا۔ جس نے اپنے بیٹے کی پسند کی شادی کا کتنا بھیانک انتقام لیا تھا۔ وہ تو تایا ہے پھر اس نے اس کی بیٹی کو ٹھکرا دیا ہے اگر وہ اب اپنی پسند سے شادی کرتا ہے تو نہ صرف اس کی جان خطرے میں پڑے گی ساتھ ہی اس کی بیوی بھی جان سے جائے گی...... بیٹا۔ اب تم ہی سوچو، میں اپنی کائنات کی جان کس طرح خطرے میں ڈال دوں۔“

”بابا...... آپ کیا چاہتے ہیں؟“ آرزو کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔

جواب میں کمال رائے نے جو کچھ کہا۔ اسے سن کر آرزو حیرت زدہ رہ گئی۔

کمال رائے نے کہا تھا۔ ”بیٹا...... اب مجھے اس رشتے سے انکار کرنا ہوگا؟“

”نہیں بابا...... ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟“ آرزو نے دھیمے مگر مستحکم لہجے میں کہا۔

”بیٹا...... میں تمہیں کسی مشکل میں پھنسانا نہیں چاہتا۔“ کمال رائے نے فکرمند ہو کر کہا۔

”بابا...... اب پیچھے نہیں ہٹنا...... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”آرزو...... تم نہیں جانتی ہو کہ یہ کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دیکھتے سب کچھ ہیں۔ بولتے سب کچھ ہیں لیکن سنتے کسی کی نہیں۔ میں اپنے باپ کے روپ میں ان وڈیروں کو دیکھ چکا ہوں۔ میں آگ میں جل چکا ہوں اس آگ میں، میں اپنی بیٹی کو کس طرح جھونک دوں۔“

”بابا...... میں آپ کے جذبات سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے ہونے والی ذرا سی بھی تکلیف آپ کو سولی پر لٹکا دے گی لیکن بابا آپ کو ہمت کرنا ہوگی۔“

”آرزو میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اپنی جان پر کھیل سکتا ہوں لیکن تمہاری جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

”بابا...... بات اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ رامش خیال اس رشتے سے انکار کر چکے ہیں۔ اب ہمیں انہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔“ آرزو نے یہ بات بڑی سادگی سے کہہ دی۔

یہ ایک بھاری جملہ تھا۔ اس نے بڑی سادگی مگر بڑے یقین سے اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ رامش خیال کو کسی طور اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ جس لڑکے نے اپنے خاندان میں اعلانِ جنگ کر دیا تھا تو اس جنگ میں شامل ہونے سے وہ کس طرح رہ جاتی جبکہ یہ جنگ اسی کے حصول کیلئے لڑی جا رہی تھی۔

”آرزو یہ ایک پرخطر راستہ ہے۔ تم کیوں اپنے باپ کی جان سولی پر لٹکانا چاہتی ہو۔“

”بابا...... زندگی بذاتِ خود ایک پہیلی ہے، حادثات سے بھری...... کون جانے اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے لگنے والی ٹھوکر ہمیں موت کی وادی میں لے جائے گی یا خوش قسمتی کا در وا کر جائے گی...... بابا...... آپ جس خطرے سے ڈرا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کل قسمت آپ کی بیٹی کو اس سے بھی سنگین

خطرے میں پھنسا دے پھر آپ کیا کریں گے۔“

”راجہ وقار سے بڑا خطرہ کوئی اور نہیں ہو سکتا...... وہ اپنی بیٹی کے انتقام میں اندھا ہو کر جانے کیا کر گزرے۔ میں تمہیں جان بوجھ کر موت کی وادی میں نہیں دھکیل سکتا۔“

”بابا...... کیا پتہ قسمت مجھے کہاں دھکیل کر لے جائے...... راجہ وقار تو گولیوں کی ہی موت دے گا ایک آسان موت...... کون جانے تقدیر مجھے کسی ایسے عذاب میں مبتلا کر دے کہ میں مرنا بھی چاہوں تو نہ مر سکوں۔“ آرزو نے بڑے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”ارے...... آرزو، یہ تم کس طرح کی بات کر رہی ہو...... بیٹا کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔“

”بابا...... ابھی تو میں پاگل نہیں ہوئی لیکن میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کل تقدیر نجانے کہاں لے جائے، کچھ کہہ نہیں سکتی...... ہو سکتا ہے مجھے پاگل کر دے۔“

”اچھا...... دیکھا جائے گا...... تم پریشان مت ہو...... میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالتا ہوں۔“

یہ بات جانے کمال رائے نے کیوں کہی تھی۔ جب کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ آرزو بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس معاملے کو سلجھانا آسان نہیں۔ یہ محض طفل تسلی ہے مگر کمال رائے اور کیا کہتا۔ وہ باپ تھا اور ایسا باپ جس کی جان، آرزو تھی تو دوسرے کنارے پر رامش خیال تھا۔ وہ یہ بات اب اچھی طرح سمجھ گیا کہ رامش خیال اس کی بیٹی کو پسند ہے۔ بیٹی کی کیا وہ تو خود اس کی بھی پسند تھا...... اس کا انتخاب تھا اور اسی انتخاب نے اس کی بیٹی کی خاطر ایک عفریت سے ٹکر لے لی ہے۔ موت کے منہ میں ہاتھ ڈال دیا ہے اور ایک وہ ہے جو تمام وسائل اور ذرائع ہونے کے باوجود ڈر رہا ہے۔ بزدلی کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک مثبت آدمی ہے۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہنا چاہتا ہے۔ امن پسندی اس کا شعار ہے لیکن یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ کوئی تمہارا گھر جلانے آ جائے تو تم اپنے گھر میں محصور ہو جاؤ اور اسے من مانی کی اجازت دے دو...... یہ کس نے کہا کہ تم دہشت گرد بن جاؤ لیکن اگر کوئی دہشت گرد تمہاری زندگی کے پیچھے پڑ جائے اور تم اس دہشت گرد سے مقابلے کی سکت بھی رکھتے ہو تو پھر پیچھے ہٹنے کی کیا ضرورت ہے۔

تب اندھیرے میں ایک جگنو چمکا ”بابا، رامش خیال کو اب ہمیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔“ یہ آرزو کے دل کی آواز تھی...... اب یہی آواز اس کے دل کی آواز بن گئی۔

بالآخر اس نے طے کر لیا کہ وہ رامش خیال کا ہر قیمت پر ساتھ دے گا۔ چاہے اس کیلئے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

پوری رات اس نے جاگ کر گزاری۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ کبھی وہ تھکی آنکھوں سے چھت کو گھورتا تو کبھی آنکھیں موند کر اندیشوں کو بھگانے کی کوشش کرتا۔ وہ بہت سی باتیں سوچتا رہا۔

قدم قدم پر روشن رائے اس کے سامنے آتا رہا۔اس کی ماروی اس کی نظروں میں گھومتی رہی۔ بالآخر صبح ہوگئی۔

اس نے سوچا کہ وہ جس نتیجے پر پہنچا ہے۔اس نتیجے سے اس فیصلے سے اپنی بیٹی کو بھی آگاہ کردے۔

دراصل اس کے ایک جملے نے اس کی کایا پلٹی تھی۔ایک ناتواں نے ایک توانا کو توانائی بخشی تھی۔

وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر آرزو کے کمرے کے سامنے پہنچا۔اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔وہ جلدی جلدی کالج جانے کی تیاری کررہی تھی۔

اپنے باپ کو اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر وہ ایک دَم چونک گئی۔

''بابا آپ...... خیر تو ہے۔'' اس نے بالوں میں برش کرتے ہوئے اپنا ہاتھ روک لیا اور اپنے باپ کا چہرہ بغور دیکھنے لگی۔

''ہاں...... آرزو...... بالکل خیر ہے۔تم پورے اطمینان سے کالج جاؤ...... اور اب ہر فکر سے آزاد ہوجاؤ...... میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں رامش خیال کو اب تنہا نہیں چھوڑوں گا...... میں اس پر ظلم نہیں ہونے دوں گا...... میں اب ہر ظالم کا مقابلہ کروں گا...... دیکھتا ہوں...... کون میری بیٹی کی خوشیاں چھینتا ہے۔'' کمال رائے نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

آرزو کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو چھلک آئے۔وہ کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے اپنے باپ کی مضبوط بانہوں میں چھپی کھڑی رہی...... اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کسی اونچے پہاڑ کی اوٹ میں کھڑی ہو۔اب اسے کسی طوفان کی فکر نہ رہی تھی۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھی کالج جارہی تھی تو اس کے چہرے پر اطمینان پھیلا ہوا تھا۔

اسے یقین تو تھا لیکن آج یہ یقین اور گہرا ہوگیا تھا کہ اس کا باپ اس کی خوشی کی خاطر اپنی جان بھی قربان کرسکتا ہے۔اس کی چاہت ناقابلِ یقین حد تک سچی تھی...... وہ اپنے باپ پر جتنا فخر کرتی کم تھا۔

وہ آج بہت خوش تھی۔

کالج میں جب مہرو پر اس کی نظر پڑی تو وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی اور اسے جاتے ہی گلے لگالیا۔

''میری مہرو۔'' وہ خوشی سے چہکی۔

''بھئی کیا ہوگیا... آج صبح ہی صبح کوئی خواب دیکھ لیا کیا؟''

''ارے نہیں میری مہرو...... میں خوابوں کے سہارے خوش ہونے والی لڑکی نہیں ہوں۔میں ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں اور ٹھوس حقیقت ہی مجھے خوش کرسکتی ہے...... ویسے میں ایک بڑی خوش قسمت

لڑکی ہوں۔میں اپنے بخت پر جتنا ناز کروں کم ہے۔'' وہ فخر سے بولی۔

''او بھائی...... کچھ منہ سے بھی پھوٹے گی یا پہیلیاں ہی بجھوائے جائے گی۔''

''ویسے مجھے تجھ سے بڑی شکایت ہے۔'' اچانک آرزو کا خوشگوار موڈ تبدیل ہوا۔

''اچھا۔'' مہرو نے آنکھیں چمکائیں۔''اب میں نے کیا کردیا۔''

''جب تیرے بھائی کی منگنی تیری تایا زاد سے ہوچکی تھی تو تُو نے مجھ سے یہ بات چھپائی کس لئے۔''

''ہاں آرزو...... میں اس معاملے میں تیری قصوروار ہوں اور سزا کی مستحق۔'' مہرو نے سنجیدگی سے کہا۔''اصل میں، میں گڑبڑا گئی۔کچھ طے نہ کرپائی کہ کیا کروں۔یہ سارا معاملہ کچھ اتنی تیزی سے اُٹھا کہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں، کیا نہ کہوں ویسے بھائی رامش شروع ہی سے اس رشتے سے خوش نہ تھے۔تمہیں دیکھنے کے بعد جیسے انہیں سہارا مل گیا۔وہ فوراً ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔اس نے طے کرلیا کہ تم سے شادی ہو یا نہ ہو مگر اب وہ تایا کی بیٹی شکیلہ سے ہرگز شادی نہ کریں گے اس فیصلے کے بعد ان کی منگنی نہ ہونے کے برابر ہوگئی۔ویسے یہ بات میں نے تجھ سے چھپائی ہرگز نہیں تھی۔سوچ رہی تھی کہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر تمہیں بتادوں گی۔''

''وہ مناسب وقت تجھے آج تک نہیں ملا؟'' آرزو نے شکایت کی۔

''آج پکا ارادہ تھا۔'' مہرو ہنس کر بولی۔''تُو تو آتے ہی برس پڑی۔''

''خبردار، جو آئندہ مجھ سے کوئی بات چھپائی تو کان کھینچوں گی۔'' آرزو نے بڑی بے تکلفی سے اس کا کان پکڑلیا۔

''اچھا میرا کان تو چھوڑ...... اب نہیں چھپاؤں گی کچھ، ویسے اب چھپانے کو رہ کیا گیا ہے۔'' مہرو نے اپنے کان سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔''آج تُو کس لئے اتنی خوش نظر آرہی ہے یہ تو بتا۔''

''آج میرے باپ نے میرا باپ ہونے کا ثبوت دے دیا ہے۔''

''اچھا...... وہ کیسے؟''

''آج مجھے ان کے سینے سے لگ کر کس قدر سکون ملا...... کس قدر تحفظ کا احساس ہوا تجھے کیا بتاؤں...... میرے باپ نے کہہ دیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر اور ہر صورت میں رامش کا ساتھ دیں گے۔انہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے...... یہ سن کر تو مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔''

''اب بتا...... میرے بابا کیسے ہیں؟''

''تیرے بابا...... بہت گریٹ ہیں...... پر میرا بھائی بھی کسی سے کم نہیں۔'' وہ شرارت آمیز لہجے

میں بولی۔

"اچھا.....چل تُو کہتی ہے تو مانے لیتی ہوں۔" آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

رامش خیال واقعی کسی سے کم نہ تھا.....اس نے اپنے تایا کی بیٹی سے شادی سے انکار کر کے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ راجہ وقار نے اسے سدا کنوارہ رہنے کی ہدایت کی تھی۔ ورنہ دوسری صورت میں اسے اپنی موت کو گلے لگانا ہوگا.....اس نے اپنے تایا کے چیلنج سے بڑی پامردی سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شام کو جب مہرو نے آرزو سے ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا اور بتایا کہ کمال رائے صاحب نے تمہیں تنہا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے تو ان کی طاقت دُگنی ہوگئی اور اس کی طاقت سہہ گنی۔ کمال رائے اکیلے تو نہ تھے ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی.....دو وہ ہوئے اور اس طرح اس کے ماموں تھے.....

اس طرح اسے تین سہارے مل چکے تھے۔ اب تو وہ ہمالیہ پہاڑ سے ٹکرانے کیلئے بھی تیار تھا۔

☆.....☆.....☆

اب ہر چیز سامنے آ چکی تھی۔ صاف اور واضح تھی۔ اب کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی، کمال رائے چاہتا تھا کہ اس رشتے کو مضبوط کر لیا جائے۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ منگنی کر لی جائے ..... دوسری صورت یہ تھی کہ نکاح کر لیا جائے۔

آرزو ابھی چھوٹی تھی، اس لئے وہ اس کی رخصتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بی اے کر لینے کے بعد وہ اس کو وداع کرے۔ ابھی دو تین سال کا عرصہ پڑا تھا۔ منگنی یا نکاح کر کے وہ اپنی ماں نفیسہ بیگم کے کنبے والوں کے منہ بند کرنا چاہتا تھا۔ ہر شخص آرزو کے رشتے کی خواہش دل میں لئے بیٹھا تھا۔ اس کی منگنی کی خبر ملتے ہی ہر طرف سناٹا پھیل جاتا.....اس طرح کمال رائے بھی آنے والے اُلٹے سیدھے رشتوں سے محفوظ ہو جاتا۔

رامش خیال سے رشتے کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے اس رشتے کو اناؤنس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمال رائے اپنے ماموؤں کو رامش خیال کے بارے میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کس دادا کا پوتا ہے۔ ویسے بھی رشتے کو راز میں رکھنا تھا کہ رخصتی سے پہلے یہ بات راجہ وقار تک نہ پہنچ جائے۔

کمال رائے نے سوچا تھا کہ منگنی یا نکاح کرتے وقت وہ رامش خیال کا فیملی بیک گراؤنڈ کسی کو نہیں بتائے گا۔ خصوصاً اپنے لوگوں کو، اپنی ماں کو بھی نہیں.....اس طرح دو تین سالوں میں جانے حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے راجہ وقار کسی فرشتۂ اجل کو پسند آ جائے۔

ویسے یہ خواہش پوری ہونی اتنی آسان نہ تھی۔ ایسے لوگ اتنی جلدی راہی ملکِ عدم نہیں ہوتے ایسے لوگوں کی رسی روز بروز دراز ہوتی رہتی ہے۔

پھر اچانک ہی اس رسی کو کھینچ لیا جاتا ہے لیکن کمال رائے کو یقین تھا کہ راجہ وقار اتنی جلدی مرنے والوں میں سے نہیں۔

کمال رائے نے رامش خیال کے ماموں سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے نکاح پر اصرار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ بے شک اس رشتے کو جہاں تک ممکن ہو سکے گا چھپایا جائے گا لیکن اس طرح کی باتیں زیادہ عرصے چھپی نہیں رہتیں۔ جب راجہ وقار کو معلوم ہوگا کہ رامش کا نکاح ہو گیا ہے تو اس پر اوس پڑ جائے گی۔ وہ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جائے گا اور اگر اسے یہ معلوم ہوگا کہ رامش کی کہیں منگنی ہوئی ہے تو وہ اس منگنی کو تڑوانے کی سرتوڑ کوشش کرے گا۔

ماموں رشید کی یہ رائے بڑی حد تک معقول تھی۔ کمال رائے اپنے تئیں بھی یہی چاہتا تھا۔ نکاح کی صورت میں اس کے اپنے لوگ بھی خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ورنہ منگنی کی صورت میں تو شورشیں اُٹھنے کا ہر وقت احتمال رہتا۔

بس پھر کیا تھا، اتفاق رائے ہونے کے بعد یہ طے ہوا کہ اگلے ماہ کی پانچ تاریخ کو آرزو اور رامش کو ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا جائے۔

نکاح ہونے میں ابھی پچیس دن باقی تھے۔

☆.....☆.....☆

آرزو نرم گداز تکیوں پر سر رکھے ایک شعری مجموعے کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلیفون کی آواز سن کر وہ بے اختیار چونک پڑی۔ وہ شعری مجموعے میں اتنی گم تھی کہ اسے اپنے ارد گرد کی خبر نہ رہی تھی۔

اس نے کتاب ایک طرف رکھ کر ریسیور اُٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا پھر ریسیور اپنے کان سے لگا کر دھیرے سے کہا۔ "ہیلو۔"

"کیا کر رہی ہو چندا۔" اِدھر سے آواز آئی۔

"اچھا..... یہ تُو ہے مہرو..... یار تُو نے تو ڈرا ہی دیا۔ میں بڑے سکون سے شاعری میں گم تھی کہ تیرے فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا ہی دیا۔ اور سنا تو کیسی ہے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن میرے آس پاس کے لوگ کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔"

"کیوں لوگوں کو کیا ہوا؟" آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کہتے ہیں بات کراؤ۔" وہ بولی۔

"میں سمجھی نہیں تُو کس کی بات کر رہی ہے۔"

"اُفوہ..... بھئی میری بڑی مصیبت ہے۔ مجھے تو ہر طرف معصومین سے واسطہ پڑا ہے۔ نکاح سر پر

ہے اور اجنبیت کا یہ عالم ہے۔"

"اچھا.....اب بھی تُو کیا بکواس کر رہی ہے۔" آرزو بولی۔

"اب تو سمجھ گئی ہے تو لے سنبھال اپنے اُن کو..... میں ریسیور دے رہی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" آرزو نے کہا۔

"لیں بھائی بات کریں۔" آرزو کو مہرو کی آواز سنائی دی۔ "آپ اطمینان سے بات کریں، میں نیچے جا رہی ہوں۔"

چند لمحوں بعد ایک گہرے سانس کی آواز آرزو کی سماعت سے ٹکرائی..... پھر کوئی جیسے کوئی بہت دور سے بولا۔ "ہیلو آرزو۔"

"جی میں بول رہی ہوں..... کیسے ہیں آپ؟" آرزو نے اپنے لہجے کو شگفتہ بنا کر کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی آواز سن کر کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو گیا ہوں۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"ایک بات بتایئے۔ کیا آپ کی یادداشت خاصی خراب ہے۔" آرزو نے عجیب سوال کیا۔

"جی نہیں تو..... میری یادداشت کا کوئی جواب نہیں۔" رامش خیال نے سادگی سے جواب دیا۔

"پھر یہ فون مہرو سے کیوں ملواتے ہیں؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"آپ کو میرا ٹیلیفون نمبر یاد نہیں رہتا کیا؟"

"آپ کا نمبر تو میرے دل پر نقش ہے۔ کوئی اگر بے ہوشی میں بھی پوچھے تو صحیح بتا دوں۔" وہ بولا۔

"آئندہ..... آپ مجھے فون کریں تو بغیر آپریٹر کی مدد کے کیجئے گا۔" آرزو ہنسی۔

"او کے..... ایسا ہی ہوگا۔" رامش خیال کے لہجے میں خوشی تھی۔

"اور سنائیں۔" آرزو نے حوصلہ افزا انداز اختیار کیا۔

"کسی دن سمندر پر چلیں۔" رامش خیال نے ایک دم چھلانگ لگائی اس نے کچھ زیادہ ہی حوصلہ پکڑ لیا۔

"ہاں، سمندر پر جانے کو تو میرا بھی جی چاہتا ہے لیکن اس سلسلے میں پہلے بابا سے بات کرنا ہو گی۔ انہوں نے اجازت دے دی تو پھر پروگرام طے کر لیں گے۔"

"پھر آج ہی بات کر لیں..... بابا سے۔" وہ بے قرار ہو کر بولا۔

"یہ نیک کام آپ کیوں نہیں کرتے..... میں بابا کے موبائل فون کا نمبر دے دیتی ہوں۔ آپ بات کر لیں۔ ان سے کہیں کہ آرزو کو سمندر پر لے جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا ارادہ ہے..... مجھے بابا سے ڈانٹ پڑوانا چاہتی ہو۔"

"ہاں، چاہتی تو یہی ہوں لیکن وہ اتنے اچھے ہیں کہ آپ کو ایک لفظ بھی نہ کہیں گے۔"

"اوہ اگر وہ اچھے نہ ہوتے تو۔"

"تو آپ کو ڈانٹ پڑتی۔"

"مجھے آخر ڈانٹ پڑوانا کیوں چاہتی ہو۔"

"ایسے بندے کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے؟"

"میں کیسا ہوں؟"

"بزدل۔" آرزو نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا اور کھٹاک سے ریسیور رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

کمال رائے نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں سمندر پر جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ بغیر گارڈوں کے نہ جائیں اور گارڈوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ کمال رائے نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں کسی پبلک پلیس پر اکٹھے نظر آئیں۔ ایک تو ان کی جوڑی چاند سورج کی تھی، چمکتی دمکتی کسی کو نظر نہ لگے۔ دوسرے وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجہ وقار کے کسی بندے کی ان پر نظر پڑے..... لیکن وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں کی خوشی میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالے..... اس لئے اللہ کا نام لے کر دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

وہ دونوں بہت خوش تھے، چلتے ہوئے انہوں نے فرداً فرداً مہرو سے بھی اصرار کیا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ ان دونوں کے درمیان بور ہو گی..... خیر ان دونوں کے ساتھ وہ بور کیا ہوتی بھلا.....؟ ایک طرف اس کی دوست تھی، دوسری طرف بھائی..... لیکن وہ چاہتی تھی کہ کباب میں ہڈی نہ بنے..... وہ دونوں سمندر کو کھل کر انجوائے کریں۔

دونوں سیکورٹی گارڈ دیوار پر مستعد بیٹھے تھے اور وہ دونوں سمندر کی طرف ڈھیر ڈھیر سے باتیں کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ دیوار سے سمندر کافی دور تھا، ادھر پبلک بھی کم تھی، ایک دو فیملیاں سمندر کی لہروں سے کھیلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

رامش خیال اسے دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بار بار مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔ بالآخر آرزو سے رہا نہ گیا۔ پوچھ بیٹھی۔ "آخر اتنا کیوں مسکرا رہے ہیں، کہتے ہیں کہ جو جتنا مسکراتا ہے وہ اتنا ہی غمزدہ ہوتا ہے۔"

"ارے غمزدہ ہوں میرے دشمن..... میں تو اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا ہوں۔"

"خوش قسمت یا بے وقوف۔" آرزو نے ایسے ہی چھیڑا۔

''ہاں...... بے وقوفو ہی کہنا چاہئے...... تمہارے ساتھ جو چل رہا ہوں۔'' رامش خیال کو جانے یہ جواب کیسے سوجھ گیا۔

آرزو چلتے چلتے فوراً رک گئی۔ اس نے ترچھی نظروں سے رامش کو دیکھا اور بولی۔ ''اچھا ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں۔''

''اے خبردار جو مجھے بلی کہا...... میں بلا ہوں۔''

''تو پھر آپ دونوں ٹانگوں پر کیوں کھڑے ہیں؟ چاروں ہاتھ پیروں پر چھلانگ لگائیے نا۔''

''میں تیار ہوں بشرطیکہ بلی بھی ایسا کرنے پر راضی ہو۔''

''اچھا...... آپ کیا کہہ رہے تھے۔'' آرزو خود بخود راہ راست پر آ گئی۔ ''خوش قسمتی کی بات کر رہے تھے!''

''آرزو سچی بات یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے...... ہر لمحے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خواب ہے۔ بس کسی پل آنکھ کھل جائے گی اور میرے تایا اپنی لڑکی کو میرے سامنے لئے کھڑے ہوں گے۔''

''اچھا تو یوں کہیں شکیلہ یاد آ رہی ہے۔''

''مہرو، ٹھیک کہتی ہے۔''

''مہرو، ٹھیک کہتی ہے...... یہ مہرو اچانک کہاں سے درمیان میں آ گئی۔''

''وہ کہتی ہے بعض اوقات آرزو سے بات کرنی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔''

''بکواس کرتی ہے وہ...... آپ اس کی باتوں میں نہ آ جائیے گا...... جانے وہ آپ کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا دے اچھا...... ہاں...... آپ کیا کہہ رہے تھے۔''

''میں کیا کہہ رہا تھا...... بھول گیا۔''

''آپ کو میرا نام معلوم ہے۔''

''ہاں...... کیوں نہیں...... رامش خیال کی آرزو۔'' رامش یہ کہہ کر زور سے ہنسا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سمندر کی لہروں کی طرف بڑھا۔ پھر وہ دونوں پانی میں کافی دور تک چلے گئے۔

اس حسین جوڑی کو دیکھ کر سمندر بڑی گرمجوشی سے ان کی طرف بڑھا۔ ایک بڑی لہر آئی اور وہ دونوں کمر تک بھیگ گئے۔ آرزو کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ وہ تو رامش خیال نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ورنہ امکان تھا کہ وہ نیچے گر جاتی۔

جب لہر واپس گئی تو آرزو کو اپنے دائیں پاؤں میں کوئی چیز لپٹی محسوس ہوئی۔ پانی ابھی اس کے پاؤں تک تھا اس لئے وہ دیکھ نہ سکی کہ کیا چیز ہے۔ جیسے ہی پانی کم ہوا اور اس نے گھبرا کر اپنا پاؤں اوپر

اُٹھایا تو رامش خیال اس کے پاؤں کی طرف دیکھ کر کانپ گیا۔

اس کے پاؤں میں زرد رنگ کا ایک پتلا سا سانپ لپٹا ہوا تھا۔

''آرزو، سانپ۔'' رامش خیال کی ایک دم سٹی گم ہو گئی۔

لیکن آرزو قطعاً پریشان نہ ہوئی، اس نے ٹانگ اُٹھائے اُٹھائے ایک نظر اس سانپ کو دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اسے منہ کے قریب سے پکڑ لیا، پھر اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ کسی چکنی چیز کی طرح آسانی سے کھنچ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ کوئی دو ڈھائی فٹ لمبا سانپ تھا۔ آرزو نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔

اس سارے منظر کو رامش خیال نہیں دیکھ سکا، اس نے آرزو کی ٹانگ سے سانپ کو لپٹا دیکھ کر دیوار کی طرف دوڑ لگا دی تھی، اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر اور ''سانپ، سانپ'' چلا کر دیوار پر بیٹھے گارڈوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ گارڈ ان دونوں ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی انہیں رامش خیال کے شور مچانے کی آواز آئی وہ دیواروں سے چھلانگ لگا کر سمندر کی طرف دوڑ پڑے۔

رامش خیال انہیں آتا دیکھ کر پھر واپس پلٹا...... اب اس کے سامنے ایک نیا ہی منظر تھا۔ اتنی دیر میں آرزو سانپ کو ٹانگ سے کھینچ کر گلے میں ڈال چکی تھی اور وہ قطعاً خوفزدہ نہیں تھی، بڑے آرام سے کھڑی تھی۔

''ارے...... آرزو...... یہ کیا کر رہی ہو...... سانپ کو گلے سے نکال پھینکو...... کاٹ لے گا۔'' رامش خیال بے اختیار چلایا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''سارے سانپ زہریلے نہیں ہوتے...... یہ ایک بے ضرر سانپ ہے۔''

''بے ضرر سہی پر سانپ تو ہے۔ اسے گلے سے نکال پھینکو۔''

''آپ اِدھر آئیں...... اسے ہاتھ میں پکڑ کر دیکھیں۔''

''میں تو کبھی نہ پکڑوں۔'' رامش خیال اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

''آپ نے گارڈوں کو بلاوجہ آواز دے لی...... وہ بے چارے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔''

''آپ کی زندگی کو خطرہ تھا...... میں انہیں بھی نہ بلاتا۔'' رامش خیال نے کہا۔

''اچھا۔ آپ ان گارڈوں کو واپس کریں، میں اس سانپ کو سمندر میں پھینکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر آرزو نے اس سانپ کو گردن سے رسی کی طرح کھینچا اور جاتی ہوئی لہروں کی طرف اُچھال دیا۔ چند لمحوں بعد اس سانپ کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کدھر گیا۔

''کیا ہوا سر؟'' ایک گارڈ رامش خیال کے نزدیک آ کر بولا۔

"بی بی کے پاؤں میں ایک سانپ لپٹ گیا تھا...... وہ انہوں نے پکڑ کر ٹانگ سے چھڑایا اور دوبارہ سمندر میں پھینک دیا۔" رامش خیال نے بتایا۔

رامش خیال کے بتانے پر گارڈوں کو کچھ یقین آیا، کچھ نہ آیا، دونوں نے آرزو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے...... آپ دونوں اطمینان سے واپس جا کر دیوار پر بیٹھیں...... ہم دونوں اندھیرا ہونے سے پہلے گاڑی پر پہنچ جائیں گے۔" آرزو نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"جی بہتر بی بی۔" ایک گارڈ نے کہا اور پھر وہ دونوں واپسی کیلئے مڑ گئے۔

"آپ کو سانپ سے بہت ڈر لگتا ہے۔" آرزو نے رامش خیال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سانپ سے کس کو ڈر نہیں لگتا؟" رامش خیال نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں لگتا۔" آرزو نے ہنس کر کہا۔ "آپ نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔"

"مجھے حیرت ہے۔"

"حیرت کی کوئی بات نہیں...... اصل میں بات یہ ہے کہ جس طرح چہرہ شناس، بندے کا چہرہ دیکھ کر اس کے اچھے برے ہونے کا کسی حد تک اندازہ کر لیتے ہیں...... بالکل اسی طرح جب میں کسی سانپ کو دیکھتی ہوں تو جان جاتی ہوں کہ اس میں کتنا زہر ہے...... یہ بندے کو کس قدر نقصان پہنچا سکتا ہے۔ خطرناک سانپ کو میں جھٹکا دے کر مار سکتی ہوں۔" آرزو نے یہ کہہ کر اچانک رامش خیال کی طرف دیکھا تو وہ اس کی چمکتی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے گھبرا کر اپنا رخ پھیر لیا۔

آرزو مسکرا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

وہ چیخنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ پھر ایک دم ہی اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی آرزو کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی۔ اس نے ایک خواب دیکھا تھا اور خواب میں ڈر کر چیخی تھی۔ اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ کمال رائے نے بھی سن لی تھی۔ کمال رائے کا بیڈروم، آرزو کے بیڈروم سے ملحق تھا۔ کمال رائے بیڈ پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کی آواز سنی۔

وہ فوراً کتاب ایک طرف رکھ کر اپنے کمرے سے باہر آیا اور آرزو کے بند دروازے پر زور سے دستک دی۔

آرزو کے ہوش و حواس بھی ابھی بحال نہیں ہوئے تھے۔ دستک کی آواز سن کر وہ مزید سہم گئی۔ پھر

جب اس نے اپنے باپ کی آواز سنی جو اس کا نام لے کر پکار رہا تھا تو اس کے دل کو ڈھارس ہوئی۔

وہ جلدی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی اور فوراً بند دروازہ کھول دیا۔ کمال رائے فوراً اس کے کمرے میں آ گیا اور بولا۔ "بیٹا...... یہ تمہاری چیخ کی آواز تھی۔"

"جی بابا...... میں خواب میں ڈر گئی تھی۔" آرزو نے سچ بات بتا دی۔

"ارے...... تم نے ایسا کیا خواب دیکھ لیا۔" وہ اس کے بیڈ پر بیٹھتا ہوا بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے نزدیک ہی بٹھا لیا۔

باپ کو نزدیک پا کر اس کا دل ایک دم ہی مضبوط ہو گیا۔ وہ باپ کی تسلی کیلئے تھوڑا سا مسکرائی، پھر بولی۔ "بابا، میں خواب میں ایک دریا کے کنارے کھڑی ہوں۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی ہیں ان میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی...... وہ سب ایک قطار میں کھڑے ہیں، میں بھی اس قطار میں لگ جاتی ہوں اب دریا پر ایک شخص کھڑا ہے۔ جس نے سر سے پاؤں تک کالا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، حتیٰ کہ اس کا چہرہ بھی ڈھکا ہوا ہے وہ لوگوں کو پانی پلا رہا ہے۔ جب میری باری آتی ہے تو میں اس کے نزدیک پہنچتی ہوں اور پانی پینے کی متمنی ہوں لیکن وہ شخص پانی پلانے کی بجائے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے تو میں خوفزدہ ہو کر چیختی ہوں۔" اپنا خواب سنا کر وہ چند لمحوں کو پھر پریشان ہو گئی۔

"وہ آدمی کون ہے......؟ اس کی کوئی شناخت نہیں ہوئی؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"نہیں...... وہ سر سے پیر تک کالے لبادے میں ڈھکا ہوا ہے۔ البتہ وہ ایک قد آور شخص ہے۔" آرزو نے بتایا۔ "بابا، یہ خواب آج میں نے تیسری مرتبہ دیکھا ہے۔"

"بالکل اسی طرح۔" کمال رائے نے سوال کیا۔

"جی۔" آرزو نے جواب دیا۔

"ہر مرتبہ چیختی ہو۔"

"نہیں بابا، اس خواب کو دیکھ کر خوف سے میری آنکھ ضرور کھلتی ہے لیکن چیخی میں آج ہی ہوں۔" آرزو نے بتایا۔

"یہ خواب کب سے دیکھ رہی ہو؟"

"میرا خیال ہے بابا کہ جب سے نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔" آرزو نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" یہ سن کر کمال رائے فکر مند ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھا تم پریشان مت ہو۔ صبح میں کسی سے اس خواب کے بارے میں معلومات کروں گا...... اب یہ بتاؤ...... کیا تم اکیلی سو جاؤ گی یا ستارہ کو اس کے کوارٹر سے بلواؤں۔"

"ارے نہیں بابا...... اب آپ کی بیٹی اتنی ڈرپوک بھی نہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "آپ اطمینان سے جا کر سوئیے...... میں اب نہیں ڈروں گی۔"

"دروازہ اندر سے لاک مت کرنا۔" کمال رائے نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا۔" وہ بولی۔

"اور اگر ڈر محسوس ہو...... نیند نہ آئے تو میرے کمرے میں آجانا...... ٹھیک ہے۔" کمال رائے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"جی اچھا۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"او کے...... گڈ نائٹ۔" کمال رائے دروازے کی طرف بڑھا۔

"گڈ نائٹ بابا۔" وہ کمال رائے کے ساتھ دروازے تک آئی اور پھر اس نے دروازہ بند کر لیا لیکن اندر سے لاک نہیں کیا۔ اس کے بعد اس نے کمرے میں لگی ہر لائٹ جلا دی۔ کمرہ ایک دَم جگمگا گیا۔ پھر وہ بیڈ پر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے۔ جلد ہی اس کی آنکھوں میں نیند اُترنے لگی۔

وہ لٹکتے پردے کے پیچھے سے پھسل کر قالین پر آیا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی ایک مسحور کن خوشبو پھیل گئی۔ جانی پہچانی خوشبو آرزو کی سانس میں شامل ہوئی تو اس نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول لیا اور تکیے سے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، اسے کوئی نظر نہ آیا۔ پھر جب وہ کروٹ بدل کر سیدھی ہوئی تو اس نے پیروں کی طرف سے بیڈ پر آتا ہوا، اسے دیکھ لیا...... وہ ایک سنہرا سانپ تھا۔ وہ رنتارو تھا۔

آرزو کو جاگتا دیکھ کر وہ اپنا پھن پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے حسین چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ آرزو اس کی چمکیلی آنکھوں کے سحر میں آ گئی۔ وہ مسحور ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

آرزو کی آنکھوں میں غبار سا بھرنے لگا، اب وہ اس کے ریشمی جسم پر پھسل رہا تھا اور وہ اپنے آپ سے بےخبر ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں تاریکی پھیلتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے اردگرد کچھ آوازیں سنیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کئی چہرے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ فوراً ہی ان چہروں کو نہ پہچان پائی، اول تو اسے ہوش آتے ہی یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے، جب ذرا حواس بحال ہوئے تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔

پھر اس نے کئی مرتبہ اپنی آنکھیں کھول کر غور سے اپنے اوپر جھکے ہوئے چہروں کو دیکھا۔

ان میں ایک چہرہ اس کے باپ کا تھا، باپ کو پہچانتے ہی اس نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"بیٹا...... لیٹی رہو۔" کمال رائے نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اسے شدید چکر آ رہے تھے اور متلی کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔

"بی بی...... لیں یہ پی لیں؟" ستارہ ہاتھ میں گلاس لئے کھڑی تھی، اس نے آنکھیں کھولتے دیکھ کر آرزو کی طرف لیموں کا پانی بڑھایا...... لیکن وہ اُٹھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ تب اس نے آرزو کا تھوڑا سا سر اوپر اُٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔

پانی پینے کے بعد تھوڑی سی دیر میں اس کی طبیعت سنبھل گئی لیکن اس کے چہرے پر جو زردی چھائی ہوئی تھی، وہ دور نہ ہو سکی۔

کمال رائے اسے بےہوشی کی حالت میں دیکھ کر ایک دَم پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا چاہتا تھا لیکن ستارہ نے اسے روک دیا تھا۔

اس نے کہا تھا۔ "مالک، آپ پریشان نہ ہوں۔ بی بی ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

اور پھر ستارہ نے بڑی مہارت سے اس کا علاج کیا تھا۔ لیموں کا پانی پیتے ہی وہ دو منٹ میں ٹھیک ہو گئی تھی۔

کمال رائے اس کیفیت کو رات کے خواب کا شاخسانہ سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آرزو وہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر کچھ زیادہ ہی دل پر اثر لے گئی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی حسین بیٹی کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے۔

☆......☆......☆

تین چار دن کے بعد آرزو نے پھر وہی خواب دیکھا۔ اس مرتبہ یہ خواب تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دکھائی دیا۔ یہ خواب اس نے رات کے بجائے دن میں دیکھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتی تھی۔ نیند کے اس وقفے میں اسے یہ خواب دکھائی دیا۔

اس نے دیکھا کہ وہ دریا پر لائن میں کھڑی ہے، جب پانی پینے کا اس کا نمبر آتا ہے اور وہ اس کالے لبادے میں پوشیدہ شخص کے نزدیک پہنچتی ہے تو وہ چہرے پر پڑا ہوا کپڑا اچانک اُٹھاتا ہے اور اسے اپنی گرفت میں لے کر کہتا ہے۔ "یاد رکھنا تم میری ہو...... کوئی اور بیچ میں آیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

آرزو اس کی بات سن کر خوفزدہ ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہوتا ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں بڑی کافی دیر تک لمبے لمبے سانس لیتی رہتی ہے۔

جب اس کے حواس بحال ہوتے ہیں تو وہ اس کالے لباس والے شخص کے چہرے پر غور کرتی ہے لیکن اسے کچھ یاد نہیں آتا کہ اس کی شکل کیسی تھی...... اس کے ذہن میں جانے یہ بات کیوں کر نقش

ہو جاتی ہے کہ وہ رہتا رہتا تھا۔ سنہرا سانپ۔

☆......☆......☆

اس دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

آرزو کالج گئی ہوئی تھی۔ سروری کچن میں تھی۔ ستارہ ناشتے سے فارغ ہو کر سروری سے بولی۔

''اماں، میں بی بی کے کمرے کی صفائی کرنے جا رہی ہوں۔''

''جا...... اور بات سن دیواریں وغیرہ اچھی طرح دیکھ لینا...... کوئی جالا والا نہ لگا ہو...... بی بی کو جالے دیکھ کر غصہ آ جاتا ہے۔'' سروری نے ستارہ کو ہدایت کی۔

''اچھا، اماں۔'' ستارہ نے فرماں برداری سے کہا اور پھر آرزو کے کمرے کی طرف چل دی۔

وہ دروازہ کھول کر ابھی کمرے میں گھسی ہی تھی کہ اس کا دل حلق میں آ گیا۔

وہ منظر ہی ایسا تھا۔

کمرے میں ہلکا سا اندھیرا تھا لیکن ایسا اندھیرا نہ تھا کہ کوئی چیز صاف نظر نہ آئے۔

وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پورے کالے لباس سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی جانب تھا۔

جب آرزو نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک دم گردن گھمائی اور پھر فوراً ہی بیڈ سے اُٹھ گیا۔

وہ کوئی لمبا چوڑا شخص تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔

ستارہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی اور وہ وہیں تیورا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

آرزو کالج سے واپس آئی تو اس نے خلاف توقع اپنے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ ستارہ نے کمرے کا دروازہ کھلا کیسے چھوڑ دیا۔

وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک گئی۔

دروازے میں ستارہ بے ہوش پڑی تھی۔

آرزو نے کتابیں جلدی سے بیڈ پر رکھیں اور پھر واپس آ کر ستارہ پر جھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ آرزو نے جلدی جلدی اس کا چہرہ تھپتھپایا اور اس کا نام لے کر پکارا۔

''ستارہ، ستارہ۔''

پھر اچانک اسے جانے کیا خیال آیا، ستارہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اس کی قمیض کا دامن اوپر کھسکایا۔ اس کے پیٹ کو غور سے دیکھنے لگی۔

پیٹ دیکھ کر آرزو نے ایک گہرا سانس لیا...... یہ سکون کا سانس تھا۔

جانے اس کے ذہن میں یہ بات کیوں آئی تھی کہ کہیں ستارہ ڈس تو نہیں گئی۔ یہ خدشہ دور ہوا تو اس

نے اس کی قمیض پھیلا دی۔ پھر اس نے گلاس سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ستارہ آخر اس کے کمرے میں آ کر کیوں بے ہوش ہوئی۔

چند لمحوں بعد اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی تو آرزو نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر آواز دی۔ ''ستارہ...... ستارہ...... آنکھیں کھولو۔''

اس کی آواز سن کر ستارہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ آرزو کا چہرہ دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا پھر جیسے ہی اسے یہ یاد آیا کہ وہ کیا دیکھ کر بے ہوش ہوئی تھی تو وہ گھبرا کر ایک دَم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بی بی۔'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔

''کچھ دیکھا ہے تُو نے کمرے میں۔'' آرزو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، بی بی، ہاں۔'' ایک دَم اس کے چہرے پر گھبراہٹ چھا گئی۔

''پریشان مت ہو۔ اب میں آ گئی ہوں۔ آ بیڈ پر بیٹھ۔'' آرزو نے اسے تسلی دی۔

ستارہ نے آرزو کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر بھی اس نے آرزو کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ اس بات سے آرزو نے اندازہ لگایا کہ وہ بری طرح ڈری ہوئی ہے۔ آرزو نے سائیڈ ٹیبل پر موجود گلاس کے ہاتھ میں دیا۔ ستارہ جلدی جلدی سارا پانی پی گئی اور پھر ڈری ڈری سی نگاہوں سے آرزو کو دیکھنے لگی۔

''پریشان مت ہو۔ مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے۔'' آرزو نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی...... میں آپ کے کمرے میں صفائی کیلئے آئی تھی۔ روز ہی آتی ہوں، یہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن یہاں اس سے پہلے وہ کبھی نظر نہیں آیا تھا۔'' ستارہ ہمت کر کے بولی۔

''وہ کون......؟ سانپ تھا کوئی...... سنہرا سا۔'' آرزو نے اپنا اندازہ پیش کیا۔

''ارے نہیں بی بی...... وہ سانپ نہیں تھا۔ وہ جانے کون تھا۔ یہاں بیٹھا تھا، اس جگہ جہاں اس وقت آپ بیٹھی ہیں۔ اس کا پورا جسم کالے لباس سے ڈھکا ہوا تھا، چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ ایک گھونگھٹ سا نکلا ہوا تھا۔ وہ اُدھر کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر میری طرف آیا۔ میں اتنی خوفزدہ ہو گئی کہ میری چیخ بھی نہ نکلی۔ بس ایک دَم میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں چکرا کر گر پڑی۔'' یہ بتاتے بتاتے ستارہ کی حالت پھر غیر ہونے لگی۔

''ڈرو مت...... اب یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔'' آرزو نے اسے یقین دلایا۔

''اللہ کا شکر ہے بی بی کہ آپ نے میری بات کا یقین کر لیا۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ آپ میری

بات سن کر جانے کتنا ڈانٹیں گی اور اسے میری نظروں کا فریب کہہ کر میرا مذاق اُڑائیں گی۔''

''ستارہ، میں جانتی ہوں کہ تُو سچ کہہ رہی ہے...... تجھے آخر ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا یہ بتا کہ کیا تو نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔''

''نہیں بی بی، چہرہ نہیں دیکھا۔ اس نے گھونگھٹ ڈالے میری طرف گردن موڑی تھی۔''

''اچھا...... اب میری بات غور سے سن۔ تُو یہ بات کسی کو نہیں بتائے گی۔ یہاں تک کہ اپنی اماں کو بھی نہیں۔'' آرزو نے اسے سختی سے تنبیہہ کی۔

''آخر کیوں بی بی؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''اس لئے کہ اس بنگلے میں رہنے والے سارے لوگ پریشان ہو جائیں گے۔ تیری اماں کا تو برا حال ہو جائے گا۔'' آرزو نے اسے سمجھایا۔ ''وہ ویسے ہی جن بھوتوں سے بہت ڈرتی ہے۔''

''ہائے بی بی...... کیا وہ جن تھا؟''

''اللہ جانے۔'' آرزو نے اسے ٹالنے کیلئے کہا۔

''بی بی...... یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں دیکھا۔ میں اتنی دیر سے یہاں بے ہوش پڑی ہوں لیکن اماں کو کچھ ہوش ہی نہیں۔ وہ سمجھ رہی ہو گی کہ میں صفائی ستھرائی میں لگی ہوں اگر وہ مجھے دیکھ لیتی تو پھر یہ بات چھپانی مشکل ہو جاتی۔''

''میں یہ بات بابا کو ضرور بتاؤں گی...... بس اور کسی کو نہیں...... ان کو بتانا بہت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے بی بی جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے بی بی یہ بات سن کر مالک مجھے ڈانٹیں گے تو نہیں۔'' ستارہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہرگز نہیں۔'' آرزو نے پورے یقین سے کہا۔ ''جاؤ، اب تم بھاگو...... کھانے کا انتظام کرو۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

''بی بی آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ منہ ہاتھ دھولیں۔ اتنی دیر میں، میں کھانا نکالے دیتی ہوں۔ آپ ڈائننگ ٹیبل پر آ جائیں۔'' یہ کہہ کر ستارہ اُٹھ گئی۔

کمال رائے اس وقت گھر میں موجود تھا۔ اور ابھی اس نے بھی کھانا کھانا تھا۔ آرزو اسے خود جا کر کمرے سے لے آئی۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد کمال رائے کا قہوہ پینے کا موڈ بنا تو آرزو نے کہا۔ ''بابا، آپ میرے کمرے میں چلیں۔ میں دومنٹ میں قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔''

''اچھا۔'' کمال رائے نے اپنی بیٹی کو خوشگوار حیرت سے دیکھا۔ ''بیٹا خیر تو ہے۔''

''ہاں، بابا...... خیر ہی خیر ہے۔ بس میرا جی چاہ رہا تھا کہ آج خود آپ کو قہوہ بنا کر پلاؤں۔'' آرزو

نے ہنستے ہوئے کہا۔

آرزو کے کچن میں جانے کے بعد کمال رائے اُٹھ کر اس کے کمرے میں آ گیا اور نرم ملائم تکیے کمر کے پیچھے رکھ کر اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کمرے میں ہلکی ہلکی عجیب سی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمال رائے نے دو تین گہرے سانس لے کر اس خوشبو کو شناخت کرنے کی کوشش کی۔ کمال رائے کو پرفیوم استعمال کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے پاس پرفیومز کا نادر خزانہ موجود تھا۔ اس خوشبو کو وہ شناخت نہ کر پایا۔

تھوڑی دیر کے بعد آرزو کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے صوفے کے سامنے پڑی ہوئی شیشے کی میز پر رکھی اور کیتلی سے قہوہ نکالنے لگی۔

جب وہ بہت خوبصورت کپ میں قہوہ لے کر کمال رائے کے پاس آئی تو اس نے کپ تھامتے ہوئے پوچھا۔ ''آرزو، یہ کون سی خوشبو ہے؟''

آرزو نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ کمال رائے کی کسی پرفیوم کی شیشی پر نظر پڑی ہے لیکن اسے کہیں شیشی نظر نہ آئی تو وہ بولی۔ ''کہاں بابا؟''

''یہ جو اس وقت کمرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ کوئی ایئر فریشنر ہے کیا؟''

''نہیں بابا۔'' آرزو نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ خوشبو میرے کمرے میں آتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بہت تیز ہو جاتی ہے۔''

''حیرت ہے۔'' کمال رائے بولا۔

''ہاں بابا...... حیرت ہی حیرت ہے۔ بس بابا، اب حیرتوں کیلئے تیار ہو جایئے۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' آرزو کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ ایک دم چونک گیا۔

''بابا...... آج جب میں کالج سے واپس آئی تو ستارہ مجھے اس کمرے میں بے ہوش ملی۔'' آرزو نے کمال رائے کے پیروں کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہیں۔'' کمال رائے یہ سن کر واقعی حیران رہ گیا۔ ''لیکن مجھے تو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔''

''کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو آپ کو بتاتا...... ویسے اب میں نے ستارہ کو منع کر دیا ہے کہ وہ کسی کو یہ بات نہ بتائے۔''

''ہوا کیا تھا۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''بابا جب وہ کمرے میں صفائی کیلئے آئی تو اس نے یہاں بیڈ پر ایک شخص کو بیٹھا ہوا دیکھا۔''

''ایک شخص کو بیٹھا ہوا دیکھا۔ کون تھا وہ؟'' کمال رائے کی آنکھوں میں غصہ جھلکنے لگا۔ وہ کچھ اور سمجھا۔ وہ سمجھا شاید گھر کے کسی ملازم نے کوئی شرپسندی کی ہے۔

"بابا، وہ شخص، وہ تھا...... جسے میں خواب میں دیکھتی ہوں۔ کالے کپڑوں میں سر سے پیر تک ڈھکا ہوا...... اونچا لمبا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" کمال رائے نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں...... ستارہ کو دیکھ کر وہ ایک دم چونک گیا۔ اس نے ستارہ کی طرف گردن گھمائی اور تیزی سے بیڈ سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔"

"پھر؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بس بابا پھر کیا...... ستارہ کیلئے اتنا ہی بہت تھا۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ چیخنا بھی بھول گئی۔ تیورا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔" آرزو نے بتایا۔

"اوہ...... یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ بیٹا...... یہ کیا ہو رہا ہے۔ تمہارے خواب میں آنے والا شخص تمہارے کمرے میں آ گیا۔ بیٹا...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" کمال رائے فکر مند ہوگیا۔

"بابا...... میں کیا کہوں...... میری خود عقل کام نہیں کر رہی۔"

"اچھا، پھر ایسا کرتے ہیں۔" کمال رائے کی سمجھ میں اچانک ایک بات آ گئی۔ "کل چھٹی ہے۔ بیٹا کل حیدرآباد چلتے ہیں۔ تم میرے ساتھ ہوگی۔ اب اس معاملے میں نور بانو سے مدد لینا ہوگی۔"

☆......☆......☆

کمال رائے آرزو کو لے کر صبح ہی صبح حیدرآباد کیلئے نکل گیا۔ پجیرو میں اس کے ساتھ دونوں مسلح گارڈ بھی تھے۔ گاڑی کمال رائے خود چلا رہا تھا جبکہ ڈرائیور لعل محمد، گارڈوں کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

کمال رائے کو گاڑی اسپیڈ سے چلانے کی عادت تھی۔ اس کی پجیرو اُڑی چلی جا رہی تھی۔ آرزو خاموش بیٹھی تھی۔

یہ دس سال پرانی بات تھی جب کمال رائے نور بانو سے ملا تھا۔ نور بانو نے آرزو کو بازیاب کرا دیا تھا اور ماروی کے جسم کو بھی آزاد کرایا تھا جو ایک اگھوری سادھو اوگھڑ ناتھ کے قبضے میں تھا۔

کمال رائے ایک مرتبہ اس کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا، اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں گیا۔ ویسے نور بانو نے بھی منع کر دیا تھا کہ اب آپ کے مسائل کیونکہ حل ہو چکے ہیں۔ اس لئے آئندہ آنے کی ضرورت نہیں۔ شکر تھا کہ یہ دس سال پرسکون گزر گئے تھے۔ اب پہلی مرتبہ کچھ الجھنیں پیدا ہوئی تھیں۔

یہ کتنی عجیب بات تھی کہ آرزو کو جو شخص خواب میں تواتر کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا، وہ اب مجسم ہو کر اس کے کمرے تک آ پہنچا تھا۔

کمال رائے کو بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا، اسے اصل بات تو معلوم ہی نہ تھی کہ ایک سانپ اس کی بیٹی

کی زندگی کو اجیرن کئے ہوئے ہے۔ وہ اچانک کمرے میں کہیں سے نمودار ہوتا ہے اور اسے ڈس کر چلا جاتا ہے۔ اگر یہ بات آرزو اپنے باپ کو بتا دیتی تو جانے اس کی کیا حالت ہوتی۔

کمال رائے نے نور بانو کے گھر کے نزدیک پہنچ کر پجیرو روک دی۔ اس نے آرزو کو اپنے ساتھ لیا اور ڈرائیور کو گارڈوں سمیت گاڑی میں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔

کمال رائے نے آرزو کو نور بانو کے بارے میں، چلنے سے پہلے کافی بتا دیا تھا۔ آرزو کی اس وقت بڑی ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں بڑی پر تجسس تھی جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی لیکن کام وہ کسی عامل کامل بزرگ کی طرح کرتی تھی۔

کمال رائے کو وہ مکان اب بھی اچھی طرح یاد تھا۔ لہٰذا وہ پورے اطمینان سے نور بانو کے گھر تک پہنچ گیا۔ گھر ویسا ہی تھا البتہ اس پر رنگ و روغن کیا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے کال بیل بجائی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

کمال رائے کو تھوڑی سی حیرت ہوئی کیونکہ وہ جب بھی یہاں آیا اس نے گھر میں کسی مرد کو نہیں پایا تھا۔ دروازہ نور بانو کی والدہ حور بانو نے کھولا یا خود نور بانو دروازے تک آئی تھی۔

کمال رائے کیا جواب دیتا کہ وہ کون ہے؟

باہر سے جواب نہ پا کر آنے والے نے گیٹ کھولا اور ان دونوں کو حیران ہو کر دیکھا اور پھر بولا۔ "جی فرمایئے؟"

وہ ایک پچاس سالہ شخص تھا۔ شلوار قمیض میں ملبوس، نظر کا چشمہ لگائے، صورت سے پڑھا لکھا دکھائی دیتا تھا۔ کمال رائے تھوڑا آگے بڑھا اور بولا۔ "میرا نام کمال رائے ہے، مجھے نور بانو صاحبہ سے ملنا ہے۔"

"نور بانو" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "اوہ شاید آپ سالوں بعد یہاں آئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ نور بانو یہاں نہیں رہتیں۔ انہیں گئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے۔"

"ارے، کہاں گئیں وہ؟" کمال رائے پریشان ہوگیا۔

"چند سال قبل ان کی شادی ہوگئی تھی۔ ان کی شادی کے بعد ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد انہوں نے یہ گھر فروخت کر دیا۔ ہم پہلے ان کے پڑوسی تھے، ہم نے یہ گھر لے لیا۔"

"اب وہ کہاں رہتی ہیں؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"پہلے تو وہ یہیں حیدرآباد میں رہتی تھیں لیکن اب سنا ہے وہ اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب چلی

گئی ہیں۔' اس شخص نے بتایا۔

''اچھا جناب بہت شکریہ.....آپ کو زحمت ہوئی۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔ آپ کہیں دور سے آئے ہیں؟'' اس نے گیٹ کی طرف پلٹتے ہوئے پوچھا۔

''جی.....کراچی سے آئے ہیں۔''

''آپ اگر آرام کرنا چاہیں تو گھر حاضر ہے۔ چائے وغیرہ پی کر چلے جائیے گا۔''

''جی، آپ کی اس عنایت کا شکریہ.....میں اب واپس جاؤں گا۔ میرے پاس گاڑی ہے۔''

کمال رائے کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ بڑی آس لے کر یہاں آیا تھا۔ اسے پوری اُمید تھی کہ نور بانو اس کا یہ مسئلہ ضرور حل کر دے گی.....لیکن وہ تو یہاں سے ہمیشہ کیلئے جا چکی تھی۔ اب اس سے آئندہ ملنے کی کوئی آس بھی نہ رہی تھی۔

''اب کیا کریں آرزو؟'' کمال رائے نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''بابا، روشن گوٹھ چلیں.....مجھے دادی یاد آ رہی ہیں۔ انہیں دیکھے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔'' آرزو نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔'' کمال رائے فوراً ہی روشن گوٹھ جانے کیلئے راضی ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

آرزو اور کمال رائے کو اکٹھا دیکھ کر نفیسہ بیگم کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے اپنی پوتی کو خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ کمال رائے ان دونوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ماں، سارا لاڈ پوتی پر ہی صرف کر دوں گی۔ آخر میں بھی تو ہوں۔''

''ہاں تو کیوں نہیں بیٹا.....آ میرے پاس آ۔'' نفیسہ بیگم نے کہا اور پھر اس کے دونوں بازو پکڑ کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور بولی۔ ''بیٹا تو دبلا ہو رہا ہے۔''

''ماں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ویسے ہر ماں کو اپنا بیٹا کمزور ہی دکھائی دیتا ہے۔'' کمال رائے نے ہنس کر کہا۔

''کیوں بابا؟'' آرزو نے فوراً پوچھا۔

''تا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔''

''کیا ماں کی بھی نظر لگ جاتی ہے۔'' آرزو حیرت سے بولی۔

''میرے خیال سے تو نہیں لگنی چاہئے.....لیکن ماں کا یہی خیال ہے۔'' کمال رائے نے بتایا۔

نفیسہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ہلکا سا گلے لگایا اور بولی۔ ''بیٹا! میں آج بہت خوش ہوں۔''

''کیوں ماں؟''

''تم دونوں کو دیکھ کر.....کل میں نے تم دونوں کو خواب میں دیکھا تھا۔''

''بس ماں.....ہم اسی لئے فوراً آ گئے۔''

جب سے کمال رائے نے اپنی ماں کو منع کیا تھا کہ وہ آئندہ آرزو کیلئے کوئی رشتہ پسند نہ کرے تب سے نفیسہ بیگم ناراض تھی۔ اسے کمال رائے کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کراچی نہیں گئی تھی۔ آرزو تو خیر کبھی بھولے بھٹکے ہی روشن گوٹھ آتی تھی، کمال رائے ضرور چکر لگایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ کمال رائے کو بھی آئے خاصا عرصہ ہو گیا تھا۔ ماں کے رشتہ طے کرنے کے بعد وہ ادھر پھٹکا ہی نہ تھا۔ ان حالات میں نفیسہ بیگم کا خوش ہونا ایک فطری امر تھا۔

آرزو اور کمال رائے کی آمد سے حویلی میں جشن کا سا سماں تھا، حویلی کے نوکر چاکر جو اپنے مالک پر جان دیتے تھے اس کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ آرزو کی موجودگی نے حویلی کے ذرو دیوار کو روشن کر دیا تھا۔ ملازمہ خاص بھاگ بھری اور دوسری ملازمائیں آرزو کو سلام پر سلام کئے جا رہی تھیں۔ وہ بہانے بہانے سے اس کے پاس گھوم رہی تھیں۔ اس سے بات کرنا چاہتی تھیں، اسے دیکھنا چاہتی تھیں۔

نفیسہ بیگم نے طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دے دیا تھا۔ وہ خود بھی بار بار کچن کے چکر کاٹ رہی تھی۔ نفیسہ بیگم نے کمال رائے اور آرزو کو دیکھتے ہی ایک بندہ ارشاد گوٹھ روانہ کر دیا تھا۔ اس نے مائرہ اور اس کے گھر والوں کو بلا بھیجا تھا اور یہ بات اس نے کمال رائے کو نہیں بتائی تھی۔

کھانے سے چند منٹ قبل مائرہ اپنے والدین کے ساتھ آ پہنچی۔ مائرہ کو دیکھ کر کمال رائے کے چہرے پر روشنی پھیل گئی، مائرہ بھی اسے دیکھ کر کھل اُٹھی تھی۔ اس نے آرزو کو بڑی محبت سے گلے لگایا۔ اس کی خیریت پوچھی۔

آرزو خوش ہو کر بولی۔ ''میں ٹھیک ہوں پھپھو، آپ نے تو کراچی آنا ہی چھوڑ دیا۔''

''کیا کریں بھئی.....کوئی بلاتا ہی نہیں۔'' مائرہ مخاطب تو آرزو سے تھی لیکن روئے سخن کمال کی طرف تھا جو نزدیک ہی بیٹھا تھا۔

آرزو بھلا کہاں چوکنے والی تھی اس نے یہ بات فوراً نوٹ کر لی اور اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بابا، سنا آپ نے، پھپھو آپ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہیں؟'' کمال رائے نے انجان بن کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' مائرہ نے فوراً مداخلت کی۔

''یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ انہیں کراچی بلاتے ہی نہیں۔''

''بیٹا......ان سے کہہ دو، وہ گھر ان کا اپنا ہے...... جب جی چاہے آئیں جتنے دن چاہیں رہیں۔'' کمال رائے نے سادگی سے کہا۔

''پھپھو اب تو آپ کو دعوت مل گئی......اب تو آپ آئیں گی نا۔'' آرزو شرارت سے بولی۔

''ایسی زبردستی کی دعوت کا کیا فائدہ۔'' مائرہ نے کمال رائے کی طرف دیکھے بنا کہا۔

''چلو بھئی...... کھانا لگ گیا ہے...... سب آجاؤ۔'' نفیسہ بیگم نے اعلان کیا تو بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

کھانے کیلئے فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا سب نے مل کر کھانا کھایا۔ آرزو کو کھانے کی اس نشست میں بڑا مزہ آیا۔ کراچی میں تو بس وہ دو آدمی ہی میز پر ہوتے تھے اور کبھی کبھی آرزو ہی اکیلی ڈائننگ ٹیبل پر ہوتی تھی۔ اسے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہنے اور بہت لوگوں کے ساتھ کھانے کا بہت شوق تھا۔

کھانے کے بعد رات دیر گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جب کمال رائے کو نیند آنے لگی تو وہ اپنے کمرے میں سونے کیلئے چلا گیا۔ اس حویلی میں کمروں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن آرزو نے اپنی دادی کے ساتھ سونا پسند کیا۔

آرزو اور نفیسہ بیگم کے ساتھ مائرہ بھی رہی۔ وہ لوگ صبح کے چار بجے تک باتیں کرتے رہے۔ جب آرزو نیند سے بالکل نڈھال ہونے لگی تو مائرہ اُٹھ کر چلی گئی۔

دیر تک جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آرزو صبح دیر تک سوتی رہی۔ نفیسہ بیگم اگرچہ جلدی اُٹھ گئی تھی لیکن اس نے آرزو کو اُٹھانے کی کوشش نہ کی۔

کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ کھڑکی میں وقت دیکھا تو وہ گھبرا کر بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔ واش روم میں منہ ہاتھ دھو کر وہ کمرے سے نکلی اور تلاش کرتی ہوئی وہ کمال رائے کے کمرے میں پہنچ گئی۔

کمال رائے اُٹھ چکا تھا اور نفیسہ بیگم سے محو گفتگو تھا۔

''لو ہاں وہ آرزو بھی آگئی۔'' کمال رائے اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بولا۔

آرزو نے باری باری دونوں کو سلام کیا اور اپنے باپ کے بیڈ پر اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

''کہو بھئی رات کو نیند آ گئی تھی۔''

''بابا...... رات کو بڑا مزہ آیا۔ خوب باتیں کیں۔ مائرہ پھپھو بڑی مزے کی باتیں کرتی ہیں اور دادی نے پرانے قصے سنائے جانے کہاں کہاں کے...... بابا، بہت اچھا لگا۔'' آرزو خوش ہو کر بولی۔

''پھر بیٹا...... ایسا کرتے ہیں...... اِدھر ہی رہ جاتے ہیں۔ چھوڑو پڑھائی وڑھائی۔'' کمال رائے

نے ہنس کر کہا۔

''بابا......ایسی باتیں نہ کریں۔ میں اپنی پڑھائی نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''تو کون کہہ رہا ہے...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''بابا، قبرستان چلیں؟'' اچانک آرزو کو جانے کیا خیال آیا۔

''کیوں، خیریت؟'' کمال رائے نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''میں امی کی قبر پر جانا چاہتی ہوں۔ رات کو میں نے انہیں خواب میں دیکھا تھا۔''

''ٹھیک ہے، بیٹا...... ناشتہ کر لیں، پھر چلتے ہیں۔''

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ آرزو کو اپنے ساتھ لے کر قبرستان آ گیا۔ اس نے گاڑی قبر کے نزدیک ہی روکی۔

ماروی کی قبر ایک اونچی جگہ پر چار دیواری کے اندر اور سرسبز درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔

آرزو، قبر کے سرہانے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

کمال رائے نے ماروی کی قبر سے چند سوکھے پتے اُٹھا کر ایک طرف پھینکے اور پھر آرزو کے نزدیک کھڑے ہو کر فاتحہ کیلئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

فاتحہ سے فارغ ہو کر جب اس نے آرزو کو دیکھا تو وہ ابھی تک سر جھکائے بیٹھی نظر آئی۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور دھیرے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

آرزو نے فوراً اپنا سر اُٹھایا اور اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ کمال رائے نے اپنی بیٹی کے آنسو اپنے ہاتھ سے صاف کئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قبر کی چار دیواری سے نکل آیا۔ وہ اگر وہاں کچھ دیر اور ٹھہر جاتا تو اس بات کے امکانات تھے کہ اس کی آنکھیں بھی بھیگ جاتیں۔

کمال رائے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے چاہا کہ وہ آرزو سے تسلی آمیز کلمات کہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہے تو کیا کہے۔

ابھی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک دم آرزو نے کہا۔ ''بابا وہ۔''

کمال رائے نے گاڑی کا دروازہ چھوڑ کر اس طرف دیکھا جدھر آرزو دیکھ رہی تھی۔

سامنے ایک درخت کی اوٹ میں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس شخص کا آدھا جسم نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک آنکھ سے ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' کمال رائے نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ پہلے تو یہاں نہیں تھا۔''

''ہاں، جب ہم آئے تھے اس وقت تو یہاں کوئی نہ تھا۔''

"کوئی فقیر ہے شاید۔" کمال رائے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" آرزو بولی۔

"بیٹا...... تم گاڑی میں بیٹھو...... میں دیکھتا ہوں۔"

کمال رائے اس درخت کی طرف بڑھا۔ وہ درخت کوئی بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھا۔ درخت کے نزدیک پہنچنے تک وہ شخص ٹس سے مس نہ ہوا۔ یونہی درخت کی اوٹ میں کھڑا ایک آنکھ سے اسے اپنے نزدیک آتا دیکھتا رہا۔ نہ ڈرا، نہ سہما، نہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔

جب کمال رائے بالکل نزدیک پہنچ گیا تو اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔

"کون ہو تم؟"

"اللہ کے بندے ہیں اور کون ہیں؟" وہ شخص پرسکون لہجے میں بولا۔

"یہاں چھپے کیوں کھڑے ہو؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"چھپے تو نہیں کھڑے...... چھپائے کھڑے ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"کیا چھپائے کھڑے ہیں؟" سوال ہوا۔

"اپنی ذات اور کیا؟" عجیب جواب ملا۔

"ارے بھئی...... یہ کس قسم کی بات کر رہے ہو۔" کمال رائے نے اُلجھ کر کہا۔

"اتنی سیدھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی تو ہم کیا کریں۔" وہ شخص بدستور درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔

"اس قبرستان میں کھڑے ہونے کی وجہ کیا ہے؟"

"جانتے ہیں کہ یہ تمہارا آبائی قبرستان ہے۔ ہمیں یہاں تم سے پوچھ کر کھڑا ہونا چاہئے...... لیکن تم بھی جان لو کہ اس قبرستان میں تمہارا باپ دفن ہے...... کل تم نے بھی یہیں آنا ہے۔ تمہارا باپ اپنی زمینوں پر بہت اکڑتا تھا، دیکھ لو اسے تین گز زمین سے زیادہ میسر نہیں...... کل کو تمہیں بھی یہی کچھ ملنا ہے۔"

"بابا جی...... معذرت چاہتا ہوں...... میرا یہ ہرگز مطلب نہ تھا۔"

"جا معاف کیا...... اس بچی کی خبر لو...... یہ بہت مشکل گھڑی ہے۔"

"میں کیا کروں بابا جی...... کچھ آپ بتائیں۔"

"ارے ہم سے کیا پوچھتا ہے۔ ہم یہاں ہیں، اس سے جا کر پوچھ جو تیرے علاقے میں ہے۔" وہ بولا۔

"کون بابا...... کس سے پوچھوں؟" کمال رائے نے تعجب سے پوچھا۔

"جس شہر سے آیا ہے، وہاں کی بات کرتے ہیں...... وہ وہاں بیٹھا ہے، اسے اکبر اسپتال کی دیوار کے زیر سایہ تلاش کر۔" اس پراسرار شخص نے ہدایت کی۔

"میں کیسے پہچانوں گا؟"

"اس زبردست کی بڑی آسان پہچان ہے۔ ایک بلی کا بچہ ہوتا ہے اس کے پاس۔"

"اچھا...... ان سے کیا کہوں؟"

"کچھ نہ کہہ...... بس تعاقب کر اور اس وقت تک تعاقب کر جب تک وہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھ لے اور تجھ سے مخاطب نہ ہو جائے۔ وہی اس مسئلے کا حل بتائے گا۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔ اس بچی کا خیال رکھنا۔ اس کے اردگرد خطرناک مخلوق منڈلا رہی ہے...... اللہ رحم کرے۔" یہ کہہ کر وہ شخص تنے کے پیچھے پورا چھپ گیا۔

"بابا جی...... میری بات تو سنیں۔" کمال رائے نے جلدی سے کہا۔

خطرناک مخلوق کا نام سن کر کمال رائے کا دھیان اس کالے لبادے والے کی طرف چلا گیا تھا جو آرزو کو پہلے خواب میں اور پھر ستارہ کو کمرے میں نظر آیا تھا۔ آخر وہ کون ہے؟ اور کیا چاہتا ہے۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا۔

اس درخت کے پیچھے سے جب کوئی جواب نہ آیا اور نہ ہی وہ شخص دوبارہ نمودار ہوا تو کمال رائے نے آگے بڑھ کر اسے تلاش کیا لیکن اب وہاں کوئی نہ تھا۔ کمال رائے نے درخت کے چاروں طرف چکر لگایا لیکن وہ اس شخص کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ وہاں کوئی ہوتا تو ملتا۔

پھر کمال رائے آرزو کے پاس آیا۔ آرزو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی سامنے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ کمال رائے نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس سے پوچھا۔ "آرزو، کیا تم نے اس شخص کو دیکھا؟"

"ہاں بابا دیکھا...... لیکن وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا؟ میں مسلسل اس پر نظریں رکھے ہوئے تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ میں نے اسے درخت کے پیچھے سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"عجیب آدمی تھا اور عجیب گفتگو کر کے چلا گیا۔ ویسے بیٹا...... اللہ تم پر مہربان ہے۔ نور بانو نہ ملی تو اس نے تمہارے لئے کوئی اور ذریعہ پیدا کر دیا۔ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، اللہ انہیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔"

"بے شک بابا...... آپ نے بالکل ٹھیک کہا...... اللہ پر مجھے کامل یقین ہے۔" آرزو نے بڑے یقین سے کہا۔

☆......☆......☆

کمال رائے جب اکبر ہسپتال پہنچا تو اسے وہ دور ہی سے نظر آ گیا۔ وہ گیٹ کے نزدیک ہی دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں جانب ایک پھٹا سا بیگ رکھا تھا۔ اس بیگ کے اوپر ہی ایک بلی کا بچہ بیٹھا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمزور بلی کا بچہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے اسے کچھ کھانے کو نہ ملتا ہو۔ وہ سفید رنگ کا تھا۔ اس کے دونوں کان اور دُم البتہ کالے رنگ کی تھی اس کے گلے میں ایک ڈوری تھی اور اس ڈوری میں ایک گھنگھرو بندھا تھا۔

وہ ایک سانولے رنگ کا شخص تھا۔ اس کا حلیہ فقیروں جیسا تھا۔ میلے سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُدھیڑ عمر کا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال بالکل کالے تھے۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے سڑک کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک چورنگی تھی لیکن اس کی نظریں چورنگی پر نہیں تھیں، وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

کمال رائے نے اپنی گاڑی فٹ پاتھ کے ایک جانب پارک کر دی اور اس شخص کو ایک طرف ہو کر غور سے دیکھنے لگا۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔ سورج مغرب کی جانب تیزی سے گامزن تھا۔

قبرستان والے بابا نے کمال رائے سے کہا تھا کہ اس شخص کا تعاقب کرنا ہے اور اس وقت تک تعاقب کرنا ہے جب تک وہ پلٹ کر نہ دیکھ لے اور اس سے مخاطب نہ ہو جائے۔

سوال یہ تھا کہ وہ اس کا تعاقب کیوں کر کرے، وہ تو پورے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ بس وہ سامنے کی طرف دیکھے جاتا تھا۔ نہ تو وہ منہ سے مانگ رہا تھا اور نہ اس نے دست سوال پھیلایا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کوئی کٹورا رکھا تھا، نہ ہی اس نے کوئی کپڑا پھیلایا ہوا تھا، وہ عجیب قسم کا فقیر تھا۔

کمال رائے کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس وقت یہاں سے اُٹھتا ہے۔ اُٹھتا ہے یا یہیں پڑ کر سو جاتا ہے۔ قریب ہی ایک جوس والے کا ٹھیلا لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس جوس والے سے کچھ معلومات کرے۔ وہ ٹہلتا ہوا اس جوس والے کی طرف بڑھا۔ اس جوس والے سے معلومات کرنے کیلئے ضروری تھا کہ اس سے جوس لیا جائے۔ وہ کینو کا جوس فروخت کر رہا تھا۔ جس انداز سے وہ جوس نکال رہا تھا اور جن گلاسوں میں وہ جوس فروخت کر رہا تھا کمال رائے کیلئے ایسا گندا جوس پینا بڑا مشکل تھا ...... لیکن اس بابا کے بارے میں غیر محسوس طریقے سے معلومات کرنے کیلئے جوس والے کے پاس کھڑا ہونا ضروری تھا۔

اس نے ایک گلاس جوس کا آرڈر دے دیا اور جوس والے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”بھئی یہ بابا بھی خوب ہیں۔ اس بلی کے بچے کو کچھ کھلاتے پلاتے بھی ہیں؟ بچہ کیسا سوکھا ہوا ہے؟“

”صاحب جی ...... اس کے بیگ میں روٹی ہوتی ہے۔ بس وہی اس کو کھلاتا رہتا ہے۔“ جوس والے نے ہنس کر کہا۔

”یہ بابا اسی طرح بیٹھا رہتا ہے۔“ کمال رائے اپنے مطلب کی گفتگو کی طرف چلا۔

”ہاں، صاحب جی ...... یہ صبح سے شام تک اسی انداز میں بیٹھا رہتا ہے۔ یہ کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں ...... ایک دو بار میں نے جوس دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ تو کسی سے کچھ مانگتا نہیں لیکن میں نے کسی شخص کو اسے بھیک دیتے ہوئے بھی نہ دیکھا جبکہ اس فٹ پاتھ سے صبح سے شام تک ہزاروں لوگ گزرتے ہیں۔“ جوس والے نے کمال رائے کو جوس بھرا گلاس دیتے ہوئے بتایا۔

”بڑے کمال کی بات ہے۔“ کمال رائے نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بابا، رات کو یہیں سوتے ہیں۔“

”نہیں جی ...... مغرب سے ذرا پہلے یہ اُٹھ جاتا ہے۔ وہ جو سامنے آپ پل دیکھ رہے ہیں اس طرف یہ کہیں جاتا ہے۔ پل کے دوسری طرف ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں کہیں اس کا بسیرا ہے۔“ جوس والے نے بتایا۔

کمال رائے خوش ہو گیا۔ بس اسے اتنا ہی تو معلوم کرنا تھا کہ وہ یہاں سے کس وقت اُٹھتا ہے۔ مغرب ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ اتنا وقت تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آرام سے گزار سکتا تھا۔

پھر اس نے اپنی گاڑی ایسی جگہ پارک کی جہاں سے وہ اس بابا پر نظر رکھ سکے۔ پھر اس نے ڈیک میں غزلوں کا کیسٹ لگایا اور آرام سے سننے لگا۔

مغرب سے ذرا پہلے بلی والے بابا نے اپنا بیگ اُٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ وہ بلی کا بچہ بیگ کے اندر تھا اور آرام سے منہ نکالے بیٹھا تھا۔ پھر وہ ایک طرف چل دیا۔ اس کا رخ سامنے پل ہی کی طرف تھا۔

جب وہ بلی والا اس کے سامنے سے گزر گیا تو کمال رائے گاڑی سے نکل آیا۔ اس نے گاڑی لاک کی اور اس کے تعاقب میں چل دیا۔

سڑک پار کر کے اس بابا نے پل کا راستہ اختیار کیا۔ وہ اپنی دُھن میں مگن سیدھا چلا جا رہا تھا۔ کمال رائے اس سے دس قدم پیچھے تھا۔

پل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی اس نے رُک کر یا پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ پھر وہ پل بھی کراس کر گیا۔ پل کی سیڑھیاں اُترنے سے پہلے بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ حالانکہ کمال رائے اس کے بہت نزدیک تھا۔

پل کے نزدیک ہی کچھ جھونپڑیاں تھیں۔ جھونپڑیوں کے سامنے کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ وہ ان بچوں کے قریب سے گزر کر جھونپڑیوں کے درمیان بنے ایک چھوٹے سے راستے میں داخل ہو گیا۔ یہ

راستہ چند قدم کے بعد ہی دائیں جانب مڑ جاتا تھا۔ وہ بابا دائیں جانب مڑ گیا۔

اب کمال رائے کا آگے جانا فضول تھا۔ وہ جھونپڑیوں میں تو داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ آیا۔ اس نے قبرستان والے بابا کی ہدایت پر پورے طور پر عمل کیا تھا لیکن بلی والے بابا نے اس سے مخاطب ہونا تو دور کی بات ہے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

وہ پورے چاند کی رات تھی۔

رات کی رانی کی مسحور کن خوشبو پورے بنگلے میں پھیلی ہوئی تھی، آرزو ستارہ کے ساتھ لان پر ٹہل رہی تھی۔ آرزو کو چپ سی لگی تھی۔ ستارہ نے ایک دو مرتبہ اِدھر اُدھر کی بات چھیڑنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن آرزو نے "ہوں" "ہاں" کے سوا کوئی جواب نہ دیا تو پھر ستارہ نے مزید بولنے کی جرأت نہ کی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس وقت "بی بی" کا بولنے کا موڈ نہیں ہے۔

پون گھنٹہ ٹہلنے کے بعد آرزو اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس پر کچھ تھکن سی طاری تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنے بیڈ پر دھم سے گر گئی اور اپنے ہاتھ پاؤں آرام دہ انداز میں پھیلا لئے۔

آج شام ہی سے اس کے دل کو قرار نہیں تھا۔ بے چینی سی تھی۔ ایک بے نام سی خلش تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ بس کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔

بیڈ پر لیٹ کر اسے کچھ سکون سا ملا...... لیکن یہ سکون پانچ سات منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔ پھر وہی بے قراری شروع ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے اور وہ اس چیز کی تلاش میں ہے لیکن نہ تو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی کیا چیز گم ہوئی اور نہ یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس چیز کو کہاں تلاش کر رہی ہے۔

وہ چاہ رہی تھی کہ کوئی آئے...... لیکن کون آئے اور کیوں آئے، معلوم نہ تھا۔

اسے پیاس لگ رہی تھی لیکن اس کا دل پانی پینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ چائے کافی کا بھی موڈ نہ تھا۔

وہ کچھ چاہ رہی تھی لیکن کیا چاہ رہی تھی اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

پھر اچانک ہی کسی نے کان کے نزدیک سرگوشی سی کی۔ جیسے کسی نے کہا ہو۔ "جاؤ، نہا لو۔"

آرزو نے فوراً اپنے تکیے کے دائیں بائیں رُخ موڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا...... لیکن یہ آواز اس کے اندر گھسی چلی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ واش روم میں جانے کیلئے مجبور ہو گئی۔

جب وہ نہا کر باہر نکلی تو اس کے دل کو کسی حد تک چین آ گیا تھا۔ پھر وہ شب خوابی کے لباس میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سکھاتی رہی اور گاہے بگاہے آئینے میں بھی دیکھتی رہی۔ تب اچانک

اسے احساس ہوا کہ وہ کسی کے انتظار میں ہے...... لیکن کس کا انتظار......؟ یہ اسے معلوم نہ تھا۔

اسی وقت کمرے میں ایک مسحور کن خوشبو پھیل گئی۔ یہ خوشبو اس کی جانی پہچانی تھی۔ اس خوشبو کو محسوس کر کے اس کے دل کو قرار آنے لگا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

رنسارو بیڈ پر پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔

☆......☆......☆

ستارہ بہت سارے جتن کر کے تھک گئی اور آرزو نے اپنے کمرے کا دروازہ نہ کھولا تو پھر وہ مجبور ہو کر کمال رائے کے پاس چلی گئی۔ کمال رائے اس وقت بنگلے میں ہی موجود تھا۔ اس نے ستارہ کو پریشان حال کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو فوراً رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ "کیا ہوا؟"

"مالک...... وہ بی بی...... دروازہ نہیں کھول رہی ہیں؟" ستارہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"ارے......" کمال رائے نے فوراً گھڑی پر نظر ڈالی۔ "بارہ بج رہے ہیں۔ وہ ابھی تک سو رہی ہے۔ کالج بھی نہیں گئی۔"

"میں انہیں اُٹھانے کے سارے جتن کر چکی ہوں لیکن آج تو وہ اُٹھ ہی نہیں رہیں۔"

"اچھا...... ٹھہرو۔" کمال رائے نے دروازے سے چابی نکالی اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

کمال رائے نے احتیاطاً آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا تو دروازے پر دستک دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ ملا تو اس نے چابی سے دروازہ کھول لیا۔

پھر وہ بہت تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔

آرزو بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ وہ آدھی بیڈ پر تھی اور آدھی بیڈ سے نیچے تھی۔ اس کا شب خوابی کا لباس بے ترتیب تھا۔ ستارہ نے بھاگ کر الماری کھولی اور آرزو کو چادر سے ڈھک دیا۔ پھر کمال رائے نے اسے بیڈ پر سیدھا کر کے لٹایا اور ستارہ سے بولا۔ "جاؤ، ڈرائیور سے کہو، گاڑی نکالے۔"

پھر کمال رائے نے آرزو کا منہ تھپتھپایا۔ اسے دھیرے دھیرے آوازیں دیں۔ "آرزو...... آرزو بیٹا آنکھیں کھولو۔"

اتنی دیر میں سروری گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "ہائے، کیا ہوا بی بی کو۔"

"پتا نہیں...... سروری...... تم اس کے کپڑے تبدیل کرو...... میں اسے اسپتال لے کر جاتا ہوں۔"

☆......☆......☆

ہسپتال میں ڈاکٹروں کی دو تین گھنٹوں کی کاوشوں کے بعد آرزو کو بمشکل ہوش آیا۔

ہوش میں آتے ہی اس نے جو سب سے پہلی بات کہی وہ ہوش اُڑا دینے والی تھی۔

کمال رائے کے آخر ہوش کیسے نہ اُڑتے؟ تین دن کے بعد آرزو کا نکاح ہونے والا تھا اور اس نے ہوش میں آتے ہی کہا تھا۔ ''بابا میرا نکاح نہ کریں...... میں اب شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

یہ بھی اچھا تھا کہ اس وقت کمرے میں کوئی اور نہ تھا۔ یہ بات صرف کمال رائے نے سنی تھی۔ وہ اس مسئلے کو سنبھال سکتا تھا۔ اگر یہ بات کسی اور نے سنی ہوتی تو وہ جانے کیا سوچتا۔ شاید اس کے ذہن میں پہلا سوال یہی آتا کہ وہ زبردستی اپنی بیٹی کا نکاح کر رہا ہے اور بیٹی اس صدمے کو برداشت نہیں کر رہی ہے۔ اسپتال کا عملہ اس کے بارے میں جانے کیا سوچتا...... اور یہ بھی اچھا تھا کہ اس وقت رامش یا اس کی بہن موجود نہ تھی ورنہ ابھی کیا سے کیا ہو جاتا۔ کمال رائے نے اس کی بات سن کر کسی گہرے تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ''اچھا بیٹا...... دیکھیں گے۔ جیسا تم کہو گی، ویسا ہی ہوگا...... گھر چل کر بات کریں گے۔''

ڈاکٹر نے طاقت کی دوائیں لکھ کر آرزو کو رخصت کر دیا۔ اس کے خیال میں کوئی بیماری نہ تھی۔ بس نقاہت تھی تو اس نے نقاہت دور کرنے کیلئے طاقت عطا کرنے والی دوائیں تجویز کر دی تھیں۔ کمال رائے اسے لے کر گھر آ گیا تھا۔

شام تک اس کی حالت بڑی حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ البتہ اس کے چہرے کی زردی ابھی برقرار تھی۔ کمال رائے نے اس کی بے ہوشی اور ہسپتال لے جانے کی اطلاع مہرو کو نہیں دی تھی۔ وہ خواہ مخواہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا...... لیکن جب آرزو کالج نہیں پہنچی تو مہرو سے نہیں رہا گیا۔ اس نے کالج سے آنے کے بعد فوراً ٹیلی فون کیا۔

آرزو اسی وقت اسپتال سے گھر پہنچی تھی۔ کمال رائے نے ستارہ سے کہلوا دیا کہ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ سو رہی ہیں۔ تب مہرو نے ستارہ سے کہا کہ وہ شام کو اسے دیکھنے کے لئے آئے گی۔

اور پھر رامش خیال کے ساتھ آ پہنچی تھی۔ کمال رائے اس وقت آرزو کے کمرے میں موجود تھا۔ ان دونوں کی آمد کی اطلاع ملی تو کمال رائے نے آرزو سے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے ان دونوں کو یہیں بلوا دیں یا ڈرائنگ روم میں چلیں۔''

''آرزو فوراً بولی۔ ''نہیں بابا...... ڈرائنگ روم میں چلیں۔''

تب کمال رائے نے ستارہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور سروری سے کہو چائے کا انتظام کرے۔''

''جی ٹھیک ہے مالک۔'' ستارہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ستارہ کے جانے کے بعد آرزو بھی کھڑی ہوگئی اور کمال رائے سے بولی۔ ''بابا، آپ چلیں...... میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔''

''اچھا، ٹھیک ہے...... بیٹا!'' کمال رائے بولا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔

وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ آرزو نے ہوش میں آتے ہی شادی سے انکار کیا تھا اور کمال رائے نے اسے ٹالنے کیلئے ہامی بھر لی تھی کہ وہ جیسا کہے گی ویسا ہی ہوگا۔ پھر اس موضوع پر اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اگر موقع ملا بھی تھا تو اس کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ اس سے اس موضوع پر بات کرے۔ یہ اچانک تبدیلی کمال رائے کی سمجھ سے باہر تھی۔

اب سرِدست یہ پریشانی تھی کہ وہ دونوں آئے ہوئے تھے اگر آرزو نے ان کے سامنے کوئی ایسی بات کر دی تو معاملہ ایک دم سنگین ہو جائے گا۔ کمال رائے چاہتا تھا کہ پہلے آرزو سے اس موضوع پر کھل کر بات ہو جائے اس کے بعد موقع محل دیکھ کر وہ ان لوگوں سے بات کرے گا۔ ابھی نکاح میں تین دن باقی تھے۔ مسئلہ سنبھالنے کے لئے نکاح کی تاریخ کسی بہانے بڑھائی جا سکتی تھی۔

وہ کائنات کے مالک سے خیر کی دعائیں مانگتا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

وہ دونوں اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے اسے سلام کیا۔ کمال رائے نے ان دونوں کو اچھی طرح خوش آمدید کہا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''انکل آرزو کیسی ہے؟'' مہرو کے لہجے میں پریشانی تھی۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''ابھی منہ ہاتھ دھو کر آ رہی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ کمزوری اسے خاصی ہے۔''

''یہ آرزو کو اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے بھی اس کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ ایک دم پیلی ہوگئی تھی۔'' مہرو فکرمندی سے بولی۔

''بیٹا...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا...... ڈاکٹر بس کمزوری بتاتے ہیں۔'' کمال رائے نے بتایا۔ اتنے میں آرزو ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر کمال رائے بولا۔ ''لو، وہ آ گئی۔''

رامش خیال اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پرخلوص لہجے میں پوچھا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' آرزو نے نیچی نگاہیں کر کے آہستہ سے جواب دیا۔

مہرو اسے دیکھ کر آگے بڑھی۔ اسے اپنے گلے لگایا اور ہنس کر بولی۔ ''کیا مشکل ہے، کیوں پریشان کر رہی ہے۔''

آرزو نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی اور اس سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''مہرو تمہارا کیا حال ہے؟''

مہرو اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''میں یہاں اپنا حال بتانے نہیں آئی، تمہارا حال سننے آئی ہوں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بغیر مسکرائے بولی۔

"لیکن مجھے تو تم ٹھیک نظر نہیں آ رہیں۔فریش ہو کر آنے کے باوجود فریش نظر نہیں آ رہی ہو۔"

"چائے آ رہی ہے......بس چائے پیتے ہی چاق و چوبند ہو جاؤں گی۔" آرزو نے بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی۔

مہرو نے آرزو کو غور سے دیکھا۔اسے آرزو کا لہجہ، اس کا رویہ کچھ بدلا ہوا محسوس ہوا۔وہ سمجھ نہ پائی کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ہو سکتا ہے وہ غلط سوچ رہی ہو۔بعض اوقات طبیعت کی خرابی کی وجہ سے بھی آدمی کا رویہ بدل جاتا ہے۔آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔

اتنے میں چائے آ گئی تو سب لوگ چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

چائے پیتے ہوئے کمال رائے رامش خیال سے محو گفتگو ہو گیا اور مہرو، آہستہ آہستہ آرزو سے بات کرنے لگی۔پھر وہ دونوں اُٹھ گئیں۔

"بابا، میں کمرے میں جا رہی ہوں۔" آرزو، کمال رائے سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اچھا، بیٹا۔" کمال رائے نے آرزو کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

آرزو کے ساتھ مہرو بھی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

اب کمرے میں پہنچ کر آرزو دھم سے بیڈ پر گری اور تکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز سی ہو گئی۔پھر اس نے مہرو سے کہا۔"بیٹھو، مہرو۔"

"آرزو تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے کیا؟" وہ اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"پھر تم نڈھال سی کیوں لگ رہی ہو۔" مہرو نے پوچھا۔

"کمزوری ہے نا......ذرا بیٹھتی ہوں تو تھک جاتی ہوں۔"

"اچھا تم آرام سے لیٹ جاؤ۔" مہرو نے اس کے پاؤں پکڑ کر پھیلانے کی کوشش کی۔

"بس میں آرام سے ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آرزو خود کو چھپانا چاہ رہی ہو۔وہ مہرو سے جو کچھ کہنا چاہتی تھی وہ کچھ کہنے کیلئے اپنے اندر ہمت نہ پاتی تھی۔وہ اپنی آنکھیں بند کر کے ہی کچھ کہہ سکتی تھی۔

"آرزو......کیا بات ہے......تم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کیوں رکھ لیا۔"

"مہرو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، کہو آرزو......کیا بات ہے؟"

"دیکھو مہرو، میری بات کا برا نہ ماننا۔"

"ارے......آخر ایسی کیا بات ہے......کہو، میں بھلا کیوں برا مانوں گی۔"

"میں تمہارے بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" آرزو نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے رکھے بڑی آہستگی سے کہا۔

آرزو کی بات سن کر مہرو کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو۔ایک بے آواز چیخ اس کے وجود میں گونجی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے آرزو کو دیکھنے لگی۔

پھر اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔"آرزو تم نے کیا کہا......کیا یہ کہا کہ تم میرے بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔آرزو خدا کے واسطے تم فوراً تردید کر دو۔تم نے یہ نہیں کہا۔تم ایسا نہیں کہہ سکتیں۔"

"ہاں، مہرو......تم نے صحیح سنا ہے، میں نے یہی کہا ہے کہ میں تمہارے بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"آخر کیوں؟" مہرو ایک دم چیخ اُٹھی۔وہ بے قابو ہو گئی۔اس سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"پتہ نہیں۔" آرزو نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ میرا بھائی تمہارا انکار سنے گا تو مر جائے گا۔"

"مہرو میں مجبور ہوں، تم اپنے بھائی کو سنبھال لینا......سمجھا لینا۔" آرزو نے کہا۔

"تین دن کے بعد تمہارا نکاح ہے۔ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔میرا بھائی کس قدر خوش ہے تم نہیں جانتیں......آرزو، سچ بتاؤ۔کیا معاملہ ہے۔کیا تایا لوگوں کی طرف سے کوئی دھمکی وغیرہ ملی ہے۔" مہرو کا دھیان فوراً اپنے تایا راجہ وقار کی طرف گیا۔

"نہیں آرزو......میں یا میرا باپ کسی تایا سے ڈرنے والے نہیں۔"

"پھر میرے بھائی کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے......کسی نے کوئی بات کہی ہے۔"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" آرزو نے وضاحت کی۔

"آرزو جب آدمی کوئی انکار کرتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے......اور یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تم شادی سے انکار کر رہی ہو، پکنک پر جانے سے تو انکار نہیں کر رہی ہو۔"

"بس، مہرو، میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیا تم نے یہ بات اپنے بابا کو بتا دی ہے۔"

"ہاں مہرو۔" آرزو نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا وہ تمہاری بات سے متفق ہو گئے ہیں۔"

''ہاں مہرو......انہوں نے کہا ہے جیسا تم چاہو گی، ویسا ہی ہوگا۔''

''اوہ......'' مہرو کو یہ بات سن کر مزید صدمہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات ابھی ان دونوں تک ہی محدود ہے لیکن بات تو بہت آگے جا چکی تھی۔ کمال رائے نے بھی اپنی بیٹی کے فیصلے سے اتفاق کر لیا تھا۔

مہرو کے گلے سے کسی طرح یہ بات نہیں اُتر رہی تھی۔ آخر آرزو نے رامش خیال سے شادی کرنے سے کس طرح انکار کر دیا۔ وہ کل تک تو اس پر جان دیتی تھی۔ وہ اس کے بھائی سے شدید محبت کرنے لگی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے تھے۔ پھر وہی نہیں، آرزو کے بابا کو بھی رامش بہت پسند تھا۔ یہ شادی جہاں ایک طرف محبت کی تھی تو وہاں لڑکا لڑکی کے سرپرست بھی اس رشتے سے خوش تھے۔

پھر یہ اچانک کس نے دیوار کھڑی کر دی تھی۔

☆......☆......☆

کمرے میں مکمل تاریکی چھائی تھی۔

باہر چاند آسمان کی پیشانی پر کسی جھومر کی طرح چمک رہا تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ایک رُوپہلی رات تھی۔

کمرے میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ آرزو کی آنکھیں بند تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی تھی لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ فضاؤں میں اُڑ رہی ہو۔

پہاڑ، بادل، بہتے چشمے، پھول، تتلیاں......عجب رنگ، عجب فضا تھی۔ جانے وہ کون سی وادی تھی۔ جانے وہ کہاں تھی۔ انگور کی بیلیں تھیں، ان سے ٹپکتا رس تھا، میٹھے سیب درختوں پر جھول رہے تھے۔ ایک بل کھاتی پگڈنڈی دور ایک جھونپڑی تک چلی گئی تھی۔ لمحہ لمحہ بدلتے مناظر تھے اور وہ ان بدلتے مناظر میں محو تھی۔

پھول پر تتلی بیٹھی تھی اور بھنورے منڈلا رہے تھے۔ کوئل کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ سفید کبوتر اُڑ رہے تھے۔ قلابازیاں کھا رہے تھے۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔

کہیں دور کوئی چرواہا پتھر پر بیٹھا بانسری کی تان اُڑا رہا تھا۔ عجیب فضا تھی۔ رنگ، موسم، خوشبو، ٹھنڈی ہوا گنگناتا سناٹا......اندھیرا، اُجالا۔

آرزو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ ایک سحر سا اس پر طاری تھا۔ سارا وجود جھوم رہا تھا جیسے اس کے کان میں کوئی میٹھی سرگوشی کر رہا تھا۔ کوئی اس کا نام بڑے مدھم سروں میں لے رہا تھا۔

''آرزو......آرزو......آرزو۔''

وہ بے قرار ہو رہی تھی۔ کوئی اس کا سکون لوٹ رہا تھا اور وہ پُرسکون تھی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار تھا اور یہ نشہ چڑھتا ہی جاتا تھا۔

کوئی اندھیرے میں بول رہا تھا۔

''اچھا کیا......میری آرزو تم نے بہت اچھا کیا۔''

''میں نے کیا کیا؟''

''تم نے شادی سے انکار کر کے بہت اچھا کیا۔''

''وہ تو کرنا ہی تھا......میں اب تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تم بہت اچھی ہو آرزو......میری آرزو، میری برہا......برمان کا انتخاب۔ بالآخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔''

کوئی بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی۔

وہ بول رہی تھی لیکن لب خاموش تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے دماغ میں بول رہا ہو یا وہ خود سے سوال کرتی ہو۔ خود سے جواب دیتی ہو۔

''اب مجھے تمہارا انتظار رہنے لگا ہے۔'' سوال ہو رہا تھا۔

''رنسارو سے اب برہا کو، اس کی آرزو کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ اگر کسی نے چھیننے کی کوشش کی تو اسے تباہ کر دوں گا......برباد کر دوں گا۔'' جواب مل رہا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ مسحور کن خوشبو تھی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بے گانہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

مہرو پوری رات جاگتی رہی تھی۔

اسے کسی کروٹ چین نہ تھا۔ آنکھوں میں جیسے انگارے بھرے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو جلن ایک دم بڑھ جاتی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کانٹوں پر لیٹی ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو یہ روح فرسا خبر کیسے بتائے۔ وہ اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ بہت حساس لڑکا تھا۔ وہ آبگینہ تھا ذرا سی ٹھیس اسے توڑ سکتی تھی۔ وہ موم تھا، ذرا سی آنچ اسے پگھلا سکتی تھی۔ وہ اسے کیسے بتائے گی کہ بھائی اب آرزو تمہاری نہیں رہی۔ اس نے تمہاری بننے سے انکار کر دیا ہے اور انکار کی وجہ بھی نہیں بتائی ہے۔

جانے ایک موہوم سی اُمید کیوں تھی۔ ایک آس تھی کہ شاید رات کی سیاہی جب اُترے گی۔ دن کا اُجالا پھیلے گا تو آرزو کا فون آئے گا اور وہ قہقہہ لگا کر کہے گی۔

''اوہ، میری مہرو......اری بے وقوف میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

دن کا اُجالا بھی پھیل گیا لیکن ایسا نہ ہوا۔ کوئی گھنٹی نہ بجی۔ آرزو کا کوئی فون نہ آیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے سوچا کہ ایک مرتبہ آرزو سے اور بات کرے۔ وہ آج کالج نہیں گئی تھی۔ مہرو کو اُمید تھی کہ وہ بھی نہیں گئی ہو گی کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اگر گئی ہو گی تو وہ پھر اس سے دوپہر کو بات کرے گی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی آ رہا تھا کہ براہِ راست کمال رائے سے کیوں نہ بات کرے......لیکن کمال رائے سے بات کرنا اس کیلئے مناسب نہ تھا۔ یہ بات ماموں رشید کریں یا پھر اس کا بھائی کرے۔

ٹیلی فون گود میں رکھ کر اس نے آرزو کے فون کا نمبر ڈال کیا اور گہرا سانس لے کر ریسیور کان سے لگایا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔

مسلسل بیل ہونے کے باوجود کسی نے ٹیلی فون نہ اُٹھایا تو مہرو نے سوچا کہ کمرے میں کوئی نہیں کہیں وہ کالج تو نہیں چلی گئی۔ پھر اس نے گھر کا دوسرا نمبر ڈائل کیا تا کہ ستارہ سے بات کر کے صحیح صورتحال جان لے۔ دوسری گھنٹی پر کسی نے فون اُٹھایا۔ ''ہیلو۔'' وہ ستارہ تھی۔

''میں مہرو بول رہی ہوں مہر النساء...... بی بی فون نہیں اُٹھا رہیں۔ کیا کالج چلی گئیں۔'' مہرو نے پوچھا۔

''نہیں......بی بی تو گھر میں ہی ہیں۔ وہ اس وقت مالک کے کمرے میں ہیں۔'' ستارہ نے جواب دیا۔

''ستارہ ذرا بلا دو گی؟'' مہرو بولی۔

''بی بی......کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ دیر کے بعد فون کر لیں۔ مالک نے کہا تھا کہ کوئی فون آئے تو منع کر دینا۔ یہ بات میں آپ کو بتا رہی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ آرزو سے کوئی خاص بات کر رہے ہیں۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں......بس آپ کو اتنا بتا سکتی ہوں کہ دروازہ بند ہے اور کسی کو اندر جانے سے منع کیا ہے۔'' ستارہ نے ساری صورتحال سچ سچ بتا دی۔

''اچھا ستارہ۔ ٹھیک ہے......تمہارا شکریہ......میں پھر بات کر لوں گی۔ وہ کمرے سے نکل آئیں تو انہیں اتنا ضرور بتا دینا کہ میں نے فون کیا تھا۔'' وہ بولی۔

''ہاں، بی بی......بتا دوں گی، ضرور بتا دوں گی۔'' ستارہ نے بڑے یقین سے کہا۔

''اچھا، اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر مہرو نے ریسیور رکھ دیا اور گہرا سانس لے کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

کمرے میں گہرا سناٹا طاری تھا۔

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کمال رائے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح بات شروع کرے۔ آرزو اس بات کو اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے بابا نے اسے اپنے کمرے میں کیوں بلایا ہے۔ وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بابا کے سوال کا کیا جواب دے گی۔ کس طرح دے گی۔

دونوں اپنی سوچوں میں گم تھے۔ کمرے میں گہرا سناٹا طاری تھا۔

''آرزو......!'' بالآخر کمال رائے نے سناٹے کی جھیل میں پتھر پھینکا۔

''جی بابا۔'' آرزو جو سوچوں کے سمندر میں گم تھی بابا کی آواز سن کر ایک دم چونک پڑی۔ اس نے اپنی بھاری پلکیں اُٹھائیں اور خوبصورت آنکھوں سے کمال رائے کو دیکھا۔

''آرزو، اب تمہارے نکاح میں صرف ایک دن بیچ میں ہے، پرسوں تمہارا نکاح ہے۔ اسپتال میں تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا......بیٹی وہ کیا تھا؟''

''بابا، جو بات میں نے آپ سے کہی تھی، وہ بات میں نے کل مہرو سے بھی کہہ دی ہے۔'' آرزو نے انکشاف کیا۔

''اوہ۔'' کمال رائے کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ''بیٹا، یہ تم نے کیا کیا؟''

''بابا...... میں جانتی ہوں کہ میری بات سے آپ کو بہت دُکھ پہنچا ہو گا۔ بابا آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''بیٹا......آخر انکار کی وجہ کیا ہے......یہ رشتہ تم نے خوشی سے قبول کیا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ رامش خیال کو تنہا نہ چھوڑیں۔ بیٹا جب میں نے اسے اپنے ساتھ لے لیا، اس کا ساتھ دینے کا پکا ارادہ کر لیا تو تم ساتھ چھوڑ رہی ہو۔''

''بابا، میں کیا کروں؟'' آرزو بے بسی سے بولی۔

''مجھے بتاؤ......آخر معاملہ کیا ہے۔ کھل کر بات کرو، جو دل میں ہے اسے زبان پر لے آؤ۔''

''بابا، میں مجبور ہوں۔'' اس نے اپنے ہاتھ ملے۔

''کس بات سے مجبور ہو، انکار کی وجہ بتانے سے یا رامش خیال سے شادی کرنے پر۔''

''دونوں باتوں سے۔''

"آرزو...... دیکھو تم مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔"

"بابا...... وہ...... نہیں بابا۔"

"ہاں، بیٹا...... بولو...... ہمت کرو۔ ڈرو مت۔" کمال رائے نے اس کی ہمت بندھائی۔

"بابا، وہ سب کچھ برباد کر دے گا۔"

"کون ہے وہ؟" کمال رائے اُٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے آرزو کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "میں اسے دیکھ لوں گا۔ تم اس کا نام بتاؤ۔"

"چھوڑیں بابا...... آپ مجھے بہت عزیز ہیں۔ مجھے رامش خیال بھی بہت عزیز ہے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اگر تم نے رامش خیال سے شادی کر لی تو ہم دونوں کو کچھ ہو جائے گا۔ ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی...... آرزو یہی بات ہے نا۔"

"بابا، مجھے کچھ نہیں معلوم...... مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔"

"آرزو، تم ڈر رہی ہو۔ تم خوفزدہ ہو۔ تم کبھی اتنی بزدل تو نہ تھیں۔ بیٹا تم تو مجھے حوصلہ دیتی رہی ہو۔ دیکھو آرزو ڈرو نہیں تمہارا باپ شیشے کا نہیں بنا۔ اگر تمہیں کسی نے دھمکی دی ہے تو مجھے صاف صاف بتاؤ۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ کس کو ماریں گے بابا...... وہ کوئی نہیں ہے۔ وہ کوئی ہوتا تو آپ اس کو مارتے۔" آرزو نے یہ بات بڑی شائستگی سے کہی۔

کمال رائے نے چونک کر آرزو کو دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بیٹی کی ذہنی رو بہکی ہوئی ہو۔ وہ بالکل پاگلوں والی باتیں کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

بلی والا بابا اپنے خاص انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ سامنے کی طرف کسی انجانی چیز کو دیکھ رہا تھا۔ بلی کا بچہ بیگ پر اُچھل کود مچائے ہوئے تھا۔ اس کے اُچھلنے سے گلے میں بندھا گھنگھرو بار بار بج رہا تھا۔ بلی کے بچے کے گلے میں بندھی ڈوری کا دوسرا سرا بیگ کے فیتے سے بندھا تھا۔

کمال رائے اپنی گاڑی میں بیٹھا، اس کے اُٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دو مرتبہ اس کا تعاقب کر چکا تھا۔ دونوں مرتبہ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا، نہ رک کر اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کی تھی۔ کمال رائے اس بابا سے مایوس ہو گیا تھا۔ بس آج یہ سوچ کر چلا آیا تھا کہ اگر آج بھی اس بابا نے توجہ نہ دی تو وہ پھر اس کے تعاقب میں یہاں نہیں آئے گا۔ اگرچہ قبرستان میں ملنے والے بابا نے کسی وقت کی حد مقرر نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس وقت تک اس کا تعاقب کرنا ہے جب تک وہ مخاطب نہ ہو جائے یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کیا ساری عمر اگر وہ اس سے مخاطب نہ ہو تو وہ اس کے تعاقب میں

ہی لگا رہے گا۔ پھر وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اگرچہ یہ ایک دور دراز علاقہ تھا لیکن اگر کسی نے اسے اس فقیر کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا تو وہ کیا سوچے گا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے وہ حسبِ معمول اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر اور بیگ میں بلی کے بچے کو بٹھا کر اپنے رستے پر چل پڑا۔

کمال رائے بھی اپنی گاڑی بند کر کے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

جب وہ بلی والا بابا، پل پر پہنچ گیا تو اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کمال رائے پانچ سات قدم پیچھے تھا۔ اس بابا نے مڑ کر دیکھا اور پھر چلتے چلتے وہیں رک گیا۔ وہ گردن موڑے بڑے غور سے کمال رائے کو دیکھ رہا تھا۔ کمال رائے نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھتے اور کھڑے ہو کر اسے گھورتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ رکا نہیں۔

کمال رائے جب بالکل اس کے نزدیک پہنچ گیا تو اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "تین دن ہو گئے، تجھے ہمارے پیچھے آتے، کیا چاہتا ہے۔"

"مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ بات کرنی ہے۔" کمال رائے فوراً حرفِ مدعا زبان پر لے آیا۔

"ہم سے کوئی بات نہ کر...... اپنی بیٹی کا نکاح کر دے۔ اگر تُو نے اپنی بیٹی کا نکاح نہ کیا تو یاد رکھ وہ اسے برباد کر دے گا۔ وہ بہت خبیث ہے۔" بلی والے بابا نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"لیکن بابا......" کمال رائے کہتے کہتے رک گیا۔

"اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے، یہی نا۔"

"ہاں بابا۔"

"وہ بچی ہے، معصوم ہے...... اس نے اسے ورغلا لیا ہے۔ تُو اس کی فکر نہ کر...... نکاح کر دے۔ یہ نکاح وقت مقرر پر ہو جانا چاہئے۔ تُو اس کی مرضی کی فکر نہ کر...... سمجھ گیا میری بات۔" بابا جانے کے لئے مڑا۔

"سمجھ گیا...... اچھی طرح سمجھ گیا۔"

"سمجھ گیا تو پھر جا...... ہم بھی یہیں بیٹھے ہیں...... دیکھ لیں گے اسے۔" یہ کہہ کر بابا اپنی راہ پر ہو لیا۔

کمال رائے اپنی جگہ کھڑا بلی والے بابا کو جاتے دیکھتا رہا مگر اس نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا نہ رکا...... یہاں تک کہ وہ پل کی سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ جب بلی والے بابا کا سر بھی غائب ہو گیا تو کمال رائے واپسی کیلئے مڑا۔

بلی والے بابا سے بات کر کے بڑی حد تک اس کی ذہنی اُلجھن ختم ہو گئی تھی۔ سب سے بڑی بات

یہ تھی کہ بابا کو کمال رائے کو کچھ بتانا نہیں پڑا تھا۔ ساری بات خود اس نے ہی واضح طور پر بتا دی تھی۔ فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا بابا بڑی اونچی چیز نکلا تھا۔ اسے کیا نہیں معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آرزو کا نکاح ہونے والا ہے۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ آرزو نکاح سے انکاری ہے۔ اسے اس انکار کی وجہ بھی معلوم تھی جو اس نے صاف نہیں کہی تھی...... لیکن کمال رائے نے اس کی بات سے ایک نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ نکاح سے انکار کی وجہ کوئی بہت اہم، بہت خاص اور پراسرار نوعیت کی ہے۔ بابا نے صاف لفظوں میں نکاح کرنے کی تاکید کی تھی چاہے آرزو انکار کرے یا اقرار۔

جب کمال رائے اپنی گاڑی میں بیٹھا تو خاصا مطمئن تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ آرزو کا نکاح وقت مقررہ پر پڑھوا کر رہے گا۔

☆......☆......☆

کمال رائے گاڑی سے اُترا تو اسے اپنے سامنے ستارہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مخاطب ہوتی، کمال رائے خود بولا۔ ''کیا ہوا ستارہ؟''

''مالک...... وہ مہرو بی بی کے ماموں آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا...... اور کون ہے ان کے ساتھ۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''وہ اکیلے ہیں جی۔''

''کتنی دیر ہوئی آئے ہوئے۔''

''کافی دیر ہوگئی آئے ہوئے...... انہوں نے کہا تھا کہ آپ سے مل کر ہی جائیں گے۔''

''اچھا...... چائے وغیرہ پلائی۔''

''میں چائے کا پوچھ چکی ہوں۔ پر جی انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔'' ستارہ نے بتایا۔

''آرزو کہاں ہے؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں جی۔''

''آرزو...... ان سے ملنے نہیں گی۔''

''نہیں جی۔'' ستارہ بولی۔

''کیا تم نے انہیں بتایا تھا۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''ہاں، جی...... ان کے آتے ہی بتا دیا تھا۔''

''اچھا ٹھیک ہے...... تم چائے کا انتظام کرو...... کچھ دیر کے بعد لے آنا...... میں ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں۔'' کمال رائے نے ستارہ کو ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے۔'' ستارہ نے کہا۔ ''کیا بی بی کو بتا دوں کہ آپ آگئے ہیں۔''

''ہاں بتا دینا...... اور ان سے کہنا کہ وہ خود چائے لے کر آئیں۔''

''جی ٹھیک ہے...... میں بی بی کو بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر ستارہ کچن کی طرف چلی گئی اور کمال رائے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

ماموں رشید سامنے ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ کمال رائے کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ایک دم کھڑے ہو گئے۔ کمال رائے نے آگے بڑھ کر ان سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، ان کی خیریت پوچھی اور پھر انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجئے گا۔ آپ کو انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔ آج آپ ساری رات نہ آتے تو میں اسی طرح بیٹھا رہتا۔'' ماموں رشید نے کچھ اس انداز میں یہ بات کہی کہ کمال رائے کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔

''آخر ایسی کیا بات ہوئی۔'' کمال رائے نے انجان بن کر پوچھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کیا بات ہوئی ہے اور ماموں رشید اس کے دَر پر کیوں بیٹھے ہیں۔

''کیا آپ نہیں جانتے۔'' ماموں رشید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ آرزو کے حوالے سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔'' کمال رائے نے دریافت کیا۔

''جی بالکل...... سنا ہے آپ کی بیٹی نے نکاح سے انکار کر دیا ہے۔'' ماموں رشید نے صاف لفظوں میں کہا۔

''جی۔'' کمال رائے نے مختصر سا جواب دیا۔

''رامش خیال اس انکار سے بہت متاثر ہوا ہے...... مجھے ڈر ہے کہ وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔'' ماموں رشید پریشان ہو کر بولے۔ ''رائے صاحب...... آخر ہم سے کیا خطا ہوئی...... کچھ تو بتائیں۔''

''یہ میری بیٹی کا فیصلہ ہے، میرا نہیں...... میں اس سے اس موضوع پر بات کر چکا ہوں لیکن وہ وجہ بتانے سے قاصر ہے۔'' کمال رائے نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا۔

''میں آپ کے اس جملے کا مطلب سمجھا نہیں۔''

''سمجھ میں تو میری بھی کچھ نہیں آیا رشید صاحب...... آپ بہرحال پریشان مت ہوئیے...... رامش خیال کو بھی تسلی دے دیجئے۔ میں نے آپ کو جو زبان دی ہے میں اس پر قائم ہوں۔ آپ کل شام کو رامش کے ساتھ آجائیے۔ میں آرزو کا نکاح اس کے ساتھ کر دوں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' کمال رائے نے یہ بات پُریقین انداز میں کہی۔

ماموں رشید یہ سن کر کھل اُٹھے۔ وہ اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کمال رائے کو ہاتھ کھینچ کر اُٹھایا اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ انہیں توقع نہ تھی کہ یہ معاملہ جو ان کے بھانجے کے لئے موت اور زندگی

کامعاملہ بن گیا تھا اتنی آسانی سے سلجھ جائے گا۔ کمال رائے نے تو ان کے نزدیک کمال دکھا دیا تھا۔

"رائے صاحب آپ بہت گریٹ آدمی ہیں...... یوں سمجھئے کہ آپ نے میرے بھانجے کی زندگی بچالی۔ وہ بڑا جذباتی لڑکا ہے۔ مجھے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ آپ سے بات کرنے کیلئے خود آرہا تھا، میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا۔" ماموں رشید نے کمال رائے کو الگ کر کے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

ابھی وہ دونوں ہاتھ ہی ملا رہے تھے کہ آرزو، سارہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑی حیرت سے دونوں کو ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ دونوں اتنی دیر بعد ایک دوسرے سے ہاتھ کیوں ملا رہے ہیں۔

"اوہ...... آرزو بیٹی۔" ماموں رشید کی اس پر نظر پڑی تو وہ آگے بڑھے۔ آرزو نے انہیں بڑے ادب سے سلام کیا۔ جس کا ماموں رشید نے بڑے تپاک سے جواب دیا اور پھر بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

☆......☆......☆

نکاح کا وقت سر پر تھا۔ نکاح خواں آچکا تھا۔ آرزو نکاح کا جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ نکاح کا فارم پُر کیا جا رہا تھا۔

یہ نکاح انتہائی سادگی اور مکمل رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اس نکاح میں ماموں رشید کی فیملی کے علاوہ باہر کا کوئی آدمی شریک نہ تھا۔ اِدھر سے بس کمال رائے کی ماں نفیسہ بیگم شریک تھی۔

کمال رائے نفیسہ بیگم کو آج صبح ہی روشن گوٹھ سے لے کر آیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہا تھا۔ "ماں، تمہاری ضرورت ہے۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ کراچی چلو۔"

تب نفیسہ بیگم نے ایک لفظ اپنے منہ سے نہیں نکالا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ پجیرو میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کا بیٹا اسے لینے آیا تھا۔ اسے اس کی ضرورت تھی۔ بس نفیسہ بیگم کیلئے اتنا ہی بہت تھا کہ اس کے اکلوتے بیٹے کو اس کی ضرورت ہے۔ پھر وہ اس سے کوئی سوال کیسے کرتی۔ وہ زبان بند کئے اس کے ساتھ چلی آئی۔ البتہ اس کے ذہن میں کھچڑی ضرور پک رہی تھی۔ طرح طرح کے خیال آرہے تھے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ ہاں، اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔

خاص بات یقیناً تھی...... اور یہ خاص بات کمال رائے نے اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر بتائی۔

"ماں میں آج شام آرزو کا نکاح کر رہا ہوں۔"

یہ سن کر نفیسہ بیگم کو بیک وقت خوشی اور دُکھ کے احساسات نے آگھیرا۔ دُکھ اس بات کا کہ کمال رائے نے اس سے اس معاملے میں مشورہ نہیں لیا۔ اسے پہلے سے کیوں نہیں بتایا۔ خوشی اس بات کی کہ اسے اللہ نے یہ دن دکھایا تھا۔ اس نے اپنے دُکھ کو خوشی کی چادر میں چھپا لیا اور اپنے بیٹے کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کر بولی۔ "یہ تو بہت خوشی کی بات ہے مگر تُو نے یہ بات روشن گوٹھ میں کیوں نہیں بتائی۔ میں جانے کیا کیا سوچتی رہی۔"

"ماں...... اصل بات یہ ہے کہ میں یہ نکاح بہت ایمرجنسی میں کر رہا ہوں۔ اس موقع پر رشتے داروں کو اکٹھا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے تمہیں خاموشی سے روشن گوٹھ سے لے آیا ہوں۔ ماں لڑکا باہر جا رہا ہے۔ میں آرزو کی رخصتی دو تین سال بعد کروں گا۔ لڑکا بہت اچھا ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ فوری طور پر نکاح کر دوں تا کہ ایک اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ماں میں نے خصوصی طور پر لڑکے کو بلوایا ہے۔ صرف تمہیں دکھانے کیلئے...... تم لڑکے کو دیکھو گی تو تمہاری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ لڑکا بہت نیک اور بہت خوبصورت ہے۔" کمال رائے نے اپنی ماں کو مطمئن کرنے کیلئے جو اس کی زبان پر آیا، کہہ دیا۔

کمال رائے نے رامش خیال کو فون کر کے بلوا لیا تا کہ اپنی ماں کو دکھا سکے۔

نفیسہ بیگم نے رامش خیال کو دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔ اس نے چٹ پٹ رامش خیال کی کئی بلائیں لے ڈالیں۔ جو تھوڑا بہت دُکھ اسے مشورے میں شریک نہ کرنے کا ہوا تھا، وہ جاتا رہا۔ اس کے بیٹے نے اس کی پوتی کیلئے بہت حسین دولہا ڈھونڈا تھا۔

ماں کو خوش دیکھ کر اس کا دل بھی خوش ہو گیا...... لیکن ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ اور یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔

ماموں رشید کی آمد نے آرزو کو ذہنی اُلجھن کا شکار کر دیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نکاح ملتوی نہیں ہوا ہے۔ وقت مقررہ پر ہونا قرار پایا ہے۔ تب سے وہ سخت پریشان تھی۔

رات بھر اسے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے رہے تھے۔ ساری رات اس نے سخت بے چینی میں گزاری تھی۔ صبح اُٹھتے ہی اسے اطلاع ملی کہ دادی آگئی ہیں۔ وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔

وہ بند دروازے پر نظریں جمائے اپنی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور کمال رائے کمرے میں داخل ہوا، وہ اکیلا تھا۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور پھر آہستہ آہستہ وہ آرزو کی طرف بڑھا۔

باپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بولی کچھ نہیں، خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس بولنے کو باقی کیا رہا تھا۔ وہ واضح طور پر اس نکاح سے انکار کر چکی تھی۔

کمال رائے دھیرے سے آرزو کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور اسے دیکھ کر بڑی خوشدلی سے مسکرایا۔ ’’کیسی ہو بیٹا؟‘‘

آرزو نے شکوہ بھری نظروں سے باپ کو دیکھا اور بڑی شائستگی سے بولی۔ ’’ٹھیک ہوں بابا۔‘‘

’’آج شام کو تمہارا نکاح ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ تمہاری دادی رامش خیال سے مل کر بہت خوش ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس نکاح کیلئے خوشدلی سے راضی ہو جانا چاہئے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔‘‘ کمال رائے نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔

’’بابا، میں یہ نکاح نہیں کروں گی، آپ نہیں جانتے کہ اس نکاح کے بعد کیسی تباہی آئے گی۔‘‘

’’تم بے فکر ہو جاؤ...... کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں اگر یہ نکاح نہ ہوا تو پھر جو تباہی آئے گی اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔‘‘ کمال رائے نے اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں دھمکی دی۔

’’چاہے کچھ ہو۔ میں یہ نکاح ہرگز نہیں کروں گی۔‘‘ آرزو کا لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا۔

اس کا لہجہ تبدیل ہوتے ہی کمال رائے نے اپنا سیدھا ہاتھ پیچھے کی طرف گھمایا اور بیڈ پر رکھے اس ریوالور کو تھام لیا جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ پھر اس نے وہ ریوالور ایک جھٹکے سے آرزو کے سامنے کیا اور اسے گھور کر دیکھنے لگا۔

’’نہیں بابا؟‘‘ آرزو خوفزدہ ہو کر بولی۔

’’یہ لو۔‘‘ کمال رائے نے بڑے اطمینان سے اس کی طرف ریوالور بڑھایا۔ ’’اسے تھام لو۔‘‘

’’نہیں بابا۔‘‘ آرزو نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لئے۔

’’نہیں کیسے؟‘‘ کمال رائے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے کیا اور پھر زبردستی ریوالور اس کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ ’’چلاؤ گولی۔ اپنے بابا کو ختم کر دو۔ پھر اطمینان سے جو چاہے کرنا۔‘‘ کمال رائے اتنا کہہ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ آرزو کی آنکھیں جھکی تھیں اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ چند لمحے اس کے کانپتے ہاتھ دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ’’بیٹا...... یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے انہیں زبان دی ہے، میں اپنی زبان سے نہیں پھر سکتا۔ اس طرح نکاح سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بیٹا...... یہ کوئی شریفانہ عمل نہیں ہے۔ میں بہرحال تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ میں خود مجبور ہو جاتا ہوں، منظر سے ہٹ جاتا ہوں۔ ریوالور اُٹھاؤ اور مجھے منظر سے ہٹا دو۔‘‘

’’نہیں بابا...... یہ کام تو میں خواب میں بھی نہیں کر سکتی۔‘‘ آرزو لرزتی آواز میں بولی۔

’’پھر اپنے باپ پر بھروسہ کرو...... میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ تم کسی چیز سے، کسی بات سے مت ڈرو۔ سارے خوف میرے لئے چھوڑ دو۔‘‘ کمال رائے نے آرزو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کمال رائے کے ہاتھ پکڑتے ہی آرزو نے ریوالور چھوڑ دیا، اور آگے بڑھ کر اپنے باپ سے لپٹ

گئی اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہاتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد جب آنسوؤں میں تھوڑی کمی واقع ہوئی تو آرزو نے سسکتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھیک ہے بابا...... پھر جیسی آپ کی مرضی۔‘‘

’’یہ ہوئی نا بات۔‘‘ کمال رائے نے اس کے سر کو چوما۔ اور خوش ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

نکاح کا وقت سر پر تھا۔ نکاح خواں آ چکا تھا۔ آرزو نکاح کا جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔ نکاح کا فارم پُر کیا جا رہا تھا۔

بنگلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عجیب سماں تھا۔ لگتا تھا، گھر میں نکاح نہ ہو کوئی مرگ ہو گئی ہو۔

مہرو، آرزو کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ اپنے طور پر باتیں کئے جا رہی تھی جبکہ آرزو اپنے ہونٹ سیئے بیٹھی تھی۔

آرزو کی آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ کسی غیر مرئی نقطے کو تکتے جا رہی تھی۔ کبھی گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر مہرو کو دیکھتی۔ کبھی کمرے میں چاروں طرف نظریں گھماتی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ کسی کی آواز متوقع ہو۔

کوئی اور تو نہ آیا...... البتہ کمال رائے اپنے ڈرائیور لعل محمد اور گھر کے ملازم دلدار کے ساتھ ضرور آ گیا۔

آرزو نے سسکی بھری آواز میں ’’قبول کیا۔‘‘ کہا۔

ایجاب و قبول کے بعد نکاح خواں نے نکاح پڑھایا۔ مبارک سلامت کا ہلکا سا شور اُٹھا۔ ایک دوسرے کو گلے لگایا گیا۔ چھوہارے کھلائے گئے۔

ماموں رشید نے اطمینان کا سانس لیا۔ رامش خیال کی خوشی قابل دید تھی۔ مہرو نے آرزو کو گلے لگا کر بھینچ لیا۔ نفیسہ بیگم نے چٹ چٹ بلائیں لیں۔

اور یوں یہ نکاح کی سادہ سی تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

دولہا اپنے لوگوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آنکھوں میں حسین خواب سجائے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

آرزو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی، آرزو آنکھیں کھولے دیوار پر لگی سمندر کی بڑی سی پینٹنگ کو گھورے جا رہی تھی۔ نظریں کہیں تھیں تو دماغ کہیں تھا اور وہ خود کہیں تھی۔

آرزو نے رامش خیال کو قبول کر لیا تھا...... لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی، رامش خیال تو جانے کب سے اس کے دل میں بسا ہوا تھا۔ اس کے دل نے بہت پہلے اسے قبول کر لیا تھا۔ آج اس نے دنیا

والوں کے سامنے اپنی زبان سے اسے اپنا کہہ دیا تھا۔ اندر سے چاہنے کے باوجود اسے اپنا بناتے ہوئے دل کانپتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ رامش خیال کا خیال دل سے ایک دم نکل جاتا اور وہ کسی اور کو اپنے وجود سے قریب تر پاتی۔ اس کا وجود جیسے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ رامش خیال اس کے دل میں تھا لیکن اس کے وجود پر کوئی اور چھایا ہوا تھا۔ ایک انجانے خوف سے لرز کر وہ نکاح سے انکار کر دیتی تھی۔

کمال رائے نے موت کی دھمکی دے کر آرزو کو اس نکاح پر راضی کیا تھا۔ اس دنیا میں اسے اپنے باپ سے زیادہ عزیز کوئی شے نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے باپ نے زبان دی تھی۔ اب وہ اپنے باپ کی پسپائی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کسی کے سامنے اس کے باپ کا سر جھکے یہ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے رامش خیال کو قبول کر لیا تھا۔

اور اب وہ آنکھیں کھولے سوچ رہی تھی۔ ایک انجانے خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔

وسوسے اُٹھ رہے تھے اور اس کے لبوں پر رامش خیال کی سلامتی کی دعائیں تھیں۔

اسی وقت وہ پردے کے پیچھے سے پھسل کر قالین پر آیا۔ کمرے میں ایک دم سحر کن خوشبو پھیل گئی۔ اس سے پہلے کہ آرزو سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھتی رہی، ایک سیاہ وجود اس پر چھا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر کسی نے کالی چادر ڈال دی ہو۔

پھر ایک دم اس کے کان میں سرگوشی گونجی۔ یہ سرگوشی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔

''آخر تم نے من مانی کر لی۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''میں نے تمہیں اچھی طرح بتا دیا تھا کہ اگر تمہارے میرے درمیان کوئی آیا تو اسے برباد کر دوں گا۔'' کوئی اس کے دماغ میں بولا۔

''کس کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے بغیر لب ہلائے جواب دیا۔

''انجان بن رہی ہو...... دیکھتا ہوں، کب تک انجان بنی رہو گی۔'' کہنے والے نے غصے سے کہا، اس کے دماغ میں ایک پھنکار سی گونجی۔

اس نے جواب میں کچھ کہا لیکن اس کے دماغ میں دھواں سا بھرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ نرم ملائم روئی کے ڈھیر میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گئی۔

صبح حسب معمول وہ دیر تک سوتی رہی۔

ستارہ اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ دس بجے تک بھی نہ جاگی تو اس نے ہینڈل پر

دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ جب سے آرزو کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ تب سے کمال رائے نے اسے سختی سے دروازہ اندر سے لاک کر کے سونے سے منع کر دیا تھا...... اور یاد نہ رہنے کی وجہ سے اگر وہ غلطی سے دروازہ لاک کر کے سو جائے تو کمال رائے نے اس کے کمرے کی چابی بنوا کر اپنے پاس رکھ چھوڑی تھی۔ ستارہ کمرے میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے ایک عجیب سی خوشبو سے اس کا واسطہ پڑا، خوشبو زیادہ تیز نہ تھی۔

پھر جب اس کی نظر آرزو پر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک کالی چادر اوڑھے سو رہی ہے۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ بال بھی بندھے ہوئے نہ تھے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

ستارہ نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''بی بی، اُٹھیں...... دس بج رہے ہیں۔''

آرزو کی نیند گہری تھی، وہ اتنی ہلکی آواز پر ذرا سا بھی نہ ہلی۔

تب ستارہ نے جھکے جھکے اس کا بازو پکڑ کر ہلانے کا سوچا۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ کوئی چیز سرسراتی ہوئی بڑی تیزی سے اس کی گردن کے پاس سے نکلی اور چہرے پر آئی۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے منہ سے تیز پھنکار نکلی...... وہ ایک سنہرا سانپ تھا جس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور دو حصوں میں تقسیم زبان بار بار اندر باہر ہو رہی تھی۔ اس سانپ کو دیکھ کر ستارہ کی تو جان نکل گئی۔ چند سیکنڈ تو وہ یوں ہی گم صم کھڑی رہی۔ پھر ایک دم اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ اُلٹے قدموں چیختی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔

سروری اس کی تلاش میں اِدھر ہی آ رہی تھی۔ وہ باہر بڑی زور سے اس سے ٹکرائی۔ اسے بوکھلائی ہوئی دیکھ کر سروری نے اسے ڈانٹا۔ ''کیا مصیبت ہے؟ کیوں بھاگ رہی ہے؟''

ستارہ بمشکل بولی۔ ''اماں، سانپ......؟''

''او، بے وقوف...... ہوش کر...... کہاں ہے سانپ؟'' سروری نے راہداری میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

''وہ، بی بی کے بیڈ پر...... بی بی سے لپٹا ہوا ہے۔'' ستارہ نے گھبرا کر بتایا۔

''اور بی بی کیا کر رہی ہیں؟'' سروری نے پوچھا۔

''بی بی...... سو رہی ہیں...... جانے بے ہوش پڑی ہیں۔''

''چل میرے ساتھ آ۔'' سروری کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ستارہ کے پیچھے پیچھے چلی۔

سروری ایک نڈر عورت تھی۔ ایک زمانے میں وہ دونوں میاں بیوی اتنے بڑے بنگلے میں اکیلے رہتے تھے۔ سروری کو کبھی کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ البتہ اس کا شوہر دلدار ضرور ڈرتا تھا۔ کتے کو دیکھ کر تو جیسے اس کے جسم میں جان نہ رہتی تھی۔ سروری نڈر عورت تھی لیکن ایسی نڈر بھی نہ تھی کہ

سانپ کا ذکر سن کر وہ آرزو کے سرہانے ہی جا کھڑی ہوتی اور سانپ کا قریب سے معائنہ کرنے کی کوشش کرتی۔

دروازے میں دو قدم بڑھا کر وہ فوراً ہی رک گئی تاکہ دور سے سامنے کا جائزہ لے سکے۔ ابھی سروری کچھ دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ ستارہ جو اس کے پیچھے تھی اس نے اس کے کندھے سے جھانک کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔

بیڈ پر اس وقت آرزو بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ چند لمحوں پہلے وہ ایک کالی چادر سے ڈھکی تھی اور ایک سانپ اس کے چہرے پر پھن پھیلائے تھا...... لیکن اب وہاں کالی چادر تھی اور نہ سانپ...... آرزو کا شب خوابی کا لباس بیڈ کے ایک طرف پڑا ہوا تھا اور آرزو کو اپنی حالت کی خبر نہ تھی۔

ستارہ نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور سروری نے شب خوابی کے لباس سے آرزو کو ڈھکا۔

پھر سروری نے چاروں طرف کمرے میں دیکھا، اسے کہیں سانپ نظر نہ آیا۔ ستارہ نے بھی اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ستارہ کو حیرت تھی۔ چند لمحوں میں کالی چادر اور سانپ کہاں اور کیسے غائب ہو گیا تھا۔

سروری نے آرزو کا چہرہ بغور دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دَم پیلا پڑا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔

سروری نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ ''بی بی...... بی بی۔''

اچانک آرزو نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے اس نے ان دونوں کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ایک دَم جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا نہیں ہے۔ یہ جان کر وہ اور پریشان ہو گئی۔ ستارہ نے جلدی سے الماری سے ایک چادر نکال کر اس پر ڈال دی اور بولی۔ ''بی بی، آپ واش روم میں چلی جائیں۔''

آرزو نے واش روم میں جا کر چادر اُتاری تو اس کی نظر اپنے پیٹ پر پڑی۔ وہاں دو ننھے گڑھوں کا اوراضافہ ہو چکا تھا۔ اسے سخت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کر کے منہ دھویا۔ اس کا چہرہ گرم ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آگ کے سامنے سے اُٹھ کر آئی ہو۔ کئی مرتبہ منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے کے بعد وہ واش روم سے نکل آئی۔ اسے چکر آ رہے تھے اور متلی کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔

واش روم کے دروازے پر ستارہ کھڑی تھی۔ آرزو ڈولنے لگی تو اس نے تھام لیا اور سہارا دے کر بیڈ تک لے آئی۔ آرزو نڈھال ہو کر بیڈ پر گر پڑی۔

''بی بی...... لیموں کا پانی پئیں گی۔'' ستارہ نے پوچھا۔

''ہاں، ستارہ لاؤ...... کہاں ہے؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

ستارہ نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لیں بی بی...... میں ابھی بنا کر لائی ہوں۔''

آرزو نے تشکر آمیز نظروں سے ستارہ کو دیکھا اور گلاس اس کے ہاتھوں سے لے کر لیموں کا پانی غٹاغٹ پی گئی۔

پانی پینے کے دو منٹ بعد اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ستارہ نے اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ لئے اور آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

''بی بی...... یہ آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟'' وہ بڑی فکرمندی سے بولی۔

''پتہ نہیں۔'' آرزو کیا جواب دیتی۔

''بی بی...... آج جب میں آپ کو اُٹھانے کیلئے کمرے میں آئی تو میں نے آپ کو ایک کالی چادر ں پایا۔''

''کالی چادر۔'' آرزو حیران ہوئی۔ ''کالی چادر کہاں سے آ گئی؟''

''آپ ایک کالی چادر اوڑھے ہوئے تھیں اور چادر کے اندر سانپ تھا۔ جب وہ سانپ چادر سے ر آیا تو اسے دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ باہر اماں مل گئی۔ اس کے ساتھ پس آئی تو یہاں کالی چادر تھی اور نہ سانپ تھا۔'' اس ذکر پر ستارہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لے۔ ''بی بی، یہ سب کیا ہے؟''

''میں کیا بتاؤں ستارہ؟'' آرزو نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بی بی...... کسی مولوی کو دکھائیں۔ آپ پر کہیں کوئی سایہ تو نہیں ہو گیا۔ آپ اتنی خوبصورت جو ۔'' ستارہ نے اپنے ذہن کے مطابق صورتحال کا تجزیہ کیا۔

''ستارہ شاید تو ٹھیک کہتی ہے۔'' آرزو نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''میری خوبصورتی شاید مجھے یں کا نہ چھوڑے گی۔ ایسی خوبصورتی کا کیا فائدہ جو جی کا جنجال بن جائے۔''

''اللہ مالک ہے بی بی...... آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ستارہ نے اسے وی۔

ای وقت آرزو کے دماغ میں کسی سانپ کی پھنکار گونجی۔ وہ چونک کر ستارہ کو دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

صبح رامش خیال کی آنکھ کھلی تو اسے رات کا خیال آیا۔ رات کا خیال آتے ہی اس پر سرخوشی سی ی ہو گئی۔ کیوں نہ ہوتی، وہ خیال ہی ایسا تھا۔ کل رات آرزو اس کی ہو چکی تھی۔ اس خیال کے آتے ں کے جسم میں بجلی سی بھر گئی۔ وہ بستر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر

زوردار انگڑائی لی اور واش روم میں گھس گیا۔ خوشی خوشی اس نے شیو بنایا پھر نہا دھو کر باہر نکلا۔

وہ ابھی آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا کہ لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

رامش خیال برش ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال کر اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ریسیور اُٹھا کر ''ہیلو'' کہنا چاہا۔

لیکن اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ باوجود کوشش کے اس کی زبان پلٹ نہ سکی۔

دوسری طرف رامش خیال کا کوئی دوست تھا۔ اس نے جب محسوس کیا کہ ریسیور اُٹھالیا گیا لیکن کوئی بول نہیں رہا ہے تو اس نے کہا۔ ''ہاں، رامش۔''

ادھر سے رامش خیال نے جواب دینے کی لاکھ کوشش کی لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ تو دور کی بات ہے ایک حرف بھی ادا نہ ہوا۔ اس کی زبان مکمل طور پر بند ہو چکی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی کہ اس کی زبان بند ہوگئی ہے، وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور زور سے پٹخا اور مہرو کے کمرے کی طرف بھاگا۔

مہرو کمرے میں نہ تھی، وہ کالج جا چکی تھی۔

وہ دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ ماموں کے بچے اسکول جا چکے تھے۔ ماموں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتے کا انتظار کر رہے تھے، ممانی کچن میں تھیں۔

امش خیال بدحواسی سے بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور ماموں کی نظر جب اس کے چہرے پر پڑی تو وہ پریشان ہو کر ایک دَم کھڑے ہو گئے۔ رامش خیال کا چہرہ ایک دَم سے سرخ ہو رہا تھا۔

رامش خیال بے اختیار ماموں رشید سے لپٹ گیا۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' انہوں نے اسے اپنے سے الگ کر کے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھر کر پوچھا۔ ''یہ تمہارا چہرہ اس قدر تمتمایا کیوں ہے؟''

رامش خیال کوئی جواب دینے کے بجائے پھر ماموں سے لپٹ گیا۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' انہوں نے اسے اپنے سے الگ کر کے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھر کر پوچھا۔ ''یہ تمہارا چہرہ اس قدر تمتمایا کیوں ہے؟''

رامش خیال کوئی جواب دینے کے بجائے پھر ماموں سے لپٹ گیا۔

اتنے میں ممانی ثمینہ بھی ناشتے کی ٹرے پکڑے کچن سے نکل آئیں۔ انہوں نے رامش خیال کو اپنے شوہر سے پاگلوں کی طرح لپٹتے دیکھا تو وہ پریشان ہوگئیں۔

''ارے کیا ہوا رامش؟'' انہوں نے ٹرے میز پر رکھی۔

ممانی کی آواز سن کر وہ ماموں کو چھوڑ کر ممانی کی طرف لپکا۔ اس نے ان کے دونوں شانے

پکڑ لئے اور پاگلوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''خیر تو ہے رامش۔'' ممانی نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''کچھ بولتا ہی نہیں۔'' ماموں رشید اُلجھن بھرے لہجے میں بولے۔

تب رامش خیال ایک دَم ماموں رشید کی طرف پلٹا اور بہت بے بسی سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے نفی میں ہاتھ ہلایا۔

''ہیں ...... کیا تم سے بولا نہیں جا رہا؟'' ماموں رشید نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے وضاحت چاہی۔

رامش خیال نے اپنی گردن زور زور سے اثبات میں ہلائی۔

''ارے...... یہ کیسے ہوا؟'' ماموں رشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ادھر آرام سے بیٹھو۔'' پھر وہ ممانی سے مخاطب ہوئے۔ ''ذرا اس کو پانی پلاؤ۔''

ممانی ثمینہ بھاگ کر پانی لے آئیں۔ انہوں نے رامش خیال کو پانی دیا۔ رامش خیال نے جلدی سے اسے پی لیا لیکن اس کی زبان نہ کھلی، پھر ممانی، ماموں کو جتنے ٹوٹکے آتے تھے، سب استعمال کر ڈالے۔ اس سے مختلف قسم کے سوال کر لئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے گلے میں کوئی تکلیف نہ تھی، زبان میں کوئی خرابی نہ تھی، وہ معمول کے مطابق حرکت کر رہی تھی۔ ہر چیز نارمل تھی۔ اس کے باوجود اس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

تب ممانی ثمینہ نے مشورہ دیا۔ ''آپ رامش کو فوراً اسپتال لے جائیں۔ اسے کسی گلے کے اسپیشلسٹ کو دکھائیں۔ یہ معاملہ کہیں سنگین نوعیت کا نہ ہو۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر ماموں رشید نے رامش خیال کا ہاتھ پکڑا۔ ''چلو بھئی۔''

رامش خیال فوراً ہی اُٹھ گیا۔ اس کی حالت خراب تھی چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''رامش پریشان مت ہو۔ اسپتال چلتے ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماموں رشید نے اسے تسلی دی۔

رامش خیال نے اُداسی سے گردن ہلائی۔

ماموں رشید اسے لے کر شہر کے ایک بڑے اسپتال پہنچے۔ وہاں ڈاکٹر نے اس کے گلے کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ اسے کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ پھر احتیاطاً اس نے دو تین مختلف ٹیسٹ لکھ دیئے۔ وہ ٹیسٹ کروا کر رامش خیال گھر آ گیا۔ ماموں رشید دفتر چلے گئے۔

مہرو کالج سے واپس آ چکی تھی۔ ممانی اسے ساری صورتحال بتا چکی تھی۔ رامش خیال جیسے ہی گھر

میں داخل ہوا وہ دوڑ کر اس کے نزدیک پہنچی اور بے قراری سے بولی۔ ''بھائی، کیسے ہو؟''
بہن کو دیکھ کر وہ بے قابو ہونے لگا۔ پھر اس نے فوراً اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا اگر وہ بے قابو ہوا تو اس کی بہن کا جانے کیا حال ہوگا۔ وہ چھوٹی ہے اسے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔

اسے دیکھ کر رامش خیال نے مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مسکراہٹ میں بڑا دکھ تھا۔

''تمہیں کیا ہوا بھائی...... تمہیں کس کی نظر لگ گئی۔'' مہرو نے بے قراری سے اس کے دونوں بازو تھام لئے۔

رامش خیال نے نفی میں گردن ہلائی۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگائے، مہرو نے اپنی انگلیوں پر نمی محسوس کی۔ رامش خیال کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

مہرو اپنے بھائی کو اوپر اپنے کمرے میں لے آئی اور اس کے سامنے کاغذ قلم رکھ کر بولی۔ ''بھائی، مجھے لکھ کر بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟''

رامش خیال نے کاغذ قلم لے کر صبح سے لے کر اب تک کی رُوداد لکھ دی، اس نے آخر میں لکھا۔

''مہرو، میں قوت گویائی سے محروم ہو گیا ہوں۔ بولنا چاہتا ہوں لیکن الفاظ ادا نہیں ہوتے، ڈاکٹر کی نظر میں بالکل ٹھیک ہوں، پھر بھی اس نے چند ٹیسٹ کروائے ہیں، کل رپورٹیں ملیں گی۔ میری بہن تم پریشان مت ہو۔ انشاء اللہ، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم میرے لئے دعا کرو اور ہاں آرزو کو بتا دو کہ تمہارا رامش گونگا ہو گیا ہے۔ اب وہ زندگی بھر تمہاری سنے گا تم سے کچھ نہ کہے گا۔''

جب یہ بات آرزو کو معلوم ہوئی تو وہ تڑپ گئی۔ فوراً اس کے دماغ میں کسی کے الفاظ گونجے۔ ''جو میرے تمہارے درمیان آئے گا، میں اسے برباد کر دوں گا۔''

رامش خیال اس کے بیچ آ گیا تھا۔ وہ رامش خیال کی منکوحہ بن گئی تھی۔ اوہ...... تو کیا...... بربادی کا سفر شروع ہو گیا۔ اسی لئے تو وہ روک رہی تھی۔ نکاح سے انکار کر رہی تھی۔ کسی نے اس کی سنی ہی نہیں...... لو اب دیکھ لو، اس کی بات نہ ماننے کا نتیجہ سامنے آ گیا۔

وہ بے حد اُداس ہو گئی۔ اس نے مہرو کو خاصی تسلی تشفی دینے کی کوشش کی لیکن اس کا اپنا قرار لٹ گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مہرو سے جو کچھ کہہ رہی ہے، ان لفظوں میں جان نہیں ہے۔

یہ اندوہناک خبر سن کر وہ سیدھی اپنے باپ کے پاس پہنچی۔ اس کی طبیعت تو پہلے ہی ٹھیک نہ تھی۔ اس خبر نے اس کی بالکل ہی جان نکال لی تھی۔

وہ نڈھال سی کمال رائے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس وقت ڈیک میں غزلوں کا کیسٹ

لگائے بیڈ پر لیٹا آنکھیں بند کئے غزلوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

آرزو نے ایک نظر باپ کو دیکھا اور پھر ڈیک کا بٹن آف کر دیا۔ کیسٹ بند ہوا تو کمال رائے چونک پڑا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ڈیک کیسے بند ہوا۔ آنکھیں کھولیں تو سامنے آرزو کو پایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ایک تو آرزو کا اس وقت کمرے میں آنا اور پھر چلتا ہوا ڈیک بند کر دینا...... ضرور کوئی غیر معمولی بات تھی۔

''کیا ہوا...... آرزو......؟'' کمال رائے نے آرزو کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ پیلی پڑی ہوئی تھی اور آنکھوں سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔

''بابا...... کچھ ٹھیک نہیں...... میں نے منع کیا تھا، آپ نہیں مانے...... آپ نے میری ایک نہیں سنی۔'' آرزو بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کوئی گڑبڑ ہوگئی۔ مجھے بتاؤ...... کیا ہوا ہے؟''

''اس نے رامش خیال کو قوت گویائی سے محروم کر دیا ہے۔'' وہ روانی میں وہ بات بھی کہہ گئی جو اس نے ابھی کھل کر نہیں بتائی تھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... رامش کو کیا ہوا ہے؟''

''وہ گونگا ہو گیا ہے بابا۔'' آرزو نے روہانسی ہو کر کہا۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''ابھی مہرو کا فون آیا تھا۔''

''اچھا تم آرام سے بیٹھو...... میں اس سے بات کرتا ہوں۔'' کمال رائے نے اسے تسلی دی۔

اس نے بیڈ پر پڑا ہوا اپنا موبائل فون اُٹھایا اور مہرو سے بات کی۔ مہرو نے صبح سے لے کر اب تک کی روداد کمال رائے کو سنا دی۔ پھر اس نے ماموں رشید سے بات کی۔ انہوں نے اسپتال میں جو کچھ ہوا، وہ بتا دیا۔ دونوں پریشان تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تسلیاں دیں اور رپورٹیں آنے تک مزید قدم نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔

''آرزو، تمہارے خیال میں رامش کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟'' کمال رائے نے موبائل فون بند کر کے ایک طرف ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''ایسا کس نے کیا ہے؟ کون ہے وہ؟''

''بابا مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' آرزو جیسے ایک دم سہم گئی۔ اس نے گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

آج صبح آرزو کے کمرے میں ستارہ نے جو کچھ دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں کمال رائے کو کچھ معلوم نہ تھا۔ آرزو نے ستارہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ یہ بات گھر میں کسی کو نہ بتائے۔

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم کچھ چھپا رہی ہو...... اس سے ڈر رہی ہو۔ بولو بیٹا...... ڈرو مت۔ جب تک تم مجھے پوری بات بتاؤ گی نہیں ...... ہمیں اپنے دشمن کے بارے میں واضح طور پر معلوم نہیں ہوگا تو ہم اس سے لڑیں گے کس طرح؟'' کمال رائے نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''تم جو کچھ بھی جانتی ہو، مجھے صاف صاف لفظوں میں بتا دو۔''

''بابا، میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے پُراعتماد لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں آرزو...... میں جانتا ہوں کہ تم بہت کچھ جانتی ہو۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھ سے چھپا رہی ہو۔ ہم سب کا نقصان کر رہی ہو۔ آج اس نے رامش خیال کو قوت گویائی سے محروم کیا ہے، ہوسکتا ہے کل وہ مجھے بھی کوئی نقصان پہنچا دے۔'' کمال رائے نے آرزو کی طرف التجا آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا...... میں سارے نقصان برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچائے۔ بابا، میں نے یوں تو کافی باتیں آپ کو بتائی ہوئی ہیں۔ میں سیاہ لباس والے کے بارے میں بھی آپ کو بتا چکی ہوں اور آج صبح جو کچھ ستارہ نے میرے کمرے میں دیکھا وہ بھی سن لیجئے۔''

''ستارہ نے کیا دیکھا؟'' کمال رائے نے پریشان ہو کر پوچھا۔

ستارہ نے اس کے کمرے میں جو کچھ دیکھا تھا اور جیسے دیکھا تھا وہ آرزو نے پوری تفصیل سے بتا دیا۔

''یہ سب کیا ہے بیٹا؟'' کمال رائے نے ساری بات پوری توجہ سے سن کر کہا۔

''بابا، یہ سب میرے بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ میں آپ کو اپنے بچپن کی بہت سی باتیں بتا چکی ہوں، جو باتیں اس وقت میرے چھوٹے سے ذہن میں واضح نہیں تھیں، وہ اب واضح ہو کر میرے سامنے آگئی ہیں۔'' آرزو نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ بیٹا...... جو کچھ بھی تم جانتی ہو...... وہ پورے اطمینان سے بتاؤ۔'' کمال رائے نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

''بابا، وہاں ایک ہال نما کمرہ تھا۔ اس کمرے میں بے پناہ طاق بنے ہوئے تھے اور ہر طاق میں ایک مجسمہ رکھا تھا۔ اس کمرے کا فرش سرخ اینٹوں کا تھا میں اس فرش پر دوڑتی پھرتی تھی، وہاں بے شمار سانپ ہوتے تھے، میں ان سے کھیلا کرتی تھی۔'' آرزو کی آنکھوں میں یادوں کا الاؤ روشن تھا اور وہ یادوں میں کھوئی دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ ''بابا وہاں ان مجسموں کا ایک دیوتا تھا، چاہیں تو آپ اسے سانپوں کا بادشاہ کہہ لیں۔ اس کے سر پر ایک سنہرا سانپ کنڈلی مارے تاج کی طرح سجا

رہتا تھا۔ اس بادشاہ کا نام پرمان تھا۔ اس پرمان نے مجھے اپنے بیٹے کیلئے منتخب کیا تھا۔ اس کے بیٹے کا نام رنسارو تھا۔ میں جب تک وہاں رہی، میں نے کبھی رنسارو کو نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے بارے میں عجیب سے قصے سنے تھے جو اس وقت میرے چھوٹے ذہن میں واضح نہیں ہوتے تھے لیکن اب ہر چیز آئینے کی طرح صاف ہو چکی ہے، کچھ عرصہ پہلے رات کی رانی پر جو سانپ دکھائی دیتا تھا وہ رنسارو ہی تھا۔ پھر سالگرہ والی رات وہ مجھ تک آ پہنچا۔ اس رات اس نے مجھے ڈسا۔ اب اس کا جب جی چاہتا ہے، آ جاتا ہے اور ڈس کر چلا جاتا ہے۔ اب شاید اس نے روپ بدل لیا ہے، وہ سیاہ لباس میں ہوتا ہے۔ میں بغیر بولے اس سے بات کرتی ہوں اور وہ بغیر آواز کے مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ بابا، وہ میرے دماغ میں بولتا ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر کوئی میرے بیچ آیا تو میں اسے برباد کر دوں گا۔ بابا اسی لئے میں نے نکاح سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے میری بات نہیں مانی بابا...... اب آپ نتیجہ دیکھ لیں۔''

''تم پریشان مت ہو آرزو...... تمہارا باپ اتنا کمزور نہیں ہے کہ وہ ایک سانپ سے ڈر جائے۔'' کمال رائے نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔ اس کے ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ وہ چند لمحے اس کو بغور دیکھنے کے بعد بولا۔ ''یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ سب کچھ مجھے بتا دیا۔ اگر پہلے بتا دیتیں تو اور اچھا ہوتا...... خیر کوئی بات نہیں۔ تم بالکل فکرمند مت ہو۔ میں دیکھ لوں گا اسے۔''

☆......☆......☆

دوسرے دن ماموں رشید رامش خیال کو لے کر اسپتال پہنچے۔ ٹیسٹ رپورٹیں آچکی تھیں۔ رپورٹیں لے کر ڈاکٹر کو دکھانے کیلئے اس کے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ کمال رائے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے رامش خیال کو گلے لگا کر اس کی پیٹھ تھپکی اور کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

رامش خیال نے اثبات میں گردن ہلائی۔

پھر وہ تینوں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر کلیم نے بغور تمام رپورٹوں کا معائنہ کیا اور پھر بولا۔ ''رپورٹیں تو ساری کلیئر ہیں۔ انہیں گلے میں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اب ایک مشورہ میں آپ کو دوں گا۔'' وہ ماموں رشید سے مخاطب تھا۔

''جی، فرمائیے۔'' ماموں رشید نے اپنی پوری توجہ ڈاکٹر کلیم کی طرف مبذول کر دی۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی ماہر نفسیات کو دکھا لیں۔ بعض اوقات کوئی جذباتی پیچیدگی قوت گویائی کو متاثر کر دیتی ہے۔'' ڈاکٹر کلیم نے مشورہ دیا۔

''اچھا...... ڈاکٹر صاحب، آپ کا شکریہ...... میں کسی ماہر نفسیات سے وقت لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ماموں رشید نے کمال رائے کو اُٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ تینوں ڈاکٹر کلیم کے کمرے سے باہر آ گئے۔

"کیا خیال ہے..... کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں؟" ماموں رشید، کمال رائے سے مخاطب تھے۔

"دکھانے میں کوئی ہرج نہیں۔ ممکن ہے اس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل ہو۔" کمال رائے نے جواب دیا۔

پھر شہر کے ایک بڑے ماہر نفسیات سے وقت لے کر رامش خیال کو دکھایا گیا۔ اس نے کوئی ایک گھنٹہ رامش خیال سے تنہائی میں بات کی۔ ڈاکٹر کے تمام سوالات کے جواب اس نے لکھ کر دیئے۔ ان جوابات کو ڈاکٹر پرویز نے پوری توجہ سے پڑھا، اس کے بعد وہ رامش خیال کو اندر ہی چھوڑ کر خود باہر آ گیا۔

اس نے ماموں رشید سے صرف ایک سوال کیا۔ "کسی قسم کا کوئی ذہنی صدمہ تو نہیں پہنچا انہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب ذہنی صدمہ تو دور کی بات ہے، اسے کسی نے ڈانٹا بھی نہیں۔" ماموں رشید مسکرا کر بولے۔ "البتہ ایک بات ضرور ہوئی ہے۔"

"وہ کیا؟" ڈاکٹر پرویز کے ایک دم کان کھڑے ہو گئے۔

"اس کا نکاح ہوا ہے، ایک دن پہلے..... یوں سمجھیں کہ رات کو نکاح ہوا ہے اور صبح یہ قوت گویائی سے محروم تھا لیکن ڈاکٹر صاحب آپ کے کوئی سوال کرنے سے پہلے میں ایک بات بالکل صاف طور پر بتائے دیتا ہوں۔ یہ نکاح اس کی عین منشا کے مطابق ہوا ہے۔ اس نکاح سے اسے ذہنی صدمہ کے بجائے بے انتہا خوشی ہوئی ہے۔ اگر اس خوشی نے اسے قوت گویائی سے محروم کر دیا ہے تو میں کہہ نہیں سکتا۔" ماموں رشید نے کمال رائے کی جانب ایک نظر دیکھتے ہوئے ڈاکٹر پرویز کو مخاطب کیا۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ اچانک خوشی کی خبر سن کر مر جاتے ہیں، ان کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے لیکن یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ بہرحال میں ایک دوا لکھ کر دے رہا ہوں۔ ایک ہفتہ کھلایئے۔ پھر مجھے آ کر بتایئے۔" ڈاکٹر پرویز نے کاغذ پر دوا کا نام لکھ کر پرچی ماموں رشید کو تھما دی اور پھر اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کر کے رامش خیال کو باہر بلوا لیا۔

کمال رائے نے اُٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ڈاکٹر پرویز کے کمرے سے لے کر باہر آ گیا۔

کمال رائے کی سمجھ میں اب یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ یہ کیس نہ کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ کا ہے اور نہ کسی سائیکاٹرسٹ کا..... یہ کیس کسی اور کا ہے۔ اس کا جو ایک بلی کے بچے کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے۔

شام کو جب کمال رائے اس کے سامنے پہنچا تو وہ حسب معمول دیوار سے ٹیک لگائے سامنے نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ بلی کا بچہ بیگ کے اوپر اچھل کود مچائے ہوئے تھا۔

کمال رائے خاموشی سے اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے بیٹھتے ہی بلی والے بابا نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر وہ یونہی آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا، پھر اچانک اس نے آنکھیں کھولیں۔

"یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ ہمارے بلی کے بچے کے لئے روٹی لا۔" بلی والے بابا نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے کمال رائے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا..... ٹھیک ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر کمال رائے فوراً اُٹھ گیا۔ اس نے جوس والے سے کسی ہوٹل کا معلوم کیا۔ ہوٹل نزدیک ہی تھا۔ کمال رائے ہوٹل کا پتہ معلوم کر کے وہاں سے دو روٹیاں لے آیا۔ بابا نے روٹیوں کی تعداد تو بتائی نہیں تھی۔ یہ روٹیاں محض اس نے اپنے اندازے سے خریدی تھیں اگر کوئی کمی بیشی ہوتی تو وہ دوبارہ جا کر لے آئے گا۔ ہوٹل کون سا دور تھا۔ یہ روٹیاں کاغذ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے بابا کے نزدیک آ کر بہت احترام سے روٹیاں آگے کر دیں۔

بابا نے روٹیاں لے کر زمین پر رکھیں۔ کاغذ کھولا۔ ایک روٹی سے نوالہ توڑا، نوالہ توڑ کر بلی کے بچے کے آگے زمین پر ڈال دیا۔ روٹی دیکھتے ہی بلی کے بچے نے فوراً نوالہ منہ میں لے لیا اور گردن ہلا ہلا کر روٹی کھانے لگا۔ اس طرح اس نے تین نوالے اپنے بلی کے بچے کو کھلائے اور پھر ثابت روٹی اُٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لی اور ٹوٹی ہوئی روٹی کاغذ میں لپیٹ کر کمال رائے کی طرف بڑھائی۔

"یہ لے پکڑ..... اسے لے جا کر اس گونگے کو کھلا دے..... فر فر بولنے لگے گا، چل جا بس۔"

بہت بہت شکریہ..... بابا جی۔" کمال رائے نے کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹی جلدی سے تھام لی اور کچھ لمحے بیٹھا رہا۔

بلی والے بابا نے پھر کوئی بات نہ کی۔ وہ حسب معمول ایک ٹک بغیر پلکیں جھپکائے سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

اب وہاں بیٹھنا بے کار تھا۔ اس نے دھیرے سے بلی والے بابا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اچھا بابا جی میں چلتا ہوں۔"

لیکن جواب میں بلی والے بابا نے کچھ نہیں کہا، وہ بغیر پلکیں جھپکائے سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

کمال رائے پھر خاموشی سے کھڑا ہو گیا اور ٹوٹی ہوئی روٹی ہاتھ میں دبائے گاڑی کی طرف بڑھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل فون آن کیا اور رامش خیال کے گھر کا نمبر ملایا۔

دوسری گھنٹی پر اُدھر سے کسی نے ریسیور اُٹھایا اور "ہیلو" کہا۔

"کون؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"آپ نے کس سے بات کرنی ہے۔" اُدھر سے پوچھا گیا۔

"جی رشید ماموں سے۔" کمال رائے نے کہا۔

"ماموں اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" جواب ملا۔

"اچھا، آپ مہر النساء بول رہی ہیں۔" کمال رائے نے ماموں کہنے کی وجہ سے اندازہ لگایا۔

"جی...... لیکن آپ کون؟" اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔

"میں کمال رائے بات کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"جی انکل...... کیسے ہیں آپ؟" مہرو خوشدلی سے بولی۔

"بھئی مہرو...... یہ بتاؤ رامش کہاں ہے؟"

"گھر پر ہیں۔" مہرو نے جواب دیا۔

"کیا کر رہے ہیں؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔"

"اچھا تم ایسا کرو...... ایک گھنٹے کے اندر رامش کو میرے گھر لے کر آ جاؤ۔"

"انکل خیریت تو ہے؟"

"ہاں، خیریت ہے اور مجھے پکا یقین ہے کہ جب رامش یہاں آئے گا تو اس کی زبان کھل جائے گا۔ فر فر بولنے لگے گا۔" کمال رائے نے بڑے یقینی انداز میں کہا۔

"ہائے سچ انکل۔" مہرو خوشی سے اچھل پڑی۔ "میں بھائی کو ابھی لے کر آتی ہوں۔"

"میں اس وقت کہیں اور بول رہا ہوں۔ تم اگر مجھ سے پہلے پہنچ جاؤ تو میرا انتظار کرنا۔"

"ٹھیک ہے انکل۔" مہرو نے یہ کہہ کر فوراً ریسیور رکھ دیا اور دوڑتی ہوئی رامش خیال کے کمرے میں پہنچی۔ رامش خیال قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹی وی کھلا ہوا تھا لیکن وہ ایک ٹک چھت کو گھور رہا تھا۔

"بھائی...... جلدی اُٹھو۔" مہرو اس پر کسی بجلی کی طرح گری۔

اس نے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"انکل نے بلایا ہے۔ ان کے گھر چلو۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"کیوں؟" رامش خیال نے بھنوؤں سے سوال کیا۔

"انہوں نے کہا ہے کہ رامش کو لے کر آ جاؤ۔" مہرو نے جلدی جلدی بتایا۔ "بھائی تم فر فر بولنے لگو گے۔"

بولنے کا ذکر سن کر تو رامش خیال کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کئے اور گاڑی اسٹارٹ کر کے مہرو کا انتظار کرنے لگا۔

☆......☆......☆

کمال رائے اپنے گھر پہنچا تو رامش خیال اور مہرو اس سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں تھے۔ آرزو بھی وہاں موجود تھی۔ مہرو اور آرزو ایک صوفے پر بیٹھی گپ شپ میں مشغول تھے۔

کمال رائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو رامش اور مہرو نے اس کا کھڑے ہو کر استقبال کیا۔

"آ گئے بھئی تم لوگ...... گڈ۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "آرزو...... ذرا ستارہ کو بلاؤ۔"

"جی اچھا۔" آرزو ڈرائنگ روم سے نکلنے لگی تو کمال رائے نے اسے روک دیا۔ "آرزو تم ان لوگوں کے ساتھ بیٹھو۔ میں خود جاتا ہوں۔"

آرزو رک گئی اور کمال رائے کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس۔ کمال رائے نے پلیٹ رامش خیال کے سامنے میز پر رکھی تو ان تینوں نے بڑی دلچسپی سے اس پلیٹ کی طرف دیکھا، انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس میں ایک تنوری روٹی ہے اور وہ بھی پوری نہیں۔

"بابا، یہ کیا ہے؟" آرزو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"شش!" کمال رائے نے اپنی ایک انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر وہ رامش خیال سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بیٹا...... مجھ سے یہ سوال نہ کرنا کہ یہ کیا ہے اور کہاں سے لایا ہوں؟ بس تم اس روٹی کو خاموشی سے کھا لو۔"

رامش خیال نے یہ سنتے ہی ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اس نے پلیٹ اُٹھا کر قریب رکھی اور ایک نوالہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور چبانے لگا۔

"شاباش بیٹا...... اسے پوری کھا لو۔" کمال رائے نے اسے اُکسایا۔ وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگا۔

رامش خیال نے جب روٹی کا آخری نوالہ منہ میں رکھ لیا تو کمال رائے نے اسے پانی دیا۔ رامش نے پورے اطمینان سے پانی پیا اور خالی گلاس میز پر رکھ دیا اور کمال رائے کی طرف پُرتجسس نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کہو اللہ۔" کمال رائے نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

آرزو جو اب تک خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی اچانک کھڑی ہوئی اور رامش خیال کے نزدیک آ کر اسے ایک انگلی دکھا کر بولی۔ "دوسرے کی روٹی کھا کر بولتا ہے، میں دیکھتی ہوں تو کیسے بولے گا؟"

آرزو کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا، اس نے تنبیہی انداز میں ایک انگلی اُٹھا رکھی تھی، انداز ایسا تھا جیسے انگلی نہ ہو ریوالور ہو، ادھر رامش خیال بولا اور ادھر اس نے گولی ماری۔

یہ ایک غیر متوقع صورتحال تھی، یہ بات اس کے تصور میں بھی نہ تھی کہ آرزو اچانک اس طرح کا انداز اختیار کرلے گی، اس کے جارحانہ انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔

"آرزو، پیچھے ہٹو۔" کمال رائے نے غصے سے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر رامش خیال سے مخاطب ہوا۔ "کہو اللہ......"

رامش خیال نے ایک نظر آرزو کی طرف دیکھا اور پھر کمال رائے کی طرف اپنا چہرہ کر کے مسکرایا اور بڑے یقینی انداز میں بولا۔ "اللہ......"

اللہ کا نام اس نے کچھ اس طرح ادا کیا کہ پورے کمرے میں گونج گیا۔ اسے بولتا دیکھ کر کمال رائے کھل اُٹھا، مہرو کے چہرے پر بھی ایک دَم خوشی ناچ اُٹھی۔

"بھائی آپ بول سکتے ہیں؟"

"ہاں، مہرو...... میں بول سکتا ہوں۔" رامش خیال نے آنکھیں بند کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"دیکھو آرزو...... میرا بھائی بول سکتا ہے۔" مہرو ایک دَم پلٹ کر آرزو سے مخاطب ہوئی۔

لیکن کمرے میں آرزو کہاں تھی، وہ تو رامش خیال کے "اللہ" کہتے ہی ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھی۔

"ارے، یہ آرزو کہاں گئی؟"

یہ کہہ کر مہرو اس کی تلاش میں ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگی۔

"مہرو...... اسے جانے دو، اس کے پیچھے مت جانا۔" کمال رائے نے تنبیہہ کی اور یہ تنبیہہ کچھ اس انداز سے کی تھی کہ مہرو سہم کر واپس آ گئی۔

"یہ آرزو کو کیا ہوا؟" رامش خیال فکرمندی سے بولا۔

"کچھ نہیں بیٹا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کمال رائے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تمہاری زبان کھل گئی، اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔"

"میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" رامش خیال نے پوری سچائی سے کہا اور بڑے تشکر آمیز انداز میں کمال رائے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "انکل میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں جو کام ڈاکٹر نہ کر پائے، وہ آپ نے کر دکھایا۔"

"بیٹا! یہ سب اوپر والے کی مہربانی ہے، وہی سب کچھ جانتا ہے، وہی راستہ دکھانے والا ہے۔"

"انکل آپ کو یہ روٹی کہاں سے مل گئی۔ اس روٹی نے تو کمال کر دیا۔" مہرو بھی اظہار تشکر کئے بنا نہ رہ سکی۔

"مہرو! یہ راز کی بات ہے۔" کمال رائے نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں انکل...... نہ بتائیں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اچھا...... بیٹا...... اب آپ لوگ جائیں، رشید صاحب کو جا کر یہ خوشخبری سنائیں۔" کمال رائے نے کہا۔

"انکل میں ذرا آرزو سے مل آؤں؟" مہرو نے اجازت چاہی۔

"نہیں بیٹا...... آپ اندر نہ جائیں اور میری بات کا برا بھی نہ مانیں...... آرزو سے ملنا اس وقت ٹھیک نہیں ہوگا، ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کمال رائے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا، انکل جیسے آپ کی مرضی۔" مہرو بھی اُٹھ گئی۔ "آؤ بھائی چلیں۔"

رامش خیال چند لمحے خاموشی سے بیٹھا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ اُٹھے نہ اُٹھے۔ اسے آرزو کا خیال تھا، وہ اسے دیکھنا چاہ رہا تھا کیونکہ آرزو کا رویہ بڑا ناقابل فہم تھا...... لیکن کمال رائے نے مہرو کو منع کر دیا تھا لہٰذا اس سلسلے میں اب اس کا کچھ کہنا فضول ہی تھا۔

"اچھا......" وہ ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر اُٹھ گیا۔

کمال رائے نے ان دونوں کو گیٹ تک چھوڑا اور پھر تیزی سے گھر کی طرف بڑھا۔ اسے اب اپنی بیٹی کی فکر تھی۔ کمال رائے نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا انداز اچانک ناقابل فہم کیوں ہو گیا تھا۔ رامش کی زبان کھلے، یہ بات اس کو کب گوارا تھی۔

وہ آرزو کو ڈھونڈتا ہوا، اس کے کمرے میں پہنچا لیکن وہ کمرے میں نہ تھی، اس نے واش روم کا دروازہ چیک کیا، وہ کھلا ہوا تھا۔ وہ باہر آیا تو سامنے سروری آتی ہوئی نظر آئی۔

"سروری...... بی بی کہاں ہیں......؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"کمرے میں نہیں ہیں؟" سروری نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"اچھا، آپ اپنے کمرے میں چلیں...... میں انہیں ڈھونڈ کر آپ کو بتاتی ہوں۔"

"سب سے پہلے انہیں پچھلے لان کی طرف دیکھو۔" کمال رائے نے کہا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

ابھی اسے بیڈ پر لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سروری تقریباً چیختی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مالک...... مالک......"

"ہاں، کیا ہوا؟" وہ ایک دَم گھبرا کر اُٹھ گیا۔

''مالک......بی بی......رات کی رانی کے پاس پڑی ہوئی ہیں،ان کی بری حالت ہے۔''

کمال رائے نے سروری کی پوری بات سنی ہی نہیں،وہ بے تحاشا پچھلے لان کی طرف بھاگا۔

وہ گھر کے پچھلی طرف پہنچا تو اسے آرزو دور ہی سے نظر آگئی،ستارہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

''بی بی......''

کمال رائے نے ستارہ کو پیچھے ہٹایا اور فوراً گھاس پر بیٹھ گیا۔

آرزو کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے،منہ کھلا ہوا تھا،وہ بڑے خوفناک انداز سے سانس لے رہی تھی،اس کے سانسوں کی آواز میں کسی سانپ کی سی پھنکار تھی۔

''ستارہ......لعل محمد کو کہو گاڑی نکالے۔''

''اچھا مالک۔''ستارہ سرونٹ کوارٹر کی طرف بھاگی۔

پھر کمال رائے نے اسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ بے حد وزنی ہو چکی تھی،اسے بڑی حیرت ہوئی،اتنا وزن اس کی بیٹی میں کہاں سے آگیا۔

اس نے ستارہ اور سروری کی مدد سے اسے اُٹھایا اور لے جا کر گاڑی میں ڈالا،کمال رائے نے ستارہ اور سروری کو بھی ساتھ لے لیا اور لعل محمد سے اسپتال چلنے کو کہا۔لعل محمد نے بڑی مہارت اور بڑی رفتار سے گاڑی چلائی،اس نے بہت کم وقت میں مطلوبہ اسپتال پہنچا دیا۔

اسپتال پہنچنے کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد آرزو کو ہوش آیا،وہ نارمل ہو گئی،دورے کی سی کیفیت جاتی رہی،جب اسے احساس ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے تو بڑی حیران ہوئی اسے بس اتنا ہی یاد تھا کہ وہ رات کی رانی کے نزدیک گئی تھی بیل کے نزدیک جاتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا اور پھر اسے ہوش نہ رہا تھا،جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال میں پایا،وہ خاصی کمزوری محسوس کر رہی تھی،اسپتال میں کمزوری دور کرنے کیلئے ڈرپ لگائی گئی اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے میں اسے رخصت کر دیا گیا۔

گھر آکر کمال رائے نے جب رامش خیال کے بارے میں بتایا کہ اس کی قوت گویائی واپس آگئی ہے تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔''بابا،یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے......یہ کیسے ہوا؟''

کمال رائے نے بلی والے بابا کا ذکر حذف کر کے اسے روٹی کھلانے کا پورا واقعہ بیان کیا،اس نے اس واقعہ کو کچھ اس انداز میں سنا جیسے وہ ڈرائنگ روم میں اس وقت موجود ہی نہ تھی،کمال رائے نے اس کی اس کیفیت کو خاص طور پر نوٹ کیا اور جب کمال رائے نے وہ بات بتائی جو اس نے رامش خیال سے شدید غصے کی حالت میں کہی تھی تو آرزو اپنے باپ کو حیرت سے تکنے لگی۔

''ہیں،بابا......میں نے ایسا کہا۔''

''ہاں،بیٹا......کیا تمہیں یاد نہیں۔''کمال رائے نے پوچھا۔

''بابا،مجھے تو بالکل یاد نہیں......سوال یہ ہے کہ میں انہیں بولنے سے کیوں روکتی بھلا۔''

کمال رائے نے یہ جان لیا کہ آرزو سے یہ سب نادانستگی میں ہوا،انجانے میں ہوا،شاید اس نے کسی کے اثر میں آکر کیا۔تب کمال رائے نے اس موضوع پر مزید اس سے بات نہ کی کہ خواہ مخواہ اس کا ذہن اُلجھن کا شکار ہوگا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

اگلے دن شام کو اس نے بلی والے بابا کی خدمت میں حاضری دی۔وہ فٹ پاتھ پر بیٹھے بابا کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گیا۔بلی والا بابا دیوار سے ٹیک لگائے سامنے کی طرف تکے جاتا تھا۔

جب کمال رائے اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے اس پر نظریں ڈالے بغیر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ کچھ دیر یوں ہی خاموشی سے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا پھر اس نے اچانک اپنی آنکھیں کھولیں اور کمال رائے کو گھور کر دیکھا اور بولا۔''تیری بیٹی پر اس نے قبضہ جما لیا ہے......خیر کوئی بات نہیں......پریشان مت ہو......اسے بھی دیکھیں گے......فی الحال تو رات کی رانی کا کچھ کر......''

''رات کی رانی کا......؟''کمال رائے نے چونک کر پوچھا۔''بابا کیا کروں......آپ جو بتائیں وہ کروں۔''

''ارے،اس مصیبت کو کاٹ کر پھینک......ارے جڑ سے نکلوا دے سسری کو......وہ کوئی انڈے تھوڑی ہی دے رہی ہے......وہ مرغی تھوڑی ہے۔وہ کمبخت تو بچے دے رہی ہے۔''

کمال رائے کی سمجھ میں بس اتنی بات آئی کہ اس رات کی رانی کو کٹوانا ہے،انڈے بچے والی بات وہ نہیں سمجھ سکا،سمجھتا بھی کیسے؟اس بات کا کوئی سر پیر ہوتا تو وہ سمجھتا بھی۔

''ٹھیک ہے بابا......میں رات کی رانی کو کٹوائے دیتا ہوں۔''کمال رائے نے فرماں برداری سے کہا۔

''جڑ سے نکلوا دے اس کو......اور دیکھ جڑ سے اسے خود ہی نکالنا اور جیسے ہی جڑ سے نکالے فوراً اس گڑھے کو بھر دینا......سمجھ گیا نا تو ہماری بات۔''بلی والے بابا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''ہاں،بابا......اتنی بات تو میری سمجھ میں آگئی۔''کمال رائے بولا۔

''بس پھر جا......راہ لگ اپنی......ہمیں اپنا کام کرنے دے۔''یہ کہہ کر بلی والے بابا نے اپنی نظریں سامنے کسی غیر مرئی نقطے پر جما دیں۔

کمال رائے خاموشی سے اُٹھا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن صبح ہی اس نے مالی کو بلوا کر اسے کام پر لگا دیا۔ مالی نے ڈیڑھ فٹ لمبی قینچی سے رات کی رانی کی شاخیں کاٹنی شروع کیں۔ کمال رائے یہ کام اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا، وہ لان میں ایک کرسی ڈالے بیٹھا تھا، ابھی مالی نے دو تین شاخیں ہی کاٹی تھیں کہ آرزو اچانک آندھی طوفان کی طرح آئی اور مالی سے قینچی چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے چیخی۔ ''نہیں......''

اس افتاد پر مالی گھبرا گیا، اس نے فوراً قینچی اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دی اور گھبرا کر کمال رائے کو دیکھنے لگا۔

کمال رائے کیلئے یہ ایک غیر متوقع عمل تھا، وہ تیزی سے اُٹھ کر آرزو کے پاس آیا اور اس کے ہاتھ سے قینچی لیتا ہوا بولا۔ ''کیا بات ہے بیٹا۔''

''بابا، یہ رات کی رانی کو کاٹ رہا ہے...... اسے منع کر دیں ورنہ اس کے یہی قینچی مار دوں گی۔'' آرزو نے غضبناک لہجے میں کہا۔

''نہیں، بیٹا...... یہ اب نہیں کاٹے گا...... آپ آ جائیں میرے ساتھ۔'' کمال رائے نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا ہوا، کمرے میں لے گیا۔

''آرزو...... تم یہاں بیٹھو...... میں مالی کو بنگلے سے نکال کر آتا ہوں۔'' وہ اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، بابا...... اس خبیث کو نکال باہر کریں۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔

کمال رائے اسے بیڈ پر بیٹھا چھوڑ کر جلدی سے کمرے سے نکلا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں سے بھاگ کر چابی لے آیا اور اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا، اس کے بعد وہ اطمینان سے بنگلے کے پچھلے حصے میں آیا اور مالی کو قینچی دے کر بولا۔ ''ہاں بھئی شروع کرو۔''

مالی نے قینچی لے کر کھٹا کھٹ رات کی رانی کی کٹائی شروع کر دی۔ رات کی رانی آدھی سے زیادہ کٹ چکی تھی کہ آرزو کے کمرے سے اس کی چیخیں سنائی دیں۔ کمال رائے نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو وہ شیشے کے اس پار نظر آئی، وہ چیخ رہی تھی اور بار بار شیشے پر ہاتھ مار رہی تھی۔

وہ رات کی رانی کے کٹنے پر احتجاج کر رہی تھی۔

مالی نے آرزو کی چیخیں سن کر اور اسے شیشے کے پیچھے احتجاج کرتے دیکھ کر رات کی رانی کو کاٹنے سے ہاتھ روک لیا تو کمال رائے نے اسے سختی سے کہا۔ ''ارے، جلدی کرو...... ہاتھ مت روکو۔''

''اچھا صاحب......'' وہ یہ کہہ کر پھر سے کٹائی میں لگ گیا۔

کمال رائے پھر اُٹھ کر کھڑکی کے نزدیک آیا، اس نے آرزو کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا مگر وہ خاموش رہنے والی کب تھی، کبھی وہ کھڑکی کے شیشوں پر ہاتھ مارتی تھی اور کبھی کمرے

کے دروازے کو جا کر ہلاتی تھی، وہ بری طرح چیخ رہی تھی، کچھ اس طرح چیخ رہی تھی جیسے قینچی رات کی رانی پر نہیں چلائی جا رہی ہو، اس پر چلائی جا رہی ہو۔

رات کی رانی کی اب تمام شاخیں کٹ چکی تھیں، محض نیچے کا تھوڑا سا حصہ رہ گیا تھا اور اس تنے کو زمین کھود کر ہی جڑ سمیت نکالا جا سکتا تھا۔ مالی تنے کے اطراف کی زمین ایک تیز کھرپی سے کھود رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ تنے کو ہلا کر اور کبھی کھینچ کر دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ کمال رائے نے اسے ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ جڑ کو محض ڈھیلا کر دے، نکالے گا وہ خود......

آرزو کی چیخ و پکار بدستور جاری تھی، رات کی رانی کے کٹنے کے ساتھ اس کی چیخ و پکار میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا، وہ چیختی ہوئی پورے کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی، کبھی وہ دروازہ بجاتی تھی اور کبھی کھڑکی کے شیشوں پر ہاتھ مارتی تھی۔

اتنے میں مالی نے رات کی رانی کی جڑ کے اطراف کی زمین کھود لی اور رات کی رانی کی جڑ ہاتھ سے تھوڑی سی کھینچ کر دیکھی، وہ نکالے جانے کے قابل ہو گئی تھی تب مالی نے کمال رائے کو آواز دی۔

''صاحب جی۔''

کمال رائے فوراً تیزی سے چلتا مالی کے پاس آیا۔ ''ہاں بھئی ......''

''صاحب جی...... جڑ ڈھیلی ہو چکی ہے، آپ کھینچ کر نکالیں گے تو پوری جڑ آرام سے نکل آئے گی۔'' مالی نے بتایا۔

''اچھا ٹھیک ہے...... تم اِدھر آ جاؤ اور کھرپی مجھے دے دو۔''

''ٹھیک ہے صاحب جی۔'' مالی اپنے کپڑے جھاڑتا، کیاری سے باہر نکل آیا اور اس نے کھرپی کمال رائے کے ہاتھ میں دے دی۔

کمال رائے نے کیاری میں گھس کر کھرپی مٹی کے ڈھیر میں گاڑی اور اللہ کا نام لے کر تنے کو مضبوطی سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے زمین سے کھینچ لیا۔ جڑ نکلنے کی وجہ سے کافی گہرا گڑھا بن گیا۔

جڑ نکلتے ہی ایک چھنا کا سا ہوا، کمال رائے کو اندازہ ہو گیا کہ آرزو نے شیشہ توڑ دیا ہے مگر اس نے ٹ کر نہ دیکھا، اس کی نظریں گڑھے پر جمی ہوئی تھیں اور وہاں اسے جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ ناقابل ین تھا۔

اس گڑھے کے اندر بے شمار سانپ کے بچے گچھے کی صورت میں کلبلا رہے تھے۔

اب کمال رائے کی سمجھ میں ملی والے بابا کا جملہ آیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''ارے اس مصیبت کو کاٹ کے پھینک...... ارے جڑ سے نکلوا دے سسری کو...... وہ کوئی انڈے وڑے ہی دے رہی ہے...... وہ مرغی تھوڑے ہی ہے...... وہ کمبخت تو بچے دے رہی ہے۔''

کمال رائے نے بلی والے بابا کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی اس گڑھے کو مٹی سے بھرنا شروع کر دیا، وہ بہت تیزی سے کھرپی کے ذریعے گڑھے میں مٹی ڈالتا گیا یہاں تک کہ وہ گڑھا مٹی سے پُر ہو گیا۔

پھر اس نے مالی کے ہاتھ میں کھرپی دے کر کہا۔ ''اس گڑھے کو اچھی طرح پاٹ دو۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کیاری سے نکلا، اب اسے آرزو کی فکر ہوئی، وہ کھڑکی کی طرف بڑھا۔

ستارہ کھڑکی کے نزدیک سے دوڑتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی، اس نے پھولتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ''مالک......''

''کیا ہوا؟'' کمال رائے کھڑکی کی طرف بڑھا۔

''مالک...... بی بی...... شاید بے ہوش ہو گئی ہیں، وہ بیڈ کے نیچے پڑی ہیں۔'' ستارہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔

کمال رائے نے ایک نظر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ڈالی، آرزو اسے قالین پر بے سدھ پڑی ہوئی نظر آئی، وہ تو اچھا تھا کہ شیشوں کے اوپر گرل موجود تھی ورنہ آرزو شیشے توڑ کر کب کی باہر آ چکی ہوتی، اگر وہ باہر آ جاتی تو جانے کیا ہو جاتا۔

کمال رائے جلدی سے گھوم کر اس کے کمرے کے دروازے پر بھاگ کر اندر پہنچا۔

آرزو کے دونوں ہاتھ زخمی تھے، ان سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

کمال رائے نے اسے اپنے ہاتھوں میں اُٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گیا۔

☆......☆......☆

دوپہر کے کھانے پر دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے، آرزو کے دونوں ہاتھوں میں پٹیاں بندھی تھیں، وہ اپنے باپ کو شرمندہ شرمندہ سی دیکھ رہی تھی، اسپتال سے گھر آنے تک کمال رائے نے اس سے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی، کمال رائے نے اس کی پسندیدہ ڈش سے سالن نکال کر نوالہ بنایا اور پھر اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''لو بیٹا...... منہ کھولو۔''

''بابا...... بڑا عجیب لگ رہا ہے۔'' آرزو خجل سی ہو گئی۔

''کوئی عجیب نہیں لگ رہا...... میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں کھلایا ہے۔''

''وہ تو بچپن کی بات ہے بابا۔''

''تم تو اب بھی میرے لئے بچی ہو۔''

''وہ تو ساری عمر رہوں گی۔''

''بس، پھر منہ کھولو...... اور میرے ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔''

آرزو نے خاموشی سے اپنا چھوٹا سا منہ کھول دیا۔ کمال رائے نے بہت احتیاط سے اس کے منہ میں نوالہ رکھا اور پھر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ آرزو اس کی نظروں کے سامنے اچانک چھوٹی سی ہو گئی تھی، وہ اس کی گود میں بیٹھی تھی اور کمال رائے اسے چمچے سے سندھی بریانی کھلا رہا تھا۔

پھر اس کا دھیان پلٹا، سندھی بریانی کے خیال سے اسے اپنی ماروی یاد آ گئی، سندھی بریانی کمال رائے کو بہت پسند تھی، جب ماروی نے پہلی بار سندھی بریانی بنائی تو ماروی بھاپ اڑاتی ڈش اس کے سامنے سرکاتے ہوئے بولی۔ ''جناب نکالئے۔''

''نہیں جناب یہ کام آپ خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیجئے۔'' کمال رائے ہنس کر بولا۔

''اچھا......'' ماروی نے کہا اور پلیٹ کھسکا کر اس میں بریانی نکالی اور چمچہ اسے دیتے ہوئے بولی۔ ''لیجئے حضور۔''

''نہیں بھئی۔'' کمال رائے نے کھانے سے صاف انکار کر دیا۔

''اب کیا ہوا؟'' ماروی حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''جناب آپ نے پہلی مرتبہ ہماری پسندیدہ ڈش بنائی، اس کا افتتاح اتنی بے دلی سے تو نہ ہوگا۔''

''پھر کیوں کر ہوگا؟'' ماروی نے پوچھا۔

''بھئی، ہمیں اپنے ہاتھوں سے کھلائیے۔'' کمال رائے نے اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے فرمائش کی۔

''اُفوہ...... بعض وقت تو آپ بالکل بچے بن جاتے ہیں۔'' ماروی نے پلیٹ اپنے آگے کر کے بریانی سے چمچہ بھرا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لیجئے، منہ کھولئے۔''

کمال رائے نے خوش ہو کر بڑا سا منہ کھول دیا اور جب چمچہ ماروی نے اس کے منہ میں رکھا تو اس نے ماروی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ بدتمیزی ہے...... کیا میرا ہاتھ کھانے کا ارادہ ہے۔'' ماروی نے خوشدلی سے کہا۔

''یہ بدتمیزی ہے......؟ یہ دنیا کی خوبصورت ترین بات ہے...... اتنا اچھا پکانے والے ہاتھ کو جی چاہتا ہے، سارے کا سارا کھا جاؤں؟'' کمال رائے نے ہنس کر کہا۔

''کمال! میں خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین عورت تصور کرتی ہوں۔'' اچانک ماروی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''وہ کیوں؟'' کمال رائے نے اس کی طرف دیکھا۔

''جسے آپ جیسا پیارا شخص ملا۔'' ماروی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچ بتاؤ..... میں پیارا ہوں۔" کمال رائے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں، بابا..... آپ بہت پیارے ہیں۔" آرزو نے بلاتکلف کہا۔

"اس....." کمال رائے، آرزو کا جواب سن کر ایک دم چونکا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

اسے اس طرح چونکتے ہوئے دیکھ کر آرزو کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اس کا باپ اسے کھانا کھلاتے کھلاتے کہیں ماضی میں گم ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے بابا سے اس موضوع پر کوئی سوال نہ کیا، وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ باپ کے ہاتھوں کھانا کھاتے ہوئے اسے بہت اچھا لگ رہا تھا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح اپنے باپ کے ہاتھوں کھانا کھاتی رہے، وہ چھوٹی ہو جائے ہمیشہ کیلئے۔

کمال رائے نے آرزو کو اپنی طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دیکھا تو اس نے سوچا کہ یہ وقت ہے آرزو سے سوال کرنے کا..... تب اس نے آہستگی سے پوچھا۔ "بیٹا، صبح آپ کو کیا ہو گیا تھا ..... اتنا شور کیوں مچا رہی تھیں۔"

"بابا، آپ نے اتنی خوبصورت رات کی رانی کی بیل کٹوا دی..... ایسی مسحور کن خوشبو تھی اس کی۔" آرزو نے جواب دیا۔

"آرزو، اپنے بابا سے جھوٹ مت بولو، سچ بتاؤ کیا بات تھی۔"

"بابا وہ اس کا مسکن تھا، آپ نے اسے اُجاڑ دیا۔" آرزو نے سچ بتایا۔

"کس کا مسکن تھا۔" کمال رائے حیران ہوا۔

"بابا..... اس سیاہ لباس والے کا..... رنتارو کا..... بابا، اس سنہری سانپ کا....." آرزو نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تم جانتی ہو کہ اس کی جڑ میں کیا تھا؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"کیا بابا؟" آرزو نے کمال رائے کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اس کی جڑ میں سینکڑوں سانپ کے بچے موجود تھے۔ کیا تم جانتی ہو کہ وہ کیسی تباہی مچاتے، وہ بڑے ہو کر پورے بنگلے میں پھیل جاتے۔" کمال رائے نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا۔

"ہیں، بابا..... لیکن وہ تو اب بھی نکل آئیں گے۔"

"اب نہیں نکل سکتے۔" کمال رائے نے پورے یقین سے کہا۔ "کھانا کھا لو..... پھر وہاں جا کر دیکھنا۔"

"آپ نے کیا، کیا ہے؟"

"میں نے کیاری پکی کروا دی ہے، پکے فرش کو توڑ کر اوپر آنا کوئی آسان کام تو نہیں۔"

"اچھا کیا..... بابا آپ نے۔" آرزو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔

"آرزو..... تم نے شیشہ توڑ کر اپنے دونوں ہاتھ زخمی کر لئے..... میری بچی کیا تم جانتی ہو کہ تمہارا کتنا خون بہہ گیا؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" آرزو معصومیت سے بولی۔

"ایسا تم نے کیوں کیا..... تم نے میری بات بھی نہ سنی۔"

"بابا، بس مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا..... اگر میں باہر نکل سکتی تو یقین کریں میں اس مالی کا ضرور گلا دبا دیتی..... آپ نے اچھا کیا کہ مجھے تالے میں بند کر دیا۔"

"اس وقت تمہاری کیفیت کیا تھی؟"

"بس..... ایک ہی بات میرے دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ رات کی رانی کسی طرح کٹنے نہ پائے، کوئی بار بار میرے دماغ میں کہہ رہا تھا کہ دیکھو رات کی رانی کو کسی طرح بچا لو۔" آرزو نے اپنی کیفیت بتائی۔

"اب تمہیں اندازہ ہوا کہ وہ تمہیں نقصان پہنچا رہا ہے۔"

"بابا، میں بے بس ہوں۔" آرزو نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"تمہیں..... ذرا جرأت سے کام لینا ہوگا۔" کمال رائے نے اس کی ہمت بندھائی۔

"بابا، وہ رامش خیال کو نقصان پہنچا چکا ہے، ڈرتی ہوں کہیں وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" آرزو نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر وہ کمال رائے کا ہاتھ روکتی ہوئی بولی۔ "بس بابا، پیٹ بھر گیا، اب نہیں کھاؤں گی۔"

"اچھا....." کمال رائے نے وہ نوالہ اپنے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ڈرو مت..... وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"بابا..... آپ نہیں جانتے..... وہ کیا چیز ہے.....؟ وہ بندے کے حواسوں پر چھا جاتا ہے۔"

"تمہیں اسے گرفت میں لینا ہوگا۔"

"بابا، وہ بادل جیسا ہے..... آپ سمجھ لیں دھواں ہے..... بھلا دھویں کو کس طرح گرفت میں لیا جا سکتا ہے، آپ ذرا خود سوچیں۔"

"اچھا..... میں کرتا ہوں..... اس کا بھی انتظام..... اس کا مسکن تو میں نے اُجاڑ دیا۔"

"بابا، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم کیوں ڈرتی ہو؟"

"بابا...... وہ بہت سنگدل ہے...... اسے کسی کا لحاظ نہیں...... وہ انسان تھوڑے ہی ہے۔

"پھر وہ کیا ہے؟"

"اللہ ہی جانے۔" آرزو نے ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹا...... اپنے کمرے میں چلو...... میں ابھی آتا ہوں...... کافی تمہارے کمرے میں ہی پئیں گے۔ کمال رائے نے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا...... آپ آجایئے...... میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں اور ہاں بابا کھانا خوب پیٹ بھر کر کھایئے گا...... آپ نے سارا وقت تو مجھے ہی کھلانے میں لگا دیا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی، اس نے اُلٹے ہاتھ میں ریسیور اُٹھا لیا جس میں کم پٹیاں بندھی تھیں پھر وہ ریسیور کان سے لگا کر دھیرے سے بولی۔ "ہیلو......"

"اوہ، مصیبت تو کہاں تھی؟" مہرو نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"رانگ نمبر۔" آرزو نے مہرو کی آواز پہچان کر کہا۔

"خبردار، جو ریسیور رکھا...... تیرے ہوش اُڑا دوں گی۔" مہرو نے وارننگ دی۔

"ارے بھائی...... اپنے تو پہلے ہی ہوش اُڑے ہوئے ہیں۔" آرزو جانے کیوں ایک دم سیریس ہو گئی۔

"کیا ہوا، آرزو...... تم تو ایک دم پٹری سے اُتر گئیں۔"

"میری مہرو...... دونوں ہاتھ زخمی ہیں...... بڑی مشکل سے ریسیور تھاما ہوا ہے۔"

"کیا ہوا آخر......؟" مہرو ایک دم گھبرا گئی۔

"تو پریشان مت ہو...... جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔"

"پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔"

"ہوا یہ کہ میں نے جنون میں آکر کھڑکی کے شیشے پر دونوں ہاتھ مار دیئے...... شیشہ ٹوٹ گیا اور میرے ہاتھ لہولہان ہو گئے...... اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا...... بابا مجھے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال اُٹھا کر لے گئے۔" آرزو نے واقعہ کو خاصا مختصر کر کے بیان کیا۔

"آخر یہ جنون کس بات پر چڑھا۔" مہرو نے پوچھا۔

"یار، بابا نے اچانک رات کی رانی کٹوا دی...... بس پھر کیا تھا، میں تو بپھر گئی۔" آرزو نے مہرو کو بتایا۔

آرزو کچھ جواب دینے والی تھی کہ وہ اچانک دروازے سے داخل ہوا، وہ اوپر سے نیچے تک سیاہ لباس میں تھا، اس کے چہرے پر گھونگھٹ پڑا ہوا تھا، وہ پورے اطمینان سے چلتا ہوا آرزو کے قریب آیا۔

"یہ تم کیا بک بک کر رہی ہو؟" آرزو کے دماغ میں ایک مردانہ آواز گونجی۔

"اری، چپ کیوں ہو گئی...... بتا زیادہ زخمی تو نہیں ہوئی۔" اِدھر سے مہرو بولی۔

"ٹیلیفون فوراً بند کر دو۔" اسے حکم ملا۔

"بولتی کیوں نہیں...... کیا مر گئی ہو۔" مہرو نے کوئی جواب نہ پا کر اُلجھ کر کہا۔

تب آرزو نے مہرو کو کوئی جواب دیئے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

"آہ، تم آ گئے۔" آرزو نے بغیر لب کھولے کہا۔ "دیکھو، میرے ہاتھ زخمی ہو گئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں...... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے...... تم ذرا یہ پٹیاں کھولو۔" آواز میں بہت محبت تھی۔

آرزو نے بلا تامل اپنے دونوں ہاتھوں سے پٹیاں اُتار دیں۔

"اپنے دونوں ہاتھ ملا لو۔"

آرزو نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑنے کے انداز میں ملائے اور اوپر اُٹھا دیئے۔ اس نے کالے لباس کے اندر سے اس کے دونوں ہاتھ، اپنے ایک ہاتھ میں لے لئے، ایک سکون کی لہر اس کے جسم میں داخل ہوئی، ابھی چند لمحوں پہلے جو اس کے ہاتھوں میں جلن سی ہو رہی تھی، وہ بند ہو گئی پھر اس نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور بولا۔ "اب کھولو ہاتھ۔"

جب آرزو نے اپنے ہاتھ کھول کر آنکھوں کے سامنے کئے تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے ہاتھ پر ایک خراش بھی نہیں تھی۔ آرزو یہ دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"شکریہ......" وہ بڑی ممنونیت سے بولی۔

"اب تو کوئی شکایت نہیں مجھ سے......"

آرزو کچھ جواب دینے والی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور کمال رائے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"اچھا ہم چلتے ہیں۔" اس کے دماغ میں آواز آئی۔

اور پھر کمرے میں وہ کالے لباس والا نہ رہا...... وہ کھڑکی کی طرف گیا اور پھر تیزی سے پردے کے پیچھے چلا گیا، پردہ اپنی جگہ ساکت تھا۔

آرزو پردے کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کے ہاتھوں کی پٹیاں کھلی ہوئی بیڈ پر پڑی تھیں۔

''ارے..... بیٹا..... تم نے یہ پٹیاں کیوں اُتار دیں۔'' کمال رائے کی نظر اچانک بیڈ پر پڑی۔

''بابا، اب ان پٹیوں کی ضرورت نہیں رہی۔'' آرزو نے فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا..... ہاتھوں کے زخم خراب ہو جائیں گے..... بینڈ یج ضروری ہے۔'' اس نے سمجھایا۔

''بابا، زخم ہوں گے تو خراب ہوں گے نا.....'' آرزو نے مسکرا کر کہا۔

''یہ تم کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔'' کمال رائے نے ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو میز پر کافی کے برتن سجا رہی تھی۔

''بی بی..... آپ ذرا اپنے ہاتھ تو دکھائیں۔'' ستارہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''یہ لو..... دیکھ لو..... کوئی زخم تو نہیں ہے نا.....'' آرزو نے ستارہ کی طرف ہاتھ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پیچھے، دونوں طرف سے دکھائے۔

اس کے ہاتھ دیکھ کر وہ دونوں حیران رہ گئے۔ اس کے خوبصورت ہاتھوں پر زخم تو دور کی بات ہے، ایک خراش تک نہ تھی۔

''یہ کیسے ہوا؟'' کمال رائے نے آرزو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس ہو گیا بابا۔'' وہ کیا جواب دیتی۔

''اچھا ٹھیک ہے..... تم بتانا نہیں چاہ رہیں..... کوئی بات نہیں..... آؤ کافی پیو۔'' کمال رائے نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں، بابا..... کافی تو میں ضرور لوں گی۔'' آرزو خوش خوش صوفے پر بیٹھ گئی اور کھڑکی کے اس پردے کی طرف دیکھنے لگی جہاں وہ غائب ہوا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے شیشے لگ چکے تھے اور پردے کھڑکیوں پر اچھی طرح پھیلے ہوئے تھے، وہاں کوئی نہ تھا یا اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ستارہ کی آنکھوں میں ابھی نیند بھری ہوئی تھی لیکن اس خواب نے اسے پریشان کر دیا تھا، وہ ابھی سونا چاہ رہی تھی لیکن اس خواب نے اس کی نیند اُڑا دی تھی۔

وہ اُٹھ گئی، اس کی ماں ابھی بھی سو رہی تھی، اس نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا پھر میز پر رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھا، صبح کے چھ بج رہے تھے، وہ سات بجے اُٹھا کرتی تھی، آرزو کالج جاتی تھی تو وہ اس کو ناشتہ وغیرہ دے دیا کرتی تھی، سات بجے کے بعد ایک دو بار چکر بھی لگایا کرتی تھی، اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ اس کی ضرورت پوری کر دیا کرتی تھی، ابھی چھ بجے تھے، وہ جانتی تھی کہ ابھی آرزو سو رہی ہو گی، اس کے کمرے میں جانا بے کار تھا لیکن اس نے جو خواب دیکھا تھا، اس کی بے چینی اسے کمرے میں جانے پر اُکسا رہی تھی۔ ستارہ نے ایک نظر اپنی سوتی ہوئی ماں پر ڈالی اور

اپنے چھوٹے سے گھر سے باہر نکل گئی۔

باہر نکل کر اس نے کئی گہرے گہرے سانس لئے، بنگلے کے پچھلے لان میں کچھ دیر ٹہلی، سورج ابھی نہیں نکلا تھا لیکن اس کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی، کچھ دیر ٹہل کر وہ وہاں سے کچن میں آئی، وہاں سنک میں رات کے برتن پڑے ہوئے تھے، وہ دھوئے اور پھر چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر وہ آرزو کے کمرے کی طرف بڑھی، اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ آرزو ابھی اُٹھی نہ ہو گی لیکن خواب کی بے چینی اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

دروازہ بند تھا، اس کا مطلب تھا کہ ابھی آرزو اُٹھی نہیں ہے، اس کی عادت تھی کہ وہ جب اُٹھ جاتی تو اپنے کمرے کا تھوڑا سا دروازہ کھول دیتی تھی، ستارہ مایوس ہو کر واپس جانے لگی پھر اسے خیال آیا کہ دروازہ کھول کر تو دیکھے..... آج کل آرزو دروازہ لاک کر کے نہیں سوتی تھی، اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا، تھوڑا سا دروازہ کھول کر اسنے اندر جھانکا۔

''او..... چور کیا جھانک رہی ہے؟'' اندر سے آرزو کی آواز آئی، وہ واش روم میں نہانے جا رہی تھی۔

''بی بی آپ اُٹھ گئیں۔''

''ہاں، میں تو اُٹھ گئی..... پر تجھے کیا ہوا؟ کیا تو نے خدانخواستہ ناشتہ تو تیار نہیں کر لیا۔'' آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں بی بی..... میں ابھی تو چائے کا پانی رکھ کر آئی ہوں۔'' ستارہ نے اسے پر تجسس نظروں سے دیکھا۔ ''بی بی، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دو منٹ رک جائیں۔''

''ہاں، رک جاتی ہوں..... کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں بی بی..... بڑی خاص بات ہے..... میں نے کالے لباس والے آدمی کو دیکھا ہے۔''

''ارے..... کیا کہہ رہی ہے تو..... کہاں دیکھا ہے..... کیا اپنے گھر میں..... آ اندر آ جا۔'' آرزو نے جو ابھی تک ستارہ سے دروازے پر ہی کھڑی بات کر رہی تھی، اسے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔

پھر وہ دونوں ساتھ صوفے کے نزدیک آئیں۔ آرزو صوفے پر بیٹھ گئی، اس نے ستارہ کو بھی اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا..... ابھی دروازہ کھلا تھا، ستارہ دوڑی ہوئی گئی، اس نے دروازہ بند کیا اور پھر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اور آرزو کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ہاں ستارہ بتا..... تو نے اس کالے لباس والے کو کیا اپنے گھر میں دیکھا؟''

''نہیں بی بی..... میں نے اسے خواب میں دیکھا۔''

''اچھا..... ذرا اپنا خواب سنا۔''

''بی بی...... میں نے دیکھا کہ وہ رات کی رانی والی جگہ پر کھڑی ہے......وہ مکمل طور پر سیاہ لباس میں پوشیدہ تھا، اچانک میں لان میں نکل آئی تو اس نے مجھے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس سے قریب آنے کا اشارہ کیا، میں اس کے قریب گئی تو وہ بڑی افسردگی سے بولا۔ ''ہمارا مسکن اجاڑ دیا ہے...... اب ہم یہاں کیسے رہیں...... دیکھو تم سب لوگوں سے کہہ دینا کہ ہم اپنی آرزو کو کل رات یہاں سے لے جائیں گے...... اگر کوئی روک سکتا ہے تو روک لے۔'' ابھی میں یہ کہنے ہی والی تھی کہ نہیں آپ ایسا نہ کریں...... مگر وہ آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔'' ستارہ نے اپنا خواب سنایا۔

''اچھا......'' آرزو نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ ''یہ تو کوئی اچھا خواب نہیں۔''

''اسی لئے بی بی، میں اپنا خواب سنانے کیلئے بے چین ہو رہی تھی۔''

پھر وہ کالج جانے کیلئے کمرے سے نکل رہی تھی کہ سروری اس کے کمرے میں آ گئی۔ آرزو نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ سروری اسے کچھ بے چین اور کچھ بتانے کے لئے بے تاب نظر آئی۔

''ہاں...... سروری؟'' آرزو اس سے مخاطب ہوئی۔

''بی بی...... میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔''

''اچھا...... تم نے کیا دیکھ لیا۔''

''بی بی...... ایک کالے کپڑوں والا آدمی ہے، اس نے اپنا منہ بھی ڈھک رکھا ہے، وہ میرے کمرے میں کھڑا نظر آتا ہے، میں ڈر کر اس سے پوچھتی ہوں کہ تو کون ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ ہمارا گھر اُجاڑ دیا...... اب ہم یہاں نہیں رہیں گے لیکن یاد رکھا اکیلے نہیں جائیں گے...... ہم کل رات آرزو کو یہاں سے لے جائیں گے...... کوئی ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرے۔'' سروری اپنا خواب سنا کر آرزو کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''کوئی بات نہیں سروری...... تم پریشان مت ہو...... میں کالج سے آ کر پھر بات کروں گی۔''

اور جب وہ کالج پہنچی تو مہرو اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ آرزو نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا، وہ اسے کچھ پریشان سی نظر آئی۔ آرزو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''مہرو کیا تو نے بھی کوئی خواب دیکھا ہے۔''

''آرزو کی بات سن کر مہرو حیرت سے آرزو کا چہرہ تکنے لگی۔

''میں نے ٹھیک کہا ہے نا......'' آرزو نے اسے حیرت زدہ دیکھ کر اپنی بات دہرائی۔ ''تو نے کوئی خواب دیکھا ہے؟''

''ہاں، دیکھا تو ہے...... پر یہ بات تجھے کیسے معلوم ہوئی؟'' مہرو نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ...... اندر چلو...... کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' آرزو اس کا ہاتھ پکڑ کر کالج میں داخل ہوئی اور پھر وہ دونوں ایک مناسب جگہ دیکھ کر سیڑھی پر بیٹھ گئیں۔

''ہاں، اب بولو...... تم نے کیا دیکھا۔'' آرزو نے پوچھا۔

''میں نے کوئی اچھا خواب نہیں دیکھا لیکن پہلے تو مجھے یہ بتا کہ تجھے کیسے اندازہ ہوا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔''

''آج صبح سے میں خواب ہی سنے جا رہی ہوں...... یہاں آ کر تجھے کالج کے گیٹ پر اپنا انتظار کرتے پایا تو میرے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ تو نے بھی ضرور کوئی خواب دیکھا ہے اور یہ خواب سو فیصد مجھ سے متعلق ہے؟'' آرزو نے اسے ہنس کر دیکھا۔

''ہاں، یہ خواب یقیناً تجھ سے متعلق ہے لیکن کوئی اچھا خواب نہیں۔'' وہ بولی۔

''تو نے کسی کالے لباس والے کو دیکھا ہے...... سر سے پاؤں تک ڈھکا ہوا۔'' آرزو نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

یہ سن کر مہرو اُچھل پڑی، اور آرزو کو کچھ اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ ''ہاں آرزو، میں نے دیکھا کہ کالے لباس والا شخص اچانک واش روم کے دروازے سے برآمد ہوا، میں بیڈ پر لیٹی پڑھ رہی تھی جونہی میری نظر اس پر پڑی، میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی، اس نے آگے بڑھ کر کہا، ڈرو مت ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، ہم بس اتنا بتانے آئے ہیں کہ آرزو ہماری ہے، ہماری ہی رہے گی، اسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا، تمہارا بھائی بھی نہیں......'' مہرو یہ بتا کر چند لمحوں کیلئے رکی تو آرزو نے [illegible] کہا۔ ''پھر اس نے کہا ہو گا کہ کل رات وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

''ہاں، واقعی...... اس نے بالکل یہی کہا۔'' مہرو نے حیرت زدہ ہو کر فوراً تصدیق کی۔

''اب میں کیا کروں۔'' آرزو نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے دیکھا مہرو...... کیا میں نے ٹھیک [illegible] کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا؟'' مہرو نے اس سے پوچھا۔

''میں نے نکاح سے اسی لئے انکار کیا تھا...... اب تمہاری سمجھ میں آیا وہ سب کچھ برباد کرنے پر تُلا ہے، دوسرے بابا نے یہ غلطی کی کہ رات کی رانی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا...... وہاں اس کا مسکن تھا ...اس کا مسکن اُجڑ گیا، اس کی آرزو کو کسی کی منکوحہ بنا دیا گیا...... آخر وہ کب تک چپ رہے گا۔ اب ایک ایک کے خواب میں آ رہا ہے، ستارہ نے یہی خواب دیکھا...... سروری نے یہی خواب دیکھا تم نے یہی خواب دیکھا... پتہ نہیں وہ کس کس کے خواب میں آئے گا۔'' آرزو نے بے بسی سے [illegible] ''جانے وہ کیا کرے گا؟''

"وہ کون ہے؟" مہرو نے پوچھا۔

"وہ جو کوئی بھی ہے، بڑا زبردست ہے، اسے زیر کرنا آسان نہیں۔"

"کیا واقعی وہ تمہیں لے جائے گا؟"

"اسے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"ہائے آرزو... ایسا نہ کہو... کیا تم چلی جاؤ گی۔"

"میں اس کے سامنے موم کی گڑیا جیسی ہوں، اسے دیکھتی ہوں تو پگھلنے لگتی ہوں، اسے سامنے پا کر میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہوں...... مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا۔" آرزو نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم پریشان مت ہو آرزو...... میں گھر جا کر ماموں سے بات کروں گی...... وہ کسی عامل سے مل کر اس مسئلے کا حل کر لیں گے۔" اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ کسی چھوٹے موٹے عامل کے بس کا نہیں...... وہ اتنا زہریلا ہے کہ محض پھنکار مار دے تو وہ بندہ چل بسے۔"

"کیا وہ کوئی سانپ ہے؟" مہرو خوفزدہ ہو کر بولی۔

"ہاں، وہ ایک سانپ ہے...... اس کا نام رنتارو ہے۔" آرزو نے بتایا۔

"تو، تو اس کا نام بھی جانتی ہے...... کیا سانپوں کے نام بھی ہوتے ہیں؟"

"تو نام کی بات کرتی ہے...... ان کی ایک دنیا ہے...... میرا بچپن اسی دنیا میں گزرا ہے۔"

"تو نے اس بات کا ذکر تو کیا ہے لیکن کبھی تفصیل نہیں بتائی...... ذرا تفصیل سے بات کر۔"

"کوئی فائدہ نہیں مہرو...... مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے تفصیل بتائی تو تجھے کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔" آرزو نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ مہرو سہم گئی۔

"چل پھر جانے دے۔" وہ جلدی سے بولی۔ آرزو اس کی اس گھبراہٹ پر مسکرا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

"بابا، وہ کل رات مجھے لے جائے گا۔" آرزو نے کمال رائے سے کہا۔

وہ اپنے باپ کیلئے شام کی چائے لائی تھی۔ ٹرے اس نے شیشے کی میز پر رکھی اور چائے نکال کر اپنے باپ کو دیتے ہوئے اس نے جو بات کہی، اس نے کمال رائے کو چونکا دیا۔

"کون لے جائے گا...... بیٹا تم کیا کہہ رہی ہو۔" کمال رائے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"بابا...... وہ جس کا آپ نے مسکن اُجاڑا۔" آرزو نے سمجھایا۔

"میں نے تو کسی کا مسکن نہیں اُجاڑا۔" کمال رائے بھول گیا۔

"رات کی رانی کو کٹوا کر آپ بھول رہے ہیں؟" آرزو نے یاد دلایا۔

"اچھا، ہاں یاد آیا، یاد دلایا تو یاد آیا۔"

"بابا وہ سب کو نظر آیا ہے۔" آرزو بولی۔

"کس، کس کو......؟"

"بابا...... اسے ستارہ نے دیکھا...... ستارہ کی ماں سروری نے دیکھا...... میری دوست مہرو نے دیکھا۔"

"اچھا...... وہ ان تینوں کے سامنے آ گیا...... میرے سامنے کیوں نہیں آیا۔"

"بابا...... وہ حقیقت میں نہیں آیا...... خواب میں آیا اور اس نے مختلف انداز میں ایک ہی بات کہی کہ وہ کل رات آرزو کو یہاں سے لے جائے گا...... اگر کسی میں ہمت ہے تو روک لے...... بابا، آپ مجھے بچا لیں...... میں اگر ایک بار یہاں سے چلی گئی تو پھر آپ مجھے کبھی نہ پا سکیں گے۔" آرزو کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

"ارے آرزو...... تم پریشان مت ہو...... تمہیں یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکتا...... کوئی نہیں چھین سکتا...... میں اسے گولیوں سے بھون دوں گا۔"

"گولیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"اچھا تم یوں کرو...... اپنے کمرے میں جاؤ...... ستارہ کو اپنے ساتھ رکھو اور کمرہ اندر سے لاک کر لو۔" کمال رائے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہمارے پاس وقت ہے...... میں اس اثناء میں مسئلے کا حل تلاش کرتا ہوں۔"

"اچھا، بابا ٹھیک ہے۔" آرزو نے اپنے باپ کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو اور پھر اس کے کمرے سے نکلنے لگی۔

"آرزو!" کمال رائے نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"جی بابا!" وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"بیٹا، چائے تو پی لو۔"

"نہیں، بابا...... جی نہیں چاہ رہا۔"

"اچھا...... اِدھر تو آؤ...... میرے پاس بیٹھو، میں چائے پی لوں...... پھر چلی جانا۔"

"اچھا بابا۔" آرزو خاموشی سے اپنے بابا کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑے انہماک سے کمال رائے کو دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

جب وہ اکبر اسپتال کے گیٹ پر پہنچا تو اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ کمال رائے نے اپنی گاڑی ایک محفوظ جگہ پر پارک کی اور پھر کار سے اُتر کر بلی والے بابا کی طرف بڑھا۔

وہ دیوار کے زیر سایہ حسب معمول موجود تھا۔ دیوار سے کمر ٹکائے ایک ٹک سامنے کی طرف دیکھے جاتا تھا۔ بلی کا بچہ رسی سے بندھا دو پاؤں پر بیٹھا بابا کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جب کمال رائے، بابا کے نزدیک پہنچا تو بلی کے بچے نے کمال رائے کو گردن گھما کر دیکھا اور پھر بیگ کے پیچھے چھپ گیا۔

کمال رائے خاموشی سے بابا کے سامنے بیٹھ گیا۔ بابا نے اس کے بیٹھتے ہی اپنی آنکھیں کھولیں اور کمال رائے کو گھور کر دیکھا۔ کمال رائے اس کی چمکتی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا، اس نے فوراً اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

''کیوں آیا ہے؟'' بابا نے اچانک پوچھا۔

''بابا، میں بہت پریشان ہوں...... مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''کیا مجبوری ہے؟''

''بابا، مجھے نہیں معلوم، وہ کون ہے...... وہ جو کوئی بھی ہے، اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ میری آرزو کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

''بکواس کرتا ہے...... وہ کیا، اس کا باپ بھی کسی کو نہیں لے جا سکتا...... ہم اس خبیث کو اچھی طرح جانتے ہیں...... تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔''

''بابا، پریشان کیسے نہ ہوں...... وہ میری اکلوتی بچی ہے...... اس میں میری جان ہے۔''

''اچھا ڈرتا ہے...... پھر ایسا کر کہ اپنی بیٹی کو اپنے بنگلے سے نکال دے...... کہیں اور بھجوا دے...... سمجھ میں آئی بات......؟''

''ہاں بابا...... یہ ٹھیک ہے...... میں سمجھ گیا۔''

''سمجھ گیا تو پھر جا...... ہم اپنے بلی کے بچے سے باتیں کر رہے تھے...... وہ تجھے دیکھ کر بیگ کے پیچھے چھپ گیا۔'' بابا نے بیگ کی طرف دیکھا۔ ''آجا بھائی...... باہر نکل آ......''

بلی کا بچہ فوراً باہر نکل آیا اور دو ٹانگوں پر بیٹھ کر منہ اُٹھا کر بابا کو دیکھنے لگا۔ بلی والے بابا نے فوراً اپنی نظریں سامنے جما دیں۔

اب کمال رائے کا وہاں بیٹھنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کا رخ ڈیفنس کی طرف کرنے کے بجائے گلشن اقبال کی جانب پھیر دیا۔

☆......☆......☆

کمال رائے، ماموں رشید کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا، سامنے صوفے پر رامش خیال بھی موجود تھا، تینوں سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور اس مسئلے کا حل سوچ رہے تھے۔ حل تو موجود تھا، بلی والے بابا نے حل خود ہی بتا دیا تھا، اب صرف یہ سوچنا تھا کہ آرزو کو ڈیفنس سے نکال کر کہاں پہنچایا جائے کہ وہ محفوظ رہے۔

ماموں رشید کا خیال تھا کہ اسے گلشن اقبال لے آئیں۔ کمال رائے کو اسے گلشن اقبال لے آنے پر کوئی اعتراض نہ تھا، آرزو، رامش خیال کی بیوی تھی، اس کا نکاح ہو چکا تھا، اسے گلشن اقبال چھوڑنے میں کوئی ہرج نہ تھا۔ کمال رائے کے خیال میں مسئلہ اس سے بھی حل نہیں ہوتا تھا۔ اس خبیث کیلئے ڈیفنس سے گلشن اقبال پہنچ جانا کون سا مشکل کام تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آرزو کو یہاں لا کر کوئی بات بنے گی نہیں...... سوچنے والی بات ہے کہ جب وہ شخص مہرو کے خواب میں آکر دھمکی دے گیا...... اس کا مطلب ہے کہ وہ اس جگہ، اس مکان سے واقف ہے، آرزو اسے ڈیفنس میں نہ ملی تو وہ سیدھا گلشن اقبال کا رخ کرے گا۔'' کمال رائے نے دلیل دی۔

''ارے ہاں...... ہم نے مسئلہ کو اس طرح تو سوچا ہی نہیں...... یہ گھر تو پہلے اس کی نظروں میں ہے، وہ رامش خیال کو قوت گویائی سے محروم کر کے جا چکا ہے۔'' ماموں رشید نے اس دلیل کی تائید کی۔

''پھر......؟'' رامش خیال نے سوال کیا۔

''آرزو کو کراچی سے دور لے جانا ہوگا۔'' کمال رائے نے جواب دیا۔

''لیکن کہاں......؟'' ماموں رشید بولے۔

''میرا خیال ہے اسے روشن گوٹھ بھیج دیا جائے۔'' کمال رائے نے تجویز پیش کی۔

''خیال تو برا نہیں!'' ماموں رشید نے کہا۔

''لیکن اسے روشن گوٹھ لے کر کون جائے گا؟'' کمال رائے نے ماموں رشید کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''رائے صاحب...... کیا آپ خود نہیں جانا چاہتے۔'' ماموں رشید نے پوچھا۔

''جی...... میں خود نہیں جانا چاہتا...... میں بنگلے پر رہنا چاہتا ہوں تا کہ اگر وہ آرزو کو نہ پا کر کوئی تخریبی کارروائی کرے تو میں وہاں موجود ہوں...... میں نہیں چاہتا کہ ملازمین پر کوئی مصیبت آجائے۔'' کمال رائے نے بتایا۔ ویسے آرزو کو روشن گوٹھ بھجوانا کوئی مسئلہ نہیں، میں اپنے ڈرائیور اور

گارڈوں کو اس کے ساتھ کر دوں گا...... وہ آرام سے حویلی پہنچ جائے گی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اسے تنہا بھیجنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔"

"رائے صاحب کوئی مسئلہ نہیں ...... میں آرزو کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔" ماموں رشید نے فوراً پیشکش کی۔

"ماموں آپ اکیلے نہ جائیں...... میں بھی چلوں گا۔" رامش خیال نے فوراً کہا۔

کمال رائے نے ایک نظر رامش خیال کو دیکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ دونوں ہی چلے جائیں تو اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... ہم دونوں جائیں گے، آپ بے فکر ہو جائیں۔" ماموں رشید نے خوشدلی سے کہا۔ "کب جائیں گے؟" کمال رائے نے پوچھا۔ پھر ان کے جواب دینے سے پہلے ہی بولا۔ "میرا خیال ہے کل صبح سات ساڑھے سات بجے تک نکل جائیں اور میری جیپ لے جائیں۔"

"ٹھیک ہے...... گاڑی تو خیر ہم بھی اپنی لے سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ سفر کے لئے جیپ بہتر رہے گی۔" ماموں رشید نے کہا۔

جب پورا پروگرام طے ہو گیا تو کمال رائے ان کے گھر سے اُٹھ آیا۔

☆......☆......☆

آرزو بڑی بے دلی سے آہستہ آہستہ کھانا کھا رہی تھی۔ کمال رائے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ کچھ دیر تو اسے دیکھتا رہا پھر بہت محبت آمیز لہجے میں بولا۔ "آرزو، کیا ہوا؟ کھانا کھاؤ بیٹا۔"

"جی، بابا لے رہی ہوں۔" آرزو نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے پریشان نظر آ رہی ہو؟" کمال رائے نے اپنا اندازہ ظاہر کیا۔

"جی بابا، پریشان تو میں ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اس کی دھمکی کی وجہ سے......؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"جی بابا!" آرزو نے گردن ہلائی۔

"تم فکر مت کرو بیٹا...... اس مسئلے کا حل نکال لیا ہے...... تمہارے باپ کے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیا حل نکالا بابا!" آرزو نے پوچھا۔

"صبح سات بجے تیار رہنا...... تمہیں کالج نہیں روشن گوٹھ جانا ہے۔" وہ بولا۔

"روشن گوٹھ......؟" آرزو سمجھ نہ سکی۔

"رشید صاحب اور رامش خیال تمہارے ساتھ جائیں گے۔" مزید وضاحت ہوئی۔

"اور آپ بابا......" سوال ہوا۔

"میں احتیاطاً گھر پر رہوں گا...... پھر ایک دو دن میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔" جواب ملا۔

"آپ یہاں اکیلے رہیں گے...... نہیں بابا، میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔" وہ گھبرائی۔

"تم میری بالکل فکر مت کرو...... میری موجودگی یہاں بہت ضروری ہے تاکہ وہ تمہارے بارے میں کچھ اندازہ نہ کر سکے کہ تم کہاں ہو؟...... اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ یہاں کے کسی فرد کو پریشان نہ کرے۔" کمال رائے نے اسے سمجھایا۔

"اچھا بابا جیسی آپ کی مرضی۔" آرزو نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"آرزو اگر آج رات تم اپنے بیڈروم میں نہ سوؤ تو کوئی حرج تو نہیں......؟"

"نہیں بابا۔" آرزو نے سادگی سے کہا۔

"پھر تم میرے بیڈروم میں سو جاؤ اور اپنے ساتھ ستارہ کو سلا لو یا سروری کو جس کو چاہو...... میں اپنے اوپر والے بیڈروم میں سو جاؤں گا۔" کمال رائے نے بتایا۔

"ٹھیک ہے بابا۔" آرزو نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "میں ستارہ کو اپنے ساتھ سلا لوں گی...... ویسے پتہ نہیں بابا...... میرے دل پر گھبراہٹ سی ہے۔"

"بیٹا...... انسان کو اللہ نے بڑی طاقت دی ہے...... یقین کی طاقت...... تم بے فکر ہو جاؤ...... انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔" کمال رائے نے بڑے مستحکم انداز میں کہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے سے ضروری چیزیں سمیٹ کر کمال رائے کے کمرے میں آ گئی، ستارہ نے بیڈ کے برابر قالین پر اپنا گدا بچھا لیا اور پھر آرزو سے بولی۔ "بی بی، آپ آرام سے لیٹ جائیں، لائیں میں آپ کے پیر دبا دوں۔"

آرزو خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی اور ستارہ نے اس کے خوبصورت گورے گورے پاؤں اپنی گود میں رکھ لئے اور بہت آہستہ آہستہ بڑی نرمی سے انہیں دبانے لگی۔

کوئی آدھا گھنٹہ بعد ستارہ نے محسوس کیا کہ آرزو سو گئی ہے، اس نے دھیرے سے اس کے پاؤں اٹھا کر بیڈ پر رکھے اور ایک نظر اسے دیکھا لیکن وہ بے خبر سو رہی تھی، اس نے آنکھیں نہ نہ کھولیں۔

ستارہ نے وقت دیکھا، ابھی تو دس بجے تھے، اسے حیرت ہوئی، آرزو اتنی جلدی کیسے سو گئی خیر ں کا سو جانا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ ستارہ نے اس کے بیڈ سے اُٹھ کر دروازہ اندر سے لاک یا، واش روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، اس نے واش روم کی لائٹ جلا کر اندر کا جائزہ لیا اور پھر ٹ بجھا کر دروازہ پوری طرح بند کر دیا پھر اس نے ایک ایک کر کے تمام لائٹیں بجھا دیں صرف ٹ بلب جلنے دیا۔

کمرے میں فل ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا، ستارہ نے کم کیا، الماری سے ایک موٹی چادر نکال کر آرزو کو اُڑھائی۔ آرزو نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا، وہ شب خوابی کا لباس پہن کر سونے کی عادی تھی۔ پیر دبانے سے اتنا آرام ملا کہ اسے لباس تبدیل کرنے کا ہوش نہ رہا۔

آرزو اپنا ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے ہلکی سی کروٹ لئے محوِ خواب تھی۔ ستارہ دھیمے اجالے میں اس کی صورت دیکھنے لگی، اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت بکھری ہوئی تھی، اور چہرہ اسے قدر پیارا لگ رہا تھا کہ ستارہ کا جی چاہ رہا تھا کہ بس دیکھے جائے اور یونہی صبح ہو جائے۔

''اسے کیا دیکھتی ہے؟'' اچانک ایک مردانہ آواز سنائی دی اور ستارہ کی سٹی گم ہوگئی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے ڈرتے ڈرتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

کوئی نہ تھا۔ پھر اس نے سہمی ہوئی نظروں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا، کمرے میں کوئی آدمی نہ تھا۔

پھر یہ کون بولا تھا...... کس نے کہا تھا۔ ''اسے، کیا دیکھتی ہے؟''

تب اسے خیال آیا، یہ آواز پیچھے سے آئی تھی، نہ دائیں سے نہ بائیں سے...... یہ آواز اس کے دماغ میں گونجی تھی شاید یہ اس کا وہم تھا۔

وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی، اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے موبائل فون نکالا، اسے آن کیا، ایک دو نمبر دبائے پھر کچھ سوچ کر موبائل آف کر دیا اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔

ستارہ کی جب آنکھ کھلی تو اس کے تکیے کے نیچے سے آواز آ رہی تھی، یہ موبائل فون کی گھنٹی تھی، اس نے جلدی سے موبائل نکال کر کان سے لگایا اور بولی۔ ''ہیلو۔''

''ستارہ!'' اِدھر سے کہا گیا۔

''جی مالک!'' ستارہ مؤدبانہ انداز میں بولی۔

''آرزو کو اُٹھاؤ...... چھ بج رہے ہیں...... سات بجے تک تیار ہو جانا ہے۔'' کمال رائے نے ہدایت دی۔

''جی اچھا مالک۔'' یہ کہہ کر اس نے بیڈ پر نظر ڈالی اور پھر فوراً چیخی۔ ''مالک......''

''کیا ہوا؟''

''مالک...... بی بی یہاں نہیں ہیں۔''

''کمرے میں نہیں ہیں؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... واش روم میں ہوگی۔''

''ایک منٹ مالک۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھی اس نے واش روم کا دروازہ کھولا...... دروازہ فوراً کھل گیا اس نے احتیاطاً لائٹ جلا کر واش روم چیک کیا پھر وہ موبائل پر بولی۔ ''مالک وہ واش روم میں بھی

نہیں ہیں۔''

''کمرے کا دروازہ چیک کرو...... لاک لگا ہوا ہے؟''

ستارہ نے کمرے کا تالا چیک کیا...... وہ کھلا ہوا تھا۔ ''مالک، لاک کھلا ہوا ہے۔'' اس نے فون پر اطلاع دی۔

''تم فون بند کرو اور آرزو کو اس کے کمرے میں دیکھو...... میں نیچے آ رہا ہوں۔''

''جی مالک اچھا۔'' ستارہ موبائل آف کر کے فوراً کمرے سے باہر نکلی، آرزو کا کمرہ برابر میں تھا، اس نے بے تابی سے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا، دروازہ نہیں کھلا، دروازہ اندر سے بند تھا۔

اتنے میں کمال رائے بھی اوپر سے نیچے اُتر آیا، اس نے دور ہی سے سوال کیا۔ ''کیا ہوا؟''

''مالک، دروازہ اندر سے بند ہے۔'' ستارہ نے اطلاع دی۔

کمال رائے کے پاس اس کمرے کی چابی موجود تھی، اس نے جلدی سے تالا کھولا اور ستارہ سے کہا۔ ''تم اندر جا کر دیکھو۔''

ستارہ کمرے میں داخل ہوئی، اس نے دور ہی سے آرزو کے بیڈ پر نظر ڈالی، وہ اپنے بیڈ پر موجود تھی۔ کمرے میں ایک دھیمی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، آرزو بیڈ پر مدہوش پڑی تھی، ستارہ نے جلدی سے اس پر چادر ڈالی اور پھر پلٹ کر دروازے تک آئی...... دروازہ کھول کر اس نے کہا۔ ''مالک آ جائیں...... بی بی، یہاں سو رہی ہیں۔''

☆......☆......☆

سپر ہائی وے پر پجیرو کسی راکٹ کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔

گاڑی رامش خیال چلا رہا تھا، اس کے برابر آرزو بیٹھی تھی، پچھلی سیٹ پر ماموں رشید نیم دراز تھے اور اس سے پچھلی سیٹ پر ڈرائیور لعل محمد مستعد بیٹھا تھا۔ ایک پٹرول پمپ نزدیک آتا دیکھ کر لعل محمد نے پیچھے سے زور سے کہا۔ ''صاحب جی، پٹرول لینا ہے۔''

''اچھا۔'' رامش خیال نے اس کی بات سن کر بائیں ہاتھ کا انڈیکیٹر کھول دیا اور پجیرو پٹرول پمپ پر روک لی۔

لعل محمد گاڑی سے نیچے اُترا اور ٹنکی میں پٹرول بھروانے لگا۔

ایک موٹر سائیکل والا ابھی پٹرول بھروا چکا تھا، وہ موٹر سائیکل کی ٹنکی کا ڈھکن کس رہا تھا کہ اس نے ایسے ہی پجیرو کے ونڈ اسکرین پر نظر دوڑائی، اس نے ونڈ اسکرین کے پیچھے رامش خیال کو دیکھا تو چونک گیا پھر اس نے جب برابر بیٹھی ہوئی ایک حسین لڑکی کو دیکھا تو مزید حیرت زدہ ہو گیا، پھر ڈھکن بند کرتے کرتے اس نے پوری گاڑی کا جائزہ لے لیا۔ لعل محمد تو باہر کھڑا ہی تھا، اس نے آرام سے

بیٹھے ماموں رشید کو بھی دیکھ لیا پھر اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ ایک بہت بڑا کیس اس کے ہاتھ آ گیا تھا، اس کیس پر تو اس کی ترقی ہو سکتی تھی۔

وہ اچھل کر گاڑی پر بیٹھا، ایک زبردست کک لگائی اور تیر کی طرح پٹرول پمپ سے نکلا، تھوڑا سا آگے جا کر اس نے گاڑی روکی اور سڑک سے نیچے اُتر کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر جلدی جلدی ایک نمبر ملایا، نمبر ملانے کے دوران وہ پٹرول پمپ کی طرف بھی دیکھتا رہا، نمبر ملتے ہی موٹر سائیکل والے نے بڑی بے چینی سے اس طرف سے ٹیلیفون اُٹھائے جانے کا انتظار کیا۔

کوئی تیسری گھنٹی پر ایک بہت بڑی کرخت سی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو''۔

''مالک میں آپ کا نمک خوار...... راجو'' راجو نے بڑی انکساری سے کہا۔

''او، خوار...... میں نے تجھے موبائل اس لئے لے کر نہیں دیا کہ تو صبح ہی صبح مجھے پریشان کرنا شروع کر دے، ابھی تو میری آنکھ بھی نہیں کھلی...... اچھا جلدی بول کیا پریشانی ہے؟'' اِدھر سے ڈانٹ بھری آواز سنائی دی۔

''مالک...... بڑی زبردست خبر ہے۔'' راجو نے ڈانٹ کی پروانہ کی۔

''تجھے جس مقصد سے کراچی بھیجا تھا...... وہ کام ہو گیا، پہلے اس کی بات کر......''

''مالک وہ تو ہو ہی گیا...... اس کام کی تو آپ فکر ہی نہ کریں...... ایک بالکل نئی خبر سنیں۔''

''اچھا...... او نمک خوار جلدی بول......''

''مالک، میں نے ابھی چھوٹے صاحب کو دیکھا ہے۔''

''چھوٹے صاحب؟ اوہ بھئی کون چھوٹے صاحب؟''

''مالک، رامش صاحب کو...... جیپ میں ہیں...... برابر ایک بہت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہے، پیچھے ان کے ماموں بیٹھے ہیں اور ایک ڈرائیور ہے۔'' راجو نے جلدی جلدی خبر سنائی...... یہ عجیب خبر تھی۔

''ہیں...... کیا کہا؟ او، ذرا پھر سے بتا'' اس خبر نے اپنا رنگ جمایا۔

''مالک...... چھوٹے صاحب یعنی رامش صاحب ایک بہت حسین لڑکی کے ساتھ جیپ میں سفر کر رہے ہیں، ان کے ساتھ رشید صاحب ہیں اور ایک ڈرائیور۔'' راجو نے خبر دہرائی۔

''او لڑکی کون ہے...... یہ بتا...... رشید کی بیٹی مہر تو نہیں، کیا اس نے عینک لگائی ہوئی ہے؟''

''نہیں مالک۔'' راجو بولا۔

''تھوڑا اس کا رنگ بھی سانولا ہے۔'' اِدھر سے پھر تصدیق ہوئی۔

''نہیں مالک...... یہ لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ ایسی لڑکی تو میں نے آج تک دیکھی نہیں۔'' راجو نے سارا شبہ مٹا دیا۔

''اچھا...... ان لوگوں کا رخ کدھر ہے؟''

''فی الحال تو سپر ہائی وے پر ہیں اور حیدر آباد کی طرف رخ ہے۔''

''لیکن جیپ ؟ جیپ کس کی ہے...... رشید کے پاس تو جیپ نہیں...... نہ ہی رامش کے پاس ہے۔''

''مالک اس گاڑی کو اور اس میں موجود ڈرائیور کو میں اچھی طرح جانتا ہوں...... مالک یہ روشن گوٹھ کی گاڑی ہے۔''

''روشن گوٹھ۔'' یہ نام اس نے کچھ اس انداز میں لیا جیسے اس کے دل میں آگ سی لگ گئی ہو۔

''جی روشن گوٹھ۔'' راجو نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''او، راجو یہ تو کھیل ہی کچھ اور ہے...... واہ بھئی تو نے تو کمال کر دیا...... بڑا زبردست نمک خوار نکلا۔''

''بس دیکھ لیا مالک...... آپ کے نمک خوار نے آپ کو کبھی مایوس نہیں کیا۔''

''اس وقت تو کہاں ہے؟''

''مالک...... میری موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی ہے اور میں ڈھلان پر جھاڑیوں کی اوٹ ل ہوں، بحالت ضرورت سے بیٹھا ہوا ہوں اور کان سے موبائل لگا رکھا ہے، آنکھیں دور پٹرول پمپ پر ہیں، لو مالک وہ جیپ پٹرول پمپ سے نکل رہی ہے۔'' راجو نے کمنٹری نشر کی۔

''راجو بڑی ہوشیاری سے اس کا پیچھا کرنا ہے...... میں راستے میں ناکہ بندی کرتا ہوں، میرے نمک خوار تو نے آج بڑی زبردست خبر سنائی...... تیرا انعام پکا۔'' اِدھر سے بڑی خوشدلی سے کہا گیا۔

''مہربانی مالک، آپ کی مہربانی...... اچھا، مالک جیپ میرے پیچھے سے گزر گئی ہے، میں اب کھڑا ہوتا ہوں۔''

''ہاں، جا...... جلدی کر...... مجھے ان کی نقل و حرکت سے باخبر رکھنا۔'' یہ کہہ کر اِدھر سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

راجو فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک عام سی شکل و صورت کا بندہ تھا۔ شلوار قمیص پہنے تھا۔ سر پر ٹوپی تھی، اس نے موبائل جیب میں ڈالا اور پھرتی سے موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور جیپ کے تعاقب میں لگ گیا۔

☆......☆......☆

جیپ ہوا کے دوش پر اُڑی جا رہی تھی، رامش خیال پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا، گاڑی میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی، اچانک موبائل کی آواز سنائی دی، آرزو نے برابر رکھے بیگ کی

زپ کھول کر موبائل نکالا، اسکرین پر اُبھرنے والے نمبر دیکھے اور گردن موڑ کر راں سیاں سے
مخاطب ہوئی۔ ''بابا ہیں۔''

''اچھا۔'' رامش خیال نے گردن ہلائی۔

''جی بابا۔'' آرزو نے فون پر کہا۔

''بس بیٹا...... میں نے سوچا کہ تمہاری خیریت معلوم کرلوں۔'' کمال رائے بولا۔

''بابا ہم سب خیریت سے ہیں...... خوب ہنس بول کر سفر کٹ رہا ہے...... ماموں رشید نے ہمیں
اب تک بے شمار لطیفے سنا دیئے ہیں...... بابا، ہم لوگ ہنس ہنس کر پاگل ہو گئے ہیں...... اب آپ
سنائیں۔'' آرزو نے کمنٹری کی۔

''اِدھر سب خیریت ہے...... میں اپنے اوپر والے بیڈروم میں بیٹھا چائے پی رہا ہوں اور میوزک
سن رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بابا...... کوئی میسج تو نہیں۔''

''نہیں...... بس اتنا خیال رکھنا کہ روشن گوٹھ پہنچ جاؤ تو فوراً فون کر دینا...... میرا خیال ہے کہ تم
آدھے گھنٹے کے بعد روشن گوٹھ میں ہو گے...... او کے...... اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر کمال رائے نے فون
بند کر دیا۔

آرزو نے موبائل فون آف کر کے بیگ میں ڈالا اور زپ بند کر کے ایک گہرا سانس لیا اور رامش
خیال کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''انکل خیریت سے ہیں......'' رامش خیال نے پوچھا۔

''مزے میں ہیں، چائے پی رہے ہیں اور میوزک سن رہے ہیں۔'' آرزو ہنس کر بولی۔

''بھئی آرزو۔'' پیچھے سے ماموں رشید بولے۔

''آرزو نے ان کی طرف گردن گھمائی۔ ''جی ماموں۔''

''چائے کے ذکر پر ایک لطیفہ یاد آیا...... وہ ہوا کیا...... ایک صاحب ہوائی جہاز میں بیٹھے چائے
پی رہے تھے...... اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ......'' ماموں رشید کی بات ادھوری رہ گئی۔

انہیں اچانک اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ اس کا سر اگلی سیٹ سے ٹکرایا، آرزو ڈیش بورڈ سے جا لگی،
رامش خیال نے پجیرو کو فل بریک لگائے تھے، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اونچی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر
آنے والی لینڈ کروزر سے ٹکرا جاتا۔

لینڈ کروزر پر سات آٹھ آدمی سوار تھے، وہ سارے کے سارے مسلح تھے، وہ دھڑا دھڑ گاڑی سے
اُترے اور انہوں نے پجیرو کو چاروں طرف سے گھیر لیا، وہ خطرناک چہروں والے لوگ تھے اور ان

کے ہاتھ میں جدید اسلحہ تھا۔

ایک کرخت صورت والا شخص آگے بڑھا، اس نے رامش خیال کی طرف کا دروازہ کھولا اور رامش
خیال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چھوٹے صاحب نیچے اُتر آئیے۔''

''بات کیا ہے؟ کیا چاہتے ہو تم لوگ۔'' رامش خیال نے کسی قدر غصے سے کہا۔

وہ چار تھے لیکن کسی کے پاس بھی اسلحہ نہ تھا، اب وہ پچھتا رہے تھے کہ اگر وہ اپنے ساتھ سیکورٹی
گارڈ بٹھا لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

''چھوٹے صاحب...... غصہ نہ کریں...... جلدی کریں، نیچے اُتر آئیں۔'' اسی کرخت صورت
والے نے نرمی سے کہا۔

''رامش...... بے وقوفی مت کرو...... نیچے اُتر جاؤ۔'' ماموں رشید نے دھیرے سے سمجھایا۔

رامش نے گاڑی بند کر کے چابی اگنیشن سے نکالی اور نیچے اُترنے لگا۔

''چھوٹے صاحب...... چابی انجن میں ہی لگا دیں۔'' کرخت چہرے والے نے ہدایت دی۔

رامش خیال نے اس کی ہدایت کے مطابق چابی دوبارہ اگنیشن میں لگا دی اور گاڑی سے اُتر
آیا۔ اس کرخت چہرے والے نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا اور رامش خیال کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا
دیا گیا۔

دو تین بندے پجیرو میں سوار ہو گئے۔ ایک بندے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلنے لگیں، ایک فرلانگ کے فاصلے پر دوراہا تھا، ایک سڑک روشن
گوٹھ کو جاتی تھی اور دوسری سڑک دوسرے گوٹھوں کو...... دونوں گاڑیوں نے روشن گوٹھ کے مخالف
سمت والی راہ پکڑ لی۔

آرزو فرنٹ سیٹ پر ہی تھی، وہ بار بار مضطرب ہو کر ماموں رشید کی طرف دیکھتی تھی، ماموں رشید
اسے ہاتھ کے اشارے سے پُرسکون رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ ویسے ان لوگوں نے آرزو یا ماموں
رشید سے کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی بلکہ ان میں سے کوئی کچھ بولا ہی نہ تھا۔

آرزو بہت پریشان تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ پھر اچانک اسے موبائل فون کا
خیال آیا، اس نے بیگ کی زپ کھول کر فون نکالا اور جلدی جلدی اپنے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی،
ڈرائیونگ کرنے والے بندے کی نظر اچانک موبائل پر پڑی تو اس نے آرزو کے ہاتھ سے موبائل
چھین لیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''بی بی، یہ کیا کر رہی ہو؟''

''میرا فون، مجھے واپس دو...... میں ابھی بابا کو بتاتی ہوں۔''

''آپ کے بابا کون ہیں؟'' اس کرخت لہجے والے شخص نے موبائل فون پیچھے کی طرف

اُچھالا جسے ماموں رشید کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے لپک لیا اور اس پر ایک نظر ڈال کر جیب میں رکھ لیا۔

"میرے بابا کا نام کمال رائے ہے..... میں روشن گوٹھ کی ہوں۔" آرزو نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"او..... مہتاب!" ڈرائیونگ کرنے والے شخص نے پیچھے بیٹھے شخص کو دیکھا جس کی جیب میں موبائل فون تھا۔ "مالک کو فون کر کے بتا دے کہ یہ کمال رائے کی بیٹی ہے۔"

"پر فون تو دوسری گاڑی میں بجلی کے پاس ہے۔" مہتاب نے کہا۔

"او، بے وقوف..... ابھی جو چیز میں نے تجھے دی ہے..... وہ کیا ہے بھلا؟"

"فون ہے۔" مہتاب نے بڑے آرام سے کہا۔

"تو پھر فون کرتا کیوں نہیں ہے۔" وہ غصے سے بولا۔

"اچھا..... کرتا ہوں..... کیا کہوں مالک کو؟"

"تو فون ملا کر مجھے دے..... میں بات کرتا ہوں۔"

مہتاب نے جیب سے موبائل فون نکال کر جلدی جلدی نمبر ڈائل کیے اور پھر کان لگا کر گھنٹی کی آواز سننے لگا۔ "دوسری گھنٹی پر کسی نے فون اُٹھا لیا اور بڑے بے ہنگم لہجے میں کہا۔

"ہیلو۔"

"مالک، میں مہتاب بول رہا ہوں..... لیں رحیم گٹو سے بات کریں۔"

"اچھا..... بابا بات کراؤ۔"

مہتاب نے ہاتھ بڑھا کر رحیم گٹو کو فون دے دیا۔ آرزو کو ان لوگوں کو اپنا فون استعمال کرتے دیکھ کر بڑا غصہ آیا مگر وہ کر کچھ نہیں سکتی تھی، بے بسی سے رحیم گٹو کو دیکھ کر رہ گئی۔

"مالک ..... رحیم گٹو....."

"ہاں، بابا..... گٹو کیا خبر ہے بابا..... کوئی گڑبڑ تو نہیں..... بجلی نے ویسے ساری صورتحال سے مجھے آگاہ کر دیا ہے۔" اُدھر سے کہا گیا۔

"مالک اس وقت میں جو بجیرو چلا رہا ہوں، اس کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ یہ کمال رائے کی گاڑی ہے۔"

"ہاں، بابا..... یہ تو پتہ ہے..... اب آگے کی کچھ بتا..... اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

"مالک یہ لڑکی بھی کمال رائے کی ہے۔"

"ارے نہیں بابا..... گٹو یہ تو کمال ہی ہو گیا..... بابا یہ تو چھکا لگ گیا چھکا..... بس گٹو تو ایسا کر انہیں میرے پاس لے آ..... دیکھ ذرا ہوشیاری سے..... کمال رائے کوئی چھوٹی موٹی چیز نہیں۔"

"مالک میں جانتا ہوں..... آپ بے فکر ہو جاؤ..... ہم کنگن پور پہنچنے ہی والے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے موبائل فون بند کیا اور پھر مہتاب کی طرف اُچھال دیا۔ "یہ لے پکڑ....."

کنگن پور کا نام سن کر ماموں رشید کی سٹی گم ہو گئی، اب انہیں پتہ چلا کہ وہ کس کے جال میں پھنس گئے ہیں، وہ تھا کنگن پور کا راجہ وقار، رامش خیال کا تایا۔

☆.....☆.....☆

رامش خیال اور ماموں رشید نظریں جھکائے بیٹھے تھے اور راجہ وقار سینہ پھیلائے اور گردن اکڑائے ان کے سامنے ٹہل رہا تھا اور باری باری دونوں کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے اچانک ماموں رشید کے سامنے رک گیا اور طنز بھرے لہجے میں بولا۔ "ہاں، بھئی رشید یہ تم لوگ کمال رائے کی گاڑی میں روشن گوٹھ کس لئے جا رہے تھے..... بجیرو میں بیٹھنے کا شوق چرایا تھا تو مجھے کہتے، میں اپنی گاڑی بھیج دیتا۔"

ماموں رشید نے گردن اُٹھا کر ایک نظر راجہ وقار کو دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔

"اب بولتے کیوں نہیں..... کیا گونگے ہو گئے ہو۔" پھر وہ رامش خیال کی طرف مڑا اور اس سے مخاطب ہوا۔ "ہاں بابا، رامش..... یہ لڑکی کون ہے؟"

"وہ کہاں ہے؟" رامش خیال نے فوراً پوچھا۔

"وہ کہاں ہے.....؟ اُلٹا مجھ سے سوال کرتا ہے، پہلے یہ بتا کہ تو دشمن کی گاڑی میں دشمن کی بیٹی کے ساتھ، دشمن کے علاقے میں کیوں جا رہا تھا.....؟ تو نے کیا سمجھا تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہوگا..... یہ کراچی نہیں ہے، یہ اپنا علاقہ ہے، یہاں تو کوئی پرندہ اس ڈال سے اُس ڈال پر جا کر بیٹھتا ہے تو راجہ وقار کو پتہ پڑ جاتا ہے..... تو تو اتنی بڑی گاڑی میں جا رہا تھا۔" راجہ وقار کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

"وہ تایا ابو....."

"ارے مر گیا..... تیرا تایا ابو..... اب کہاں رہا میں تیرا تایا ابو..... تو نے میری ساری عزت خاک میں ملا دی، تو نے اپنے باپ کی روح کو بھی تڑپا دیا..... کیا تو جانتا نہیں کہ کمال رائے کون ہے؟ ارے بے وقوف روشن گوٹھ والوں نے تیرے باپ کو قتل کروایا، میری بھابھی کو مروایا اور رشید کیا تم نہیں جانتے کہ روشن گوٹھ والوں نے تمہاری بہن کو قتل کیا، تمہارے بہنوئی کو قتل کیا..... کیا تم بھول گئے؟"

"بھائی وقار، یہ قصہ پارینہ ہے۔" ماموں رشید نے ہمت کر کے کہا۔

"رشید میں تیرا سازینہ بنا دوں گا..... اگر میرے سامنے بے غیرتی کی بات کی..... تو اپنی بہن کے قتل کو بھول جا..... لیکن میں اپنے بھائی کی موت کو نہیں بھول سکتا..... کھیل تو اب شروع ہوا ہے اب دیکھ کیسا مزہ آئے گا دشمنی کا....."

”میرے ماں باپ کے قتل میں کمال رائے صاحب کا کوئی ہاتھ نہیں......وہ نہایت شریف آدمی ہیں۔“ رامش بولا۔

”اچھا......“ راجہ وقار آنکھیں پھیلا کر بولا۔ ”پھر تو کمال رائے کا باپ روشن رائے بھی شریف آدمی ہوگا، کیوں بابا؟“

”نہیں......روشن رائے شریف آدمی نہیں تھا......اس بات کو کمال رائے بھی جانتے ہیں......وہ بے چارے تو خود اپنے باپ کے ستائے ہوئے ہیں......ان کے باپ نے ان پر جو ظلم کیا، وہ تو شاید کبھی کسی باپ نے نہ کیا ہوگا۔“ رامش خیال نے بھرپور انداز میں کمال رائے کی وکالت کی۔

”اوہ، معلوم ہوتا ہے کہ کمال رائے نے تمہیں ٹھیک ٹھاک چُوری کھلائی ہے تبھی اس کے میاں مٹھو بنے ہوئے ہو......یہ تو بتاؤ کہ وہ ہے کہاں؟“ راجہ وقار حسب عادت آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”کراچی میں۔“ رامش نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”اس نے اپنی لڑکی کو تمہارے حوالے کیوں کر دیا؟“ راجہ وقار نے پوچھا۔

”ہم آرزو کو روشن گوٹھ چھوڑنے جا رہے تھے۔“ رامش خیال نے صاف گوئی سے کہا۔

”تمہارا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے؟“

ابھی رامش خیال جواب دینے ہی والا تھا کہ ایک ناٹے قد کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ استرا پھرا سر، گھنی اور موٹی مونچھیں، فربہ جسم، پینٹ شرٹ پہنے......وہ مؤدبانہ راجہ وقار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

راجہ وقار نے ایک نظر اس شخص کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔ ”ہاں، رولی......“

”مالک، اس لڑکی کے بارے میں آپ کا حکم لینے آیا تھا۔“ رولی نے ہاتھ باندھے باندھے کہا۔

”بابا......رولی......تھوڑا انتظار کرو......اس کے بارے میں حکم دیں گے......جلدی کیا ہے؟ یا کوئی جلدی ہے بابا؟“ وقار نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مالک، کوئی جلدی نہیں۔“ رولی نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔ ”مالک پھر میں چلوں......؟“

”ہاں، بابا جاؤ اور ہمارے حکم کا انتظار کرو۔“

رولی جس طرح مؤدبانہ آیا تھا، ویسے ہی واپس چلا گیا۔ رامش خیال اور ماموں رشید دونوں نے رولی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ وہ انہیں بڑا انوکھا سا آدمی محسوس ہوا۔

”ہاں بھئی، رامش خیال تم نے بتایا نہیں کہ اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”میرا اس لڑکی سے بہت گہرا تعلق ہے......بس تایا ابو یہ خیال رکھئے گا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”اچھا بابا......اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہاری دوست موست ہے......بابا، کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ہماری دشمن کی بیٹی ہے......ہم سے اسے کوئی فائدہ بھلا کیسے پہنچ سکتا ہے۔“ راجہ وقار نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی ہنسی بڑی بے ہنگم تھی اور زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

”تایا، بات یہ ہے کہ......“ رامش خیال نے کچھ بتانا چاہا لیکن راجہ وقار نے اس کی بات فوراً کاٹ دی۔ ”اچھا تم اب چپ کرو......مجھے ذرا رشید سے بات کرنے دو۔“ پھر وہ ماموں رشید سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں بھئی رشید......رامش تو چلو لڑکا ہے......وہ اپنی دوست کے چکر میں آگیا......پر بابا تم اپنی بتاؤ تم کس چکر میں روشن گوٹھ جا رہے تھے، تمہیں تو ہر بات کا پتہ تھا، تم بھی ہمارے قاتلوں سے جا ملے۔“

”بھائی وقار......روشن گوٹھ میں ہمارا کوئی قاتل نہیں......اگر ہوتا تو سب سے پہلے میں وہاں اپنی بہن کے قاتل کا بدلہ لینے پہنچ جاتا۔“ ماموں رشید نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا۔

”کمال رائے کو تم بھی فرشتہ سمجھتے ہو؟“ راجہ وقار نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”ہاں بھئی......میں بھی اسے فرشتہ سمجھتا ہوں۔“ ماموں رشید نے راجہ وقار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اطمینان سے جواب دیا۔ ماموں رشید کا یہ جواب راجہ وقار کیلئے غیر متوقع تھا۔ وہ غصے سے انہیں دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

آرزو سے موبائل پر رابطہ کئے کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا تھا، کمال رائے کے اندازے کے مطابق اب تک انہیں روشن گوٹھ پہنچ جانا چاہئے تھا، اس نے آرزو کو ہدایت کی تھی کہ وہ روشن گوٹھ پہنچتے ہی اسے فون پر مطلع کر دے لیکن اس کا فون ابھی تک نہیں آیا تھا، تب کمال رائے نے خود اسے ڈائل کیا۔

آرزو کا موبائل بند تھا، کوئی جواب نہیں مل رہا تھا، یہ اور پریشانی کی بات تھی، ایک تو اس نے فون پر پہنچنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ دوسرے اس نے اپنا فون ہی آف کر رکھا تھا۔ یہ لاپروائی کی انتہا تھی۔

تب کمال رائے نے حویلی کا فون نمبر ملایا، چار گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے سہمی سی آواز میں کہا۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو“ سن کر کمال رائے کو اندازہ ہو گیا کہ فون کسی ملازمہ نے اُٹھایا ہے، یہ ملازمہ بھاگ بھری ہی ہو سکتی تھی، اس نے پوچھا۔ ”کون بھاگ بھری......؟“

”جی ہاں۔“ ادھر سے جواب ملا۔

”بھاگ بھری......یہ بتاؤ کیا چھوٹی مالکن روشن گوٹھ پہنچ گئیں؟“

”نہیں مالک......ابھی تک تو نہیں پہنچیں......ہم سب ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“ بھاگ بھری

نے کمال رائے کی آواز پہچان کر کہا۔ ''ٹھہریں مالک...... میں ابھی مالکن کو بلاتی ہوں۔''

''اچھا......'' کمال رائے نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''ہاں، کمال کیا ہوا؟'' اِدھر سے نفیسہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

''ماں...... آرزو کو نکلے بہت دیر ہو چکی ہے، اب تک تو اسے پہنچ جانا چاہئے تھا۔''

''ہو سکتا ہے راستے میں گاڑی خراب ہو گئی ہو؟''

''تو ماں اسے فون تو کرنا چاہئے تھا...... پریشانی کی بات ہے۔ اس نے اپنا فون بھی آف کر رکھا ہے۔'' کمال رائے نے بتایا پھر بولا۔ ''اچھا ماں...... میں فون بند کرتا ہوں، جیسے ہی وہ حویلی پہنچے مجھے فوراً فون کر دینا۔''

''بیٹا...... تم فکر نہ کرو...... میں فوراً فون کر دوں گی۔''

پھر ایک گھنٹہ گیا، کئی گھنٹے گزرے اور دوپہر سے شام ہو گئی لیکن آرزو کا کچھ پتہ نہ چلا۔

☆......☆......☆

رولی، راجہ وقار کے حکم کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ پھر اسے بلاوا آ گیا۔

وہ فوراً راجہ وقار کے حضور پہنچا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''جی مالک!''

''رولی...... اس لڑکی کو صحرا کی سیر کرا دو...... جتنی دور اسے صحرا میں لے جا سکتے ہو، لے جاؤ...... میں نے اسے تمہارے اختیار میں دیا...... جو چاہے برتاؤ کرو...... میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ صحرا سے کبھی واپس نہ آ سکے۔'' راجہ وقار نے ایک حکم سنایا۔

''ٹھیک ہے مالک...... وہ صحرا سے کبھی واپس نہ آ سکے گی۔'' رولی نے یقین دلایا۔

''میری جیپ لے جاؤ...... اکیلے جاؤ گے؟'' راجہ وقار نے پوچھا۔ پھر رولی کے جواب دینے سے پہلے بول پڑا۔ ''اکیلے ہی جاؤ...... وہ چھٹانک بھر کی لڑکی ہے، یکھو بابا میری جیپ کے بجائے پجیرو لے جاؤ۔''

''اکیلا ہی جاؤں گا مالک...... ایسے معاملات میں گواہیاں بڑھانے سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔'' رولی نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''واہ رولی واہ...... تم نے بڑے پتے کی بات کی...... جاؤ شاباش! خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے مالک...... میں چلتا ہوں...... آپ اب بالکل بے فکر ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

ماموں رشید کمرے میں داخل ہوئے تو اس وقت تک رامش خیال منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوا بیٹھا تھا،

اسے چائے کی شدید خواہش ہو رہی تھی، وہ چائے کا انتظار کر رہا تھا۔

''رامش...... اندر حویلی میں تو تمہارے نکاح کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' ماموں رشید نے روح فرسا خبر سنائی۔

''ماموں کچھ خدا کا خوف کریں۔'' رامش خیال سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''جو اندر دیکھ کر آیا ہوں، وہ کہہ رہا ہوں۔'' ماموں رشید نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ میں نکاح کر چکا ہوں۔'' رامش خیال فوراً بولا۔

''نہیں...... یہ بات میں نے نہیں بتائی۔'' ماموں رشید نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''آپ کو بتا دینا چاہئے تھی۔'' رامش خیال دوٹوک انداز میں بولا۔

''بتانے کا فائدہ کیا...... وہ اب کسی کی نہیں سنے گا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ زبردستی میرا نکاح اپنی بیٹی کے ساتھ کر دیں گے؟''

''مجھے تو یہی دکھائی دے رہا ہے۔''

''ماموں...... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر رامش خیال جوش میں کھڑا ہو گیا۔ ''کہاں ہیں تایا...... میں ابھی جا کر ان سے بات کرتا ہوں۔''

اسی وقت کمرے میں راجہ وقار داخل ہوا۔ اس نے رامش خیال کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''میں خود آ گیا ہوں، بیٹا...... بولو کیا بات کرنی ہے؟''

''تایا، ماموں نے مجھے کچھ بتایا ہے؟''

''رشید نے اگر تمہیں کوئی بات بتائی ہے تو وہ ضرور کوئی اچھی بات ہو گی، تمہیں خوش ہو جانا چاہئے لیکن تم خوش نہیں دکھائی دے رہے۔''

''تایا، وہ خوشی کی بات نہیں ہے۔'' رامش خیال نے ذرا لہجہ بدل کر کہا۔ ''ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

''بابا...... کیوں نہیں ہو سکتا؟ شکیلہ کی ماں نے مجھے کہا کہ شکیلہ کی منگنی تو ہو ہی چکی ہے، اب لڑکا گھر پر آیا ہوا ہے تو نکاح بھی کر دو...... رخصتی رہ جائے گی، وہ لڑکا جب چاہے گا کرا کر لے جائے گا، مجھے شکیلہ کی ماں کی بات بڑی پسند آئی...... میں نے کہا صد بسم اللہ، بھاگوان ابھی لے...... یہ سوچ کر کہ شکیلہ کی ماں کبھی کبھی عقل کی بات کرتی ہے، میں نے فوراً نکاح کے انتظامات کا حکم دے دیا اور نکاح میں کرنا کیا ہے، ایک قاضی کو بلانا ہے، وہ آئے گا اور آ کے دو بول پڑھائے گا...... بس اتنی سی بات ہے۔ کیوں رشید؟'' راجہ وقار نے تائیدی نظروں سے ماموں رشید کو دیکھا۔

''خیر بھائی وقار...... یہ بات تو اتنی سی نہیں ہے جتنی تم نے بتا دی ہے، بہتر ہو گا کہ رامش خیال کی بھی بات سن لی جائے۔'' ماموں رشید نے تائید کرنے سے انکار کر دیا۔

”ہاں جی..... کیوں نہیں۔“ راجہ وقار نے اپنی آنکھیں پھیلائیں۔”ہاں، بیٹا بولو۔“

”تایا ابو..... آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اس رشتے سے انکار کر چکا ہوں۔“

”بچکانہ بات مت کرو..... میں نے تمہارے انکار کو انکار نہیں مانا اسے تمہارا بچپنا جانا۔“

”آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میں نکاح کر چکا ہوں۔“

”کیا کہا؟“ راجہ وقار کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔”رشید یہ کیا کہہ رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ رامش خیال جو کچھ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ماموں رشید نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اچھا بابا۔“ راجہ وقار کی آنکھوں میں آگ بھرنے لگی۔”کس سے کیا ہے نکاح تو نے؟“

”آرزو سے۔“ رامش خیال نے فوراً جواب دیا۔

”آرزو.....؟ رشید یہ کون ہے؟“

”بھائی وقار..... وہ کمال رائے کی بیٹی ہے..... وہی لڑکی جسے ہم روشن گوٹھ چھوڑنے جا رہے تھے۔“

”اوہ.....“ راجہ وقار نپے تلے قدم رکھتا، رامش خیال کی طرف بڑھا، اس کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا بڑا سا ہاتھ رامش خیال کے سینے پر رکھا اور تیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔”بیٹا اب اسے بھول جاؤ۔“

☆.....☆.....☆

مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔

کمال رائے کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی، وہ پورے گھر میں ادھر سے اُدھر ٹہلتا پھر رہا تھا، اسے کہیں قرار نہیں مل رہا تھا، وہ کئی مرتبہ حویلی فون کر چکا تھا، وہاں سے ہر مرتبہ یہی جواب ملا تھا۔”ابھی نہیں پہنچی۔“ نفیسہ بیگم نے اس اثناء میں گاڑی بھیج کر اسے سپر ہائی وے تک تلاش کروا لیا تھا لیکن بھیرو کا کہیں کوئی نشان نہیں ملا تھا، گاڑی خراب ہونے کا امکان ختم ہو گیا تھا۔

کمال رائے سوچ رہا تھا کہ کہیں ڈاکوؤں نے اغوا تو نہیں کر لیا، ایک میل کا راستہ جنگل سے ملحق تھا، وہاں سے ڈاکو کبھی کبھی سڑک تک آ جاتے تھے، اگر ان لوگوں کو اغوا کر لیا گیا ہے تو اب تک وہاں سے فون آ جانا چاہیے تھا جبکہ موبائل فون بھی آرزو کے پاس موجود تھا، فون کرنے کی آسانی تھی لیکن تاوان کے سلسلے میں اب تک کوئی فون موصول نہیں ہوا تھا۔

کمال رائے متعدد بار موبائل فون پر ٹرائی کر چکا تھا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں موصول ہو رہا تھا، آرزو کا فون بدستور بند تھا۔

کمال رائے اب یہ سوچ رہا تھا کہ وہ روشن گوٹھ کی طرف روانہ ہو جائے، وہاں پہنچ کر ہی ان لوگوں کے بارے میں تحقیق کروائی جا سکتی تھی، اس سلسلے میں اسے اپنے ماموں سے مدد لینا ہوگی، پولیس والوں سے بھی بات کرنا ہوگی آخریوں تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا جا سکتا تھا۔

روشن گوٹھ جانے یا نہ جانے کے بارے میں ابھی وہ کسی فیصلے پر پہنچنے ہی والا تھا کہ اس نے سامنے سے ستارہ کو اپنی طرف آتے دیکھا..... اس کے چہرے پر پریشانی لکھی تھی۔

”مالک..... مالک.....“ وہ پھولی سانسوں کے درمیان بمشکل بولی۔

”کیا ہوا ستارہ؟“ کمال رائے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”مالک میں نے ایک سانپ دیکھا ہے؟“

”سانپ!“ کمال رائے حیرت سے بولا۔”کہاں؟“

”مالک وہ ابھی ابھی بی بی کے کمرے میں گیا ہے؟“

”بی بی کے کمرے میں؟“ کمال رائے نے کہا۔”اچھا میں دیکھتا ہوں۔“

”مالک آپ اکیلے مت جائیں..... باہر سے سیکورٹی گارڈ کو بلوا لیں۔“ ستارہ نے تشویش سے کہا۔

”ارے نہیں ستارہ..... سانپ سے کیا ڈرنا..... میں ابھی آتا ہوں ذرا اپنے کمرے سے ریوالور لے آؤں۔“ یہ کہہ کر کمال رائے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

ستارہ باہر رک کر اس کا انتظار کرنے لگی تھوڑی دیر میں ہی وہ ریوالور ہاتھ میں سنبھالتا باہر نکل آیا۔

آرزو کا کمرہ اس کے کمرے کے برابر میں ہی تھا، اس کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، کمال رائے نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور پھر دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے اندر کا جائزہ لیا، کمرے میں اندھیرا تھا، دروازہ کھلنے کی وجہ سے جتنی روشنی کمرے میں جا رہی تھی، اتنی روشنی میں سانپ نہیں دکھائی دیا، کمال رائے نے دو قدم بڑھا کر کمرے کی لائٹ آن کی اور پھر ریوالور سیدھا کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

اس کے پیچھے ستارہ تھی۔

وہ دو قدم آگے بڑھتا رہا اور کمرے کا جائزہ لیتا رہا یہاں تک کہ وہ آرزو کے بیڈ تک پہنچ گیا، اسے ابھی تک کہیں سانپ نظر نہیں آیا تھا، ابھی وہ اِدھر اُدھر نظریں گھما ہی رہا تھا کہ اچانک ستارہ پیچھے سے بولی۔”مالک یہ کیا؟“

وہ سمجھا کہ ستارہ نے سانپ دیکھ لیا، اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور والا ہاتھ بلند کیا اور بولا۔”کدھر؟“

"مالک، یہ نشان کیسا ہے چادر پر......"

کمال رائے نے بیڈ پر بچھی چادر پر نظر ڈالی تو اسے درمیان میں دو تین جگہ سے چادر جلی ہوئی نظر آئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے بیڈ شیٹ پر تیزاب ڈالا ہو، کئی جگہ سیاہ نشان پڑے ہوئے تھے۔ تب اچانک ہی کمال رائے کے دماغ نے کام کیا اور اسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ نشان کس چیز کے ہیں۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سانپ نے جگہ جگہ چادر میں اپنا پھن مارا ہو۔"

"اوہ، مالک اتنا زہریلا سانپ ہے کہ اس کے منہ مارنے سے چادر جل گئی۔"

اس طرح کے نشان قالین پر بھی تھے اور انہیں غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے سانپ بیڈ سے اُتر کر کھڑکی کی طرف گیا ہے۔

کمال رائے نے آرزو کا کمرہ بڑی باریک بینی سے چھان مارا لیکن وہ سانپ کو نہ پا سکا۔

موزائیک کے فرش پر بھی اس کے زہر کے نشان موجود تھے، باوجود کوشش کے کمال رائے سانپ کو نہ دیکھ سکا۔

☆......☆......☆

ادھر عجب تکرار چل رہی تھی۔

راجہ وقار کا اصرار یہ کہ "اسے بھول جاؤ۔"

اور رامش خیال کی ضد یہ کہ "تایا، اسے بھول گیا تو پھر کیا رہ جائے گا۔"

ابھی یہ تکرار چل ہی رہی تھی کہ ایک ملازم نے قاضی کے آنے کی اطلاع دی۔

رامش خیال کو اسلحہ کے زور پر اُٹھایا گیا، ماموں رشید نے احتجاج کیا، رامش خیال نے غصہ کیا لیکن راجہ وقار نے کسی کی نہ سنی، اس پر بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ یہ نکاح ہر صورت میں ہو کر رہے گا۔

قاضی فارم پر کر چکا تھا، ماموں رشید بار بار رامش خیال کی طرف دیکھ رہے تھے، وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی تشدد آمیز عمل سے روکنے کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ راجہ وقار پر یہ بات اچھی طرح روشن کر چکے تھے کہ اس طرح زبردستی نکاح پڑھانا ٹھیک نہیں، لڑکا جب نکاح پر راضی نہیں ہے تو اس طرح کی زبردستی کا نتیجہ برا ہی نکلے گا۔

لیکن راجہ وقار کی سوئی نکاح پر اٹکی ہوئی تھی، اس نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے، یہ نکاح ضرور ہو کر رہے گا۔

خیر جب قاضی نے ایجاب وقبول کیلئے لڑکی کے کوائف اور مہر کی رقم وغیرہ بتا کر کہا۔ "آپ کو

قبول ہے؟"

تو رامش خیال نے جواب میں بے دھڑک لاحول پڑھی...... لاحول سن کر قاضی صاحب کی سٹی گم ہو گئی، وہ تو خدا کا شکر ہے کہ قاضی صاحب انسان تھے ورنہ کب کے غائب ہو چکے ہوتے۔

جب زبانی رامش خیال نے اقرار نہ کیا تو اس کے سامنے نکاح نامہ رکھا گیا اور اس پر دستخط کرنے کو کہا گیا۔

دو مسلح شخص اس کے سر پر مسلط تھے اور راجہ وقار گھور کر رامش خیال کو دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں اور پیشانی پر بل پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

"رشید، اس سے کہو کہ اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو اس نکاح نامے پر دستخط کر دے۔"

"بھائی وقار...... میں اس طرح کی کوئی بات رامش سے نہیں کہہ سکتا۔" ماموں رشید نے صاف انکار کر دیا۔

"پھر تم دونوں میرے ہاتھ سے بچ کر نکل سکو گے۔" راجہ وقار نے دھمکی دی۔

"بھائی وقار...... جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" ماموں رشید نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی۔

"رامش جلدی کرو...... نکاح نامے پر دستخط کرو۔" راجہ وقار نے ایک مرتبہ اور کہا۔

رامش خیال نے کچھ سوچ کر ہاتھ بڑھایا، قاضی نے اس کے سامنے بھرے ہوئے فارم رکھے، رامش خیال نے نکاح نامے کے فارم ہاتھ میں اُٹھائے اور انہیں ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا پھر اس نے یہیں پر بس نہیں کیا بلکہ یہ ٹکڑے فضا میں اُچھال دیئے۔

راجہ وقار کا غصہ اس وقت قابل دید تھا، اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور دھاڑا۔ "رامش یہ تو نے اچھا نہیں کیا...... تو شکیلہ کا نہیں ہوا تو کسی کا بھی نہیں ہو سکے گا۔"

☆......☆......☆

سانپ تلاش کرتے ہوئے کمال رائے کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اس اثناء میں اس نے ایک مرتبہ حویلی بھی فون کر لیا تھا لیکن وہاں سے حسب معمول وہی جواب ملا تھا۔ "ابھی نہیں پہنچی۔"

سانپ کی تلاش سے تھک کر اس نے روشن گوٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، ابھی وہ ایک سیکورٹی گارڈ کو لے کر گاڑی میں نکل ہی رہا تھا کہ ستارہ بے تحاشا دوڑتی ہوئی آئی۔ "مالک...... بی بی کا فون ہے۔"

"مالکن کا......" کمال رائے سمجھا نفیسہ بیگم کا فون ہے، اس لئے اس نے وضاحت چاہی۔

"نہیں مالک...... آرزو بی بی کا۔" ستارہ نے جلدی سے کہا۔

"آرزو کا نام سن کر وہ آنکھیں بند کر کے گاڑی سے نکلا اور گھر کے اندر کی طرف بھاگا۔

چند لمحوں بعد ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''آرزو...... آرزو...... تم کہاں ہو؟''

''بابا...... پریشان نہ ہوں...... میں بالکل خیریت سے ہوں اور کراچی واپس آ رہی ہوں۔ بابا آپ میرا انتظار کریں۔''

اور اس سے پہلے کہ کمال رائے اس سے مزید سوال و جواب کرتا، ادھر سے فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس نے اللہ کا بے اختیار شکر ادا کیا۔ اگرچہ اس سے پوری بات نہ ہو سکی تھی لیکن یہ کیا کم تھا کہ وہ جہاں بھی تھی، خیریت سے تھی اور کراچی واپس آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے گھر کی بیل بجی۔

گھنٹی کی آواز پر کمال رائے کے کان کھڑے ہو گئے، وہ اپنے اوپر والے بیڈروم میں تھا اور ٹہل رہا تھا، اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر گیٹ کی طرف دیکھا، اس وقت گیٹ کھل چکا تھا اور کمال رائے کی پجیرو اندر داخل ہو رہی تھی، فرنٹ سیٹ پر اس کی چہیتی بیٹی، اس کی آرزو موجود تھی...... بس اس نے اتنا ہی دیکھا اور اپنے بیڈروم سے نکل کر دھڑا دھڑ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ آرزو نے اپنے باپ کو اوپر سے اُترتے دیکھ لیا تھا، وہ گاڑی سے نکل کر بے قراری سے اپنے باپ کی طرف بڑھی اور اس سے لپٹ گئی۔ ''بابا......''

''میری بیٹی...... میری آرزو...... تو کہاں چلی گئی تھی؟'' کمال رائے کی بے قراری قابل دید تھی۔

''بابا، میں بالکل خیریت سے ہوں۔'' اس نے اپنے باپ سے الگ ہو کر آنسو پونچھے۔

''شکر ہے اللہ کا۔'' وہ خالق کائنات کا شکر گزار ہوا۔

اسی وقت آرزو پجیرو کے پیچھے گئی اور بلند آواز میں بولی۔ ''آپ آئیں نا...... گاڑی کے پیچھے کیوں کھڑے ہیں؟''

''کون ہے آرزو؟'' کمال رائے نے دو قدم آگے بڑھائے۔

تب ایک شخص گردن جھکائے، گاڑی کے پیچھے سے نکلا۔ کمال رائے اسے غور سے دیکھنے لگا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ رولی ہی تھا۔

''رولی تم؟'' کمال رائے حیرت سے بولا۔

''مالک...... سلام۔'' وہ کمال رائے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آرزو تم رولی کے ساتھ آئی ہو...... اس کے ساتھ؟'' ابھی اس کی حیرت دور نہ ہوئی تھی۔

''ہاں بابا...... میں ان کے ساتھ آئی ہوں...... انہوں نے نہ صرف میری زندگی بچائی بلکہ بہت

عزت اور احترام کے ساتھ یہاں لائے ہیں...... بابا...... آپ ان کو جانتے ہیں؟''

''ہاں، بہت اچھی طرح...... یہ تمہارے دادا روشن رائے کے ملازم خاص تھے۔'' کمال رائے نے بتایا۔

''کیا دادا نے انہیں نکال دیا تھا؟''

''نہیں...... انہوں نے نہیں...... میں نے اسے نکالا تھا۔'' کمال رائے بولا۔

''اچھا تبھی...... یہ آپ کے سامنے آنے سے کترا رہے تھے...... یہ مجھے گیٹ پر چھوڑ کر واپس جا رہے تھے...... میں انہیں زبردستی اندر لے کر آئی ہوں۔'' آرزو نے رولی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم نے بہت اچھا کیا آرزو...... بہت عقلمندی کا ثبوت دیا۔'' کمال رائے نے خوشدلی سے کہا۔

''آؤ، آرزو اندر چلو، تمہارا کیا حلیہ بنا ہوا ہے۔'' پھر وہ ایک سیکورٹی گارڈ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔''

''جی سر۔'' سیکورٹی گارڈ نے فرماں برداری سے کہا اور رولی کو ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

رولی چند لمحے رکا جیسے گھر میں نہ جانا چاہتا ہو، گھر سے باہر جانا چاہتا ہو، پھر کچھ سوچ کر وہ سیکورٹی گارڈ کے ساتھ چل دیا۔

آرزو اور کمال رائے گھر میں جا چکے تھے۔

آرزو نے اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے کمال رائے کو چار پانچ جملوں میں سارا حال کہہ سنایا۔

''اچھا آرزو...... تم تھکی ہوئی ہو، شاور لے لو...... میں جب تک رولی سے بات کر لوں۔''

''ہاں، بابا...... آپ ان سے بات کریں، وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

آرزو کے ریمارکس پر کمال رائے دھیرے سے مسکرایا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رولی کس قسم کا آدمی ہے لیکن وہ جیسا بھی تھا، اس کیلئے آج فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

اللہ کے کھیل بھی نرالے ہیں، کون کب کیا بن جائے یہ بس وہی جانتا ہے۔

کمال رائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو رولی اسے دیکھتے ہی کسی اسپرنگ کی طرح اُٹھ گیا اور اس نے اپنے ہاتھ باندھ لئے اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

کمال رائے نے اسے بغور اوپر سے نیچے تک دیکھا...... وہی گنجا سر چمکتا ہوا، بھاری مونچھیں، گٹھا ہوا مضبوط جسم...... پینٹ شرٹ پہنے...... کمال رائے نے اسے دس گیارہ سال بعد دیکھا تھا لیکن اس میں کوئی بھی تبدیلی نہ آئی تھی، اس کی فرماں برداری بھی ویسی ہی تھی۔

کمال رائے اس کے نزدیک گیا، اس کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن رولی رک گیا۔ ''نہیں مالک...... ملازم کو مالک کے برابر نہیں

بیٹھنا چاہئے۔"

"رولی تم میرے ملازم کب ہو...... کبھی تھے، سو اس بات کو بہت عرصہ ہوا...... دوسری بات یہ کہ جب مالک ہی تمہیں اپنے قریب بٹھانا چاہ رہا ہو، پھر تو انکار کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔"

"اچھا مالک...... جیسی آپ کی مرضی۔" یہ کہہ کر وہ ذرا اوپر سے سمٹ کر کمال رائے کے برابر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آرزو سے میری مختصر سی بات ہوئی ہے...... ساری بات میری سمجھ میں آ گئی لیکن جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی...... وہ میں تم سے سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا مالک؟" رولی بولا۔

"اس وقت تم راجہ وقار کے ملازم ہو۔"

"جی مالک۔"

"پھر تم نے آرزو کو یہاں پہنچا کر اس کی حکم عدولی کیوں کی...... صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس کی نمک حرامی کیوں کی؟"

"مالک...... میرے اصل مالک تو آپ کے والد محترم تھے، میری ساری زندگی ان کے ساتھ گزری، انہوں نے مجھے اپنے پاس بہت مان سے رکھا، نہ صرف مجھے رکھا بلکہ میرے بھائی ہولی کو بھی رکھ لیا، میں بڑے مالک کو کبھی نہیں بھول سکا۔" رولی نے بڑی عقیدت سے کہا۔

"لیکن رولی میں نے تو تمہیں نکال دیا تھا پھر ایک مرتبہ میں نے تمہارے منہ پر تھپڑ بھی مارا تھا، تمہیں یاد ہوگا اور جب میں نے تمہیں حویلی سے نکالا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اب میں کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں۔"

"ہاں، مالک مجھے یاد ہے...... میں کچھ نہیں بھولا...... یہی وجہ تھی کہ میں بی بی کو بنگلے کے گیٹ پر چھوڑ کر واپس جا رہا تھا لیکن بی بی نے ایسا نہیں کرنے دیا، مالک میں نے آپ کو اپنی منحوس شکل دکھائی میں شرمندہ ہوں۔"

"شرمندہ تو میں ہوں...... میں نے تمہارے ساتھ کیا، کیا اور تم نے میرے ساتھ کیا، کیا...... تم میری زندگی کو بچا کر لائے ہو رولی...... اگر میری آرزو کو کچھ ہو جاتا تو پھر میری زندگی کا کوئی جواز نہ رہتا۔"

"مالک آپ نے مجھے اور ہولی کو نکالا ضرور لیکن آپ نے ہمیں اتنے پیسے دیدیئے کہ اگر ہم سال دو سال تک کوئی کام نہ کریں تو بڑے عیش سے زندگی گزار سکیں...... مالک یہ احسان میں کبھی نہیں بھولا ...... آپ چاہتے تو ہمیں خالی ہاتھ بھی چلتا کر سکتے تھے...... مالک اسی احسان نے میری زندگی پلٹ

دی تھی...... جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بی بی آپ کی بیٹی ہیں تو یقین جانئے، میں تڑپ اُٹھا...... میں نے اپنے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا...... دل میں سوچ رہا تھا کہ بی بی کو گھر تک چھوڑ کر پلٹ جاؤں گا ...... مالک میں نے راستے میں بی بی کا ہر طرح خیال رکھا...... پھر بھی کوئی غلطی ہوگئی ہو تو آپ معاف کر دینا...... اب میں چلتا ہوں۔"

"اب تم کہاں جاؤ گے...... تم نے اپنا راستہ تو خود بند کر لیا۔"

"ہاں، مالک آپ نے ٹھیک کہا...... اب میں کنگن پور نہیں جا سکتا، یہ بات آج نہیں تو کل معلوم ہو جائے گی کہ بی بی اپنے گھر بحفاظت پہنچ گئی ہیں پھر میرے لئے گولی کا انتخاب کیا جائے گا، مالک میری زندگی نے پھر پلٹا کھایا ہے، وہ اوپر والا شاید پھر مجھے نیکی کی راہ دکھانا چاہتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک دَم کھڑا ہو گیا۔ "اچھا مالک اجازت۔"

"رولی اگر میں تم سے کچھ کہوں گی تو کیا مانو گے؟"

"مالک...... آپ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کریں...... آپ حکم کریں۔"

"آج رات میرے پاس رک جاؤ...... کل دن میں چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے مالک...... جیسے آپ کی مرضی۔"

"تم بھی سفر کر کے آ رہے ہو...... نہا دھو لو...... تمہیں بھوک بھی لگی ہوگی، میں تمہارے لئے کھانا نکلواتا ہوں۔"

"مہربانی مالک۔" رولی نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

رولی نے نہا دھو کر کھانا کھایا...... پھر کمال رائے اس سے رات کے دو بجے تک باتیں کرتا رہا، اس نے وہ تمام تفصیل معلوم کر لی جس کی اس کو ضرورت تھی، اسے اندازہ ہو گیا کہ آرزو کو پرانی دشمنی کے تحت راجہ وقار نے ختم کرانے کی کوشش کی تھی، رولی کو راجہ سلیم اور روشن رائے کے درمیان چلنے والی دشمنی اچھی طرح یاد تھی، اسے یہ بھی یاد تھا کہ کمال رائے کی بیوی کو راجہ سلیم نے ہی قتل کروایا تھا۔ کمال رائے کو راجہ وقار پر بہت غصہ تھا، وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُڑ کر کنگن پور پہنچ جائے اور راجہ وقار کو بھون کر رکھ دے۔

رولی سے ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ رامش خیال اور ماموں رشید کنگن پور کی حویلی میں ہیں اور ان سے کسی قسم کا تشدد آمیز رویہ روا نہیں رکھا گیا۔ اصل میں رولی کو حویلی کے اندر کا حال معلوم نہ تھا کہ رامش خیال کے ساتھ راجہ وقار نے کیسا ظلم توڑا تھا، کمال رائے کو رامش کی بھی فکر تھی بہر حال وہ اب اس کا داماد تھا، اس کیلئے فکر مند ہونا فطری امر تھا۔

رولی سے ساری تفصیل معلوم کرنے کے بعد اس نے دلدار کو بلایا اور اس سے کہا۔ "دیکھو، رولی کو

ان کا کمرہ دکھا دو اور صبح کو ان کے ناشتے وغیرہ کا خیال رکھنا۔"

"جی مالک۔" دلدار نے بڑے احترام سے رولی کو اس کے کمرے تک پہنچایا۔

رولی بہت تھکا ہوا تھا، اس نے کمرہ اندر سے بند کیا اور بیڈ پر بڑے آرام سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا، کمرے میں ابھی لائٹ روشن تھی، وہ کچھ دیر اپنی زندگی کے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا پھر تھوڑی دیر میں اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تو اس نے سوچا کہ لائٹ بجھا دے تاکہ آرام سے سو سکے، ابھی وہ اُٹھا ہی تھا کہ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اس کے سامنے ایک سنہرا سانپ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔

☆......☆......☆

"مالک...... میں آپ کو کیا بتاؤں، وہ کس طرح کا سانپ تھا...... وہ ایک سنہرا سانپ تھا، چمکتا ہوا، لگتا تھا جیسے سونے کا بنا ہوا...... اس کے سر پر ایک ہیرا رکھا ہوا تھا جو جگمگا رہا تھا، وہ کافی لمبا سانپ تھا، مالک میں نے اتنا خوبصورت سانپ آج تک نہیں دیکھا...... وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہا تھا، اس کی لمبی دو دھاری زبان بار بار اندر باہر ہو رہی تھی...... مالک وہ جانے اچانک کہاں سے آ گیا، میں لائٹ بند کرنے اُٹھا تو وہ میرے سامنے تھا...... میں نے سوچا لے بھئی رولی تیرا روزِ آخر آ پہنچا، میرا خیال تھا کہ چند لمحے ہی جاتے ہیں کہ وہ میری ٹانگ پر پھن مارے گا لیکن مالک بڑی عجیب بات ہوئی، اس نے مجھے ڈسنے کی کوشش نہیں کی بس مجھے دیکھ کر اپنا پھن پھیلائے جھومتا رہا۔"

"اچھا پھر......" کمال رائے اس کی بات بڑی دلچسپی اور توجہ سے سن رہا تھا۔ رولی نے ناشتہ کرنے کے بعد فوراً ہی کمال رائے سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ وہ جلد از جلد سانپ والا واقعہ کمال رائے کے گوش گزار کر دینا چاہتا تھا، اب وہ بیٹھا اسے سنا رہا تھا۔

"بس مالک...... پھر ایک اور عجیب بات ہوئی...... مالک آپ اس بات کو مذاق مت سمجھئے گا۔"

"وہ کیا؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"مالک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سانپ بولا ہے۔"

"بولا ہے۔" کمال رائے نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، مالک...... میں نے محسوس کیا جیسے اس نے کہا ہو کہ تم نے ہماری آرزو کی جان بچائی، اسے یہاں بحفاظت لے آئے...... ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا۔"

"مالک میں کیا جواب دیتا...... ایسی عجیب و غریب صورتحال نے تو میری سٹی گم کر دی، بیڈ پر جھومتا

سانپ اور وہ بھی بولتا ہوا...... مجھ پر تو سکتہ طاری تھا بس مالک پھر وہ چند لمحے اور میرے سامنے رہا، اس کے بعد بیڈ سے پھسل کر نیچے چلا گیا، میں نے اسے پردے کی طرف جاتے دیکھا پھر کچھ دیر کے بعد جب میں ہمت کر کے اُٹھا اور میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر اسے تلاش کیا تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ کمرے میں بہت اچھی خوشبو ضرور پھیلی ہوئی تھی۔"

"بڑی حیرت میں ڈالنے والی بات ہے۔" کمال رائے نے کہا۔ وہ سارا معاملہ فوراً سمجھ تو گیا لیکن رولی کے سامنے وہ اس کے متعلق کیا بات کرتا، لہٰذا اس نے غیر یقینی انداز اختیار کر کے سانپ والے قصے کو یہیں ختم کر دیا اور پھر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک سیکورٹی گارڈ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، اس نے ایک موٹا لفافہ کمال رائے کے سامنے رکھا اور بولا۔ "سر پیسے چیک کر لیجئے۔"

کمال رائے نے لفافہ اُٹھا کر اس کے اندر جھانکا، لفافے میں اسے پانچ گڈیاں نظر آئیں اور یہ گڈیاں ہزار ہزار کے نوٹوں کی تھیں۔ "ٹھیک ہیں۔" اس نے کہا۔

سیکورٹی گارڈ کے جانے کے بعد کمال رائے نے رولی کو مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ "رات کو تم جانا چاہ رہے تھے لیکن میں نے تمہیں روک لیا تھا...... اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں رخصت کر دوں لیکن جانے سے پہلے میں چاہوں گا کہ تم میری ایک چھوٹی سی بات مان لو۔"

"آپ حکم کریں مالک۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

"اس لفافے میں پانچ لاکھ روپے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم اس لفافے کو اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لو۔" کمال رائے نے کہا۔

کمال رائے کی یہ "چھوٹی سی بات" سن کر رولی کا چہرہ محبت کے جذبات سے تمتما اُٹھا، وہ بڑی عقیدت سے اُٹھا اور میز کی طرف سے گھوم کر کمال رائے کی طرف آیا جبکہ نوٹوں سے بھرا لفافہ میز پر رکھا ہوا تھا، اس نے اس لفافے پر نظر ڈالنا بھی پسند نہ کیا، وہ ایک دم جھکا، اس نے کمال رائے کے پیروں کو چھوا۔

"رولی...... یہ کیا کر رہے ہو؟" کمال رائے نے اپنے پیر ایک دم پیچھے کھینچ لئے۔

جب وہ اُٹھا تو اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی، وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "مالک میں ایک انتہائی گھٹیا اور منحوس آدمی ہوں...... میری زندگی میں گناہ ہی گناہ ہیں...... میں نے بے شمار لوگوں کو دُکھ پہنچایا...... مالک! اب اگر مجھ سے ایک نیکی سرزد ہو گئی ہے تو اُسے رائیگاں تو نہ کریں، کیا پتہ مالک اس ایک نیکی کے بدلے میری بخشش ہو جائے...... مالک یہ لفافہ میں کبھی نہیں اُٹھاؤں گا...... کسی قیمت پر اپنی جیب میں نہیں رکھوں گا...... آپ نے مجھے اتنا مان دیا، اتنی عزت دی...... اپنے برابر بٹھایا...... مالک

اس سلوک کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

کمال رائے شش و پنج میں پڑ گیا، کیا کرے، کیا کہے کہ رولی یہ روپے قبول کر لے اسی وقت آرزو ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"اچھا، آپ لوگ یہاں ہیں۔" وہ کمال رائے کو دیکھتی ہوئی بولی۔ پھر اس نے رولی کو عجیب انداز میں کھڑے ہوئے دیکھا تو اس سے مخاطب ہوئی۔ "ارے، آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھئے نا......"

"جی بی بی۔" رولی فوراً صوفے پر دراز ہو گیا۔

"بھئی آرزو......تم ہی انہیں سمجھاؤ۔"

"کیا ہوا بابا......؟"

"بیٹا......اس لفافے میں تھوڑے سے پیسے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ یہ رکھ لیں لیکن یہ مان نہیں رہے۔" کمال رائے نے شکوہ کیا۔

"ارے کیوں؟" آرزو نے جلدی سے اُٹھ کر لفافہ اُٹھایا، اس میں جھانک کر رقم کا اندازہ لگایا۔ پھر وہ رولی کی طرف بڑھی اور بڑے احترام سے بولی۔ "کیوں انکل......آخر کیا بات ہے، یہ تو بہت تھوڑے سے پیسے ہیں...... میں جانتی ہوں کہ اب آپ راجہ وقار کے علاقے میں نہیں رہ سکیں گے، آپ کو کوئی نئی جگہ ڈھونڈنا ہوگی......آپ کو پیسے کی ضرورت ہوگی...... یہ پیسے آپ رکھ لیں، آپ کے کام آئیں گے۔"

"نہیں بی بی......مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"اچھا یوں کریں......ان پیسوں کو بطور قرض رکھ لیں......جب کبھی آپ کے پاس فالتو پیسے ہوں تو آ کر مجھے دے جایئے گا......میں لے لوں گی......ٹھیک ہے......انکل اب تو انکار نہ کریں۔"

رولی کیلئے اب کوئی فرار کا راستہ نہ تھا، اس چھوٹی سی لڑکی نے اسے انکل کہہ کر ایک لمحے میں اپنا بنا لیا تھا، پھر وہ رقم بھی بطور قرض دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے بی بی...... میں لے لیتا ہوں......موت و زندگی کا بہر حال کوئی بھروسہ نہیں......اگر میں مر جاؤں تو یہ قرض مجھے معاف کر دیجئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے لفافہ اُٹھا لیا۔

"انکل......یہ قرض میں نے ابھی معاف کیا......میرے بابا نے معاف کیا......کیوں بابا؟"

"ہاں بیٹا بالکل۔" کمال رائے نے خوش دلی سے کہا۔

"اللہ نے چاہا تو یہ قرض میں ضرور لوٹاؤں گا۔" رولی نے بڑے یقین سے کہا۔ جانے کیا سوچ کر۔

"بابا......میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ مہر النساء کو اس سلسلے میں کیا بتاؤں؟"

"ابھی تم اسے کچھ مت بتاؤ......میں سوچتا ہوں کہ ابھی کیا کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا۔" یہ کہہ کر آرزو ڈرائنگ روم سے جانے لگی۔

"اچھا......بی بی......میں کچھ دیر کے بعد چلا جاؤں گا......اللہ حافظ۔"

"ابھی نہیں انکل......دوپہر کا کھانا کھا کر جایئے گا۔" آرزو نے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

کمال رائے نے مسکرا کر رولی کو دیکھا اور بولا۔ "بھئی، ہم سے اچھی تو ہماری بیٹی......رہی۔"

"بہت اچھی بی بی ہیں......اللہ ان کی زندگی خوشیوں سے بھر دے۔" رولی نے دل سے دعا دی۔ پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ "مالک، یہ دنیا بندے کو اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کیوں نہیں دیتی۔"

"کیوں کیا ہوا؟" کمال رائے اس کی بات سمجھ نہ پایا۔

"مالک......آپ کو میرا بھائی ہولی یاد ہے۔"

"ہاں، بہت اچھی طرح......"

"مالک......کیا آپ جانتے ہیں، اس کے ساتھ کیا ہوا؟"

"ہاں، ہولی کے بارے میں تو میں نے پوچھا ہی نہیں......وہ کہاں ہے؟"

"مالک......وہ مر گیا۔" رولی کا چہرہ ایک دَم بدل گیا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر انگارے پھینک دیئے ہوں۔

"ارے، یہ کب ہوا؟" کمال رائے نے دکھ سے پوچھا۔

"مالک...... یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہم نے روشن گوٹھ چھوڑا تھا۔ آپ نے ہمیں اتنے پیسے دے دیئے تھے کہ کھانے کمانے کی کوئی فکر نہ تھی۔ روشن گوٹھ چھوڑنے کے بعد پتہ نہیں میرے دل کو کیا ہوا؟ اس جرائم کی زندگی سے نفرت سی ہوگئی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے دل کو ٹٹولا تو وہاں بھی ایسے ہی جذبات پائے۔ رقم ہمارے پاس کافی تھی۔ ہم دونوں نے اپنے علاقے میں جا کر ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور کھول لیا......اور ہم دونوں پوری نیک نیتی سے کام کرنے لگے۔ اللہ نے اس کام میں برکت دی۔ ہمارا جنرل اسٹور خوب چل پڑا۔ مالک میں آپ کو سچ بتاتا ہوں جتنے دنوں میں نے جنرل اسٹور چلایا، حلال کی روزی کھائی، اس روزی کا مزہ اور سکون کچھ اور ہی تھا۔ ایسا مزہ اور سکون میں نے زندگی میں کبھی نہ پایا تھا......لیکن تقدیر کو میرا یہ سکون پسند نہ آیا، میرے برے اعمال جو مجھے رہ رہ کر یاد آتے تھے ایک دن مجسم ہو گئے۔ ہاں مالک، میرے برے اعمال ایک نئے تھانیدار کی صورت میں میرے جنرل اسٹور پر آ کھڑے ہوئے۔ اس دن میں دکان پر موجود نہیں تھا، شہر سے دکان کے لئے مال لینے گیا ہوا تھا۔ اس نے ڈنڈے سے شوکیس کا شیشہ بجایا اور اتنے زور سے بجایا کہ شیشہ چیخ

گیا اس نے دکان پر موجود ہولی سے کہا۔ ''اوئے...... یہ تم لوگ کیا ترازو باٹ لئے بیٹھے ہو۔ کام کرو کام ......ان دو دو پیسوں کی چیزیں بیچنے میں کیا رکھا ہے۔ سمجھے کہ نہیں......اور وہ رولی کہاں ہے؟ آج شام کو تم دونوں تھانے کا چکر لگاؤ...... میری بات سمجھ گئے ہونا۔''

وہ بے چارہ ہولی کیا جواب دیتا۔ ڈنڈا مار کر تھانیدار نے شوکیس کا شیشہ پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ اس کیلئے سر توڑنا کون سا مشکل تھا۔ اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

میں جب شہر سے واپس آیا اور میں نے ہولی کو منہ لٹکائے اور شوکیس کا شیشہ ٹوٹا ہوا دیکھا تو فوراً ٹھٹھک گیا۔ میں نے سوچا لے بھئی رولی...... جس کام سے تم بچ رہے تھے آج وہ کام ہو گیا۔

''یہ شیشہ کس نے توڑا...... کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رولی...... وہ نیا تھانیدار آج خود دکان پر آیا تھا......اور ہم دونوں کو تھانے بلا گیا ہے۔''

''اسے کیا پریشانی ہے؟''

''وہ کہتا ہے...... ترازو باٹ چھوڑو......اور کام کرو کام۔'' اس نے تھانیدار کی پریشانی بتائی۔

''اچھا...... میں شام کو اس سے جا کر ملوں گا...... تو پریشان مت ہو۔'' میں نے اپنے بھائی کو تسلی دی۔

شام کو میں اکیلا ہی تھانے پہنچ گیا۔ اس تھانیدار کو دیکھ کر میری سٹی گم ہو گئی۔ وہ مجھے اور میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ روشن گوٹھ کے علاقے میں بھی تعینات رہ چکا تھا اور اب مختلف علاقوں میں ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے خلاف توقع مجھے بڑی عزت سے بٹھایا۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اور بڑی عاجزی سے کہا۔ ''سرکار...... ہم لوگ بڑی مشکل سے راہ راست پر آئے ہیں۔ اب ہمیں سیدھے راستے سے نہ ہٹانا۔''

میری بات سن کر اس تھانے دار نے، جس کا نام عمر دراز تھا، ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے ڈنڈے سے میرے دونوں ہاتھوں کو الگ کیا اور بولا۔ ''اوئے...... تو نے بڑی مزیدار بات کی ہے ......ہنس ہنس کر میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اوئے تو سوچو ہے کھا کر بلی حج کو چلی...... نا رولی نا...... میں کہتا ہوں، تم لوگ سیدھے راستے بھٹک گئے ہو۔ اب اپنے اصل راستے پر آ جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

''سرکار، کیا چاہتے ہو؟''

''واردات۔'' اس نے ایک لفظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا لیکن یہ لفظ کسی گولی سے کم نہیں تھا۔

''کیسی واردات؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''اوپر سے دس لاکھ کی ڈیمانڈ آئی ہے...... میں پریشان ہوں۔'' اس نے بات شروع کی۔

''یہ ڈیمانڈ کس طرح پوری ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی پچیس لاکھ کی آسامی اٹھا کر۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ۔'' اب یہ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں علاقے کے کسی زمیندار کو اغوا کروں اس سے پچیس لاکھ روپے وصول کروں اور اسے تھانے پہنچاؤں۔ اس طرح کے کام میں نے بہت کئے تھے۔ میری پوری زندگی جرائم سے پُر تھی۔ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن نہ جانے مجھے کیا ہوا......؟ کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے بڑے بھرپور انداز اور بڑے مستحکم لہجے میں کہہ دیا۔ ''سرکار، یہ کام میں نے چھوڑ دیا ہے۔''

تھانیدار کو مجھ سے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اس پر جیسے بجلی سی گری۔ اس کا چہرہ ایک دم بجھ گیا۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ نہ کہا۔ کسی قسم کے غصے کا اظہار نہ کیا...... بس اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور ڈنڈے سے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھا اور تھانے سے باہر نکل گیا۔ تھانیدار عمر دراز کے اس انداز نے میرے اندر ہلچل مچا دی تھی۔ میرے اندر سے بار بار آواز آ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ ہونے والا ہے۔

اور مالک ابھی چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ عمر دراز نے میرے جنرل اسٹور پر چھاپہ مارا۔ میرے جنرل اسٹور میں کوئی قابل اعتراض چیز نہ تھی، اس کے باوجود ہم دونوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہم پر الزام لگایا گیا کہ ہم جنرل اسٹور کی آڑ میں شراب کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جھوٹی شہادتیں بھی اکٹھی کر لی گئیں۔ ہمارا جنرل اسٹور بند ہو گیا اور ہم دونوں کو حوالات میں ڈال دیا گیا...... لیکن حکمت عملی یہ اختیار کی گئی کہ ہم دونوں کو الگ الگ لاک اپ میں رکھا گیا۔

دو تین دن کے بعد میں نے دیکھا کہ دو سپاہی ہولی کو ہتھکڑی ڈالے باہر لے جاتے ہیں۔ وہ میرے سامنے سے گزرے تو میں بھاگ کر سلاخوں تک آیا اور چیخ کر بولا۔ ''میرے بھائی کو کہاں لے جا رہے ہو؟''

میری اس بات کا کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے بھائی کا چہرہ دیکھا۔ اس نے میری آواز پر مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تھی۔ وہ چہرہ میری نظروں میں آج بھی سمایا ہوا ہے، اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن سپاہی نے اسے آگے دھکیل دیا۔ یہ میرے بھائی کا آخری دیدار تھا۔ پھر میں اس کو کبھی نہ دیکھ سکا۔

سات دن مجھے حوالات میں رکھ کر آٹھویں دن اچانک حوالات کا دروازہ کھول دیا گیا اور عمر دراز

بہ نفس نفیس اندر آیا اور بولا۔ ”جاؤ، رولی...... تم آزاد ہو...... لیکن یاد رکھنا تم نے واپس میرے پاس ہی آنا ہے۔“ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، سر جھکا کے حوالات سے باہر آ گیا۔

تھانے سے باہر نکلا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ عمر دراز نے اگر مجھ پر حوالات کا دروازہ کھول دیا تو اس کے پیچھے کوئی راز ضرور ہے۔

پھر مالک، جب میں اپنے علاقے میں پہنچا تو مجھے آہستہ آہستہ سب معلوم ہو گیا۔ میرے گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس گھر کی چابی پڑوسی کے پاس تھی۔ اس سے چابی لے کر گھر کھولا۔ گھر کا دروازہ کیا کھولا گویا دُکھ کا دروازہ کھل گیا۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے مکین غائب تھے، گھر میں تھا ہی کون......؟ ایک میں تھا اور ایک میرا بھائی...... گھر اس لئے بھائیں بھائیں نہیں کر رہا تھا کہ وہاں ہولی نہ تھا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ پورے گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ ہماری حلال کی کمائی سے خریدا گیا گھر کا تمام سامان غائب تھا۔

میں وہی دھم سے زمین پر بیٹھ گیا۔ تب لوگ آتے گئے اور مجھے بتاتے گئے۔ پھر کسی نے میرے سامنے ایک اخبار رکھ دیا۔ مالک، اس اخبار میں میرے ہولی کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ اس کی لاش کی تصویر تھی، خون میں لت پت...... اسے پولیس مقابلے میں مار دیا گیا تھا اور اسے ایک مشہور ڈاکو دادل ظاہر کیا گیا تھا۔ دادل کی گرفتاری پر حکومت نے پچاس لاکھ روپے انعام رکھا ہوا تھا۔

اپنے بھائی ہولی کی تصویر دیکھ کر میرے دل میں آگ بھڑک اُٹھی۔ مالک ہولی سے مجھے بہت محبت تھی۔ اس کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مالک میں آنسو نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھا۔ جب میرے آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہے تب مجھے معلوم ہوا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ یہ کیوں آنکھوں میں آتے ہیں۔ میں نے تو زندگی بھر لوگوں کو رُلانے کا ہی کام کیا تھا۔ جانے کتنی زندگیاں برباد کی تھیں، جانے کتنے گھر لوٹے تھے۔ آج اپنے آگے آئی تھی تو دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

بس مالک قصہ مختصر...... میں نے اسی دن بیٹھے بیٹھے زمین چھو کر قسم کھائی کہ اب عمر دراز کی عمر تباہ کر کے رہوں گا۔ اس نے میرے بھائی کو جعلی مقابلے میں جعلی نام سے مارا ہے۔ میں بھی اس کی لاش کو بے نام و نشان کر دوں گا۔ مالک آپ جانتے ہیں کہ ایسے کاموں کے لئے ایک مضبوط پناہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ واردات کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا واردات کر کے چھپنا...... پھر میں نے راجہ وقار کی صورت میں جلد ہی پناہ تلاش کر لی۔ اسے بھی اتفاق سمجھیں کہ جب میں نے راجہ وقار سے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ سوچ میں پڑنے کے بجائے خوش ہو گیا کیونکہ عمر دراز نے اسے بھی کسی معاملے میں ستایا ہوا تھا۔

میں موقع کی تلاش میں رہا اور ایک رات جب وہ ”اس بازار“ سے نشے میں دھت اپنے گھر جا رہا تھا تو میں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کی گاڑی پر حملہ کر دیا۔ میں نے اسے رسیوں سے باندھ دیا اور جنگل میں لے گیا۔ وہ بہت زیادہ چڑھائے ہوئے تھا۔ اسے اپنا کچھ ہوش نہ تھا...... لیکن جب اس نے موت کو سامنے دیکھا تو سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس طرح مالک میں نے اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے لیا۔ اس کی لاش کو بے نام و نشان کر دیا، اس کی لاش آج تک کسی کو نہ مل سکی اور ملتی بھی کس طرح، میں نے اسے ٹوٹوں کی صورت میں مختلف جگہوں پر دفنا دیا۔ اس کے بعد میرے پھر وہی شب و روز ہو گئے، میں راجہ وقار کا غلام ہو گیا۔ اندھیروں میں گھر گیا۔ مالک میرا تجربہ ہے کہ جب گھور اندھیرا چھا جائے تو کہیں نہ کہیں سے روشنی کی کرن ضرور چمکتی ہے۔ ایک مرتبہ وہ کرن آپ کی صورت میں چمکی تھی۔ مالک میرا خیال ہے کہ اپنا کیا، اپنے آگے ضرور آتا ہے۔ مالک برائی کی طرح اچھائی بھی اسی طرح سامنے آتی ہے۔ زندگی میں کیا ہوا کوئی اچھا عمل کبھی نہ کبھی فائدہ ضرور پہنچاتا ہے۔“

اتنا کہہ کر رولی چپ ہو گیا۔

کمال رائے اس کی کہانی سن کر سوچنے لگا۔ یہ انسان بھی کیا عجیب چیز ہے۔ اسے پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ ایک جرائم پیشہ شخص کے دل میں کب روشنی آ جائے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اور ایک اچھے انسان کے دل میں کب اندھیرا چھا جائے کوئی نہیں جان سکتا۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ نیکی اور بدی کے درمیان محض ایک لمحے کا فاصلہ ہوتا ہے۔

دونوں اپنی سوچوں میں گم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کمال رائے نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

”رولی، تمہیں اگر پناہ کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

”آپ نے مالک...... مجھے اتنی بڑی رقم دے دی۔ یہ میرے لئے بہت بڑی پناہ ہے۔“ رولی نے بڑے ممنون لہجے میں کہا۔ ”پھر مالک میں چاہتا بھی نہیں کہ میرے معاملے میں آپ کسی بھی طرح ملوث ہوں۔ آپ راجہ وقار کو نہیں جانتے۔“ وہ اپنے باپ راجہ سلیم سے چار ہاتھ آگے ہے۔ راجہ سلیم اگر کسی کے ساتھ دشمنی کرتا تھا تو اس کے کچھ اصول تھے یہ شخص تو کسی اصول کا پابند نہیں، اسے وقار سے زیادہ پیسہ چاہئے۔ پیسے کے حصول کیلئے وہ کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ مالک میں اب زندگی کے آخری مرحلے میں ہوں، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ جیسے ہی راجہ وقار کو معلوم ہو گا کہ میں نے بی بی کو بحفاظت آپ کے حوالے کر دیا ہے، اسی وقت میرے نام کی گولی چل جائے گی۔ اس گولی پر میری موت کندہ ہو گی۔ اس گولی سے میں کب تک بچوں گا۔ کون جانے......؟ خیر مالک ایک دن مرنا تو

سبھی نے ہے۔ پھر اب موت سے کیا ڈرنا۔ ویسے مالک، یہ بات میں نے طے کر لی ہے۔ اکیلا نہیں مروں گا، اپنے ساتھ دو چار بندوں کو لے کر مروں گا۔"

"رولی، تمہارے لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ جرائم کی دنیا سے نکل آؤ...... کہیں دور جا بسو۔"

"مالک کہاں جاؤں گا...... راجہ وقار بڑا خطرناک شکاری ہے۔ اس نے کہاں کہاں جال لگائے ہوئے ہیں آپ کو کیا معلوم...... آپ ٹھہرے ایک سیدھے سادے شریف آدمی۔" رولی بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم بھی شریف آدمی بن جاؤ۔" کمال رائے نے کہا۔

"مجھے کون بننے دے گا شریف آدمی...... بنا تو تھا شریف آدمی...... میرے بھائی کو مار دیا۔" رولی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"تم گم کیوں نہیں ہو جاتے؟" کمال رائے نے مشورہ دیا۔

"گم۔" اس نے اس لفظ کو کچھ اس طرح دُہرایا جیسے بات نہ سمجھا ہو۔

"ہاں...... کسی ایسی جگہ چلے جاؤ...... جہاں راجہ وقار تمہیں تلاش نہ کر سکے۔"

"اس ملک میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اس کے کتے نہ گھومتے ہوں۔"

"تو پھر بیرون ملک چلے جاؤ۔" کمال رائے نے تجویز پیش کی۔ "تمہیں اس سلسلے میں مزید رقم درکار ہو تو مجھ سے آ کر لے جانا۔"

"اچھا، مالک...... سوچوں گا...... آپ میری طرف سے پریشان نہ ہو، میری پوری زندگی خطرات سے کھیلتے ہی گزری ہے۔ اب خطرات سے کیا ڈرنا...... مجھے اب اپنے سے زیادہ آپ کی فکر ہے۔ بی بی کی فکر ہے، راجہ وقار آپ کا پرانا دشمن ہے۔ اس دشمن کو ابھی تازہ تازہ گھاؤ لگا ہے۔ وہ میری جان کا دشمن بننے کے ساتھ پلٹ کر آپ پر بھی حملہ کرے گا۔" رولی فکرمند ہوتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری بات سمجھتا ہوں رولی۔ وہ میرا پرانا دشمن تو ہے ہی...... اب اس کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں نے اس کی بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ یہ جان کر تو اس کی جان نکل گئی ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں رولی...... میں شریف آدمی ضرور ہوں لیکن بزدل نہیں ہوں۔ راجہ وقار نے اگر پر پرزے نکالنے کی کوشش کی تو میں اسے دیکھ لوں گا۔" کمال رائے نے بڑے یقین سے کہا۔

اس بات کے بعد رولی خاموش ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جیسے اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔

☆......☆......☆

رامش خیال نے راجہ وقار کی سخت توہین کی تھی۔ اس نے نکاح سے تو انکار کیا ہی تھا، ساتھ ہی نکاح

نامہ بھی پرزے پرزے کر کے ہوا میں اُچھال دیا تھا۔

راجہ وقار کو اس بات پر سخت غصہ تو تھا لیکن وہ اندر سے مطمئن بھی تھا۔ اس نے آرزو کو رولی کے حوالے کر دیا تھا، اب وہ شاخ ہی نہ رہی تھی جس پر رامش خیال کا آشیانہ تھا۔

راجہ وقار ایک شاطر آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ جب بنیاد ہی ختم ہو گئی تو پھر سختی یا غصہ کرنے سے کیا فائدہ۔ جوان خون ہے، سختی کرنے سے رام نہ ہوگا۔ ویسے اس نے سختی کا نتیجہ دیکھ بھی لیا تھا۔ لہٰذا راجہ وقار نے فوراً کسی سیاست داں کی طرح اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور نیا چولا پہن کر رامش خیال کے سامنے آ گیا۔

رات گزرنے کے بعد جب رامش خیال اور ماموں رشید نے راجہ وقار کا رویہ یکسر تبدیل دیکھا تو دونوں چوکنے ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تفہیمی نظروں سے دیکھا۔

"بھئی، کیا معاملہ ہے؟" ماموں رشید بالآخر بولے بغیر نہ رہ سکے۔

"ماموں، کیا ہوا؟"

"یہ راجہ صاحب...... صبح سے کئی چکر لگا چکے ہیں...... انہیں ایک دم ہماری بڑی فکر ہو گئی ہے۔ ہم رات کو اچھی طرح سوئے کہ نہیں...... منہ دھویا کہ نہیں...... ناشتے میں تم لوگ کیا لیتے ہو وغیرہ...... بھئی یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"کچھ نہیں ماموں...... لومڑی نے خرگوش کی کھال پہن لی ہے۔" رامش خیال نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، یہی بات ہے...... لیکن خرگوش کی کھال اسے پوری نہیں آ رہی ہے۔" ماموں رشید بھی چپ نہ رہے۔

"ویسے...... وہ چھپنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔" رامش خیال بولا۔

ماموں رشید اچانک اُٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ رامش خیال انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

"ماموں کہاں جا رہے ہیں؟"

ماموں رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازے سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر جھانکا۔ پھر دروازہ اندر سے بند کر کے واپس آ گئے اور اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولے۔ "آرزو کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"آپ نے بات نہیں کی راجہ صاحب سے؟" رامش خیال نے پوچھا۔

"ہاں کی تھی...... لیکن وہ اس موضوع پر کچھ کہنے کیلئے تیار ہی نہیں۔"

''ماموں......اگر آرزو کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو اس حویلی کو آگ لگا دوں گا۔''

''مجھے تو یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ ہم رائے صاحب کو کیا جواب دیں گے۔انہوں نے اپنا جان کر اپنی بیٹی ہمارے حوالے کی تھی۔ رامش، بہت برا ہو گا، اگر ہم آرزو کو روشن گوٹھ نہ پہنچا سکے۔''

''ماموں، تایا سے بات تو کریں......ہو سکتا ہے، آج کچھ بتا دیں۔''

''میں تمہارے سامنے ہی بات کروں گا......اسے ادھر آنے تو دو۔''

ابھی وہ دونوں باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے پر بے ہنگم دستک ہوئی۔ دونوں نے جان لیا کہ یہ دستک راجہ وقار کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔ رامش خیال نے ماموں رشید کی طرف دیکھا جیسے کہتا ہو ہوشیار، لومڑی آ گئی۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اندر سے لگی چٹخنی ایک جھٹکے سے نیچے کی اور پھر جھٹکے سے ہی دروازہ کھول دیا۔ رامش خیال کے چہرے پر غصہ تھا جیسے کسی نے خواہ مخواہ آ کر ڈسٹرب کیا ہو۔

''تایا......آپ ہیں۔'' وہ اپنے چہرے پر نرمی لاتا ہوا بولا۔

''ہاں، بیٹا میں ہوں۔'' راجہ وقار کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ ''ارے یہاں تو رشید بھی ہیں ......اچھا کوئی خاص بات ہو رہی تھی، میٹنگ چل رہی تھی۔ بھئی شہروں میں تو بات بات پر میٹنگ ہوتی ہے۔ تو بابا ہمیں بھی بتاؤ......دروازہ بند کر کے کس خفیہ مسئلے پر غور ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ماموں رشید کچھ کہتے، رامش خیال بول پڑا۔ ''ہم لوگ آرزو کے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

''دروازہ بند کر کے۔'' راجہ وقار نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''ایک بلی بار بار کمرے میں آ رہی تھی، اس لئے دروازہ بند کر دیا تھا۔'' رامش خیال نے یونہی بہانہ کر دیا۔

''ہاں، بابا......اس حویلی میں بلیاں بہت ہیں......رات کو جب سب مل کر شور مچاتی ہیں تو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' راجہ وقار نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''رات کو روتی ہوئی بلیاں آپ کو اچھی لگتی ہیں۔'' اس مرتبہ ماموں رشید بولے۔ ''بھائی جی، رات کو بلیاں اس خوفناک طریقے سے روتی ہیں کہ میری تو جان نکلتی ہے۔''

''اوئے رشید......تم شہری لوگ ہو......تمہیں جنگل کا کیا پتہ......بابا جنگل کا مزہ تو کوئی شیر ہی اُٹھا سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر راجہ وقار بے ہنگم طریقے سے ہنسا......گویا اپنے تئیں اس نے بڑی لاجواب بات کی ہو۔

رامش خیال نے جب محسوس کیا کہ راجہ وقار نے آرزو کو چھوڑ کر جنگل اور شیر کا ذکر شروع کر دیا ہے تو اس نے پریشان ہو کر ماموں رشید کو دیکھا۔ راجہ وقار اچانک اپنی ہنسی روک کر شکار کی کوئی داستان شروع کر دے گا اور یہ داستان بڑے آرام سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لے جائے گی۔ اس نے اشارہ کیا کہ وہ آرزو کا ذکر چھیڑیں گے۔

''وہ بھائی جی......ہم لوگ جانا چاہتے ہیں۔''

''ارے رشید......اتنے دنوں کے بعد تو آئے ہو......دو چار دن تو ہمیں مہمان نوازی کا موقع دو۔ ٹھیک ہے بابا، مجھے معلوم ہے کنسٹرکشن کا کام کرتے ہو۔ اس کام میں سو جھگڑے ہوتے ہیں، چلے جانا......ایک دو دن تو رکو۔'' راجہ وقار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بھائی جی......آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔'' ماموں رشید نے فوراً پینترا بدلا۔

''ہاں، ہاں...... پوچھو بابا ضرور پوچھو......جو مرضی آئے پوچھو......بس اس چھوکری کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔'' راجہ وقار ایک کائیاں آدمی تھا، اس نے وہ بات کہہ دی جو ان کے دل میں تھی۔

''کیوں بھائی جی......اس کے بارے میں کیوں نہ پوچھیں......آپ جانتے ہیں کہ وہ محض ایک چھوکری نہیں ہے رامش خیال کی منکوحہ ہے۔ وہ راجہ کمال کی بیٹی ہے، ہم اسے روشن گوٹھ چھوڑنے جا رہے تھے۔''

روشن گوٹھ اور کمال رائے کا نام سن کر جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک دَم اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے غصے میں کچھ کہنا چاہا مگر وہ صرف ''روشن گوٹھ'' کہہ کر ہی چپ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ دونوں اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھا اپنے جذبات پر قابو پاتا رہا، پھر بولا تو اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

''دیکھو، رشید اس بات کو تو مان لو کہ تم لوگوں سے ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ خیر بابا، کوئی بات نہیں تمہاری اس غلطی کا خمیازہ اب میں بھگتوں گا...... پہلے کمال رائے کا باپ ہم لوگوں کا دشمن تھا، اس نے ہمارے خاندان کو بہت نقصان پہنچایا، اب اس کا بیٹا ایک مرتبہ اسی روش پر چل پڑا ہے۔ اب اس نے دوسری طرح سے جال پھینکا ہے وہ رامش خیال کو ہم سے چھین لینا چاہتا ہے۔ بابا، رشید تم جانتے ہو کہ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ تم لوگ تو دشمن کے دام میں آ گئے ہو لیکن میں زیر ہونے والا نہیں، میں بڑا زبردست ہوں۔'' راجہ وقار نے گردن اکڑا کر کہا۔

''بھائی جی، جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا......آپ براہِ کرم ہمیں آرزو کے بارے میں بتا دیں۔ وہ

کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم بابا۔" یہ کہہ کر راجہ وقار اُٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆......☆

راجہ وقار غصے میں بھرا، اپنے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اسے رولی کا انتظار تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اب تک کئی بندے اس کے گھر بھیج چکا تھا لیکن ہر بار بندہ یہی خبر لے کر لوٹتا تھا کہ اس کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہے۔ اس نے پورے کنگن پور میں اور آس پاس کے علاقوں میں اپنے ہرکارے دوڑا دیئے تھے۔ کہیں رولی کو پائیں تو فوراً اسے آ کر مطلع کریں۔ مگر ابھی تک کوئی اطلاع آئی تھی اور نہ رولی آیا تھا۔

رولی اس کے اعتماد کا آدمی تھا اور اس قسم کے کاموں میں وہ بڑا ماہر تھا۔ بندے کو قتل کر کے ایسا غائب کرتا تھا کہ دنیا ڈھونڈتی رہ جاتی تھی لیکن مقتول کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ رولی نے آرزو کو ضرور قتل کر دیا ہوگا اور قتل کر کے محفوظ مقام پر اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا......لیکن یہ کام کر کے اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ پوری ایک رات گزر گئی تھی، اب دن بھی ڈھل رہا تھا۔

ابھی وہ بے قراری سے ٹہل ہی رہا تھا کہ راجہ مؤدبانہ انداز میں چلتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

"ہاں بابا......رولی کی کوئی خبر لائے ہو؟"

"نہیں مالک......میں اس کے سارے ٹھکانے دیکھ آیا ہوں، لیکن وہ کہیں نہیں ہے؟"

"کہیں نہیں ہے......آخر راجو وہ کہاں مرگیا؟ وہ پجیرو لے کر گیا ہے......پجیرو تو کہیں نظر آنا چاہئے تھی۔"

"مالک......ہمارے علاقے کے آس پاس کہیں کوئی گاڑی نہیں...... میں پورا علاقہ چھان کر آرہا ہوں۔"

"اچھا بابا......تھوڑا اور انتظار کرتے ہیں، پھر کچھ کرتے ہیں......اب تو مجھے خطرے کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔ بابا......تم ذرا جنگل کے لوگوں کو بھی ہوشیار کردو۔ میری بات سمجھ گئے ہونا۔" راجہ وقار نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"جی مالک!" راجہ نے سر جھکا کر کہا۔

"بس بابا راجو......پھر تم جاؤ۔"

راجو کے جانے کے بعد راجہ وقار نے پھر اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا، اس کا شاطر ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اب وہ ایک اور امکان پر بھی غور کر رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رولی، اس چھوکری کو لے کر فرار ہو گیا۔ بابا، نیابدلتے کیا دیر لگتی ہے، چھوکری بہت خوبصورت تھی۔ گاڑی اس کے پاس تھی، اسے اس علاقے سے نکلنے میں کتنی دیر لگتی۔ اب تو وہ جانے کہاں پہنچا ہوگا؟ چھوکری بھی گئی اور گاڑی بھی گئی۔ خیر چھوکری تو ہر صورت میں جاتی تھی، اس کا تو پتہ صاف ہونا ہی تھا اور گاڑی کون سی اس کے باپ کی تھی جو وہ اس کا غم کرے......لیکن مسئلہ چھوکری اور گاڑی کا نہ تھا مسئلہ حکم عدولی کا تھا۔ رولی نے آخر جرأت کیسے کی۔ آخر اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ چھوکری اور گاڑی لے کر غائب ہو گیا۔ کیا وہ جانتا نہیں کہ اس سے کتنے دن اور کہاں چھپ کر رہ سکے گا۔ نہیں رولی ایسی حماقت نہیں کر سکتا ضرور اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ کہیں راستے میں پھنس گیا ہے۔ راجہ وقار نے بالآخر اپنے آپ کو تسلی دی۔

جب دن کی آخری کھڑکی بند ہو رہی تھی اور اندھیرا گہرا ہو رہا تھا تو رولی کے حویلی میں داخل ہونے کی اطلاع ملی۔ راجہ وقار نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً اسے طلب کر لیا۔

"بابا، سب خیر ہے؟" راجہ وقار نے اپنی ساری بے قراری، بے چینی، غصہ دبا کر بڑے اطمینان سے پوچھا۔

رولی نے اپنے دونوں ہاتھ باندھے ایک نظر راجہ وقار کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا، دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اندر ہی اندر جانچنے کی کوشش کی۔ پھر رولی نے فوراً اپنی نظریں نیچی کر لیں، مالک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بھی ادب کے خلاف تھا۔

"ہاں، مالک سب خیر ہے؟" رولی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"بابا رولی......تمہیں کچھ زیادہ دیر نہیں ہو گئی کیا؟" راجہ وقار نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مالک......دیر تو ہو گئی مگر کام پکا کر کے آیا ہوں۔"

"بابا، اسی لئے تو ہم نے اس چھوکری کو تمہارے حوالے کیا تھا کہ تم جو کام کرتے ہو پکا کرتے ہو۔" راجہ وقار نے حسب معمول بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ "بابا، پھر بھی چاروں طرف دیکھ لیا تھا۔"

"ہاں، مالک......آدمی تو آدمی، مجھے کسی پرندے نے بھی نہیں دیکھا۔" رولی نے بڑے یقین سے کہا۔

"اور بابا گاڑی؟"

"مالک گاڑی میں نے اس لڑکی کے ٹھکانے سے بہت دور چھوڑی ہے..... کوئی گاڑی کی موجودگی سے لڑکی کے ٹھکانے کا کبھی اندازہ نہ کر پائے گا۔" رولی نے اطمینان دلایا۔

"بابا، میں جانتا ہوں..... اچھی طرح جانتا ہوں۔ واردات کا یہی صحیح طریقہ ہے۔" راجہ وقار نے معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر کہا۔ "ٹھیک ہے، بابا..... تم اب آرام کرو۔"

"جو حکم مالک۔" رولی نے بڑی فرماں برداری سے کہا اور اسؔ کے کمرے سے نکل آیا۔

رولی کے کمرے سے جانے کے بعد راجہ وقار کے دماغ میں کہیں گھنٹی سی بجی۔ جانے رولی کے انداز میں کیا بات تھی کہ وہ مطمئن نہ ہو پایا۔ پھر اس نے بجیرو کا صحیح ٹھکانہ بتانے کی بجائے گول مول انداز میں جواب دیا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ایک ملازم کو رولی کے پیچھے دوڑا دیا۔

ابھی رولی حویلی سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔ "رولی سائیں..... رولی سائیں۔"

اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو حویلی کا ایک ملازم ہانپتا کانپتا چلا آ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"آپ کو مالک نے بلایا ہے۔"

"اچھا۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی پلٹ پڑا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا راجہ وقار کے سامنے حاضر ہو گیا۔

"جی مالک۔"

"بابا رولی..... میں تم سے یہ پوچھ رہا تھا کہ تم نے گاڑی کس جگہ چھوڑی۔"

"مالک..... گوٹھ قاسم سے دو میل پرے..... ایک ٹیلے کے پیچھے کھڑی کر کے آیا ہوں۔" رولی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"رولی تم وہ گاڑی وہاں سے واپس لے آؤ۔ میں اسے راجو کے حوالے کر دوں گا بابا وہ دور دراز علاقے میں جا کر اسے بیچ آئے۔" راجہ وقار نے اچانک ایک ایسی بات کہہ دی کہ رولی کی سٹی گم ہو گئی۔ پھر بھی اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور پورے اطمینان سے بولا۔ "ٹھیک ہے مالک، میں جا کر لے آتا ہوں۔"

"کسی کو ساتھ لے جاؤ..... راجو کو لے جاؤ۔ اس کے پاس موٹر سائیکل ہے۔"

"نہیں مالک..... میں اکیلا جاؤں گا۔ اس طرح کی واردات میں، میں کبھی کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے رولی۔"

"مالک..... میں اب صبح ہی واپس آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ راجہ وقار کے کمرے سے نکل گیا۔ راجہ

وقار اسے ترچھی نظروں سے دیکھا ہوا گردن ہلانے لگا۔

☆.....☆.....☆

راجہ وقار ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ملازم نے رولی کے آنے کی اطلاع دی، راجہ وقار نے اسے فوراً ہی بلوایا۔ رولی مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا راجہ وقار کے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں، بابا..... گاڑی لے آئے۔" راجہ وقار نے پوچھا۔

"نہیں مالک۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں بابا؟" سوال ہوا۔

"مالک وہاں گاڑی نہیں ملی۔" جواب ملا۔

"بابا..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی جلدی وہاں سے گاڑی کون اُٹھا سکتا ہے۔ کیا تم نے بالکل سڑک پر ہی چھوڑ دی تھی۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں، مالک..... میں نے گاڑی ٹیلے کے پیچھے کھڑی کی تھی۔ وہاں اتفاق سے ہی گاڑی پر نظر پڑ سکتی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ وہاں سے چند گھنٹوں میں گاڑی کون نکال کر لے گیا۔" رولی نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہی۔

راجہ وقار کی عقابی نظریں اس کے چہرے کا ایکسرے لے رہی تھیں۔ وہ یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اس کے دماغ میں جو گھنٹی بجی تھی، وہ بڑی صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ رولی راجہ وقار کی نگاہوں میں مشکوک ہو گیا تھا۔ گاڑی تو غائب ہو چکی تھی..... اب اسے یہ فکر ہو گئی تھی کہ رولی نے چھوکری کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ آیا اس نے اسے ٹھکانے لگایا ہے یا اسے اِدھر اُدھر کر کے آ گیا ہے۔ اگر وہ زندہ بچ کر نکل گئی تو اس کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ ایک طرف اس کا منصوبہ فیل ہو گا تو دوسری طرف انتقام کی آگ جو دشمن کی بیٹی کو ختم کر کے بجھ سکتی تھی، اس کے نہ بجھنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ راجہ وقار کے دماغ نے بہت تیزی سے کام کیا۔ اس نے چند لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ چھوٹے کو چھوٹے کے گھر تک پہنچا کر رہے گا۔

"بابا رولی..... تم ذرا باہر چل کر میرا انتظار کرو..... میں ابھی آتا ہوں۔"

"اچھا مالک۔" رولی پورے اطمینان سے چلتا کمرے سے نکل گیا۔

رولی کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ راجہ وقار کو اس پر شبہ ہو گیا ہے لیکن وہ یہ نہ جان سکا تھا کہ راجہ وقار نے اسے انتظار کرنے کو کیوں کہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی بندے کو اس کے پیچھے لگانے کا

بندوبست کر رہا ہو۔ کنگن پور میں کوئی بندہ ایسا تھا نہیں جو اس کے مقابل آ سکے، دیکھا جائے گا۔ رولی نے اپنا سر جھکا۔

پندرہ منٹ کے بعد راجہ وقار حویلی سے باہر نکل آیا۔

''آؤ، رولی۔'' راجہ وقار نے اسے اپنے قریب بلایا۔

''مالک، کہیں جانا ہے۔'' رولی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

''ہاں، پہلے تو گوٹھ قاسم چلتے ہیں۔ پھر آگے کی دیکھیں گے۔'' راجہ وقار گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے مالک۔'' رولی نے آگے بڑھ کر راجہ وقار کیلئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس کی جانب کا دروازہ آہستگی سے بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

''چلوں مالک۔''

''ہاں، چلو بابا...... انتظار کس کا۔''

رولی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور حویلی کے گیٹ سے تیزی سے نکل گیا۔

رولی نے گوٹھ قاسم کے نزدیک جس جگہ کی نشاندہی کی تھی، وہ سات آٹھ میل سے زیادہ دور نہ تھی۔

کچی سڑک سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک ٹیلہ تھا اور اس ٹیلے کے چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔

رولی نے جیپ ٹیلے کے پیچھے جا روکی اور اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مالک یہاں کھڑی کی تھی، میں نے گاڑی۔''

راجہ وقار نے جیپ سے اُتر کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر رولی کی طرف تیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''بابا، تمہیں یقین ہے کہ تم نے بجیرو یہیں چھوڑی تھی۔''

''ہاں، مالک۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔

''رولی تم جھوٹ بول رہے ہو؟'' اچانک راجہ وقار کا لہجہ خونخوار ہو گیا۔

''مالک، میں بھلا آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا...... میں نے گاڑی یہیں کھڑی کی تھی۔''

''اچھا، تو پھر یہ بتاؤ کہ گاڑی تم نے ہیلی کاپٹر سے اُتار کر یہاں کھڑی کی تھی؟'' یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔

''نہیں مالک...... میں اسے چلا کر یہاں لایا تھا۔''

''تو پھر ریت پر اس کے پہیوں کے نشان کہاں ہیں؟'' راجہ وقار نے غصے سے اسے دیکھا۔ ''جس

جیپ میں ہم بیٹھ کر آئے ہیں آخر اس کے نشان تمہیں نظر آ رہے ہیں کہ نہیں...... اور یہ پہلی گاڑی ہے جو اس ٹیلے کے پیچھے آئی ہے، اب رولی میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ مجھے اب اس چھوکری کے ٹھکانے پر لے چلو، جہاں تم نے اسے دفن کیا ہے۔''

''مالک میں سچ کہہ......'' رولی اپنا جملہ پورا نہ کر سکا کہ راجہ وقار نے اسے ٹوک دیا۔

''سچ کہہ رہے ہو تو چلو...... مجھے اس لڑکی کی لاش دکھاؤ۔ کیا پتہ بابا، چیل کوا لاش کو لے اُڑا ہو، وہاں اب لاش ہی نہ ہو۔'' راجہ وقار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''جیسے ابھی ہوا ہے...... بجیرو۔ تم نے یہاں کھڑی کی اور وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔ لے جانے والا شاید اسے اپنے کندھوں پر رکھ کر لے گیا کہ پہیوں کے نشان بھی باقی نہ رہے۔'' یہ کہہ کر راجہ وقار نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

''مالک میں خود حیران ہوں۔''

''آؤ، اب چلو...... مجھے اس چھوکری کی لاش دکھاؤ۔'' راجہ وقار جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔

بس یہی وقت تھا کچھ کرنے کا...... راجہ وقار کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ رولی بہت تیزی سے جھکا اور اس نے اپنی پینٹ کا پائنچہ اُٹھا کر پنڈلی سے بندھا ہوا ریوالور کھینچ لیا۔

اور ریوالور سیدھا کر کے اس کی پیٹھ کا نشانہ لیا۔ اس نے بس دو گولیاں چلائیں۔ راجہ وقار کو مڑ کر دیکھنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ تیورا کر زمین پر گرا، رولی نے ٹھوکر مار کر اس کو سیدھا کیا اور تیسری گولی اس کے سر میں پیوست کر دی۔ وہ چند لمحوں میں ہی اپنا جسم چھوڑ گیا۔

رولی نے بڑے اطمینان سے ریوالور پینٹ کی جیب میں رکھا۔ راجہ وقار کی لاش اُٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹوں کی طرف پھینکی اور گاڑی کو برق رفتاری سے چلاتا حویلی کی طرف بڑھا۔

اس نے گاڑی حویلی سے ذرا دور ایک کھیت کے نزدیک کھڑی کی۔ راجہ وقار کو ایک نظر دیکھا اور پھر جیپ سے اُتر کر کھیتوں میں بھاگتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

یہ کوئی معمولی خبر نہ تھی۔

راجہ وقار کا قتل کوئی عام سا واقعہ نہ تھا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ لوگ ایک دوسرے کو راجہ وقار کے قتل کی خبر سنا رہے تھے اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے راجہ وقار نہ مرا ہو، کوئی عفریت مر گیا ہو۔

حویلی کا بھی یہی حال تھا۔اس کے غم میں ایک آنکھ بھی اشکبار نہ تھی۔اس کی تین بیویاں تھیں لیکن تینوں میں سے ایک کو بھی اس کے مرنے کا دلی صدمہ نہ تھا۔البتہ رامش خیال کی تائی کی آنکھوں میں ضرور ایک دو آنسو آ گئے تھے۔پتہ نہیں وہ آنسو تھے یا اس کے محض دکھاوے کیلئے دوپٹے سے آنسو پونچھنے کی کوشش کی تھی۔ویسے اندر سے وہ بھی دکھی نہ تھی۔راجہ وقار نے اسے کون سا سکھ دیا تھا کہ وہ اس کی موت پر دکھی ہوتی۔

یہ خبر جب رامش اور ماموں رشید تک پہنچی تو دونوں پر چند لمحے تک سکتہ سا طاری ہو گیا۔انہیں یقین ہی نہ آیا کہ راجہ وقار قتل ہو گیا ہے۔یہ بات ان کے تصور میں بھی نہ تھی کہ راجہ وقار جیسا ظالم شخص اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مر بھی سکتا ہے۔یہ لوگ تو اللہ کی زمین پر اس طرح اکڑ کر چلتے ہیں گویا زمین کا سینہ پھاڑ دیں گے۔انہیں یہ امید کب ہوتی ہے کہ یہی زمین کسی بھی لمحے آسانی سے نگل بھی سکتی ہے۔اگر یہ ایسا سوچ لیں اور اس پر یقین کر لیں تو پھر وہ ظلم ہی کیوں کریں۔

''ماموں......چلیں......بس اب یہاں سے فوراً نکل چلیں۔'' راجہ وقار کے قتل کی خبر سننے کے بعد رامش خیال کا یہ پہلا ردعمل تھا۔

ماموں رشید نے رامش خیال کی طرف پرفکر نظر سے دیکھا اور آہستگی سے بولے۔''بیٹے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم راجہ وقار کی تدفین تک یہاں رک جائیں۔''

''نہیں ماموں، ایسا نہیں ہو سکتا۔میں یہاں اب ایک لمحے کیلئے بھی نہیں رکنا چاہتا۔'' رامش خیال نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔''مجھے آرزو کی فکر ہے۔''

''اچھا، پھر یوں کرو کہ اپنی تائی کے پاس دو منٹ بیٹھ کر آؤ۔''

''ہاں ماموں......اتنا میں کر سکتا ہوں۔'' رامش خیال نے ماموں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

کمال رائے آنکھیں بند کئے بیڈ پر لیٹا، غزلوں کا کیسٹ سن رہا تھا کہ اس کے دائیں جانب رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

کمال رائے کو اس وقت کسی کا فون آنا اچھا نہ لگا۔اس نے موبائل فون اٹھا کر اسکرین پر ابھرنے والا نمبر چیک کیا۔فون نمبر پڑھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا کہ فون پر بات کرے یا نہ کرے۔

وہ ایک اجنبی فون نمبر تھا۔

اس اجنبی نمبر کو دیکھ کر اچانک تجسس ابھرا، اس کی چھٹی حس جاگی اور اس نے موبائل فون آن

کر کے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔''ہیلو۔''

''مالک، یہ آپ ہیں؟'' اِدھر سے ایک موٹی اور کرخت سی آواز سنائی دی۔اس نے کمال رائے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''میں کمال رائے بول رہا ہوں۔'' کمال رائے نے تصدیق کی۔''تم کون؟''

''مالک، میں رولی بات کر رہا ہوں۔'' اِدھر سے آواز سنائی دی۔

''ارے رولی تم......؟ خیریت تو ہے؟'' کمال رائے چونکا۔

''مالک آپ کیلئے ایک خبر ہے؟'' اِدھر سے سنجیدہ لہجے میں کہا گیا۔

''رامش خیال کے بارے میں؟ وہ خیریت سے تو ہے نا۔'' کمال رائے پریشان ہو گیا۔

''ہاں، مالک......وہ دونوں خیریت سے ہیں۔ان تک بھی یہ خبر پہنچ چکی ہو گی۔''

''آخر ہوا کیا؟''

''مالک میں نے آپ کی زندگی کا کانٹا نکال دیا ہے۔'' انکشاف ہوا۔

''رولی، میں سمجھا نہیں۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''مالک، میں نے راجہ وقار کے ظلم کی داستان ختم کر دی ہے۔''

''ارے......یہ کیسے ہوا؟ تم نے تو کہا تھا کہ میں اب کنگن پور نہیں جاؤں گا۔''

''ہاں، مالک کہا تھا......لیکن جب میں نے یہ بات کہی تھی، تبھی عہد کر لیا تھا کہ ایک مرتبہ اور کنگن پور جاؤں گا۔مالک آپ راجہ وقار کو نہیں جانتے، وہ بہت خبیث چیز تھا۔مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ بی بی کو بحفاظت پہنچانے کا راز زیادہ دیر چھپا نہ رہ سکے گا اور جیسے ہی اسے بی بی کے ہاتھ سے نکلنے کی خبر ملے گی، وہ بے قابو ہو جائے گا۔ایک طرف وہ میری جان کا دشمن ہوا تو دوسری آپ کی زندگی کا......بس یہ سوچ کر مالک میں کنگن پور پلٹ گیا۔'' رولی نے حقیقت حال بیان کی۔

''لیکن تم نے تو میرے سامنے آئندہ شریفانہ زندگی گزارنے اور کوئی جرم نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔''

''ہاں، مالک کیا تھا۔جب میں نے آپ کے سامنے آئندہ جرم نہ کرنے کا عہد کیا تھا تو اس وقت یہ عہد بھی دل میں کیا تھا کہ ایک آخری جرم کرنے کے بعد اس عہد پر عمل کروں گا......تو مالک میں نے آخری جرم کر دیا۔اب آئندہ چاہے کچھ ہو جائے، میں جرم نہیں کروں گا۔مالک میں بھیک مانگ لوں گا لیکن آئندہ کسی بھی ظلم نہیں کروں گا۔مالک اس بات کیلئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا۔مالک آپ کی شخصیت میں جادو ہے۔کوئی سحر ہے۔آپ کو دیکھتے ہی سچی زندگی کی مہک آنے لگتی ہے۔سیدھے راستے پر چلنے کو جی چاہتا ہے۔'' رولی نے بڑی عجیب بات کہی۔

''رولی......تم نے یہ جرم کیا ہے......ایسا خطرناک جرم۔'' کمال رائے نے پریشان ہو کر کہا۔

''مالک......وہ فرعون تھا۔ اپنے آگے کسی کو جانتا ہی نہ تھا......اور مالک آپ کو ایک حیرت انگیز بات بتاؤں اس کے قتل کی خبر پورے علاقے میں مسکراتے ہونٹوں کے ذریعے سنائی گئی ہے۔'' یہ بڑا عجیب انکشاف تھا۔

''اچھا......یہ بڑی عجیب بات ہے۔''

''مالک وہ بہت خطرناک بندہ تھا۔ اسے مجھ پر شک ہو گیا تھا۔ اگر میں اس کا کام تمام نہ کرتا تو وہ مجھے اوپر بھجوا دیتا۔ صحیح وقت پر صحیح کام ہو گیا ہے۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں۔ اب اس دھرتی پر آپ کا کوئی دشمن ہیں رہا۔'' رولی نے پراطمینان انداز میں کہا۔

''رولی......اب تم کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟'' کمال رائے نے فکرمندی سے پوچھا۔

''یہ دنیا بہت بڑی ہے مالک...... کہیں چلا جاؤں گا۔ آپ سے اب یہ آخری بات چیت ہے۔ اسے آخری ملاقات سمجھ لیں۔ اچھا مالک......اللہ حافظ......اللہ آپ کو خوش رکھے۔''

''دیکھو رولی اپنا خیال رکھنا۔''

''مالک، اپنی دعاؤں میں مجھے شامل رکھنا......میں ایک بھٹکا ہوا بندہ ہوں۔''

''اور سنو رولی اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑے تو بلا کھٹکے میرے پاس آ جانا۔''

''مالک...... بہت بہت شکریہ۔ آپ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔ اللہ حافظ مالک۔'' یہ کہتے ہوئے رولی کی آواز بھرا گئی تھی، اس نے کمال رائے کا جواب سنے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا۔

کمال رائے موبائل فون ہاتھ میں پکڑے سوچوں میں گم ہو گیا۔ یہ انسان بھی اوپر والے نے کیا چیز بنائی ہے۔ اسے نہ بگڑتے دیر لگتی ہے اور نہ بنتے۔ کبھی شریف بدمعاش بن جاتا ہے اور کبھی بدمعاش اچانک شریف بن جاتا ہے۔ کمال رائے کے تصور میں بھی یہ بات نہ تھی کہ رولی، راجہ وقار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔ ویسے وہ راجہ وقار کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ راجہ وقار کو جیسے ہی آرزو کے زندہ سلامت کراچی پہنچ جانے کا علم ہو گا وہ کسی طوفان کی طرح بپھر جائے گا۔ ابھی تو اسے رامش خیال کی فکر تھی جو راجہ وقار کے قبضے میں تھا۔ پتہ نہیں اس نے ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ بات اب چھپی نہ رہی ہو گی کہ آرزو کا نکاح رامش خیال کے ساتھ ہو چکا ہے۔ رامش نے یہ بات ضرور راجہ وقار کو بتا دی ہو گی۔ شاید اسی غصے میں اس نے آرزو کی موت کا پروانہ جاری کر دیا۔ یہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا۔ ایک طرف رامش خیال کی منکوحہ سے جان چھوٹ رہی تھی تو دوسری طرف کمال رائے سے بھی اپنے بھائی اور بھابھی کا بدلہ چکتا ہو رہا تھا۔ وہ

اپنی منصوبہ بندی میں لگا ہوا تھا اور تقدیر اپنا کھیل، کھیل رہی تھی۔ دوسروں کی جان کے درپے ہونے والا خود اپنی جان گنوا بیٹھا اور وہ بھی اپنے ملازم کے ہاتھوں......کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ چیونٹی ہاتھی کی جان لے لیتی ہے۔

اصل طاقت تو اللہ کی ہے، وہ جس کو چاہے طاقت عطا کر دے۔ بکری کو شیر بنا دے یا شیر کو بکری، لیکن یہ مٹی گارے کی پیداوار خود کو اس قدر طاقتور تصور کر لیتی ہے کہ اللہ کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے، خود ہی خدا بن جاتا ہے۔

کس قدر نادان ہے یہ انسان......اور کس قدر خسارے کا سودا کرتا ہے یہ انسان۔

☆......☆......☆

حویلی میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ تینوں بیویوں کے بھائی حویلی میں آ دھمکے تھے اور جائیداد کی تقسیم پر جھگڑا شروع ہو چکا تھا۔ راجہ وقار کی لاش حویلی میں رکھی تھی۔ جو لوگ اس کی زندگی میں زور سے سانس لینے کی جرأت نہ کرتے تھے، اب اس کی لاش کے سرہانے کھڑے چیخ رہے تھے۔ رامش خیال اور ماموں رشید کو اس سارے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ فوری طور پر اس جنجال سے نکلنا چاہتے تھے۔ اب انہیں کوئی روکنے والا بھی نہ تھا۔ وہ راجہ وقار کی تدفین سے پہلے ہی حویلی سے نکل آئے اور اب وہ ایک ایئر کنڈیشن کوچ میں بیٹھے کراچی کی طرف عازمِ سفر تھے۔

اس اثناء میں جتنی دیر وہ حویلی میں رہے انہوں نے مختلف لوگوں سے آرزو کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن حویلی کا کوئی ملازم اس سلسلے میں کچھ نہ بتا سکا۔ البتہ ایک دو بندوں نے دبے لفظوں میں رولی کا نام ضرور لیا کہ اس سلسلے میں وہی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ رولی کون تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے پھر لوگوں نے حلیہ بتایا تو رامش خیال کو وہ عجیب سے حلیے کا شخص یاد آ گیا۔ وہ اس شام کسی لڑکی کے بارے میں راجہ وقار سے ہدایت لینے آیا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ لڑکی یقیناً آرزو ہی ہو گی۔

تب ان دونوں نے رولی کے گھر تک رسائی حاصل کی لیکن وہ گھر پر نہیں تھا۔

وہ گھر پر کیا، وہ تو اس علاقے میں کہیں دور تک نہیں تھا۔

تب وہ مایوس ہو کر کراچی کی جانب چل پڑے۔

دونوں افسردہ بیٹھے تھے اپنی سوچوں میں گم۔ ان دونوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ آرزو کی گمشدگی دونوں کیلئے باعث تشویش تھی۔ اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح کمال رائے کے سامنے جائیں اور یہ روح فرسا خبر سنائیں۔ آخر وہ کیا سوچے گا کہ اس نے اپنی بیٹی ان کے حوالے کی اور وہ اسے بحفاظت روشن گوٹھ نہ پہنچا سکے، نہ صرف روشن گوٹھ نہیں پہنچا سکے بلکہ اسے گنوا بھی بیٹھے۔ وہ

کمال رائے کی اکلوتی بیٹی ہے اس شخص میں اس کی جان ہے۔ وہ اغوا کی خبر سنے گا تو اس پر کیسی بجلی گرے گی۔

''ماموں اب کیا ہوگا؟'' رامش خیال اچانک گھبرا کر بولا۔

''رامش، میری خود سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''ماموں، بہر حال رائے صاحب کو حقیقت تو بتانا ہوگی۔''

''ظاہر ہے۔'' ماموں رشید نے افسردگی سے کہا۔ ''ہم پہلے رائے صاحب کے ہاں چلیں گے، پھر اپنے گھر جائیں گے۔''

☆......☆......☆

کمال رائے جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ دونوں سر جھکائے اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔ کمال رائے کے سلام کرنے پر دونوں چونکے۔ گردن اُٹھا کر کمال رائے کو دیکھا اور پھر دونوں کھڑے ہوگئے۔

''بیٹھو۔'' کمال رائے نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو کمال رائے خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے ان دونوں کا چہرہ بڑے غور سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں نیچی تھیں جیسے نظریں چرا رہے ہوں۔ چہروں پر تھکن کے آثار تھے اور ایک کرب کی سی کیفیت تھی۔ اس نے اندازہ کرلیا کہ ان دونوں کو آرزو کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔

تب وہ ماموں رشید کی طرف دیکھتا ہوا ذرا گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''بھئی رشید صاحب کیا ہوا؟ آپ نے واپسی میں کچھ زیادہ دیر نہیں کردی۔ میں تو بھئی فون کر کر کے عاجز آ گیا۔ آرزو کا موبائل فون بھی بند تھا۔ ادھر روشن گوٹھ سے یہی اطلاع مل رہی تھی کہ آپ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے۔ آپ لوگ آخر درمیان میں کہاں اٹک گئے تھے۔ اب آپ دونوں کے چہرے دیکھ کر جان میں جان آئی ہے۔ آرزو کو آپ نے کب روشن گوٹھ پہنچایا۔ کل رات تک تو وہ حویلی نہیں پہنچی تھی۔ رات کو میری ماں سے بات ہوئی تھی۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہو، دونوں ذمہ دار بندے ہیں۔ راستے میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہوگا۔ دیر سویر ہو جاتی ہے۔ پہنچ جائیں گے۔''

ماموں رشید اور رامش خیال میں جو رہی سہی جان تھی، وہ کمال رائے کی بات سن کر نکل گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گھبرا کر دیکھا۔ اب کیا کہیں اور کس طرح کہیں؟

کمال رائے نے ان دونوں کی گھبراہٹ صاف محسوس کرلی، وہ محظوظ ہوا۔

''ارے صاحب...... ہم شرمندہ ہیں۔'' آخر ماموں رشید نے بولنے کی ہمت کی۔

''اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے بھئی...... سفر میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔''

''ہمارے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' اس مرتبہ رامش خیال نے حوصلہ دکھایا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں رامش۔''

''ہم آرزو کو روشن گوٹھ نہ پہنچا سکے، ہمیں اغوا کرلیا گیا۔''

''کس نے اغوا کرلیا، آرزو کہاں ہے؟ وہ خیریت سے تو ہے۔'' کمال رائے نے بڑے کمال کی اداکاری کرتے ہوئے بے حد پریشان ہو کر پوچھا۔

''آرزو کے بارے میں، کوشش کے باوجود کچھ پتہ نہ چل سکا۔'' ماموں رشید شرمندہ شرمندہ سے بولے۔

''ارے...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' کمال رائے ایک دم گھبرا کر بولا۔ ''کس نے اغواء کیا؟ کیوں کیا؟ پھر آپ لوگ کس طرح رہا ہوگئے۔ مجھے جلدی سے بتائیں۔''

رامش نے تشویش بھری نظروں سے ماموں رشید کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ماموں۔ آپ ساری بات کھل کر انکل کو بتادیں۔''

''اچھا بیٹا۔'' ماموں رشید نے رامش سے کہا اور پھر اغوا سے لے کر کراچی واپس پہنچنے تک کی روداد حرف بہ حرف انہوں نے گوش گزار کردی۔

اس روداد میں نکاح والی بات کمال رائے کیلئے نئی تھی۔ اسے یہ بات معلوم نہیں ہوسکی تھی کہ راجہ وقار نے زبردستی اپنی بیٹی کا نکاح رامش سے کرنے کی کوشش کی تھی اور رامش نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکاح نامہ کا فارم پرزے پرزے کر کے ہوا میں اُڑا دیا تھا۔

کمال رائے نے یہ بات سن کر بڑی ستائشی نظروں سے رامش خیال کو دیکھا، اب اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کیلئے صحیح لڑکے کا انتخاب کیا ہے۔

''بھئی رامش تم نے تو کمال کردیا بڑی زبردست بہادری کا مظاہرہ کیا۔''

''بس انکل میں نے سوچ لیا تھا کہ اب چاہے جو ہو...... یہ نکاح نہیں کرنا۔''

''مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اس گستاخی کے باوجود اس نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا۔ وہ تو اپنے وقت کا فرعون تھا۔ اس نے انکار سننا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔''

''مجھے خود حیرت ہے کہ اس انکار پر انہوں نے مجھے زندہ کیسے چھوڑ دیا...... نہ صرف زندہ چھوڑ دیا بلکہ کوئی سزا بھی نہ دی۔ اس واقعہ کے بعد تو ان کا رویہ ہی تبدیل ہوگیا تھا۔ بڑے مہربان ہوگئے

تھے۔" رامش مسکرایا۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ مہربان کیوں ہوا؟ وہ شکاری آدمی تھا۔ اس نے شکار پر براہِ راست گولی چلانے کے بجائے اس کیلئے جال لگا دیا۔ اس کے جال سے نکلنا آسان نہ تھا۔" کمال رائے نے رائے دی۔

"شاید ایسا ہی ہو۔" ماموں رشید نے پرخیال انداز میں کہا۔

"انکل......اب آرزو کے لئے کیا کریں......؟ پولیس میں رپورٹ وغیرہ تو درج کرائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔" کمال رائے بولا۔

"پھر آپ اپنے وسائل استعمال کریں گے؟" رامش خیال نے پوچھا۔

"کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" کمال رائے نے مسکرا کر رامش خیال کو دیکھا۔

رامش خیال کو کمال رائے کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ اغوا کا سارا قصہ سننے کے بعد بھی اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں دکھائی دی تھی۔ اب رامش اس کی بازیابی کے رستے تلاش کر رہا تھا تو کمال رائے طرح دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ رامش خیال کوئی سوال کرتا، کمال رائے ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس سے کہا۔ "میں ابھی آیا۔"

اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو رامش خیال کے ہر سوال کا جواب سامنے موجود تھا اور وہ دونوں اس جواب کو جو لا جواب تھا، بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے مسکراتی ہوئی آرزو کھڑی تھی۔

آرزو نے دونوں کو بڑے ادب سے سلام کیا اور ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

اور اب کمال رائے کے بولنے کی باری تھی۔ اس نے آرزو کے بحفاظت گھر تک پہنچنے کی داستان بڑی تفصیل سے سنائی۔ رولی کی اس نیکی کے بارے میں دونوں سن کر حیرت زدہ ہوئے۔ کیا کسی مجرم سے ایسی خیر کی توقع کی جاسکتی ہے، یہ سب اوپر والے کا کمال ہے کہ جس سے، جب چاہے، جس طرح کا کام لے لے۔

"بھئی، میں تو آرزو کے ساتھ رولی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ یہ میرا وہ ملازم تھا جسے میں نے حویلی سے نکال باہر کیا تھا۔ البتہ میں نے اتنا ضرور کیا تھا کہ نکالتے ہوئے اسے کچھ پیسے دے دیئے تھے اور اسی کو کیا، یہ پیسے تو میں نے ہر اس ملازم کو دیئے تھے جنہیں میں نے بابا کی موت کے بعد نکال باہر کیا تھا۔ پھر بھی اس نے اتنا خیال کیا۔ سچی بات ہے کہ میں رولی کا یہ احساس زندگی بھر نہیں بھول

سکوں گا۔"

"بابا، رولی صاحب کا آخری احسان بھی تو بتا دیں۔" آرزو نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں، یہ کام بھی اس نے کمال کا کیا؟" کمال رائے نے آرزو کی بات سن کر کہا۔

"وہ کیا؟" ماموں رشید نے پوچھا۔

"راجہ وقار کو اسی نے قتل کیا؟" کمال رائے نے انکشاف کیا پھر بولا۔ "یہ راز کی بات ہے، راز ہی میں رہنا چاہئے۔"

"یہ تو اس نے واقعی کمال کیا۔ بھئی وہ شیطان تو ہم سب کیلئے اچانک فرشتہ رحمت ثابت ہوا۔" ماموں رشید نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"انکل، وہ شخص میرا تایا تھا لیکن ایسا مردود آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ میں اس کی تدفین میں بھی شامل نہیں ہوا، جی ہی نہیں چاہا...... پھر انکل آپ کو ایک عجیب بات بتاؤں۔ اس کی موت کا وہاں کسی کو ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوا۔ میت گھر پر پڑی تھی اور لوگ جائیداد کے بٹوارے پر چیخ و پکار کر رہے تھے۔" رامش خیال نے بڑے دکھ سے کہا۔

"ایسی عبرتناک موت سے اللہ سب کو بچائے۔" کمال رائے نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

☆......☆......☆

چار پانچ دن سے سکون تھا۔

آرزو جب سے واپس آئی تھی، گھر میں کسی قسم کا ہنگامہ آرائی نہیں ہوئی تھی۔ احتیاطی تدبیر کے طور پر کمال رائے نے ستارہ کو مستقل آرزو کے کمرے میں سونے کی ہدایت کر دی تھی۔ وہ قالین پر گدا ڈال کر سو جاتی تھی، شروع میں ایک دو رات وہ نیچے سونے سے خوفزدہ ہوئی تو آرزو نے بیڈ روم میں پڑے صوفے پر سونے کی ہدایت کی۔ اب صوفے پر وہ آرام سے سونے لگی۔ اس طرح چار، پانچ دن سکون سے گزر گئے۔

کوئی اس کی راہ میں آئے، کوئی اس کی تنہائی میں مخل ہو، یہ بات اس کو ہرگز پسند نہ تھی۔

پہلے وہ خواب میں آیا۔

آرزو نے دیکھا کہ وہ ایک کنویں پر پانی بھر رہی ہے۔ ساری رسی کھینچنے کے بعد جب ڈول اوپر آتا ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ ڈول میں ایک قطرہ پانی نہیں ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس نے تو ڈول کو کنویں میں ڈال کر پانی بھرا تھا اور اسے اوپر کھینچتے ہوئے وہ بھاری بھی محسوس ہوا تھا لیکن جب ڈول پکڑ کر اس نے کنویں کی منڈیر پر رکھا تو وہ بالکل خالی تھا۔ وہ ڈول کو دوبارہ کنویں میں پھینکتی ہے، جب

ڈول پانی سے بھر جاتا ہے اور بھاری محسوس ہونے لگتا ہے تو وہ رسی کو کھینچنے لگتی ہے۔ ایک مرتبہ ڈول پھر کنویں سے باہر آتا ہے تو وہ دیکھتی ہے ڈول پھر پانی سے خالی ہے۔

تیسری مرتبہ پھر وہ اس عمل کو دہراتی ہے۔

جب ڈول کنویں سے باہر آتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ اس ڈول میں رنسارو پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سر پر رکھا ہیرا جگمگا رہا ہوتا ہے اور دو حصوں میں بٹی زبان بار بار اس کے منہ سے نکل رہی ہوتی ہے۔ وہ ایک دم پھن پھیلا کر دور سے پھنکارتا ہے۔

آرزو ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

''اسے اپنے کمرے سے نکالو۔'' اچانک اس کے دماغ میں ایک آواز گونجتی ہے۔

اور اسی وقت آرزو کی آنکھ کھل جاتی ہے، وہ خوفزدہ ہو کر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر ستارہ کی طرف دیکھتی ہے۔ ستارہ آرام سے محو خواب تھی، وہ ایک اطمینان بھرا سانس لیتی ہے اور پھر دوبارہ بیڈ پر لیٹ جاتی ہے

وہ سونے کی کوشش کرتی ہے لیکن نینداس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک جملے کی تکرار بار بار اس کی سماعت میں گونجنے لگتی ہے۔

''اسے اپنے کمرے سے نکالو۔''

اس حکم کے پیچھے غصہ تھا، تنبیہہ تھی ساتھ ہی التجا بھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اب نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اس کے کمرے میں آئے۔ وہ ستارہ کو اپنے ساتھ سلا کر بڑی مطمئن تھی...... لیکن وہ تو مطمئن نہ تھا، آرزو نے ستارہ کو اپنے کمرے میں سلا کر اسے اپنے پاس آنے سے روک دیا تھا لیکن وہ کوئی پابندی قبول کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اسے کمرے میں آنے سے کون روک سکتا تھا۔

وہ سوچتی رہی اب کیا کرے؟ پھر وہ سوچتے سوچتے سوگئی۔

اس تنبیہہ کے باوجود ستارہ کو کمرے سے نہیں ہٹایا گیا تو اس نے خود ہی اسے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ علی الصباح جیسے ہی آرزو کے کمرے سے نکل کر اپنے کوارٹر میں پہنچی کہ منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ بنگلے میں آئے تو وہ اس کے باتھ روم میں موجود تھا۔ جب وہ واش بیسن پر کھڑی اپنے منہ پر آنکھیں بند کئے صابن لگا رہی تھی تب اس نے اس کے پیر پر پھن مارا اور لہراتا ہوا باتھ روم سے نکل گیا۔

اس کے کاٹتے ہی ستارہ نے اپنا پاؤں زور سے جھٹکا اور صابن لگی آنکھوں کو کھول کے نیچے دیکھا۔

اس نے باتھ روم کے دروازے سے ایک سنہری سانپ نکلتے دیکھا۔

سانپ کو دیکھتے ہی ستارہ نے ایک زوردار چیخ ماری۔ ''اماں۔''

وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی اور سروری اس کی چیخ سن کر جاگ گئی تھی۔ ستارہ اس کے اوپر زور سے گری۔ ''ہائے، اماں۔''

سروری ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی...... اور اسے سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا؟''

''اما، مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔'' وہ آنکھیں بند کئے بولی۔

''ہائے میں مر جاؤں۔'' سروری فوراً اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے جلدی سے ستارہ کو لٹایا، تولیے سے اس کا منہ صاف کیا اور بولی۔ ''دکھا، کدھر کاٹا ہے۔''

''یہاں پاؤں میں۔''

سروری نے اس کا پیر دیکھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا دھبہ موجود تھا۔ سروری نے پہلا کام تو یہ کیا کہ پاؤں کو ٹخنے سے اوپر ڈوری سے کس دیا تا کہ زہر اوپر نہ جائے۔ اس کے بعد وہ دوڑتی ہوئی اپنے کوارٹر سے نکلی۔ دلدار لان میں موجود تھا اور پودوں کے درمیان سے کوڑا نکال رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''دلدار، کوارٹر میں جا، ستارہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ میں بی بی کو جا کر بتاتی ہوں۔''

دلدار نے فوراً اپنا کام چھوڑ دیا اور اپنے کوارٹر کی طرف دوڑا۔

سروری بھاگتی ہوئی آرزو کے کمرے میں پہنچی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور آرزو بے خبر سو رہی تھی۔ سروری نے آہستگی سے آرزو کے بازو پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''بی بی۔''

آرزو کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک نظر اوپر دیکھا تو ستارہ کی جگہ سروری کا پریشان چہرہ نظر آیا۔

''ارے...... سروری تم...... خیریت؟''

آرزو ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بی بی...... خیریت نہیں ہے۔ ستارہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔''

''اوہ۔'' آرزو کے دل کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ اس کی نظر فوراً صوفے کی طرف گئی۔ صوفہ خالی تھا۔

اس نے سروری سے پوچھا۔ ''کہاں ہے ستارہ؟''

''وہ گھر میں ہے جی...... وہ منہ دھو رہی تھی تو اس کے پاؤں میں سانپ نے کاٹ لیا۔'' سروری نے جلدی جلدی بتایا۔

''اچھا...... سروری تم، ایسا کرو...... اسے باہر لے کر آؤ...... میں بابا کو جگاتی ہوں، اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔'' آرزو اچھل کر کھڑی ہوئی اور سروری کے باہر نکلنے سے پہلے خود نکل گئی۔

آرزو نے اپنے برابر والا کمرہ دیکھا۔ وہ اس بیڈروم میں نہ تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اوپر والے بیڈروم میں گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ آرزو نے آہستہ مگر جلدی جلدی دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر میں کمال رائے نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا اور آنکھوں میں نیند تھی۔

آرزو کو دروازے پر دیکھ کر اس کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اسے پریشان دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ گھبرا کر بولا۔ ''کیا ہوا بیٹا؟''

''وہ بابا...... ستارہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔''

''ارے۔'' کمال رائے چونک کر بولا۔ ''بیٹا...... تم نیچے چلو لعل محمد سے کہو، گاڑی نکالے میں ابھی آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بابا۔'' آرزو دروازے سے ہی پلٹ آئی۔

بنگلے میں ہنگامی صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ ہر شخص کو معلوم ہوگیا تھا کہ ستارہ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ سب اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے، دونوں سیکورٹی گارڈ سانپ تلاش کرتے پھر رہے تھے مگر اب سانپ وہاں کہاں تھا۔ وہ اپنا کام دکھا کر جا چکا تھا۔

کمال رائے بہت تیزی سے تیار ہو کر نیچے آیا۔ اتنی دیر میں ستارہ کو گاڑی میں ڈالا جا چکا تھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ آرزو اسے ایک گلاس لیموں کا پانی پلا چکی تھی لیکن اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بگڑتی چلی جا رہی تھی۔

''چلو۔'' کمال رائے نے گاڑی میں بیٹھتے ہی حکم دیا۔

ڈرائیور لعل محمد نے گاڑی راکٹ کی طرح بنگلے سے نکالی۔ پھر وہ ذیلی سڑکوں سے تیزی سے گزرتا بڑی شاہراہ پر آ گیا۔

گاڑی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ اچانک پیچھے سے دلدار کی آواز آئی۔ ''لعل محمد ذرا گاڑی روکو۔''

لعل محمد نے فوراً بریک پر پاؤں رکھا اور گاڑی کو جھٹکا لگنے سے بچاتے ہوئے گاڑی سڑک کے کنارے روک لی۔ ''کیا ہوا؟'' کمال رائے نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

''مالک، مجھے ایک سپیرا نظر آیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس سانپ کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک نظر اسے ستارہ کو دکھا دوں۔''

''سپیرا کہاں ہے؟ پیچھے آ رہا ہے۔'' دلدار نے گاڑی کی پچھلی اسکرین سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... لعل محمد، گاڑی بیک کرلو۔ اسے دکھا لیتے ہیں۔ دکھانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔''

کمال رائے نے دلدار کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

پھر لعل محمد گاڑی بیک کر کے سپیرے کے قریب لے آیا۔

وہ سپیرا اپنی دھن میں چلا آ رہا تھا۔ وہ گیروے رنگ کی شلوار قمیص پہنے تھا، اس کے بال بہت لمبے اور چمکیلے تھے۔ باریک مونچھیں، کلین شیو، سانولا رنگ، درمیانہ قد، ہاتھ میں بین اور کندھے پر پڑی جھولی۔

دلدار نے گاڑی سے اُتر کر فوراً اس کا راستہ روک لیا۔ اس سپیرے نے پہلے گاڑی کو اور پھر دلدار کو دیکھا لیکن وہ معاملہ نہ سمجھ سکا۔ کسی گاڑی والے کو اس سے بھلا کیا کام ہو سکتا تھا۔ تب دلدار پھر اس کے سامنے آ گیا اور بولا۔ ''او، بھائی، کیا تم سانپ کے کاٹے کا علاج جانتے ہو؟''

''ہاں، جانتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

''پھر جلدی سے آؤ، گاڑی میں۔''

''کس کو کاٹا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ایک لڑکی کو۔'' دلدار نے بتایا۔ ''میری بیٹی ہے۔''

ستارہ سروری کی گود میں لیٹی تھی۔ اس کے پاؤں دروازے کی طرف تھے۔ سپیرے نے گاڑی کے دروازے میں کھڑے ہو کر ستارہ کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ اسے انگوٹھے سے دو انچ اوپر، ایک سیاہ اور گول نشان نظر آیا۔ اس نشان کو دیکھ کر سپیرا حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے اپنی زبان سے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا لیکن اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ایک خوشی سی بھی پھیل گئی تھی۔

''بابا، اس لڑکی کو کہاں لے جاتے ہو؟'' وہ بولا۔

''اسپتال لے جا رہے تھے۔'' کمال رائے نے کہا جو گاڑی سے اُتر آیا تھا۔

سپیرے نے ایک نظر کمال رائے پر ڈالی، اس نے اندازہ کر لیا کہ وہ گاڑی کا مالک ہے اور کوئی بڑا آدمی ہے، وہ کمال رائے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں سے گھر کتنی دور ہے۔''

''قریب ہی ہے...... دو تین منٹ کا راستہ ہوگا۔'' کمال رائے نے بتایا۔

''سائیں...... گھبرانے کی ضرورت نہیں، لڑکی کو گھر لے چلو۔ یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے سانپ نے کاٹا نہیں ہے۔'' وہ سپیرا گاڑی میں بیٹھتا ہوا بولا۔ گاڑی واپس چل پڑی۔

''او، بھائی...... یہ کیا کہہ رہے ہو۔'' دلدار فوراً بولا۔ ''لڑکی نے خود سانپ کو کاٹ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے وہ ایک سنہری سانپ تھا۔''

''سنہری سانپ۔'' سپیرا یہ سن کر چونکا۔

"ہاں، وہ ہمارے گھر میں بہت بار نظر آیا ہے......لیکن ابھی تک اس نے کسی کو کاٹا نہ تھا۔" دلدار نے بتایا۔

"بابا کاٹا تو اس نے اب بھی نہیں ہے۔ اس نے صرف منہ مارا ہے۔ وہ سانپ اتنا زہریلا ہے کہ اگر اسے کاٹ لیتا تو لڑکی دو منٹ بھی زندہ نہ رہتی۔ اس کی پھنکار سے دیکھو، لڑکی کا کیا حال کر دیا ہے۔ خیر گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور میں اس سانپ کو بھی پکڑ کر لے جاؤں گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"راولا ہے جی، میرا نام......یہ میرا آبائی پیشہ ہے۔ میرا باپ شاہ بابا، سپیروں کا سردار ہے۔ ہمارا پورا خاندان سپیروں کا ہے جی......میری ایک بہن بھی سپیرن ہے، اس نے بڑے بڑے خطرناک سانپ پکڑے ہیں۔" نام پوچھنے کے نتیجے میں راولا نے اپنے پورے خاندان کا تعارف کرا دیا۔ بعض لوگوں کو بولنے کا کتنا شوق ہوتا ہے، بس ذرا سی چابی دینے کی دیر ہوتی ہے۔ کمال رائے نے پوچھا۔

گاڑی بنگلے میں رکتے ہی دلدار نے ستارہ کو احتیاط سے گاڑی سے اُتارا اور اسے اپنے دونوں ہاتھ میں اُٹھا کر بنگلے کے نچلے حصے کی طرف چلا۔ راولا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب دلدار برآمدے سے اُتر کر لان کی طرف بڑھا تو راولا نے اسے روک لیا اور بولا۔ "لڑکی کو اس گھاس پر لٹا دو اور ایک بلیڈ لے آؤ۔"

دلدار نے ستارہ کو لان پر لٹا دیا۔ ابھی یہاں سایہ تھا۔

سروری اپنے کوارٹر سے جا کر دلدار کے شیو بنانے کے سامان سے ایک نیا بلیڈ نکال لائی۔ آرزو، کمال رائے کے برابر کھڑی تھی اور وہ اس سپیرے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

سپیرے نے ستارہ کی ٹانگ پر بندھی ڈوری کھولی، ڈوری کی وجہ سے اس کی ٹانگ پر سرخ نشان بن گئے تھے۔ ستارہ کی حالت ابھی تک غیر تھی، وہ کبھی آنکھیں کھولتی تھی، کبھی بند کر لیتی تھی، اس کی آنکھوں میں کسی کی پہچان نہیں تھی۔

راولا نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز ٹٹولی اور جب وہ چیز اس کے ہاتھ میں آ گئی تو اس نے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گول ڈبیہ تھی جس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ نسوار کھانے والوں کے پاس ایسی ڈبیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس ڈبیہ میں نسوار نہ تھی، ایک چھوٹا سا کھردرا سا پتھر رکھا ہوا تھا، یہ پتھر راولا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنے منہ کے قریب کر لیا۔

وہ شاید کچھ پڑھ رہا تھا۔ سب لوگ بڑی محویت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بلیڈ ابھی تک سروری

کے ہاتھ میں تھا اور ستارہ آنکھیں بند کئے بے سدھ لیٹی تھی۔

راولا نے کچھ دیر کے بعد اس پتھر پر پھونک ماری اور اشارے سے سروری سے بلیڈ مانگا۔ اس نے بلیڈ کا کاغذ ہٹا کر ایک طرف پھینکا اور بلیڈ ایک انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پکڑ کر ستارہ کے پاؤں پر اس جگہ جہاں ایک اٹھنی بھر سیاہ نشان تھا، بلیڈ کی نوک ماری اور بلیڈ سروری کو واپس کر دیا۔

پھر اس نے اس سیاہ نشان کو اپنی چٹکی سے دبایا تو کالے رنگ کا ایک قطرہ اُبھر آیا۔ تب اس نے اس پتھر کو نشان پر رکھ دیا اور اسے اپنے انگوٹھے سے دبا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ دل ہی دل میں کچھ پڑھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے زہر مہرہ ہٹایا تو وہ ہلکے گلابی رنگ سے ایک دم سیاہ ہو چکا تھا اور ستارہ کے پاؤں کا سیاہ نشان غائب ہو چکا تھا۔ وہاں سکڑی ہوئی سی کھال تھی جیسے چھال پھٹ جانے کی صورت میں ہو جاتی ہے۔ راولا نے اس زہر مہرے کو چاروں طرف گھما کر اس کا بغور جائزہ لیا اور پھر اس نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ پھر ایک گلاب کے پودے پر اس کی نگاہیں ٹک گئیں۔

"لڑکی کو اندر لے جائیں۔ اس کو آدھا کپ چائے پلا دیں۔ یہ آدھے گھنٹے میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ گلاب کے پودے کی طرف بڑھا۔

اس نے گلاب کے پودے کے پاس سے اپنی انگلیوں سے مٹی ہٹائی۔ دو انچ کا گڑھا بن گیا تو راولا نے وہ زہر مہرہ جو گلابی سے کالا ہو چکا تھا، اس گڑھے میں رکھ دیا اور اس پر مٹی ڈال کر ڈھک دیا۔ پھر اس نے اپنا پورا ہاتھ اس بند گڑھے پر رکھ دیا اور کچھ پڑھنے کے بعد اس نے بائیں ہاتھ کو اپنے سر پر گھمایا اور ایک دَم کھڑا ہو گیا۔

اتنی دیر میں ستارہ کو کوارٹر میں لے جایا جا چکا تھا۔ کمال رائے اور آرزو لان میں موجود تھے۔ راولا واپس آیا ان دونوں کے نزدیک آ کر بولا۔

"سائیں، اس پتھر کو کوئی نہ نکالے، میں کل اپنے شاہ بابا کے ساتھ آؤں گا۔ پھر یہ پتھر میں خود نکالوں گا اور......" یہ کہتے کہتے اس کی نظر آرزو پر پڑی تو وہ ایک دَم چپ ہو گیا۔ اس نے اب تک آرزو کو غور سے نہیں دیکھا تھا، اب وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

کمال رائے کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ وہ ذرا اونچے لہجے میں بولا۔ "ہاں پھر اور......"

راولا کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے آرزو سے نظریں ہٹا کر کمال رائے کو دیکھا اور بولا۔ "سائیں یہاں تو کھیل ہی کچھ اور ہے۔"

''کیا مطلب؟'' کمال رائے کی سمجھ میں اس کی بات نہ آئی۔

''میں کل آؤں گا...... اپنے باپ کو ساتھ لاؤں گا۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے خالی ڈبیہ جھولی میں ڈالی، اپنی جھولی کندھے پر سنبھالی اور بین ہاتھ میں پکڑ کر چل پڑا۔

''سلام سائیں۔''

''ارے ٹھہرو...... بات تو سنو۔'' کمال رائے نے جلدی سے کہا۔

راولا جاتے جاتے رک گیا اور بڑے ادب سے بولا: ''جی، سائیں۔''

کمال رائے نے اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''راولا یہ رکھ لو۔''

''سائیں...... یہ کیا ہے؟'' راولا نے نوٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی...... یہ تمہارا انعام ہے اور کیا ہے؟'' وہ بولا۔

''نہیں سائیں...... اس علاج کا ہم پیسہ نہیں لیتے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو پھر ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔'' راولا نے بتایا۔

''بھائی...... یہ تمہارے کام کا معاوضہ نہیں ہے، میری خوشی ہے...... رکھ لو۔''

''نہیں سائیں...... میں کل آؤں گا، اگر وہ ہمارے ہاتھ آ گیا تو اس سے بڑا انعام اور کیا ہوگا؟''

''کون؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''سائیں...... وہ سنہری سانپ...... وہ ایک نایاب سانپ ہے۔'' راولا نے بتایا۔ ''بے حد قیمتی۔''

''راولا...... اگر تم نے اس سانپ کو پکڑ لیا تو تمہارا ہی ہوگا لیکن میں منہ مانگا انعام تمہیں الگ دوں گا۔ اسے پکڑ کر یا مار کر یوں سمجھو، میری بڑی مشکل حل کر دو گے۔''

''سائیں...... میں جانتا ہوں۔ میں نے بی بی کو دیکھ لیا ہے، اللہ سائیں بی بی کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ کل میرا باپ آئے گا۔ اس نے بڑے بڑے سانپوں کو کیچوے کی طرح پکڑ لیا ہے، یہ سانپ بھی پکڑا جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' راولا نے تسلی دی۔

''کل تم کب آؤ گے؟''

''سائیں، ہم کل شام کو آئیں گے۔ رات کو یہیں بسیرا کریں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''ہرگز نہیں...... شوق سے رات کو رہو تم میرے مہمان ہو گے۔''

''اللہ سائیں...... آپ کو خوش رکھے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک نظر آرزو کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''اچھا بی بی سلام۔''

''بابا، مجھے ڈر لگ رہا ہے؟'' راولا کے جانے کے بعد آرزو بولی۔

''تمہیں کیوں ڈر لگ رہا ہے؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''بابا، جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔''

''جو ہوگا...... اچھا ہی ہوگا۔ اگر وہ سانپ پکڑا گیا تو ایک بڑی مصیبت سے نجات مل جائے گی۔''

''دیکھیں بابا...... کیا ہوتا ہے؟'' وہ غیر یقینی انداز میں بولی۔

''اچھا، میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔ تم ذرا ستارہ کو دیکھ لو۔'' یہ کہہ کر کمال رائے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

''ٹھیک ہے بابا۔'' آرزو، ستارہ کے کوارٹر کی طرف چل پڑی۔

وہ اس گلاب کے پودے کے پاس سے گزری جس کی جڑ میں وہ پتھر دفن تھا جس نے ستارہ کے پاؤں سے آناً فاناً زہر کھینچ لیا تھا اور اس کی رنگت گلابی سے سیاہ ہو گئی تھی۔ اس پتھر کو مٹی میں دبانے کا کیا فائدہ ہے۔ وہ سپیرا، اس پتھر کو یہاں کیوں دبا گیا ہے، کیا ہونے والا ہے؟ کیا یہ معمولی سپیرے رستارو جیسے خطرناک سانپ کو قابو میں کر لیں گے؟

یہی سوچتی ہوئی آرزو ستارہ کے کمرے میں پہنچی تو ستارہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے چائے پی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب تھوڑی سی رونق آ گئی تھی۔ اس کے ہوش و حواس بحال تھے۔

''آئیں بی بی۔'' سروری، ستارہ کے پاس سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''سروری، تم بیٹھو...... میں تو ذرا اس کی شکل دیکھنے آئی ہوں، ابھی چلی جاؤں گی۔''

''بی بی، ادھر میرے پاس آ جائیں۔'' ستارہ اپنے پاؤں سکیڑتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''ہاں ری...... اب بول تو کیسی ہے......؟ تو نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''بی بی...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس سپیرے نے تو کمال کر دیا۔'' ستارہ نے خوش ہو کر کہا۔

☆......☆......☆

شام کا وقت تھا۔

آرزو اپنے کمرے میں اسٹڈی میں مصروف تھی کہ ستارہ دوڑتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا ہو گیا......؟ کیوں آندھی طوفان کی طرح چلی آ رہی ہے۔'' آرزو مسکرا کر بولی۔

''بی بی...... وہ سپیرے لوگ آ گئے ہیں...... ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' ستارہ نے بتایا۔

"کہاں ہے وہ؟" آرزو نے پوچھا۔

"وہ جی باہر کھڑی ہے، دروازے پر۔"

"اچھا، اس کو بلاؤ اندر۔" آرزو نے کہا۔ پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر بولی۔ "ٹھہرو، میں خود ہی باہر چلتی ہوں۔"

اور جب آرزو اپنے کمرے کے دروازے پر آئی تو اس عورت کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تیوح.....!"

"نہیں بی بی..... میں تیوح نہیں ہوں..... میرا نام شبورا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

آرزو کو یقین نہیں آیا..... اور اسے یقین آتا بھی کیسے؟ وہ بالکل تیوح جیسی تھی۔ وہی سیاہ لباس، وہ جگمگاتی آنکھیں، سانولی پرکشش رنگت، وہی جان لیوا مسکراہٹ..... یہ تو تیوح ہے مگر یہ کہہ رہی ہے کہ میں شبورا ہوں۔

"کیا تمہاری کوئی بہن بھی ہے۔" آرزو نے پوچھا۔

"نہیں بی بی، میری کوئی بہن نہیں..... بس میرا ایک ہی بھائی ہے راولا، اسے آپ دیکھ ہی چکی ہیں۔" شبورا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اچھا، خیر آؤ۔" آرزو نے اس کیلئے راستہ چھوڑا۔ وہ ایک ادائے بے نیازی سے چلتی کمرے میں داخل ہوئی اس کی تو چال بھی تیوح سے ملتی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر ایک خاص انداز سے قدم اُٹھانا.....

شبورا نے کمرے کے درمیان کھڑے ہو کر آنکھیں بند کرلیں اور پھر آنکھیں بند کئے کئے وہ قالین پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "کمرہ تو اس وقت بالکل خالی ہے۔"

آرزو نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ خاموش رہی، جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔

شبورا نے بیٹھے بیٹھے ایک گہرا سانس لیا اور تفہیمی انداز میں گردن ہلائی اور آرزو کی طرف دیکھا جو اب اپنے بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔ ستارہ، شبورا کے نزدیک ہی قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس عورت کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔

"اس کمرے میں اس کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔" شبورا نے آرزو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

آرزو نے جیسے اس کی یہ بات سنی ہی نہیں۔ وہ اس وقت ایک اور ہی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شبورا میں اسے اس قدر کشش محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے لپٹ

جائے..... یہ کس قسم کا جذبہ تھا، وہ یہ سوچنے سے قاصر تھی۔

"بی بی..... یہ کب سے آپ کے پیچھے لگا ہے؟" شبورا نے اب براہِ راست آرزو سے سوال کیا۔

"کون؟" آرزو ایک دم چونک کر بولی۔

"بی بی..... وہی جس کی اس کمرے میں خوشبو بسی ہے۔"

"مجھے تو کمرے میں کوئی خوشبو محسوس نہیں ہو رہی۔" آرزو نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "تم یہاں قالین پر کیوں بیٹھی ہو۔ آؤ، صوفے پر آ جاؤ۔"

آرزو کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ وہ شبورا کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھانے کے بجائے اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھا لے لیکن وہ صرف سوچ کر رہ گئی، اپنے دل میں مچلتے جذبے کو دبا لیا۔

"نہیں بی بی..... میں یہاں ٹھیک ہوں۔" شبورا نے کہا، پھر ستارہ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا تمہیں بھی کوئی خوشبو محسوس نہیں ہو رہی۔"

"ہاں، مجھے تو محسوس ہو رہی ہے..... ہلکی ہلکی سی خوشبو آ رہی ہے۔ بی بی کے کمرے سے یہ خوشبو آتی رہتی ہے۔ کبھی ہلکی، کبھی تیز۔" ستارہ نے بتایا۔

"لیکن مجھے تو اس وقت کوئی خوشبو محسوس نہیں ہو رہی۔" آرزو نے کہا۔

"یہ خوشبو آپ کے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے، اس لئے آپ کو محسوس نہیں ہو رہی۔" شبورا نے کہا۔

"شاید۔" آرزو نے پرخیال انداز میں کہا۔

"آرزو۔" کسی نے پکارا اور پھر پکارنے والا کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمال رائے تھا۔

"اچھا، میں چلتی ہوں۔" شبورا، کمال رائے کو دیکھتے ہی فوراً اُٹھ گئی۔ کمال رائے نے شبورا کو بغور دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔

"ابھی تو تم یہیں ہو نا۔" آرزو نے پوچھا۔

"جی بی بی..... شاہ بابا، جب تک اسے پکڑ نہیں لیتے..... ہم یہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ستارہ بھی چلی گئی۔

ان دونوں کے نکل جانے کے بعد بھی کمال رائے خالی دروازے پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

"کیا ہوا بابا خیر تو ہے؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس عورت کو میں نے کہاں دیکھا ہے؟" کمال رائے سوچتا ہوا بولا۔

"ہیں بابا۔" آرزو یہ سن کر حیران رہ گئی۔ "آپ نے بھی اس عورت کو دیکھا ہے۔"

"بھی کا کیا مطلب ہے۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بابا...... میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ یہ بالکل تیوح کی صورت ہے۔ وہی شکل وصورت وہی چال ڈھال، وہی انداز...... میں تو اسے دیکھ کر بے اختیار اس کا نام پکار اُٹھی تھی۔ وہ مجھے تیوح جیسی نظر آئی تھی۔"

"تیوح کون؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بابا...... وہ میری انا تھی۔ اسی نے مجھے پالا تھا۔ اسی کا میں نے دودھ پیا۔ اوہ، اب سمجھ میں آیا۔" آرزو کو بات کرتے کرتے خیال آیا۔ "مجھے اس عورت کو دیکھ کر بے پناہ کشش کیوں محسوس ہو رہی تھی، میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کے گلے لگ جاؤں۔ اس میں بات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن اب سمجھ میں آ گئی۔ اس دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا تھا۔"

"یہ تو ان سپیروں کے ساتھ آئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے کمرے میں ہے تو میں فوراً ادھر آ گیا کہ دیکھوں وہ کیا کر رہی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟"

"شبورا۔" آرزو نے بتایا۔ "لیکن آپ نے تیوح کو کہاں دیکھا ہوگا۔ یہ ہو بہو تیوح کی شکل ہے۔"

"سوچنا پڑے گا۔ جب مجھے یہ یاد آیا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے تو پھر ضرور کہیں دیکھا ہے۔ یاد کرنا پڑے گا۔"

"یاد کریں۔" آرزو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یاد آ گیا۔" کمال رائے نے ایک زوردار چٹکی بجائی اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "اسے میں نے ایک باغ میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دیوہیکل آدمی بھی تھا۔ یہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے ایک گڑیا رکھی تھی۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ جب تم پانچ چھ سال کی تھیں۔ میں نے اس عورت کو اور اس کے ساتھی مرد کو ناریل کے ذریعے آگ میں جلا دیا تھا...... لیکن یہ عورت میری نگاہوں میں رہ گئی تھی۔ میں نے تمہاری دادی سے اس کے بارے میں ذکر بھی کیا تھا۔"

"اچھا...... آپ نے کیا کہا تھا۔" آرزو نے پرتجسس لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ مجھے یاد آ گیا...... میں نے کہا تھا کہ ماں وہ بڑی پرکشش عورت تھی، اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ آدمی اسے دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ ماں نے کہا کہ ہائے پتہ نہیں کون چڑیل تھی۔ میں نے ہنس کر پوچھا کہ ماں کیا چڑیلیں بھی اتنی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آ گیا۔ یہ وہی عورت ہے،

بالکل اس کی ہم شکل۔" کمال رائے نے خوش ہو کر کہا۔

"میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔" آرزو نے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔

"یہ یہاں کیا کر رہی تھی؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"مجھ سے ملنے آئی تھی۔ یہاں آنکھیں بند کر کے بیٹھی تھی۔" آرزو نے بتایا۔

"یہ لوگ مجھے کافی ماہر معلوم ہوتے ہیں، مجھے پکا یقین ہے کہ یہ اس سنہری سانپ کو ضرور پکڑ لیں گے۔" کمال رائے نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔

آرزو نے جواب میں کچھ نہ کہا، ایک ٹھنڈا سانس ضرور لیا۔

☆......☆......☆

ان تینوں نے اپنی نشست کیلئے لان کا انتخاب کر لیا تھا۔ تینوں کے پاس جھولیاں تھیں۔ ان جھولیوں میں ایک ایک پٹاری تھی، کچھ سامان تھا۔ تینوں کے پاس اپنی اپنی بین تھی۔ شاہ بابا کے پاس جو بین تھی وہ سب سے خوبصورت تھی۔ اس بین پر مختلف رنگ کے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ سکے بھی چپکے ہوئے تھے۔ شاہ بابا بالکل راولا کی کاپی تھے۔ بس ان دونوں کی عمروں میں فرق تھا اور وہ باپ بیٹے لگنے کی بجائے ایک دوسرے کے بھائی محسوس ہوتے تھے۔

"ہاں ری شبو...... اس کی جگہ دیکھی۔" شاہ بابا نے شبورا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر پوچھا۔

"بابا...... جگہ بالکل صاف ہے۔" شبورا نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ رات کو جال لگانا پڑے گا۔" شاہ بابا نے کہا۔

"او، رے بابا۔" گلاب کے پودے کے پاس سے راولا نے آواز لگائی۔

"ہاں، کیا ہوا؟" شاہ بابا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ادھر پتھر نہیں ہے۔" راولا نے بتایا۔

"لے گیا کیا۔" شاہ بابا نے پوچھا۔ "اس کا کوئی نشان موجود ہے۔"

"ہاں، بابا نشان تو نظر آ رہا ہے۔" راولا بولا۔

"چلو، اس کی موجودگی کا تو یقین ہو گیا۔ ہمارے پاس پتھر بہت۔" شاہ بابا نے مطمئن لہجے میں کہا۔

راولا گلاب کے پودے کے پاس سے اُٹھ کر شاہ بابا کے پاس آ بیٹھا۔

"بابا، کام شروع کر دیں۔" شبورا نے شاہ بابا کی جانب دیکھا۔

"ہاں، شبورا تو الاپ لگا۔" شاہ بابا نے کام شروع کرنے کی اجازت دی۔

تب راولا اپنی جگہ سے اُٹھا۔اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ تھا۔اس میں کوئی سفید سا پاؤڈر تھا۔وہ پاؤڈر اس نے ہاتھ میں لے کر گھاس پر ڈالنا شروع کیا۔اس طرح ان تینوں کے اطراف ایک دائرہ سا بن گیا۔وہ تینوں اس حصار میں سما گئے۔

شبورا نے اپنی بین سنبھالی۔شبورا کی بین کالے رنگ کی تھی اور اس پر سفید رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔شبورا نے پہلے اپنے باپ کے پاؤں کو ہاتھ لگایا۔اس کے بعد اپنی بین کو چوما اور منہ میں دبا کر بین بجانی شروع کی۔بین بجاتے ہوئے اس کے گال ایک خاص انداز میں پھول پچک رہے تھے اور بین کی آواز پورے بنگلے میں گونج رہی تھی۔

بین کی آواز سن کر گھر کے سارے ملازمین اکٹھے ہوگئے۔ان لوگوں نے سپیروں کو تو بین بجاتے دیکھا لیکن سپیرن کو بین بجاتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

کمال رائے اور آرزو بھی آگئے تھے۔وہ دونوں برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔کمال رائے شبورا کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔بین بجاتی ہوئی وہ اسے کوئی غیر انسانی مخلوق لگ رہی تھی۔

وہ تینوں ایک مثلث کی شکل میں بیٹھے تھے۔شاہ بابا کی کمال رائے کی طرف پیٹھ تھی جبکہ شبورا اور راولا اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

تب اچانک شاہ بابا نے ہاتھ اُٹھایا تو شبورا نے فوراً بین بجانا بند کردی۔پھر شاہ بابا نے راولا کو اشارہ کیا۔اشارہ پاتے ہی راولا نے اپنی بین منہ میں لگائی اور شروع ہوگیا۔شبورا اپنی بین گود میں رکھ کر یوگا کے انداز میں بیٹھ گئی اور اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں بند کرلیں۔

کمال رائے کی نظریں اب راولا پر تھیں لیکن گاہے گاہے وہ شبورا کو بھی دیکھ لیتا تھا اور جب اس پر نظریں پڑتیں تو ہٹانے کو جی نہ چاہتا۔شبورا میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ آدمی اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوجاتا اور جب دیکھنے لگتا تو اس سے نظریں ہٹانا مشکل ہوجاتا۔

شبورا آنکھیں بند کئے بالکل شانت بیٹھی تھی۔جیسے گیان دھیان میں مصروف ہو۔راولا کی بین سے نکلتے سُروں میں ڈوب گئی ہو۔اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ کسی کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کررہی ہیں۔تب اس کا گیان دھیان بھنگ ہوگیا،اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی اس کی نظر کمال رائے پر پڑی۔وہ محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

شبورا چند لمحے اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی، پھر فوراً ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں،اس نے اپنی ساری توجہ گیان دھان پر لگادی۔راولا کی بین کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی اور وہ عمل کرنے میں مصروف ہوگئی۔

ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔راولا کی بین کے سُر فضا میں بکھر رہے تھے۔شبورا بین کی آواز میں ڈوبی ہوئی تھی۔وہ گیان دھیان میں مگن تھی۔کچھ پڑھنے میں مصروف تھی کہ پھر اس کی توجہ ہٹی۔اسے اپنے چہرے پر کسی کی نظریں محسوس ہوئیں۔وہ باوجود کوشش کے اپنی آنکھیں بند نہ رکھ سکی۔اس نے آنکھیں کھولیں تو کمال رائے کو اپنی طرف پوری توجہ سے دیکھتا پایا۔

پھر نظروں سے نظریں ملیں،آنکھوں کا تصادم ہوا۔دونوں کے دلوں میں ہلچل سی مچی۔کمال رائے نے فوراً اپنی نظریں ہٹالیں اور آرزو کو گردن موڑ کر دیکھا۔وہ بہت غور سے شبورا کو دیکھ رہی تھی۔

شبورا نے پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اب راولا کے بین بجانے کا وقت ختم ہونے کو تھا اور شبورا اپنا عمل ابھی تک پورا نہ کرسکی تھی۔اس نے کوشش کر کے آنکھیں بند رکھی تھیں لیکن اس کا دھیان بار بار بٹ رہا تھا۔اس کی بند آنکھوں میں کمال رائے کی تصویر گھوم رہی تھی۔پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

راولا نے بین بجانی بند کردی لیکن شبورا کا عمل پورا نہ ہوا۔شبورا کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔اب وہ اس بات کو چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔عمل پورا نہ ہونے کی وجہ سے سارا کھیل بگڑ جاتا۔یہ زندگی کا معاملہ تھا۔ایک زبردست سانپ سے مقابلہ تھا۔ذرا سی غلطی ان کو دوسرے جہاں میں منتقل کرسکتی تھی۔

جب شاہ بابا نے اپنی بین منہ میں لگائی تو شبورا نے جلدی سے کہا۔"بابا ٹھہرو۔"

"کیا ہوا؟" شاہ بابا نے بین اپنے منہ سے نکالتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"بابا، پڑھائی پوری نہیں ہوئی۔" شبورا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" شاہ بابا نے اسے گھور کر دیکھا۔تیرا دھیان کہاں ہے؟اس طرح کرے گی تو ہم سب مشکل میں پھنس جائیں گے۔"

"بابا.....اب ایسا نہیں ہوگا۔" شبورا نے بڑے یقین سے کہا۔"بابا،تم میری جگہ آجاؤ۔"

"ٹھیک ہے آجاتا ہوں۔" یہ کہہ کر شاہ بابا اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

جب وہ شبورا کی جگہ بیٹھا تو اس کی جہاندیدہ نظروں سے فوراً معاملے کو تاڑ لیا۔کمال رائے اب اس کے سامنے تھا۔کمال رائے ایک خوبصورت آدمی تھا۔اگر شبورا کا اس کی وجہ سے دھیان بٹ رہا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی لیکن اس کام میں جس کیلئے وہ یہاں آئے تھے ذرا سی بھی چوک انہیں موت کی نیند سلاسکتی تھی۔

تب شاہ بابا اچانک ہی اُٹھ گیا۔شبورا نے حیرت سے اسے دیکھا۔شاہ بابا نے ابھی دو قدم آگے

بڑھائے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ حصار سے نکلتا۔ شبورا فوراً بولی۔ ”بابا، حصار۔“

”اوہ۔“ شاہ بابا ایک دم چونک کر رک گیا۔ ”مجھے تو یاد ہی نہ رہا تھا۔“

پھر اس نے کھڑے کھڑے کمال رائے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”صاحب جی، آپ بی بی کو لے کر اندر جائیں۔ ساتھ ہی اپنے نوکروں کو بھی لے جائیں۔ بس کوئی ایک آدمی یہاں چھوڑ دیں تاکہ ضرورت کے وقت آپ کو پیغام بھیجا جا سکے۔“

یہ سنتے ہی کمال رائے فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ آرزو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آؤ بیٹا۔“

”چلیں بابا۔“ آرزو کرسی چھوڑتے ہوئے بولی۔

کرسی کھسکنے کی آواز پر شبورا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کمال رائے بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر دونوں نے گھبرا کر نظریں پھیر لیں۔

کمال رائے آرزو کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ اس نے وہاں کھڑے ملازمین کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی سب لوگ وہاں سے ہٹ گئے۔ پھر اندر جا کر اس نے ایک سیکورٹی گارڈ کو ان سپیروں کے پاس بھیج دیا، اسے ہدایت کر دی کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں فوراً اسے مطلع کیا جائے۔

میدان صاف ہونے کے بعد شاہ بابا نے چاروں طرف دیکھا اور پھر شبورا سے مخاطب ہو کر بولا۔

”چل ری شبورا پھر سے الاپ لگا...... اور اب جاپ بھنگ نہ ہو۔“

”نہیں بابا...... اب ایسا نہیں ہوگا۔“ شبورا نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

”چل پھر شروع کر۔“

شبورا نے اپنی بین منہ میں لگائی اور ایک لمبی تان لی۔ اس کے گال ایک خاص انداز میں پھولنے اور پچکنے لگے۔ اس مرتبہ اس کے بین بجانے کے انداز میں والہانہ پن تھا۔

ایک خاص وقت گزرنے کے بعد بابا نے شبورا کو رکنے اور راولا کو شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ راولا کے بین شروع کرتے ہی شبورا نے اپنی بین گود میں رکھ لی اور یوگا کے انداز میں بیٹھ گئی اور اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں بند کر لیں اور بڑے اطمینان سے جاپ کرنے لگی۔ اب اسے اپنے چہرے پر کسی کی نظریں نہیں محسوس ہو رہی تھیں لیکن اس کے دل کے دروازے پر آہٹیں سی محسوس ہو رہی تھیں جیسے کوئی دھیرے دھیرے دل کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ اسے ہولے سے پکارتا ہو۔ اس نے جاپ کرتے کرتے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تاکہ اس تصور کو توڑ سکے۔ آنکھیں کھولیں تو اپنے باپ کو گھورتے ہوئے پایا۔ اس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جلدی جلدی پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

بمشکل تمام اس نے راولا کے بین بند کرنے سے پہلے اپنا عمل مکمل کر لیا۔

راولا نے بین بجانی بند کی تو شاہ بابا نے اپنی بین منہ سے لگا لی۔ اس کے بین شروع کرتے ہی راولا نے اپنی بین گود میں رکھ لی اور گیان دھیان میں مصروف ہو گیا۔ شبورا نے بھی اپنا عمل جاری رکھا۔ جب اس نے بین بجانی بند کی تو یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

اب شاہ بابا نے بھی اپنی بین گود میں رکھ لی اور یوگا کے انداز میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شاہ بابا نے پڑھتے پڑھتے آنکھیں بند کیں، اپنا سیدھا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور بولا۔ ”شل۔“

اس کی آواز سن کر شبورا اور راولا نے کہا۔ ”شل، شل۔“

کوئی ایک گھنٹے تک یہ عمل جاری رہا، بنگلے کے لان پر وقفے وقفے سے ”شل، شل۔“ کی آواز گونجتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر کے بعد شاہ بابا بولا۔ ”چل ری شبورا، الاپ لگا۔“

”اچھا بابا، لگاتی ہوں۔“ شبورا نے یہ کہہ کر اپنی گود میں رکھی بین اُٹھائی اور بجانے لگی۔

یہ عمل رات کے نو بجے تک جاری رہا۔ مگر اس عمل کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔

کمال رائے نے دلدار کو بھیج کر کھانے کا پوچھوایا...... لیکن شاہ بابا نے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”ہم حصار میں بیٹھے ہیں، جب تک یہاں بیٹھے ہیں، اس وقت تک کچھ نہیں کھائیں گے۔“

☆......☆......☆

آرزو کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ریسیور اُٹھانے سے پہلے پردہ کھسکا کر باہر جھانکا۔ وہ تینوں اپنے گیان دھیان میں لگے ہوئے تھے۔ شاہ بابا بین بجا رہا تھا اور شبورا اور راولا آنکھیں بند کیے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

آرزو نے فوراً پردہ برابر کیا اور دوڑتی ہوئی ٹیلی فون کے پاس پہنچی۔ جلدی سے ریسیور اُٹھایا اور بڑے مترنم لہجے میں بولی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو کی بچی...... تو ہے کہاں؟“ اُدھر سے مہرو کی شکوے بھری آواز سنائی دی۔

”اچھا، مہرو، یہ تم ہو۔ بھئی میں تو گھر پر ہی ہوں۔“

”اتنی دیر سے ٹیلی فون کر رہی ہوں تو اُٹھاتی ہی نہیں۔“

”میں دراصل کمرے میں نہیں تھی۔ بابا کے پاس تھی۔ پھر کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ کھانا کھا کر ابھی

کمرے میں گھسی ہوں۔تم دوسرے نمبر پر رنگ کر لیتیں۔"

"بس، میں نے کیا نہیں......سوچا جب تو کمرے میں ہوگی تبھی بات کروں گی۔"

"کوئی خاص بات ہے؟" آرزو نے پوچھا۔

"نہیں......کوئی خاص بات نہیں......ایسے ہی گپ شپ کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔"

"نہیں، میری مہرو......کوئی خاص بات ضرور ہے، ورنہ تو میرے کمرے میں آنے کا انتظار نہ کرتی۔" آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آرزو، میں پریشان ہوں۔" بالآخر مہرو کو بتانا پڑا۔

"خیریت؟" آرزو نے پوچھا۔

"ہاں، ویسے تو خیریت ہے۔بس پتہ نہیں کیوں دل ڈر رہا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔" مہرو کی خوفزدہ آواز سنائی دی۔

"میرا اغوا ہوگیا...... مجھے مارنے کی کوشش کی گئی......لیکن مجھے مارنے والا خود ہی قتل ہوگیا۔اب اس سے زیادہ کیا ہوگا۔اب تو کس بات سے ڈر رہی ہے۔" آرزو نے پوچھا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا۔" انکشاف ہوا۔

"تیری عمر ہی خواب دیکھنے کی ہے۔ایک کیا تو ہزار خواب دیکھ۔" آرزو ہنس کر بولی۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"اچھا......چل میں سیریس ہوگئی۔تو اپنا خواب بتا۔تو نے کیا دیکھا۔"

"آرزو میں نے اپنے بھائی کو خواب میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔" مہرو پریشان ہو کر بولی۔

"اس کا مطلب ہے، تیرے بھائی کے پاس زبردست پیسہ آنے والا ہے کیونکہ خواب کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔" آرزو نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ نہ صرف بھیک مانگ رہے ہیں بلکہ اندھے بھی ہیں۔" مہرو سنجیدہ تھی۔

"تو پریشان کیوں ہوتی ہے۔محض ایک خواب ہے اور ایسے خواب ہمیشہ بدہضمی کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔" آرزو مسئلے کو سنجیدگی سے لینے کیلئے تیار نہ تھی۔وہ بدستور مذاق کر رہی تھی۔

"آرزو تو مذاق کے موڈ میں ہے لیکن جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ہول رہی ہوں۔جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں ایسا سچ نہ ہو جائے۔"

"اللہ نہ کرے۔" آرزو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔"یہ کس قسم کی بات کر رہی ہے تو۔"

"وہ ٹھیک کہہ رہی ہے، ایسا ہی ہوگا۔" کوئی اچانک بولا۔

آرزو نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔اس آواز کے ساتھ خوشبو پھیل گئی تھی اور وہ پردے سے پھسل کر قالین پر آیا تھا اور اب اس کے بائیں جانب سیاہ لباس میں کھڑا تھا۔

خوشبو محسوس کر کے آرزو نے دائیں جانب دیکھا۔وہ اسے دیکھ کر سہم گئی۔اب اس نے جان لیا کہ یہ بات کس نے کہی اور کیسے کہی......وہ ہمیشہ کی طرح اس کے دماغ میں بولا تھا اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ ایک بہت خطرناک بات تھی۔اس نے مہرو کے خواب کے سچے ہونے پر مہر ثبت کر دی تھی۔

"میرا دل ڈر رہا ہے۔اسی لئے میں تجھ سے اکیلے میں بات کرنے کیلئے بے چین تھی۔" مہرو اپنی بات کہہ رہی تھی۔اسے پتہ نہ تھا کہ آرزو کے پاس اب کون پہنچ چکا ہے۔

"فون بند کردو۔" اچانک اس کے دماغ میں حکم گونجا۔

"اچھا، مہرو......تو پریشان نہ ہو۔میں تجھ سے پھر بات کروں گی۔" یہ کہہ کر آرزو نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔مہرو کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" اس کے دماغ میں آواز گونجی۔

"کون سا تماشا؟" آرزو نے بغیر ہونٹ ہلائے دل ہی دل میں سوال کیا۔

"یہ لوگ جو باہر بیٹھے ہیں اور بین بجائے جاتے ہیں۔ان کا کیا خیال ہے کہ یہ مجھے اپنی گرفت میں لے لیں گے۔یہ بے وقوف لوگ ہیں، انہیں ابھی میری طاقت کا اندازہ ہی نہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"پھر ان سے کہو کہ یہ یہاں سے چلے جائیں۔اگر نہ گئے تو صبح تک ان میں سے کوئی میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔" اس نے دھمکی دی۔"ہوسکتا ہے سارے ہی مارے جائیں۔"

"ایسا نہ کرنا۔" آرزو نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

"پھر ان سے کہو کہ چلے جائیں۔" حکم ہوا۔

"یہ تمہیں لئے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔" آرزو نے ہمت کر کے کہا۔

"یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ سارے کے سارے مارے نہ جائیں۔"

"تم نے ستارہ کو کیوں کاٹا۔" آرزو نے شکوہ کیا۔

"میں نے کاٹا کب......؟ اگر کاٹ لیتا تو وہ چند لمحوں میں چل بستی۔میں نے تو محض اسے ڈانٹا تھا۔ایک ہلکی سی تنبیہہ کی تھی۔ایک پھنکار ماری تھی۔"

"آخر کیوں؟"

"وہ ہمارے درمیان جو آگئی تھی۔" اس کی آواز گونجی "وہ ملازمہ سے زیادہ تمہاری سہیلی ہے اس

لئے میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

"تمہارا بڑا شکریہ کہ تم میرے لوگوں کا اتنا خیال رکھتے ہو۔" آرزو کے لہجے میں طنز تھا۔

"تمہارے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"

"ایک بات کہوں...... مان لو گے؟"

"ہاں کہو...... ماننے والی ہوگی تو ضرور مان لوں گا۔"

"مجھے چھوڑ دو۔" آرزو نے التجا کی۔

"ایسا نہ کہو...... تمہارے لئے تو میں نے بغاوت کی ہے۔ پرمان کی حکم عدولی کی ہے۔ اپنی دنیا چھوڑی ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔"

"لوٹ جاؤں گا لیکن اکیلا نہیں...... تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"میرا تمہارا کیا ساتھ۔ مجھے تمہارے ساتھ سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ میرے اعصاب کمزور ہو رہے ہیں۔ میں اندر سے ٹوٹ رہی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اپنے آپ سے بیگانہ نہ ہو جاؤں، پاگل نہ ہو جاؤں۔"

"اور تم نے جو مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔؟" شکوہ ہوا۔

"اس میں میرا بھی قصور نہیں...... تمہیں پرمان نے میرے لئے منتخب کیا، مجھے تمہاری آس دلائی۔ اب میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تمہیں میری دنیا سے نکال لیا گیا لیکن تمہیں میرے دل سے نہیں نکالا جا سکتا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مجھ سے بہت محبت کرتے ہو؟" سوال ہوا۔

"ہاں بہت۔" بلا جھجک جواب ملا۔

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں پرمان سے جا کر کہوں گا کہ تو نے اسے کھو دیا تھا لیکن میں اسے ڈھونڈ لایا ہوں اگر پرمان نے میرا قصور معاف کر دیا اور وہ میرا قصور ضرور معاف کر دے گا۔ پھر تم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری ہو جاؤ گی۔" یہ کہہ کر اچانک اس نے اپنا سر جھکایا۔ یوں لگا جیسے گرنے کو ہو۔ "یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" وہ جیسے آپ سے بولا۔

"کیا ہوا؟" آرزو نے پوچھا۔

"یہ لوگ نہیں مان رہے ہیں...... مجھ پر اپنا جال پھینک رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کون لوگ؟" آرزو نے پوچھا۔

"یہی بین والے...... انہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں...... خواہ مخواہ مارے جائیں گے۔" یہ کہتے کہتے وہ زمین کی طرف جھکتا چلا گیا اور قالین پر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا دیا ہو۔

باہر سے بین بجانے کی آواز مسلسل آ رہی تھی اور اب وہ بیٹھا مسلسل جھوم رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بین کی آواز اسے اپنی گرفت میں لے رہی ہو۔

پھر وہ بیٹھے بیٹھے اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ اب وہ لہراتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے سر پر رکھا ہوا پتھر جگمگا رہا تھا۔

آرزو نے اسے جھک کر دیکھا تو وہ اسے پردے کے پیچھے غائب ہوتا دکھائی دیا۔ آرزو فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اب وہ خود کو ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے جسم پر جو ایک بوجھ سا تھا، ہٹ گیا تھا۔

اب نہ اس سے کوئی سوال کر رہا تھا اور نہ وہ کوئی جواب دے رہی تھی۔

کمرے میں محسوس ہونے والی خوشبو کم ہو گئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔

بیڈ سے اُتر کر پہلے اس نے سوچا کہ وہ کھڑکی کی طرف جائے...... لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

شاہ بابا بڑی محویت سے بین بجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بین کی آواز کسی طلسم کی طرح ہر سُو پھیل رہی تھی، شبورا اور راولا اپنی اپنی بین گود میں رکھے، آسن جمائے بیٹھے تھے اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھ رہے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک سیکورٹی گارڈ سیڑھی پر مستعد کھڑا تھا۔ اس کی نظریں کسی ریڈار کی طرح پورے لان کا جائزہ لے رہی تھیں۔

تب وہ لہراتا ہوا، گلاب کے پودے کے نیچے سے برآمد ہوا۔ سیکورٹی گارڈ نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ بہت تیزی سے لہراتا ہوا، ان تینوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اور وہ تینوں آنکھیں بند کئے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کا دشمن بالکل سر پر آ پہنچا ہے۔

خطرہ محسوس کر کے سیکورٹی گارڈ نے بڑی تیزی سے اپنی کلاشنکوف سیدھی کی اور اس پر دھڑا دھڑ گولیاں برسا دیں۔

یہ ایک آفت ناگہانی تھی۔ وہ تینوں اس کیلئے تیار نہ تھے۔ فائر کی آواز سن کر تینوں اپنا گیان دھیان بھول گئے۔ شاہ بابا گھبرا کر اُٹھ کر بھاگا جبکہ شبورا اور راولا اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ آخر ہوا کیا ہے؟

اس پر گولیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ شاہ بابا حصار سے نکل چکا تھا۔ گولیوں کی آواز نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا۔

بس اتنا ہی اس کیلئے کافی تھا۔ گولیاں تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں لیکن اس نے شاہ بابا کا حلیہ بگاڑ دیا، اس نے اچھل کر شاہ بابا کی ٹانگ پر کاٹا اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شاہ بابا کو گرتا دیکھ کر شبورا زور سے چیخی۔ ''ہائے بابا۔''

راولا فوراً اُٹھ کر بھاگا۔ اس نے سنہرے سانپ کو اپنے باپ کو ڈستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شبورا اور راولا دونوں نے مل کر اسے سنبھالا۔ گھاس پر سیدھا لٹا لیا۔

شاہ بابا پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ کوشش کر کے اپنی آنکھیں کھول رہا تھا اور کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔

سنہرے سانپ نے اس کی پنڈلی پر کاٹا تھا۔ وہاں دانتوں کے نشان بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ ان سے خون بہہ رہا تھا اور وہ جگہ تیزی سے نیلی ہوتی جا رہی تھی۔

راولا نے جلدی سے جھولی سے ایک ڈوری نکال کر اس کے پاس کا انگوٹھا کس دیا۔ پھر اس نے چاقو کی نوک سے اس زخم کو اور گہرا کر دیا۔ شبورا نے اس زخم پر اپنا منہ رکھ دیا اور شاہ بابا کے جسم میں پھیلنے والے خطرناک زہر کو چوسنے لگی۔ وہ جلدی جلدی منہ ہٹا کر تھوکتی جاتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد راولا نے اسے زہر چوسنے سے منع کیا اور ایک پتھر اس کی پنڈلی پر رکھ دیا اور اس پتھر کو اپنے ہاتھ سے دبا لیا۔

گولیوں کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا، سب سے پہلے تو گیٹ پر موجود دوسرا سیکورٹی گارڈ بنگلے کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا۔ اس نے لان میں پہنچ کر دیکھا کہ بوڑھا سپیرا زمین پر گرا ہوا ہے۔ سیکورٹی گارڈ نے یہ سمجھا کہ گولی بوڑھے کو لگی ہے۔ اس نے موقع پر موجود دوسرے گارڈ سے حال دریافت کیا جو اپنی کلاشنکوف کے ساتھ مستعد کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ گولیاں لگنے کے باوجود سانپ کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ بس ذرا سا اُچھل کر پیچھے ہوا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر اس بوڑھے سپیرے کی پنڈلی پر کاٹ لیا اور اس کے بعد وہ کچھ اس طرح غائب ہوا کہ پتہ ہی نہ چلا، کدھر گیا۔

کمال رائے بھی موقعہ واردات پر پہنچ چکا تھا۔ آرزو بھی اپنے کمرے سے نکل آئی۔ گھر کے

دوسرے مکین بھی وہاں پہنچ چکے تھے اور ایک دوسرے کو حال احوال بتا رہے تھے۔

راولا ابھی تک زخم پر پتھر رکھے ہوئے تھا اور شبورا اپنے بابا کا چہرہ پکڑے زور زور سے پکار رہی تھی۔ ''بابا، اُٹھو...... آنکھیں کھولو۔''

راولا نے کچھ دیر کے بعد پتھر اُٹھا لیا۔ اس کا رنگ بدل چکا تھا۔ وہ گلابی سے کالا ہو گیا تھا۔ اس نے پتھر شبورا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شبورا اسے زمین میں دبا دے۔''

شبورا نے زہر مہرہ اپنے ہاتھ سے لے کر اسے گھما پھرا کر غور سے دیکھا اور پھر اس کو گلاب کے پودے کے نیچے اسی جگہ جہاں پہلا زہریلا مہرہ دبایا تھا، جو غائب ہو گیا تھا تھوڑی سی زمین کھود کر دبا دیا اور اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑتی ہوئی واپس آئی۔

راولا، شاہ بابا کے سرہانے بیٹھا، اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاہ بابا کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور تھوڑا سا منہ کھلا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ راولا نے اس کا چہرہ تیزی سے اِدھر اُدھر ہلایا جلایا اور اسے آوازیں دیں۔ ''بابا...... بابا۔''

مگر شاہ بابا نے آنکھیں نہ کھولیں۔

''اس کے چہرے پر پانی ڈالو۔'' کمال رائے نے اپنی رائے دی جو کچھ فاصلے پر کھڑا، یہ سارا تماشا بڑی خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

دلدار نے ایک جگ میں پانی لا کر دیا۔ شبورا نے جگ لے کر اپنے ہاتھ میں پانی نکالا اور شاہ بابا کے منہ پر چھینٹے مارے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ یونہی آنکھیں بند کیے، بے حس و حرکت پڑا رہا۔

اب راولا کے چہرے پر فکرمندی کے گہرے بادل چھا گئے۔ راولا نے شبورا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا کریں، بابا کا سکتہ ٹوٹتا ہی نہیں۔''

''راولا، اب شاہ ناگ کو یہاں لانا ہوگا۔'' شبورا نے مشورہ دیا۔

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں...... پھر میں بستی جاؤں؟''

''جاؤ...... جلدی کرو۔'' شبورا بولی۔

''کہاں جانا ہے...... مجھے بتاؤ۔'' کمال رائے نے مداخلت کی۔

''دھمن گوٹھ۔'' راولا نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم لعل محمد کے ساتھ گاڑی میں چلے جاؤ۔'' یہ کہہ کر کمال رائے نے پاس کھڑے لعل محمد کو ہدایت کی۔ ''جاؤ...... اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

چند لمحوں میں راولا لعل محمد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دھمن گوٹھ کی طرف چل پڑا جبکہ شبورا اپنے

باپ کے پاس بیٹھ گئی۔اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

پھر اچانک اس نے اپنی گردن گھمائی اور آرزو کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ان نظروں میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ کمال رائے نے پاس کھڑی اپنی بیٹی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

شبورا کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ایسی چمک جیسے اس نے کچھ پا لیا ہو۔پھر وہ ایک دم اُٹھی اور آرزو کی طرف بڑھی۔

کمال رائے نے اپنی بیٹی کو کھینچ کر اپنے پیچھے کر دیا جانے کس چیز سے ڈر کر۔

شبورا کمال رائے کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔اس نے اپنی کالی چمکیلی آنکھوں سے کمال رائے کو دیکھا۔اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

''صاحب جی،میرا بابا مر رہا ہے۔اسے بچالیں۔''شبورا نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''میں نے تمہارے بھائی کو شمن گوٹھ بھیج دیا ہے۔''کمال رائے نے اسے تسلی دی۔

''صاحب جی۔وہ جانے کب تک یہاں واپس پہنچے گا۔تب تک تو میرا بابا چل بسے گا۔''

''پھر اب کیا کریں بتاؤ۔''کمال رائے نے نرم لہجے میں کہا۔

''بی بی،اگر دو قطرے خون دے دیں تو میرا بابا کی حالت فوراً ٹھیک ہو سکتی ہے۔''شبورا نے بڑے یقین سے کہا۔''دیکھیں صاحب جی انکار مت کیجئے گا۔''اس کے لہجے میں التجا تھی۔

دو قطرے خون دینے میں بھلا کمال رائے کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔وہ بھی اس صورت میں کہ وہ لوگ اس کی بیٹی کو بچانے کیلئے یہ سب کارروائی کر رہے تھے اور وہ سنہرا سانپ شاہ بابا کو ڈس کر چلا گیا تھا۔کمال رائے نے آرزو کو اپنے پیچھے سے نکال کر آگے کیا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیوں آرزو؟''

''کوئی حرج نہیں ہے بابا۔اگر میرے خون دینے سے ان کے باپ کی زندگی بچ سکتی ہے تو یہ دو قطرے کیا دو بوتل خون لے لیں۔''آرزو نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

''بی بی۔اللہ آپ کو خوش رکھے۔''شبورا اسے بڑی ممنونیت سے دیکھتے ہوئی بولی۔''آئیں میرے ساتھ آجائیں۔''

آرزو اس کے پیچھے چل دی۔شبورا،شاہ بابا کے سر کے ایک جانب بیٹھ گئی اور اس نے دوسری جانب آرزو کو بیٹھنے کا اشارہ کیا آرزو اس کی خواہش کے مطابق بیٹھ گئی،اب وہ دونوں آمنے سامنے تھیں اور درمیان میں شاہ بابا کا سر۔

کمال رائے بھی ان دونوں کے نزدیک آ گیا تھا۔

شبورا نے اپنے لباس میں لگی سوئی ڈھونڈ کر نکالی۔اس سوئی کے سوراخ میں چھوٹا سا دھاگہ موجود تھا پھر اس نے آرزو کے بائیں ہاتھ کی سب سے بڑی انگلی پکڑی اور چند لمحے اسے دبا کر رکھا پھر اچانک اس نے انگلی میں سوئی چبھو دی۔آرزو کے منہ سے ایک سسکاری نکلی۔شبورا نے اس کی انگلی دبائی۔

اس کی انگلی پر ایک قطرہ خون اُبھر آیا پھر اس نے شاہ بابا کا سر اونچا کر کے آرزو کی انگلی اس کی ناک کے قریب کر دی۔ایک قطرہ خون شاہ بابا کی ناک کے نتھنے میں چلا گیا پھر شبورا نے دوسرا قطرہ ناک کے دوسرے نتھنے میں ٹپکا دیا۔

اور آرزو کو اُٹھاتے ہوئے بولی۔''بس بی بی آپ ہاتھ دھو کر انگلی پر پٹی باندھ لیں۔''

آرزو فوراً اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔کمال رائے وہیں کھڑا رہا۔

شاہ بابا کی ناک میں دو قطرے خون ڈالنے کے بعد اس نے شاہ بابا کے سر کو تیزی سے اِدھر اُدھر ہلایا پھر اس نے جگ اُٹھا کر اپنے ہاتھ پر پانی نکالا اور اس کے منہ پر چھپکے مارے اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولی۔''بابا،آنکھیں کھولو۔بابا آنکھیں کھولو۔''

شاہ بابا نے اس کے کہتے ہی بڑی فرماں برداری سے آنکھیں کھول دیں اور مسکراتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔بیٹھتے ہی اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔اسے فوراً ہی یاد آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔گولیوں کی آواز پر چونک کر جیسے ہی وہ اُٹھ کر بھاگا تو اس نے سنہرے سانپ کو اپنے سامنے پایا۔ابھی وہ واپس پلٹ کر حصار میں جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس سنہرے سانپ نے اُچھل کر اس کی پنڈلی پر کاٹا اور چند لمحوں میں جانے کہاں غائب ہو گیا۔

شاہ بابا نے شلوار اونچی کر کے اپنا پنڈلی کا زخم دیکھا جو اب سیاہ پڑ چکا تھا۔وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔''راولا کہاں ہے؟''

''وہ گوٹھ گیا ہے،آتا ہی ہوگا۔''

''کیوں۔وہ گوٹھ کیوں گیا ہے؟''شاہ بابا نے پوچھا۔

''بابا تجھ پر سارے داؤ آزمالئے۔تُو اُٹھ ہی نہیں رہا تھا۔پھر ہم نے یہی سوچا کہ شاہ ناگ لایا جائے۔''شبورا نے بتایا۔

''اچھا۔وہ شاہ ناگ لینے گیا ہے۔''شاہ بابا کی سمجھ میں بات آ گئی۔

''ہاں بابا۔''شبورا بولی۔

''وہ تو ابھی آیا نہیں۔ پھر مجھے ہوش کیسے آیا؟'' ایک اور سوال ہوا۔

''بابا، میں بہت پریشان تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی خطرے میں پڑتی جارہی تھی تب اچانک مجھے بی بی کا خیال آیا۔ تریاق تو ہمارے پاس موجود تھا۔ راولا ویسے ہی شاہ ناگ لینے چلا گیا۔ میں نے بی بی کا دو قطرے خون تیری ناک میں ڈال دیا۔ اس تریاق نے جادو اثر دکھایا تُو ایک منٹ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔'' شبورا نے اپنا کارنامہ بڑے فخر سے بیان کیا۔

''واہ، میری بیٹی واہ۔ تُو نے تو کمال کر دیا تُو تو راولا سے دو ہاتھ آگے نکلی۔ وہ شاہ ناگ لینے گیا ہے۔ جانے کب تک آئے گا۔ اس وقت تک میں واقعی چل بستا۔'' شاہ بابا نے اپنی بیٹی شبورا کو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں آرزو اپنے کمرے سے واپس آگئی۔ اس نے اپنا ہاتھ دھولیا تھا لیکن پٹی باندھنے کی نوبت نہ آئی تھی، خون فوراً ہی بند ہو گیا تھا۔

شاہ بابا کے قریب آکر آرزو نے پوچھا۔ ''آپ ٹھیک ہو؟''

''ہاں بی بی، میں بلکل ٹھیک ہوں۔ آپ کا بڑا احسان ہے۔ آپ کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔'' شاہ بابا نے آرزو کو بڑی ممنونیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' کمال رائے شاہ بابا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہ آپ کی بیٹی نے میری بیٹی کا خون ہی کیوں لیا۔ دو قطرے تو کوئی بھی دینے کیلئے تیار ہو جاتا۔''

''جو بات بی بی کے خون میں ہے وہ کسی اور کے خون میں نہیں۔ بی بی کا خون سانپ کے کاٹے کا بہترین تریاق ہے، یوں سمجھیں جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے ویسے ہی زہر کا علاج زہر سے کیا جا سکتا ہے۔'' شبورا نے جواب دیا۔

''تمہارا مطلب ہے میرے خون میں زہر شامل ہے۔'' آرزو نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔ آپ نے دیکھا کہ میرا ابا دو منٹ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک بات میں آپ کو اور بتاؤں۔ اگر آپ کسی کو کاٹ لیں تو اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ زندہ نہ بچ سکے۔'' شبورا نے انکشاف کیا۔

اس انکشاف پر آرزو اور کمال، دونوں ششدر رہ گئے۔

''شبورا، اب ہمیں یہاں سے چلنا ہوگا۔'' شاہ بابا نے اچانک اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔

''کیوں بابا؟'' یہ کہتے ہوئے شبورا کی نظریں جانے کیوں کمال رائے پر مرکوز ہو گئیں۔

''شبورا، یہ معاملہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے، وہ جانے کیا چیز ہے میری

اتنی عمر آگئی۔ بڑے بڑے سانپوں کو قابو میں کر لیا اپنا غلام بنا لیا لیکن ایسا سانپ میں نے کبھی نہیں دیکھا وہ چھلاوہ ہے چھلاوہ۔ اس پر نظر ہی نہیں ٹکتی۔'' شاہ بابا نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے چلتے ہیں بابا۔ راولا تو آ جائے۔'' شبورا نے کہا۔

''وہ اتنی جلدی نہیں آئے گا۔ ہم اس کی جھولی لے چلتے ہیں وہ خود ہی گوٹھ واپس پہنچ جائے گا۔'' شاہ بابا بولا۔

''آپ لوگ رک جائیں۔ اپنے بیٹے کو واپس آنے دیں وہ میری گاڑی میں گیا ہے وہ واپس آجائے تو میں گاڑی میں ہی آپ لوگوں کو گوٹھ تک چھڑوا دوں گا۔ رات کا وقت ہے اب کس طرح گوٹھ تک جاؤ گے۔'' کمال رائے نے شاہ بابا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''بابا، صاحب جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' شاہ بابا سے پہلے شبورا بات کو سمجھ گئی۔

شاہ بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی بیٹی کو غور سے دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

لعل محمد خاصی تاخیر سے بنگلے واپس پہنچا۔ وہ اتنی دیر سے آیا کہ شاہ بابا نے بے چین ہو کر کئی بار واپسی کا قصد کیا لیکن کمال اور شبورا نے تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کا کہہ کر اس کو ہر مرتبہ روک لیا۔

لعل محمد واپس آیا تو اس کی اپنی حالت خراب تھی وہ اکیلا ہی واپس آیا تھا اس پر اچھی خاصی گھبراہٹ طاری تھی۔

ثمن گوٹھ بارہ تیرہ میل کی مسافت پر واقع تھا، دو تین میل کا راستہ بھی خراب تھا۔ کچی سڑک اور جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے پھر گاڑی کو گوٹھ کے باہر ہی روکنا پڑا کیونکہ گوٹھ کی گلیاں تنگ تھیں اور اس کا گھر کافی اندر جا کر تھا۔

راولا نے لعل محمد کو اپنے ساتھ ہی لے لیا۔ اپنے مکان کا تالا کھول کر صحن کی لائٹ جلائی، اس کے بعد اس نے کمرے کے دروازے پر لگی زنجیر کھولی اور دونوں کواڑوں کو زور سے دھکا دیا۔ وہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ دیوار سے جا لگے۔ راولا نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگا بٹن آن کیا تو کمرے میں چالیس واٹ کے بلب کی دھندلی سی روشنی پھیل گئی۔

لعل محمد اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے کمرے میں ایک عجیب سی بو محسوس کی۔ اس کمرے میں دو چار پائیوں کے علاوہ زمین پر بہت سی پٹاریاں رکھی نظر آئیں لیکن راولا ان پٹاریوں کی طرف بڑھنے کی بجائے سامنے رکھی اس ٹوٹی ہوئی میز کی طرف بڑھا جس پر ایک لال کپڑا پڑا ہوا تھا۔ اس لال کپڑے کے نیچے کوئی گول سی چیز تھی۔

راولا نے اس لال کپڑے کو ہٹایا تو اس کے اندر سے ایک بڑی پٹاری نکلی۔ راولا نے اس پٹاری کا تھوڑا سا ڈھکن اُٹھا کر اندر جھانکا۔ بس اس کا پٹاری کا ڈھکن اُٹھانا ہی غضب ہوگیا۔ اس میں سے ایک سانپ بڑی تیزی سے نکلا۔ اس کی پیشانی پر پھن مارا۔ وہ ایک سنہرا سانپ تھا۔ لعل محمد نے اس سانپ کو پٹاری سے نکل کر میز کے پائے پر سرسراتے ہوئے دیکھا بس اس کے بعد وہ نظر نہ آیا کہ کدھر گیا۔ سانپ کے کاٹتے ہی راولا ہائے بابا کہہ کر زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

لعل محمد اس آفت ناگہانی کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ ایک دَم گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے وہ دروازے کے نزدیک تھا۔ آگے بڑھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ پٹاری سے نکلا ہوا سانپ دیکھ چکا تھا۔ وہ بلا سوچے سمجھے باہر بھاگا پھر اس نے پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ پورا گوٹھ سپیروں کا تھا۔ یہ بات راولا اسے راستے میں بتا چکا تھا۔ جیسے ہی ایک شخص دروازے پر آیا اس نے جلدی جلدی راولا کے ساتھ ہونے والا حادثہ بیان کر دیا۔

اس شخص نے گلی میں آ کر زور زور سے آوازیں نکالیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی مرد اپنے گھروں سے نکل آئے۔

پھر وہ سارے مرد بڑی تیزی سے راولا کے گھر میں داخل ہوئے۔

اُن کے پیچھے پیچھے لعل محمد بھی تھا۔ راولا کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دو بوڑھے بندوں نے فوراً اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مشکل یہ تھی کہ اس سانپ نے راولا کی پیشانی پر وار کیا تھا۔ زہر بہت تیزی سے اس کے دماغ میں پھیل کر اس کے جسم کو مفلوج کرتا جا رہا تھا۔ راولا کے جسم میں شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ لوگ احتیاطی تدابیر کے طور پر جو کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کیا لیکن راولا کی زندگی ہی اتنی تھی اس کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اس کے ناک سے اچانک کالا خون نکلا اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

اس کی موت کا یقین ہونے کے بعد بستی والوں نے لعل محمد سے کہا کہ وہ فوراً واپس جائے اور شاہ بابا کو اس حادثے کی اطلاع کرے تب تک ہم اس کی تدفین کے انتظامات کرتے ہیں۔ راولا کی لاش بہت تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ اسے زیادہ دیر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

لعل محمد نے جو ٹمن گوٹھ سے گاڑی اُڑائی تو سیدھے بنگلے پر آ کر دَم لیا اس کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے راولا کو جس انداز سے تڑپتے ہوئے دیکھا تھا اسے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

لعل محمد کو اکیلا آتا دیکھ کر شاہ بابا کا ماتھا ٹھنک گیا وہ گھبرا کر بولا۔ ''راولا کہاں ہے؟''

وہ اس بات کا کیا جواب دیتا۔ وہ گم صم کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات شروع

کرے۔ بوڑھے باپ کو اس کے بیٹے کی جوان موت کے بارے میں کیسے مطلع کرے۔

تب کمال رائے اس کے قریب آیا اور لعل محمد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ''کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے کیا؟''

''شاہ بابا کا بیٹا چل بسا۔ اسے سانپ نے ڈس لیا۔'' لعل محمد اپنے مالک کے استفسار پر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے بولنا پڑا اور یہ بات اس نے اتنے زور سے کہی کہ ان دونوں نے بھی سن لی۔

بس پھر کیا تھا۔ شبورا جو راولا کی جھولی سمیٹ رہی تھی۔ سامان وہیں چھوڑ کر لعل محمد کے پاس آئی اور جذباتی انداز میں بولی۔ ''کیا کہا تم نے۔ میرا بھائی مر گیا۔''

اس خبر نے چند لمحوں کیلئے شاہ بابا پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ کبھی اپنی بیٹی کو دیکھتا کبھی لعل محمد کو، پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔''

تب جواب میں لعل محمد کو پوری روداد سنانا پڑی۔ یہ جان لیوا روداد سن کر دونوں تڑپ گئے۔ شاہ بابا کا دہرا نقصان ہوا تھا۔ اس کا بیٹا جان سے گیا ہی تھا، وہ سنہرا سانپ اس کے سب سے قیمتی سانپ، شاہ ناگ کو جسے راولا لینے گیا تھا۔ ٹکڑے کر گیا تھا۔ شاہ بابا کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

شبورا نے یہ قصہ الم بڑی ہمت سے سنا پھر اس نے اپنے باپ کا سیدھا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے سر پر رکھا اس کے اس عمل پر شاہ بابا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''نہیں شبورا نہیں۔''

وہ جان گیا تھا کہ اس کی بیٹی آگے کیا کرنے والی ہے۔ وہ ایک ایسا عہد کرنے جا رہی تھی جس میں جان کو خطرہ ہی خطرہ تھا۔ بیٹا تو چلا گیا تھا۔ اب وہ بیٹی کو کیسے خطرے میں ڈال دیتا لیکن شبورا نے باپ کے ردعمل کی پرواہ نہیں کی۔ وہ شدید غم و غصے میں تھی۔ اس نے باپ کا سیدھا ہاتھ سر پر رکھ کر کہا۔ ''بابا مجھے تیری قسم ہے۔ اب یہ ناگ نہیں یا میں نہیں۔ میں شوم کا عمل کروں گی۔''

شاہ بابا اس قسم سے اسے بچانا چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ نا، نا کرتا رہ گیا اور اس نے شاہ بابا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر قسم اُٹھا بھی لی۔ اس نے قسم بھی بڑی خطرناک کھائی تھی۔ شوم ایک ایسا عمل تھا جسے کرتے ہوئے بڑے بڑے سپیرے گھبراتے تھے۔ اس میں ہر لمحے جان کا خطرہ تھا۔ لیکن اس عمل کے پورا ہونے کے بعد بڑے سے بڑا ناگ بھی کیچوا بن جاتا تھا۔

پھر وہ دونوں اپنا سامان سمیٹ کر چلنے لگے جاتے ہوئے شبورا نے آرزو سے کہا۔ ''فکر مت کرنا بی بی میں ایک مرتبہ پھر آؤں گی۔ اب یہ سانپ نہیں یا میں نہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

آرزو اس کا یہ عزم سن کر اندر ہی اندر لرز گئی تھی۔ وہ اس لڑائی کا انجام جانتی تھی۔ رنسارو کو زیر کرنا آسان نہ تھا۔ شبورا کی زندگی اسے صاف خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ شبورا سے آرزو کو ایک لاشعوری طور پر لگاؤ محسوس ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ تیوح کی ہو بہو تصویر تھی۔ یہ اور بات ہے کہ تیوح کا کردار کچھ اور تھا، جس سے آرزو واقف نہ تھی اور شبورا کا انداز کچھ اور تھا جس سے آرزو دھیرے دھیرے واقف ہو رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینے کیلئے قسم کھائی تھی لیکن رنسارو کی موت سے آرزو کو بھی تو فائدہ تھا۔ وہ سنہری سانپ جو اس کی زندگی کیلئے عذاب بنا ہوا تھا۔ اس سے چھٹکارا مل جاتا۔

کمال رائے نے لعل محمد کو حکم دیا کہ وہ ان دونوں کو چھوڑ کر آئے اس نے چلتے ہوئے شاہ بابا کو کچھ پیسے دینے کی کوشش کی تو اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”سانپ کے کاٹے کا علاج یا سانپ پکڑنے کا کام ہم کچھ نہیں لیتے۔“

پھر اس نے وہ پیسے لعل محمد کو دے دیئے اور ہدایت کی کہ گوٹھ پہنچ کر خفیہ طور پر یہ پیسے شاہ بابا کے کسی رشتے دار کے حوالے کر دے۔

جب شبورا گاڑی میں بیٹھنے لگی تو بیٹھتے بیٹھتے رک گئی، چند قدم کے فاصلے پر کھڑے کمال رائے کی طرف بڑھی اور دھیرے سے بولی۔ ”اچھا صاحب جی میں چلتی ہوں۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

جانے اس جملے میں کیا بات تھی کہ کمال رائے کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔ اس کے دل میں بے پناہ دکھ کا احساس جاگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی متاع زندگی اس سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے اختیار اس کا جی چاہا اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھ دے لیکن وہ سوچتا ہی رہ گیا۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر چونکا لیکن اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی جیسے وہ پتھر کا ہو گیا تھا۔ گاڑی جانے کے بعد آرزو اپنے باپ کے قریب آئی اور اس کی کھوئی ہوئی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ ”بابا آئیں اندر چلیں۔“

آرزو کی آواز سن کر اسے جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک سرد آہ بھری اور آرزو کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ”آؤ بیٹا۔“

☆......☆......☆

لعل محمد نے ثمن گوٹھ پہنچ کر جب گاڑی روکی تو اسے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بستی کے باہر کئی لوگ

نظر آئے جو گاڑی کو دیکھتے ہی فوراً نزدیک آ گئے۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ بستی کے لوگوں نے تدفین کے سارے انتظامات کر لئے تھے۔ راولا کی لاش بہت تیزی سے گل رہی تھی۔ اسے بڑی مشکلوں سے غسل دیا گیا تھا، اسے کفن پہنایا جا چکا تھا لیکن کفن پر جگہ جگہ کالے دھبے نمایاں ہو رہے تھے۔

شاہ بابا کے آتے ہی اسے اپنے بیٹے کا آخری دیدار کرایا گیا، اگرچہ بستی کے کچھ بزرگ چاہتے تھے کہ شاہ بابا کو راولا کی شکل نہ دکھائی جائے کیونکہ اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا، اس کا چہرہ دیکھ کر مزید دُکھ بڑھتا لیکن شاہ بابا نہ مانا، اس نے اپنے بیٹے کی بگڑی ہوئی شکل اپنی دھندلائی آنکھوں سے دیکھی اور پھر گھر کے ایک کونہ میں منہ پھیر کر سسک سسک کر رونے لگا۔

شبورا نے بھی اپنے بھائی کا چہرہ بغور دیکھا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تجدید عہد کی اور پھر وہ بھی گھر کے دوسرے کونے میں جا کھڑی ہوئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

بستی کے بڑے بوڑھوں نے شاہ بابا کو سنبھالا اور بستی کی بڑی بوڑھیوں نے شبورا کو تسلی دی۔

☆......☆......☆

راولا کی موت کے ساتویں دن شبورا صبح تڑکے ہی گھر سے نکلی۔ گھر سے قدم باہر نکالنے سے پہلے اس نے اپنے باپ کا سیدھا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور اس سے جانے کی اجازت طلب کی۔ شاہ بابا نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ جانتا تھا کہ شبورا کس راستے پر جا رہی ہے۔

وہ دروازے تک اسے چھوڑنے آیا اور اس کے دروازے سے نکلتے ہی وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔ بیٹا تو جا ہی چکا ہے۔ اب بیٹی نے بھی رخصت لے لی تھی......کون جانے وہ زندہ واپس آئے یا نہ آئے۔

شبورا جانتی تھی کہ اس نے ایک پرخطر راستے پر قدم رکھ دیا ہے، شوم کا عمل کوئی آسان کام نہ تھا، اس عمل کو کرتے ہوئے بڑے بڑے سپیرے گھبراتے تھے لیکن اس میں جانے کہاں سے ہمت آ گئی تھی، ایک تو اسے اپنے بھائی سے بہت محبت تھی پھر جس انداز میں راولا کی موت ہوئی تھی، وہ اس کیلئے ایک چیلنج بن گئی تھی......اس کے علاوہ اس نے آرزو کو جس حال میں پایا تھا، اسے دیکھ کر اس کا دل دُکھ گیا تھا۔ اس سے ہمدردی ہو گئی تھی، وہ اس معصوم لڑکی کو اس موذی کے چنگل سے نکال لینا چاہتی تھی ......اور پھر اس لڑکی کا باپ، جانے اس میں کیا بات تھی کہ وہ اس کے دل کے مقفل دروازوں کو کھلتا ہوا اندر گھسا چلا آتا تھا۔

شبورا بستی کی عام عورتوں کی طرح نہ تھی، اس عمر میں تو بستی کی عورتیں پانچ پانچ چھ چھ بچوں کی

مائیں بن کر چولہا جھونک رہی ہوتی ہیں لیکن شبورا کی عمر پینتیس سال سے کم نہ تھی، اس کی آدھی زندگی بیت چکی تھی لیکن اس نے ابھی تک شادی نہ کی تھی، ایسا نہیں تھا کہ شبورا کیلئے بستی میں یا بستی سے باہر رشتے نہ ہوں، وہ ایک پرکشش عورت تھی، نوجوانی میں یہ حسن اور قیامت خیز تھا۔ بستی کے جوان اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے لیکن شبورا کو شادی سے دلچسپی نہ تھی، راولا، اس سے ایک سال بڑا تھا۔ اسے بھی شادی سے دلچسپی نہ تھی، بڑی مشکل سے اس نے شادی کی تھی لیکن راولا کی بیوی اس سے وفا نہ کر سکی۔ ایک دن اسے ہلکا سا بخار ہوا اور دوسرے دن وہ چل بسی۔ راولا کو اس سے بہت محبت تھی، وہ سات سال اس کے ساتھ رہی، کوئی اولاد نہ ہوئی لیکن راولا نے اس طرف کبھی توجہ نہ دی، وہ اپنی بیوی کو دیکھ کر جیتا اور وہی اس کیلئے کافی تھی، جب وہ نہ رہی تو اس نے دوسری شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا اور مرتے دم تک اس پر قائم رہا۔

شبورا کو شادی میں کوئی دلچسپی نہ تھی یا یوں کہنا چاہئے کہ بستی کے یا بستی سے باہر کے کسی مرد نے اسے اتنا متاثر ہی نہ کیا، وہ ایک غیر روایتی لڑکی تھی، اس نے اپنے دل میں یہ بات طے کر لی تھی کہ جب دل کسی کی طرف اشارہ کرے گا تو وہ شادی کرے گی ورنہ زندگی بھر کنواری ہی رہے گی۔ شبورا کی ماں بچپن میں چل بسی تھی، شاہ بابا نے دونوں کو پالا تھا، شاہ بابا چاہتا تھا کہ شبورا شادی کر لے، اس کے رشتے آتے ہی رہتے تھے لیکن اس نے اپنے باپ سے بھی کہا تھا کہ وہ اس کا در چھوڑ کر نہیں جائے گی، شاہ بابا نے شروع میں اسے کافی مجبور کیا، جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی تو اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی، ویسے بھی اپنی بیٹی کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ جس بات کا عہد کر لیتی تھی، اس کام کو کر کے چھوڑتی تھی۔

شبورا کو بچپن سے ہی بین سے دلچسپی تھی، بین بجانا کوئی آسان کام نہیں، یہ بہت مشکل ساز ہے، اسے ہر آدمی نہیں بجا سکتا، بین بجانے کیلئے ایک لمبے سانس کی ضرورت ہوتی ہے، مردوں سے سانس روکنا مشکل ہو جاتا ہے، کسی عورت سے اتنے لمبے سانس کی توقع کرنا عبث ہے لیکن شبورا نے چیلنج کو قبول کیا، وہ اپنے باپ کے پیچھے لگی رہی اور بالآخر اس نے بین سیکھ کر ہی چھوڑی، شاہ بابا ایک ماہر سپیرا تھا، اس کا شوق دیکھ کر اس نے اپنی بیٹی کو ہر وہ چیز سکھا دی جو اس کے سینے میں محفوظ تھی، وہ اپنی بستی کی پہلی خاتون سپیرن تھی جسے نہ صرف بین بجانا آتی تھی، وہ سانپ پکڑنے کے فن سے بھی واقف تھی، اس نے اپنے باپ کے ساتھ رہ کر کئی نادر سانپ پکڑے تھے، ان سانپوں کی اچھی قیمت مل گئی تھی، شہر سے ایک بندہ آ کر ان سانپوں کو خرید کر لے جاتا تھا۔

شبورا کی مشکل پسند طبیعت نے آج پھر ایک مشکل فیصلہ کیا تھا، وہ صبح تڑکے ہی گھر سے نکل کھڑی

ہوئی تھی، وہ سورج نکلنے سے پہلے اپنے بھائی کی قبر پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔

قبرستان بستی کے نزدیک ہی تھا، سورج ابھی نہ نکلا تھا لیکن روشنی پھیل رہی تھی، اس نے اپنے بھائی کی قبر کو دونوں ہاتھوں سے چھوا، جھولی اپنے کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھی اور بین اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک مخصوص انداز سے قبر کے سرہانے بیٹھی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ پڑھ کر اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں کھولیں اور بین منہ میں رکھ کر ایک لمبا سانس لیا اور بین کی تیز آواز قبرستان میں پھیلتی چلی گئی۔

وہ بڑی محویت سے بین بجاتی رہی، کچھ ہی دیر میں سورج نے مشرق سے اپنا سر اُبھارا، جیسے ہی اس کے چہرے پر سورج کی روشنی پڑی اس نے بین بجانا بند کر دی پھر اس نے اپنی جھولی سے سلور کا پیالا نکالا اسے قبر کے اوپر رکھا، بین ہاتھ میں اُٹھا کر قبر کا ایک چکر کاٹا اور قبر سے ایک چٹکی مٹی بھر کر اس نے پیالے میں ڈالی۔

اس طرح اس نے قبر کے سات چکر لگائے اور سات چٹکیاں بھر کر پیالے میں ڈالیں۔

پھر وہ دوبارہ قبر کے سرہانے بیٹھ گئی، اس نے پیالے سے ایک چٹکی مٹی نکال کر بین کے آخری سوراخ میں ڈالی اور پھر یہ مٹی بین میں پھونک مار کر فضا میں اُڑا دی۔

اب اس نے دوبارہ بین بجانا شروع کی پھر اس نے کچھ دیر بین بجانے کے بعد ایک جھٹکے سے بین اپنے منہ سے نکلی اور پیالے سے ایک چٹکی مٹی اُٹھا کر اپنی مانگ میں ڈالی، قبر کی مٹی اپنی مانگ میں ڈالتے ہوئے اپنے دل ہی میں دل شبورا نے کچھ پڑھا، اس نے پھر بین اپنے منہ سے لگا لی اس طرح وہ بار بار بین بجا کر راولا کی قبر کی مٹی اپنے سر میں ڈالتی رہی یہاں تک کہ ایک چٹکی مٹی رہ گئی۔

پیالے میں بچنے والی مٹی کو اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا اور پھونک مار کر اُڑا دیا، اب اس نے دوبارہ بین سنبھالی اور منہ میں لے کر اسے بجانے کا آغاز کیا۔

اس کی بین کی آواز پورے قبرستان میں پھیل رہی تھی، شاہ بابا دھیرے دھیرے چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو رہا تھا، اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک لمبا سا گلاس تھا جو ایک تانبے کی چھوٹی سی قلعی شدہ رکابی سے ڈھکا ہوا تھا، شاہ بابا کے کان بین کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

شبورا بڑے پرسوز انداز میں بین بجا رہی تھی۔ اس کے بین بجانے کے اس پختہ انداز سے وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا، ایسی بین تو راولا بھی نہیں بجاتا تھا، یہ پختگی بس خود اس کے اپنے انداز میں تھی، شاہ بابا نے اپنا سر فخر سے بلند کر کے دور بیٹھی شبورا کو دیکھا اور پھر تیزی سے قبر کی طرف بڑھنے لگا، وہ جانتا تھا کہ اب تک ایک آدھ سانپ اس کے قریب ضرور پہنچ چکا ہوگا۔

اور ہوا بھی ایسا ہی...... جب وہ شبورا کے نزدیک پہنچا تو اس نے زرد رنگ کے سانپ کو ایک قبر سے اُتر کر شبورا کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا، شاہ بابا نے فوراً دودھ کا گلاس زمین پر پڑے ایک پتھر پر رکھا اور تیزی سے اس زرد سانپ کی طرف بڑھا پھر اس نے اس سانپ کو رسی کی طرح پکڑ لیا، اس کا پھن شاہ بابا کے ہاتھ میں تھا اور وہ لہرا رہا تھا، وہ زیادہ بڑا سانپ نہ تھا، شاہ بابا نے شبورا کے نزدیک رکھی پٹاری کھول کر وہ سانپ اس میں چھوڑ دیا، وہ بل کھاتا ہوا پٹاری میں داخل ہو گیا، شاہ بابا نے پٹاری فوراً بند کر دی۔

شبورا آنکھیں بند کئے بین بجانے میں مصروف تھی، شاہ بابا نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر نزدیک ہی بیٹھ گیا اور شبورا کو بڑے فخر سے دیکھنے لگا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس نے بین اپنے ہونٹوں سے جدا کی، آنکھیں کھولیں تو اپنے باپ کو اپنے سامنے پایا جو اپنی بوڑھی آنکھوں میں محبت جگائے اسے بڑے فخر سے دیکھ رہا تھا، اپنے بابا کو فخریہ انداز سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کر کے اس کا دل سرشار ہو گیا۔

شاہ بابا نے دودھ سے بھرا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لے شبورا، دودھ پی لے تیرا سانس پھول گیا ہوگا۔''

''ارے نہیں بابا...... ابھی چاہتی تو تین گھنٹے تک مزید بین بجا سکتی تھی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' شاہ بابا نے خوش ہو کر کہا۔ ''بستی میں کوئی نہیں تیرے جیسا۔''

''بابا، کوئی ہو بھی نہیں سکتا...... میں شاہ بابا کی بیٹی ہوں...... شاہ بابا جیسا سپیرا تو بستی چھوڑ دور دور تک کوئی نہیں۔'' شبورا نے بڑے فخر سے کہا اور گلاس منہ سے لگا لیا۔

وہ ایک ہی سانس میں ہاتھ بھر لمبا دودھ کا گلاس غٹاغٹ پی گئی اور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی اپنے باپ کو دیکھنے لگی۔

''ایک سانپ پکڑا ہے۔'' شاہ بابا نے بتایا۔

''اچھا، کیسا ہے؟''

''بے دانت کا، دودھ پیتا بچہ ہے۔'' شاہ بابا نے ہنس کر کہا۔

''اچھا میری طرح کا......'' یہ کہہ کر شبورا ہنسی۔ شاہ بابا بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

پھر شبورا نے پٹاری کا ذرا ڈھکن اُٹھا کر اس میں جھانکا اور پٹاری زمین پر رکھ کر اپنی بین اُٹھالی۔

سایہ غائب ہونے تک اپنی بین جاری رکھی، شاہ بابا اس کے پاس ہی بیٹھا رہا اور شبورا کے نزدیک آنے والے سانپوں کو پکڑ پکڑ کر پٹاری میں ڈالتا رہا۔

کوئی بارہ بجے تک شبورا نے بین بجائی، اس کے بعد اس نے اپنی بین منہ سے نکال کر قبر پر رکھ دی اور اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ہاں بابا شوم کی ابتدا کیسی ہے؟''

''بہت اچھی......'' شاہ بابا خوش ہو کر بولا۔ ''تو نے تو کمال کر دیا۔''

''ہیں بابا...... میں نے کیا کمال کیا ہے...... ذرا بتاؤ۔''

''میں اب تک سات سانپ پکڑ چکا ہوں...... اس سے زیادہ کمال اور کیا ہو سکتا ہے۔'' شاہ بابا نے کہا۔

''واقعی بابا...... یہ تو نے بڑے تعجب کی بات ہے اور خوشی کی بھی۔'' شبورا پر مسرت لہجے میں بولی۔

''چلو شبورا، اب گھر چلو...... آج کا کام تو ختم ہوا۔''

''ہاں بابا...... آج کا کام ختم۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جھولی سنبھالنے لگی۔

☆......☆......☆

کمال رائے نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی...... عجیب خواب تھا وہ...... اس نے دیکھا کہ وہ ایک لق و دق صحرا میں گھوم رہا ہے، تن تنہا، پا پیادہ...... اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ صحرا میں کافی عرصے سے بھٹک رہا ہے شاید وہ کسی کی تلاش میں ہے، اس کے جسم پر جو لباس ہے وہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے پھر اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ شبورا کی تلاش میں ہے، شبورا جیسے کہیں کھو گئی ہے۔ کمال رائے سوچتا ہے کہ اگر وہ کھو گئی ہے تو اسے آواز دینا چاہئے بغیر پکارے بھلا وہ کیسے سن سکتی ہے، اس خیال کے آتے ہی وہ زور زور سے پکارنے لگتا ہے، اسے آوازیں دینے لگتا ہے۔

''شبورا...... شبورا۔''

اس کے اس والہانہ انداز میں پکارنے اور صحرا میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھ کر کوئی کہتا ہے۔

''ارے، یہ تو مجنوں ہے۔''

وہ گھڑی دیکھتا ہے، رات کے تین بجے تھے، وہ اُٹھ کر واش روم جاتا ہے اور پھر اس خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے سو جاتا ہے۔ دوبارہ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو سب سے پہلے اسے یہ خواب یاد آتا ہے، وہ اس خواب کو یاد کر کے مسکرا اُٹھتا ہے۔ عجیب خواب تھا۔ بھلا شبورا کے خواب میں آنے کی کیا تک...... اور وہ بھی اس انداز میں کہ وہ شبورا کیلئے صحرا میں بھٹک رہا ہے اور لوگ اس کے بارے میں تصور کر رہے ہیں کہ وہ مجنوں ہو گیا ہے...... یہ کیسی احمقانہ بات تھی...... یہ کیسا احمقانہ خواب تھا۔

نہیں، یہ احمقانہ خواب نہیں...... اس کے دل کے کسی نہاں خانے سے آواز آئی۔ اس عورت

میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ تمہارے دل میں چپکے سے بیٹھ گئی ہے، تمہارا دل اس کی طرف کھنچ رہا ہے، تم اس کے خواب دیکھ رہے ہو اور تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں کہ تمہارا دل اس کو کس طرح دیکھ رہا ہے۔

یہ خواب پورے دن اس کے دل و دماغ پر چھایا رہا، رہ رہ کر اس کا خیال آتا رہا اور اپنی اس کیفیت پر وہ رہ رہ کر ہنستا رہا، مسکراتا رہا۔

☆......☆......☆

یہ اکیس دن کا عمل تھا۔

اس میں مختلف مرحلے تھے، راتیں بھی تھیں، دوپہریں بھی تھیں اور شامیں بھی تھیں۔

اس عمل پر عمل پیرا ہوتے شبورا کو تین دن گزر چکے تھے، شوم کے دوران کھانا پینا بند ہو جاتا تھا، دودھ اور پانی کے سوا کوئی اور چیز نہیں کھا پی سکتی تھی۔

آج شوم کا چوتھا دن اور پہلی رات تھی، آج رات بارہ بجے سے صبح چار بجے تک قبرستان میں رہ کر عمل کرنا تھا، یہ بہت مشکل مرحلہ تھا، ایک تو اندھیری رات اوپر سے قبرستان اور وہ اکیلی......

شبورا، رات کو قبرستان میں بسیرا کرنے کیلئے اپنی تیاری کر رہی تھی، شاہ بابا اسے فکرمندی سے دیکھ رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ شوم کس قدر خطرناک عمل ہے، ذرا سی غفلت بندے کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے، شبورا کے سوا اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا، وہ اپنا بیٹا کھو چکا تھا اور بیٹی جواب اس کی زندگی کا سہارا تھی، اسے بے سہارا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

تین دن ہوئے تھے، شوم کا یہ ابتدائی مرحلہ تھا، ابھی اس عمل کو ترک کرنے کی گنجائش تھی لیکن آج کی رات گزر جانے کے بعد واپسی کے سارے راستے بند ہو جاتے تھے، شاہ بابا بار بار نظریں اُٹھا کر شبورا کو دیکھ رہا تھا، وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بار بار اس کی بات لبوں پر آ کر دم توڑ جاتی تھی۔

''دیکھ شبورا اب بھی وقت ہے۔'' بالآخر شاہ بابا ہمت کر کے اپنی بات لبوں تک لے آیا۔

''کس چیز کا بابا......'' وہ اپنا سامان سمیٹتے سمیٹتے رک کر بولی۔

''دیکھ شبورا......راولا تو چلا گیا، وہ میرا بڑا فرماں بردار بیٹا تھا، وہ ہیرا تھا ہیرا......اس کی موت کا مجھے بڑا دکھ ہے، میں جیسے چلتی پھرتی لاش بن گیا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں بابا......وہ آپ کا بیٹا تھا تو وہ میرا بھائی بھی تھا......وہ ایسا بھائی تھا جس پر بہنیں بڑا مان کرتی ہیں، وہ بہنوں پر جان چھڑکنے والا بھائی تھا، وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا، اسے کسی ظالم نے مجھ

سے چھین لیا، مجھے اپنے بھائی کے چھن جانے کا بڑا غم ہے، اس سے زیادہ مجھے اس ظالم پر بڑا غصہ ہے جس نے میرے پیارے بھائی کو چھینا ہے...... بابا میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔''

''دیکھ شبورا راولا تو چلا گیا......اگر تجھے کچھ ہو گیا تو میں کس کے سہارے زندگی گزاروں گا، بس مجھے تو اتنا بتا دے۔'' شاہ بابا نے اسے حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ شبورا، اب بھی وقت ہے، مان جا......''

''بابا......ایسی باتیں کر کے میرے ارادوں کو کمزور نہ کر...... مجھے کچھ نہیں ہوتا تو بس میرے لئے دعا کر۔''

''بابا...... میں نے تیری قسم کھائی ہے، اپنے بھائی کی قسم کھائی ہے...... میں نے اس معصوم لڑکی سے بھی وعدہ کیا ہے جس پر اس ظالم نے قبضہ کر رکھا ہے...... بابا، میری قسمیں اور میرے وعدے نہ تڑوا۔'' شبورا نے اس کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا......شبورا...... جیسی تیری مرضی۔'' بالآخر شاہ بابا نے ہتھیار ڈال دیئے۔

وہ اپنی بیٹی کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح آشنا تھا، وہ جانتا تھا کہ شبورا نوٹ جائے گی۔ لیکن اپنا عزم نہیں توڑے گی، اس نے شوم کا عہد کر لیا تھا اور تین دن شوم میں گزار بھی لئے تھے، اب اس کی واپسی ممکن نہ تھی، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ شوم کا عہد اس نے راولا کی موت کا انتقام لینے کیلئے کیا ہے......ساتھ ہی وہ آرزو کو بھی بچانا چاہتی تھی......اسے آرزو بہت اچھی لگی تھی، وہ اس پیاری سی لڑکی کو ہر قیمت پر اس کے چنگل سے چھڑوانا چاہتی تھی۔

''لے شبورا، دودھ پی لے۔'' شاہ بابا اس کیلئے دودھ گرم کر کے لے آیا۔

''ارے، بابا...... میں خود دودھ لے لیتی تو نے کیوں گرم کیا۔'' شبورا نے لمبا سا گلاس پکڑتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' شاہ بابا نے اسے پرشفقت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا، کیا وقت ہوا ہے؟'' شبورا نے گلاس اپنے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی گیارہ بجے ہیں۔'' شاہ بابا نے کہا۔ ''ساڑھے گیارہ بجے تک چلیں گے قبرستان......''

''بابا، یہ دیکھ۔'' شبورا نے گھبرا کر کہا۔ اس کی نظریں دودھ پر جمی ہوئی تھیں۔

شبورا کو دودھ میں کوئی چیز کلبلاتی نظر آئی تھی اور دودھ کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔

''ہاں، کیا ہوا؟'' شاہ بابا نے جلدی سے آگے بڑھ کر دودھ سے بھرا گلاس اس سے لے لیا۔ ''کیا دودھ میں کچھ ہے؟''

"ہاں، بابا۔" شبورا شاہ بابا کے نزدیک آ کر گلاس میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "کوئی سانپ کا بچہ معلوم ہوتا ہے؟"

شاہ بابا نے فوراً ہی گلاس فرش پر اُلٹ دیا۔ سارا دودھ فرش پر بکھر گیا۔ تب ان دونوں نے دیکھا کہ سانپ کا ایک چھوٹا سا بچہ دودھ کے درمیان موجود ہے۔ وہ بہت دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔ گویا موت کی آخری سیڑھی پر تھا۔ شاہ بابا نے جوتے کی نوک سے اس سانپ کے بچے کو پلٹ کر دیکھا۔

"بابا، اگر یہ دودھ میں پی لیتی...... تو کیا ہوتا؟" شبورا نے نیلے دودھ اور سانپ کے بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ گلاس میں کس طرح آ گیا۔" شاہ بابا حیران تھا۔

"بابا، دیگچی میں ہوگا۔" شبورا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"دیگچی میں ہوتا تو مجھے نظر آتا...... دودھ کی رنگت بھی اس وقت سفید تھی۔"

"نہیں بابا۔" شبورا نے کہا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں دیگچی دیکھتی ہوں۔"

"تو دیگچی دیکھ...... میں ذرا اس سانپ کے بچے کو دیکھ لوں۔" شاہ بابا نے بڑی توجہ سے اسے دیکھا۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ وہ سانپ کا بچہ نہیں بلکہ پورا سانپ ہے اور اتنا زہریلا کہ دودھ کا ایک گھونٹ شبورا کیلئے کافی ہوتا۔ شاہ بابا نے اسے جوتے کی نوک سے ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔ اب زندگی کی کوئی رمق بھی اس میں باقی نہ تھی۔

شبورا باورچی خانے سے آئی تو اس نے اور ہی انکشاف کیا، وہ بولی۔ "بابا، دیگچی کا دودھ بالکل صاف ہے۔"

"اور یہ سانپ کا بچہ نہیں، پورا سانپ ہے، انتہائی زہریلا۔" شاہ بابا نے بھی جواب میں حیرت انگیز انکشاف کیا۔

"اوہ، بابا...... اگر میں بغیر دیکھے دودھ پی جاتی تو...... وہ تو اتفاق سے میری نظر اس پر پڑ گئی۔"

"دودھ کا ایک گھونٹ...... تیری جان لینے کیلئے کافی ہوتا۔"

"یہ سانپ اچانک آیا کہاں سے؟"

"شبورا تو بھول گئی کہ تو شوم کا عمل کر رہی ہے، آج اس عمل کی پہلی رات ہے۔ میں نے تجھے بتایا تو ہے کہ یہ کام جان جوکھوں کا ہے، قدم قدم پر زندگی کو خطرہ ہے۔"

"بابا، مجھے ڈرائیں نہیں، میرا حوصلہ بڑھائیں...... ویسے اب میں بڑھا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں

گی، چاہے کچھ ہو جائے۔" شبورا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"آئندہ ہوشیار رہنا...... دودھ کو دیکھ بھال کر پینا۔" شاہ بابا نے اسے سمجھایا۔

"ہاں، بابا...... ہوشیار تو رہنا ہوگا۔" شبورا نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے اس چھوٹے سے سانپ کو دیکھا جو فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ "اس کا کیا کروں، کوڑے کے ڈبے میں ڈال دوں۔"

"نہیں۔" شاہ بابا نے کہا۔ "اسے زمین میں دفن کرنا ہوگا۔" یہ کہتے کہتے اس کی نظر زمین پر پھیلے دودھ پر پڑی تو وہ فوراً بولا۔ "اری شبورا، دودھ دیکھ۔"

شاہ بابا نے فرش پر بیٹھ کر دودھ کو ذرا سا کریدا تو وہ زمین سے اُکھڑ گیا۔ شاہ بابا نے کاغذ کی طرح اُکھڑے ہوئے دودھ کو پکڑ کر اُٹھایا تو وہ کسی چاندی کے ورق کی طرح زمین سے اُکھڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ سارا کا سارا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب وہ کسی ٹین کی طرح سخت ہو گیا تھا۔

یہ ایک پریشان کن بات تھی۔ شاہ بابا کی پوری زندگی سانپوں سے کھیلتے گزری تھی۔ اس نے بڑے بڑے سانپوں کے زہریلے دانت توڑ کر رکھ دیئے تھے لیکن ایسا تماشا اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس نے سانپ کو انگلی سے چھوا تو وہ غیر معمولی سخت محسوس ہوا، اب اس نے سانپ کو دفن کرنے کا ارادہ تبدیل کر دیا۔ وہ سخت ہوئے دودھ اور مرے ہوئے سانپ کو اُٹھا کر صحن میں آ گیا۔

پھر اس نے باورچی خانے سے مٹی کے تیل کی بوتل اُٹھائی اور صحن میں آ گیا۔

"بابا، مٹی کے تیل کا کیا کرنا ہے۔" شبورا نے پوچھا۔

"تو ذرا ماچس لے کر آ...... پھر دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔"

"اسے جلاؤ گے کیا؟"

"ہاں، شبورا...... اسے جلانا ہوگا۔ پتہ نہیں یہ کیا بلا ہے؟ میں نے آج تک ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔" شاہ بابا کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"لو بابا۔" شبورا نے ماچس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

شاہ بابا نے ماچس پکڑ کر جیب میں ڈالی اور بوتل میں بھرا تیل ٹین کی چادر بنے دودھ اور لوہے کی طرح سخت ہوئے سانپ پر چھڑکنے لگا۔ پھر اس نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلائی اور مٹی کے تیل پر پھینک دی لیکن وہ دیا سلائی فوراً ہی بجھ گئی۔ اس نے دوسری دیا سلائی جلا کر اس پر پھینکی مگر وہ بھی بجھ گئی۔ اب اس نے دیا سلائی پھینکنے کے بجائے جلتی ہوئی دیا سلائی کا شعلہ مٹی کے تیل کے قریب کیا تا کہ وہ آگ پکڑ لے۔

تب فوراً ہی بابا نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا کیونکہ آگ ایک دَم ہی بھڑک اُٹھی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ پورے دودھ پر پھیل گئی۔ ٹین کی چادر بنا ہوا دودھ جل کر رول سا ہونے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہاں کالی راکھ کے سوا کچھ نہ بچا۔

شاہ بابا نے ساری راکھ بڑی احتیاط سے سمیٹی اور اسے ایک پلاسٹک کی تھیلی میں جمع کرلی اور شبورا سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''چل شبورا، تیرا ڈیرہ جمانے کا وقت ہوگیا۔''

شبورا اپنا تمام ضروری سامان جھولی میں ڈال چکی تھی۔ وہ جانے کیلئے بالکل تیار تھی اس نے جھولی کندھے پر ڈالی اور بولی۔ ''چلو، بابا۔''

''شبورا، آج بے چاند کی رات ہے۔ تُو نے لیمپ لے لیا۔'' شاہ بابا نے پوچھا۔

''نہیں تو بابا۔''

''لیمپ لے لو...... اگر روشنی کی ضرورت پڑ جائے تو کیا کرو گی۔'' شاہ بابا نے سمجھایا۔

''چلو، ٹھیک ہے بابا۔'' شبورا فوراً ہی مان گئی۔

پھر شبورا نے لیمپ اس طرح اپنی جھولی میں رکھ لیا کہ اس کا تیل نہ گرے۔ پھر وہ دونوں گھر سے باہر نکلے۔ شاہ بابا کے ہاتھ میں پلاسٹک کی تھیلی موجود تھی جس میں جلا ہوا دودھ اور سانپ تھا۔

''بابا اس راکھ کا کیا کرو گے؟'' شبورا اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

''اسے قبرستان میں دفن کروں گا۔'' شاہ بابا نے بتایا۔

بستی کی گلیاں سنسان تھیں۔ گلی کے کتے منہ ڈالے سو رہے تھے۔ انہیں آتا دیکھ کر منہ اُٹھا کر غراتے جب احساس ہوتا کہ یہ بستی کے لوگ ہیں تو پھر سے منہ ڈال کر سو جاتے۔

قبرستان بستی کے نزدیک ہی تھا۔ وہ جلدی ہی قبرستان میں داخل ہوگئے۔ تاریک رات تھی۔ قبرستان میں گہرا سناٹا طاری تھا۔

وہ دونوں راولا کی قبر تک پہنچ کر رک گئے۔

شبورا اپنی جھولی اُتار کر اپنے بیٹھنے کی جگہ صاف کرنے لگی۔ شاہ بابا دو چار قبریں چھوڑ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے زمین کھودنی شروع کی۔ زمین نرم اور ریتلی تھی، جلد ہی ایک چھوٹا سا گڑھا بن گیا۔ شاہ بابا نے اس گڑھے میں راکھ سے بھری تھیلی رکھی اور گڑھے میں مٹی ڈال کر اسے برابر کردیا۔

جب وہ شبورا کے پاس آیا تو وہ حصار کھینچ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے لیمپ روشن کر کے راولا کی قبر پر رکھ دیا تھا۔ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں شبورا بڑی پراسرار سی مخلوق لگ

رہی تھی۔ وہ کسی اور دنیا کی معلوم ہو رہی تھی۔

''یہ لیمپ کیوں جلایا ہے شبورا۔'' شاہ بابا نے پوچھا۔

''بابا، تمہارے لئے۔'' شبورا بولی۔

''میرے لئے کیوں......؟ میں تو گھر جا رہا ہوں۔''

''اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کی روشنی میں آرام سے گھر پہنچ جاؤ گے۔''

ارے نہیں شبورا...... تم اسے اپنے پاس رکھو۔ میں بڑے آرام سے گھر پہنچ جاؤں گا۔ کہو تو اسے بجھا دوں۔'' شاہ بابا نے پوچھا۔

''ہاں بابا، بجھا دو...... روشنی میں کس طرح عمل ہوگا۔'' شبورا بولی۔

شاہ بابا نے لیمپ کی چمنی ہٹا کر پھونک ماری۔ لیمپ فوراً ہی بجھ گیا۔ لیمپ پر دوبارہ چمنی رکھ کر اس نے پھر سے قبر پر رکھ دیا۔ اب قبرستان میں پھر سے گہرا اندھیرا چھا گیا۔

''اچھا، شبورا میں چلتا ہوں۔'' شاہ بابا نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

شبورا کچھ نہ بولی۔ وہ اپنا کام شروع کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

گہرا اندھیرا تھا۔ لیکن شاہ بابا کو کوئی خاص دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ قبرستان تک تھوڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ قبروں کے درمیان سے راستہ ڈھونڈنا ذرا دقت طلب کام تھا۔ قبرستان سے نکلتے ہی پھر اتنی مشکل نہ رہی۔ بستی کا راستہ اس کے پاؤں کو لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راستے میں کتنے گڑھے ہیں۔ کہاں کہاں پانی بھرا ہوا ہے۔ وہ اندازے سے راستہ طے کر رہا تھا۔

جب وہ اپنی گلی میں پہنچا تو کتوں نے اچانک بھونکنا شروع کردیا۔ وہ چار پانچ کتے جانے کہاں سے اکٹھے ہوگئے تھے اور اس کے گلی میں قدم رکھتے ہی بھونکنے لگے تھے۔

شاہ بابا نے ان کتوں کو زور سے ڈانٹا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور بھونکتے رہے۔ البتہ یہ خیر رہی کہ کوئی کتا اسے کاٹنے کیلئے آگے نہیں بڑھا۔ شاہ بابا کو حیرت ہو رہی تھی کہ آج بستی کے کتوں کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ اسے پہچان کیوں نہیں رہے ہیں؟

بہرحال وہ ان سے بچتا بچاتا، ڈانٹتا پھٹکارتا اپنے گھر کے نزدیک آگیا۔ اس نے دروازے پر لگا تالا کھول کر زنجیر نیچے گرائی اور کواڑوں کو دھکا دے کر گھر میں داخل ہوا۔

پھر اس نے کواڑ بند کر کے اندر سے زنجیر لگائی اور صحن پار کر کے کمرے میں پہنچا اور بٹن دبا کر لائٹ جلائی لیکن بلب روشن نہ ہوا، تب اسے احساس ہوا کہ بجلی نہیں ہے۔ ویسے بھی اس بجلی کا کوئی فائدہ نہ

تھا۔ چوبیس گھنٹے میں مشکل سے دو چار گھنٹوں کیلئے آتی تھی۔

تب وہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں گیا۔ ماچس اُٹھا کر کمرے میں میز پر رکھی ہوئی لالٹین روشن کی، پھر اس نے دیوار سے لگی چارپائی بچھائی اور دوسری چارپائی پر رکھے بستروں میں سے ایک دری کھینچی اور چارپائی پر بچھا کر تکیہ سرہانے رکھا اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

وہ اپنی بیٹی کی طرف سے فکرمند تھا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ خواہ مخواہ ضد میں آ گئی تھی۔ شوم کا عمل کوئی آسان عمل نہ تھا۔ اگر آسان ہوتا تو ہر سپیرا عمل کر کے کامل بن چکا ہوتا۔ اس کی اتنی عمر آ گئی تھی لیکن اس نے آج تک کسی سپیرے کو شوم کا عامل نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس نے اپنے پردادا کے بارے میں ضرور سنا تھا کہ وہ شوم کے عامل تھے۔

اب تین چار نسلوں کے بعد، اس خاندان میں پھر کسی کے دماغ میں خلل ہوا تھا اور اس نے شوم کا عمل کرنے کی ٹھان لی تھی اور وہ عمل کرنے والا بھی کوئی مرد نہ تھا، عورت تھی۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا، آج اس عمل کی پہلی رات تھی۔ یہ رات اگر خیریت سے گزر گئی تو سمجھو اس عمل کی انگلی ہاتھ میں آ جائے گی۔ اگر انگلی ہاتھ میں آ گئی تو باقی راتوں میں پنجہ پکڑنا مشکل نہ ہوگا۔

شاہ بابا، چارپائی پر پاؤں لٹکائے اپنی بیٹی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ وہ اسے قبرستان میں اکیلا چھوڑ آیا تھا لیکن اس کا دل وہیں تھا۔ اگر شوم کے عامل کی قبرستان میں تنہا رہنے کی شرط نہ ہوتی تو وہ کبھی اپنی بیٹی کو اکیلا نہ چھوڑتا۔

شاہ بابا ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ وہ ایک تاریک گوشے سے برآمد ہوا۔ اس کی طرف شاہ بابا کی پیٹھ تھی۔ شاہ بابا کو اندازہ نہیں تھا کہ اگلے چند لمحوں میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اچانک لالٹین بجھ گئی۔ کمرے میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ اس سے پہلے کہ شاہ بابا کچھ سمجھتا کہ یہ لالٹین کیوں بجھ گئی۔ وہ کھڑا ہو کر دوبارہ لالٹین جلانے کی کوشش کرتا اتنے میں اس پر کوئی کپڑا آ گرا، اس کپڑے نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، جکڑ لیا۔

اس کپڑے کے گرتے ہی شاہ بابا کو یوں لگا جیسے اسے ہائی وولٹیج کا کرنٹ لگا ہو۔ اس کے سر پر آسمانی بجلی گری ہو۔ اس کے جسم کو بس دو چار جھٹکے ہی محسوس ہوئے۔ پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ جس طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا، بیٹھا رہ گیا۔

تاریک گوشے سے برآمد ہونے والے نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ اس نے شاہ بابا کو تو ٹھکانے لگایا ہی ساتھ ہی اس گھر میں جتنے سانپ پٹاریوں میں بند تھے، انہیں بھی آزاد کر دیا۔

☆......☆......☆

صبح تڑکے ہی شبورا قبرستان سے اُٹھ گئی۔ آج کی رات اس نے کامیاب عمل کیا تھا۔ رات خیریت سے گزر جانے پر وہ بہت خوش تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سارا سامان سمیٹا۔ جھولی کندھے پر ڈالی، راولا کی قبر کو جھک کر اپنے ہاتھوں سے چھوا اور تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

اسے معلوم تھا کہ بابا اس وقت دودھ لینے نکلا ہوگا یا دودھ لے کر آ گیا ہوگا، تو اپنے لئے چائے بنا رہا ہوگا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بابا اُٹھتے ہی سب سے پہلا کام کیا کرتا تھا...... وہ اُٹھتے ہی سیدھا دروازے کی طرف جاتا تھا اور اس کی کنڈی کھول دیتا تھا۔

شبورا اکثر اس سے ہنس کر پوچھا کرتی۔ ''بابا، یہ تم صبح ہی صبح دروازے کی کنڈی کیوں کھول دیتے ہو۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ ''فرشتوں کے لئے...... جس گھر کا دروازہ صبح بند ہوتا ہے وہاں سے فرشتے لوٹ جاتے ہیں۔''

شبورا ہنس کر کہتی۔ ''بابا، فرشتوں کا تو پتہ نہیں، منہ اندھیرے گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر کوئی چور نہ گھر میں گھس آئے۔''

شبورا جب گھر کے دروازے پر پہنچی تو اچھی خاصی روشنی ہو چکی تھی۔ سورج بس نکلا ہی چاہتا تھا۔ اس نے گھر کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا، یہ سوچ کر کہ وہ اندر سے کھلا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چوری چوری گھر میں داخل ہوگی اور اپنے بابا کے سامنے اچانک آ جائے گی...... لیکن دھکا دینے سے دروازہ نہیں کھلا۔ کواڑ ہل کر ضرور رہ گئے۔ تب اس نے ذرا زور سے دھکا دیا۔ دروازہ اب بھی نہ کھلا، اسے احساس ہوا کہ وہ اندر سے بند ہے۔ تو کیا بابا ابھی تک سو رہا ہے...... لیکن یہ بالکل انہونی سی بات تھی۔ ایسا ممکن نہ تھا کہ بابا روشنی ہونے تک سوتا رہے۔ وہ تو منہ اندھیرے اُٹھنے کا عادی تھا۔

پھر اس نے جھک کر کواڑ کی جھریوں میں سے اندر جھانکا۔ سامنے کمرے کا تھوڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن بابا کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اب مجبوراً اس نے دروازے کی کنڈی ہلائی۔ پھر وہ وقفے وقفے سے مسلسل کنڈی پیٹتی رہی لیکن شاہ بابا نے دروازہ نہ کھولا۔

اسے بری طرح دروازے کی کنڈی پیٹتے دیکھ کر گلی میں چلتے راہ گیر اور پاس پڑوس کے لوگ باہر نکل آئے۔

''کیا بات ہے ری...... شبورا؟'' پڑوس کے چاچا ڈینو نے اپنے گھر سے نکل کر پوچھا۔

''بابا، دروازہ نہیں کھول رہا۔'' شبورا نے قدرے پریشانی سے کہا۔

''تو کہاں سے آ رہی ہے؟'' ڈینو نے پوچھا۔

"چاچا، میں قبرستان سے آ رہی ہوں۔"

پھر جیسے ڈینو کو یاد آ گیا کہ وہ شوم کا عمل کر رہی ہے، وہ اچھا، اچھا کہہ کر گردن ہلانے لگا۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازے کو زور زور سے ہلایا۔ کنڈی بجائی، دروازہ پیٹا مگر اندر سے کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

"یہ شاہ بابا کو کیا ہو گیا...... کوئی نشہ پی کر سو گیا کیا؟" چاچا ڈینو نے ذرا ناراضگی سے کہا۔

اتنے میں دروازے پر کافی لوگ جمع ہو گئے۔ اس گھر کی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ اس پر بآسانی چڑھا جا سکتا تھا۔ ایک نوجوان نے تجویز دی۔ "میں دیوار کود کر اندر سے دروازہ کھول دیتا ہوں۔"

"ہاں، بھائی...... جا......" شبورا نے فوراً اسے اجازت دے دی۔

وہ نوجوان بندر کی طرح اُچھلا اس نے دیوار پر دونوں ہاتھ جمائے اور اُچک کر دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ پھر اس نے پلک جھپکتے ہی گھر کے صحن میں چھلانگ لگا دی اور چند لمحوں میں دروازے پر چڑھی زنجیر اُتار کر دروازہ کھول دیا۔

شبورا، بہت تیزی سے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے چاچا ڈینو اور پاس پڑوس کے دو بڑی عمر کے بندے اور چلے، باقی لوگ دروازے پر ہی کھڑے رہ گئے۔

شبورا کمرے کا دروازہ کھول کر کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنی جھولی زمین پر پٹخی۔ اس کے سامنے چارپائی پر پاؤں لٹکائے شاہ بابا بیٹھا تھا...... لیکن وہ سر سے پاؤں تک ایک بڑی کالی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔

شبورا کا دل ایک دَم دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا ہوا؟ یہ بابا کالی چادر اوڑھے کیوں بیٹھا ہے۔ کیا بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اتنا شور ہونے کے باوجود اس کی ابھی تک آنکھ نہیں کھلی۔

اس نے آگے بڑھ کر ایک دَم چادر شاہ بابا کے سر سے کھینچ لی۔

اور پھر اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

شاہ بابا سر سے پیر تک سیاہ ہو چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی نے جلا دیا ہو، وہ جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ اس کی لاش اکڑ چکی تھی۔

شبورا حیرت اور سکتے کے عالم میں اپنے باپ کی جلی ہوئی لاش کو دیکھتی رہی۔ پھر جب اسے ادراک ہوا کہ وہ کس سانحے سے گزر چکی ہے، اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے تو اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور اپنے باپ کی جلی ہوئی لاش سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگی۔

ابھی بھائی کی موت کا غم ہلکا نہ ہوا تھا کہ باپ بھی چل بسا۔ پھر اس گھر میں سانپوں کی صورت میں جو قیمتی سرمایہ تھا وہ بھی ضائع ہو چکا تھا۔ گھر میں ایک بھی سانپ موجود نہ تھا۔ سب کو آزاد کر دیا گیا تھا۔

شبورا، اس گھر میں، اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

دس گیارہ دن سے گھر میں سکون تھا۔

کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی تھی۔ آرزو پورے اطمینان اور سکون سے کالج جا رہی تھی۔ گھر میں بھی وہ پڑھتی دکھائی دیتی تھی۔ مہرو کے ہاں بھی آرزو ایک دو مرتبہ جا چکی تھی۔ مہرو بھی اس کے پاس آ چکی تھی۔ رامش خیال اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ خوب گپ شپ رہی تھی۔

کمال رائے بھی خوش تھا۔ وہ اپنے شب و روز میں مصروف تھا۔ ایک دو مرتبہ ماموں رشید سے بھی اس کی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ فون پر تو اکثر بات ہوتی رہتی تھی۔

روشن گوٹھ سے بھی نفیسہ بیگم کے فون آتے رہتے تھے۔ کمال رائے خود بھی فون کر کے ماں کی خیریت معلوم کر لیا کرتا تھا۔ ہر طرف اطمینان تھا، سکون تھا۔

پھر ایک دن صبح صبح نفیسہ بیگم کا فون آیا۔ کمال رائے ابھی بستر پر ہی تھا۔ اس نے تکیے کے برابر رکھا موبائل اُٹھا کر ہیلو 'ہیلو' کہا تو اُدھر سے نفیسہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ "کمال کیسے ہو؟" نفیسہ بیگم کی آواز میں نقاہت تھی۔ وہ اپنی ماں کی نقاہت بھری آواز سن کر تڑپ گیا۔

"ماں، کیا ہوا......؟ خیریت تو ہے۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... سب خیریت ہے...... تم پریشان مت ہو۔" وہی نقاہت بھرا لہجہ۔

"تو ماں پھر تم اس طرح کیوں بول رہی ہو؟" کمال رائے نے تڑپ کر پوچھا۔

"بیٹا بولا نہیں جا رہا...... اصل میں بولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔

"ماں، اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔"

"بیٹا...... مجھے تھوڑا سا بخار ہے۔"

"اوہ......" کمال رائے پریشان ہوا۔ "ماں، ڈاکٹر کو بلایا۔"

"ہاں، ڈاکٹر کل شام آیا تھا۔ دوا دے گیا ہے۔" نفیسہ بیگم نے بتایا۔

"اچھا، ماں...... تم پریشان مت ہو، میں ابھی ناشتہ کر کے روشن گوٹھ کیلئے نکلتا ہوں۔ دو تین گھنٹے میں تمہارے سامنے ہوں گا۔" کمال رائے نے کہا۔

"ہاں، بیٹا آ جا...... تجھے میں کئی دن سے خواب میں دیکھ رہی ہوں۔"

"بس، ماں...... اب تک تم نے خواب میں دیکھا ہے اب حقیقت میں دیکھنا۔" کمال رائے نے ہنس کر کہا۔ "ٹھیک ہے ماں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا...... میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" نفیسہ بیگم کے لہجے میں خوشی آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

ساڑھے بارہ بجے تک وہ روشن گوٹھ پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر نفیسہ بیگم کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو کمال رائے نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اُٹھنے سے روک دیا۔

"ماں لیٹی رہو۔"

نفیسہ بیگم نے پھر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا اور ایک ٹک دیکھنے لگی۔ نفیسہ بیگم کی ہتھیلیاں گرم ہو رہی تھیں۔ اس نے نفیسہ بیگم کے دونوں ہاتھ کلائی سے پکڑ لئے اور وہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔ نفیسہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔

"ماں، تم پریشان مت ہو...... ٹھیک ہو جاؤ گی...... میں ڈاکٹر سے مل کر آیا ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں...... تھوڑا سا بخار ہے۔ وہ شام تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں جانتی ہوں بیٹا۔" نفیسہ بیگم نے اپنی آنسو بھری آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ آنکھیں بند کرتے ہی آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

"پھر ماں رو کیوں رہی ہو؟" کمال رائے نے ماں کی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... بات یہ ہے کہ اب حویلی کے معاملات مجھ سے نہیں سنبھلتے...... تُو روشن گوٹھ آ کر اپنی زمین جائیداد سنبھال...... تاکہ میں سکون سے رہ سکوں۔"

"ماں، آرزو پڑھ رہی ہے۔ اسے وہاں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ بی اے کر لے تو میں اسے گھر کی کر دوں، پھر میں یہاں آ جاؤں گا۔"

"بیٹا...... پڑھائی کو چھوڑ، کون سی اس نے نوکری کرنی ہے۔ اب تو اس کی جلدی سے شادی کر دے۔ دیکھ کمال اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ مجھ میں اب پہلی سی جان نہیں رہی۔ جانے کب چل بسوں، میں اپنی آنکھوں سے اسے رخصت ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا، ماں۔" کمال رائے نے اپنی ماں کی تسلی کیلئے کہا۔

"کمال، مجھے لفظی تسلی نہیں چاہئے۔ تُو جلد از جلد آرزو کو اس کی گھر کا کر...... اور روشن گوٹھ آ کر اپنی زمین جائیداد سنبھال...... میں کب تک اس زمین جائیداد کی نگرانی کروں۔ اب مجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں، میں تجھے جلد از جلد روشن گوٹھ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسے تُو میرا حکم سمجھ۔" نفیسہ بیگم نے یہ حکم بڑے التجا آمیز لہجے میں دیا۔

"اچھا، ماں تم فکر نہ کرو، تم جیسا کہو گی، ویسا ہی ہو گا۔ میں کراچی جا کر آرزو کی رخصتی کا انتظام کرتا ہوں۔ وہ اپنے گھر کی ہو گئی تو پھر میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر جائے گا۔ میں آزاد ہو جاؤں گا۔ پھر روشن گوٹھ واپسی میں کوئی اڑچن نہ رہے گی۔ ماں تم فکر نہ کرو۔" کمال رائے نے پریقین لہجے میں کہا۔

"تم واپس آ جاؤ تو پھر تمہاری فکر کروں۔" نفیسہ بیگم نے صاف لہجے میں کہا۔

"میری فکر......؟ ماں میری کیا فکر کرنی ہے؟" کمال رائے نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں اب اکیلی نہیں رہوں گی...... آخر کب تک اکیلی رہوں۔" نفیسہ بیگم نے بات پھر بھی صاف نہ کی۔

"ماں، جب میں روشن گوٹھ آ جاؤں گا تو تم اکیلی کہاں رہو گی، میں جو یہاں رہوں گا۔" کمال رائے نے ماں کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔

"تیرے ساتھ رہ کر میں نے کیا کرنا ہے...... مجھے اب بہو کے ساتھ رہنا ہے۔" نفیسہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"ماں، اب مجھ بڈھے کی شادی کر کے کیا کرو گی؟" کمال رائے شوخی سے بولا۔

"تُو بوڑھا کہاں سے ہو گیا...... ابھی تو تجھ سے دُگنی عمر کے لوگ شادیاں رچا رہے ہیں۔" نفیسہ بیگم نے کہا۔

"ماں، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اب شادی نہیں کروں گا۔ اب مجھے آرزو کی شادی کرنی ہے، ماں تم اس کی تیاری کرو۔" کمال رائے نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں تیار ہوں...... تُو شادی کی تاریخ مقرر کر۔" نفیسہ بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

☆......☆......☆

بھئی رائے صاحب...... میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ لڑکا لڑکی کی جتنی جلد شادی ہو جائے اچھا ہے۔ آپ شادی کی تاریخ مقرر کیجئے...... میں بارات لے کر آ جاؤں گا۔" ماموں رشید نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ پھر بولے۔ "ویسے رائے صاحب یہ اچانک آپ کو شادی کا خیال کیسے آ گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ آپ آرزو کی رخصتی اس کے گریجویٹ ہونے پر کرنا چاہتے تھے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا...... میں آرزو کی شادی گریجویشن کے بعد چاہتا تھا لیکن میری ماں چاہتی ہیں کہ میں فی الفور آرزو کی شادی کر دوں۔ وہ بیمار رہنے لگی ہیں۔ میں انہیں مزید اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر انہوں نے مجھے حکم دیا ہے۔ میں ان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔" کمال رائے نے سعادت مندی سے کہا۔

"بہت اچھی بات ہے۔ مجھے خوشی ہوئی۔" ماموں رشید نے کمال رائے کو عقیدت سے دیکھتے

ہوئے کہا۔ "شادی کہاں سے کریں گے۔"

"شادی تو روشن گوٹھ سے ہی ہوگی ...... یہاں اپنا کون ہے۔ یہاں تو میں آرزو کی وجہ سے رہ رہا تھا۔" کمال رائے نے صاف گوئی سے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے......ہم بارات روشن گوٹھ لے آئیں گے۔ آپ شادی کب کرنا چاہتے ہیں۔"

"جلد از جلد......ایک ماہ کے اندر۔" کمال رائے نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔" ماموں رشید نے فوراً مان لیا۔

"رامش خیال سے بات کریں گے؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بات کرلوں گا۔ اسے بتا دوں گا۔ بھلا اسے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔" ماموں رشید نے ہنس کر کہا۔

"پھر بھی بات کرلیں تو اچھا ہے۔" کمال رائے نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سے بات کرلوں گا......اور کوئی حکم۔" ماموں رشید نے کمال رائے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

"ہاں، میری رانی۔"

آرزو نے ریسیور اُٹھا کر "ہیلو" کہا تو ادھر سے کسی نے بے تکلفی سے کہا۔

"ہاں، میری رانی؟ یہ کیا بکواس ہے۔" آرزو نے اس کی آواز پہچان کر جواب دیا۔

"جب تم مجھے، میری مہرو کہہ سکتی ہو تو میں تجھے میری رانی کیوں نہیں کہہ سکتی۔"

"پہلے اپنے بھائی سے اجازت لے لے۔" آرزو نے خوشی سے کہا۔

"بھائی سے اجازت لے لی......انہوں نے خوشی خوشی ہاں کہہ دی ہے۔"

"کیا بک رہی ہے۔ یہ تجھے صبح ہی صبح کیا ہوگیا ہے۔ آج ناشتہ کس چیز کا کیا ہے۔"

"جو روز کرتی ہوں۔" مہرو ہنس کر بولی۔

"پھر بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی ہے۔"

"بہکنے کے دن تو اب تیرے آنے والے ہیں اور تجھے کچھ خبر ہی نہیں۔" مہرو آج اسے اچھی طرح تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔

"تو سیدھی طرح بات نہیں کرے گی۔" آرزو کو غصہ آنے لگا۔

"کیا واقعی تجھے کچھ خبر نہیں۔" مہرو نے تصدیق چاہی۔

"کس بات کی؟" آرزو نے پوچھا۔

"یہی کہ تیری رخصتی ہونے والی ہے۔" مہرو نے بتایا۔

"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔"

"پھر مجھ سے سن لے......اگلے ماہ کی اکیس تاریخ کو تو رخصت ہو کر ہمارے گھر آجائے گی۔" مہرو نے بڑے والہانہ انداز میں خبر سنائی۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" آرزو کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس خبر پر کس قسم کا ردعمل ظاہر کرے۔

"کوئی تماشا نہیں......تمہاری رخصتی تو ہونی ہی ہے۔ کل نہیں تو آج......جتنی جلدی ہوجائے اتنا اچھا ہے۔" مہرو گویا ہوئی۔

"یہ جلدی کیسے ہے۔" آرزو نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"تمہارے بابا کو......تمہاری دادی کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ تمہاری شادی سے فارغ ہو کر روشن گوٹھ واپس لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ تمہاری دادی کا حکم ہے کہ شادی جلد سے جلد کردی جائے۔" مہرو نے صورتحال بتائی۔

"اوہ۔" آرزو ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئی۔

"آرزو، کیا بات ہے...... تجھے خوشی نہیں ہوئی۔" مہرو نے پوچھا۔

"یار، میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ میں چاہ رہی تھی کہ کم از کم بی اے تو کرلوں۔" آرزو نے اپنے دل کی بات بتائی۔ "بابا بھی یہی چاہتے تھے۔ اب ایک دم وہ کیوں پلٹ گئے ہیں۔"

"تمہاری دادی کی وجہ سے...... وہ روشن گوٹھ میں اکیلی ہیں۔ پھر پڑھائی تو شادی کے بعد بھی جاری رہ سکتی ہے۔ ایسا کیا مسئلہ ہے۔" مہرو نے اسے تسلی دی۔

"اری بے وقوف...... شادی کے بعد کون پڑھنے دیتا ہے۔ کیا تیرا بھائی مجھے پڑھنے دے گا۔" آرزو نے خفگی سے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں پڑھنے دے گا...... میں بات کروں گی، بھائی سے...... پھر ہم دونوں ساتھ ہی کالج جایا کریں گے۔" مہرو نے خوشی کے لہجے میں کہا۔

"میری مہرو......اگر ایسا ہوجائے تو بہت اچھا ہو۔" آرزو ایک دم خوش ہو کر بولی۔

☆......☆......☆

آرزو تکیوں سے ٹیک لگائے اسٹڈی میں مصروف تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھایا اور مترنم لہجے میں بولی۔ "ہیلو۔"

''میں بول رہا ہوں۔'' اُدھر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

''میں کون؟'' آرزو نے پوچھا۔

''واہ، بھئی واہ...... تاریخ ہمیں ایک کر دینے پر تلی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ اس خوبصورت موڑ پر ہمیں پہچاننے سے انکاری ہیں۔'' اُدھر سے شوخ لہجے میں کہا گیا۔

''اچھا، آپ ہیں...... کیا آپ کو نزلہ ہو رہا ہے۔ آپ کی آواز پہچانی نہیں گئی۔'' آرزو نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' رامش خیال نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔'' آرزو نے ہنس کر کہا۔ ''اور سنائیں۔''

''بس اور کیا سناؤں...... اکٹھا ہی سناؤں گا...... سننے سنانے کے دن قریب ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آج کل شاعری خوب ہو رہی ہے۔'' آرزو نے ہنس کر کہا۔

''کیوں؟'' ایسا کیوں کہا۔

''بھئی جو بات ہو رہی ہے، وہ شاعرانہ انداز لئے ہوئے ہے۔ معنی خیز لہجہ...... کچھ کہنے اور کچھ چھپانے کی تمنا۔'' آرزو نے شوخ لہجے میں کہا۔

''آرزو...... ایک بات پوچھوں؟ سچ بتاؤ گی؟''

''جی فرمائیں؟'' آرزو نے سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

''تم خوش تو ہو نا؟'' رامش خیال نے پوچھا۔

''کیوں مجھے کیا ہوا؟ میں تو ہر دم خوش رہنے والی لڑکی ہوں۔''

''نئی صورتحال سے...... اس تاریخی فیصلے سے۔''

''ایسا تو ہونا ہی تھا...... آج نہیں تو کل۔''

''یہ کل بھی ڈھائی تین سالوں پر مشتمل تھی...... بھئی میں تو بہت خوش ہوں اور تمہاری دادی کو دعائیں دیتا ہوں جنہوں نے دور دکھائی دیتی منزل کو قریب کیا۔''

''اور اگر کسی اور کی منزل قریب آتے آتے دور ہو گئی ہو تو۔''

''تو ہم دادی اماں بن جائیں گے۔ اس کی دور ہوتی منزل کو پکڑ کر لائیں گے۔''

''اچھا۔'' آرزو کو اس کے اس انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ وہ بولی۔ ''واہ، دادی اماں کیا بات ہے آپ کی۔''

''جگ جگ جیو بیٹا...... دودھوں نہاؤ، پو......''

''اے بکواس نہیں۔'' آرزو نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔

''اچھا، چلو۔ اب مذاق ختم۔'' رامش خیال سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو آرزو، تمہیں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں...... مہرو نے مجھے بتایا ہے کہ تم اپنی تعلیم کی وجہ سے پریشان ہو تو آرزو میری بات اچھی طرح سن لو...... یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ جب تک تم پڑھنا چاہو گی، پڑھ سکو گی۔ تم بی اے کی بات کرتی ہو، میں تمہیں ایم اے کراؤں گا۔''

''سچ۔'' آرزو ایک دَم کھل اُٹھی۔

''دو سو فیصد سچ۔'' رامش خیال نے بڑے یقین سے کہا۔

''تھینک یو رامش۔'' آرزو نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

کمال رائے غزلوں کا کیسٹ بڑے انہماک سے سن رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کمال رائے نے ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر ڈیک کی آواز کم کی اور زور سے بولا۔ ''کون ہے آ جاؤ۔''

''دروازہ کھلا ہوا تھا اندر سے بند نہ تھا۔ آرزو کمرے میں داخل ہوئی۔ کمال رائے نے آرزو کا چہرہ غور سے دیکھا۔ آرزو پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ نہ وہ خوش نظر آ رہی تھی اور نہ ناراض۔ کمال رائے نے ڈیک بند کر دیا۔

آرزو نے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کے پاؤں پکڑ لئے اور ان پر اپنا سر رکھ کر رونے لگی۔

اس کی اس حرکت پر کمال رائے کا دل ہل گیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے پاؤں کھینچ لئے اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

''کیا ہوا بیٹا۔'' وہ پریشان ہو کر بولا۔

''بابا، کیا میں آپ کو بہت بری لگتی ہوں۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو...... تم سے کس نے کہا۔''

''آپ نے؟'' وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

''ہیں...... میں نے کب کہا؟'' کمال رائے حیران ہوا۔

''پھر یہ تاریخیں...... کیوں مقرر کرتے پھر رہے ہیں۔'' آرزو نے اپنے باپ کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔

''بیٹا...... یہ ہر باپ کی مجبوری ہے۔'' کمال رائے نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

آرزو گہری نیند میں تھی کہ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر

ہلا دیا ہو۔ اس کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ نائٹ بلب روشن کر کے سوئی تھی نائٹ بلب کا بٹن دور تھا، اسے جلانے کیلئے اُٹھنا پڑتا، لہٰذا اس نے لیٹے لیٹے کروٹ لے کر سائیڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔

ایک دھیمی سی روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی۔ اسے اپنے سامنے سیاہ لبادے والا نظر آیا۔ وہ سہم گئی۔

''اب نہیں۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا اب نہیں؟'' یہ سوال اس کے دماغ میں گونجا۔

''مجھ سے دور ہو جاؤ۔ میں اب تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے ہمت کر کے جواب دیا لیکن اس کے ہونٹ نہیں ہلے۔

''اس کی وجہ کیا ہے؟'' اس کے دماغ میں سوال گونجا۔

''میری شادی ہو رہی ہے...... تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔'' آرزو نے اسے بتایا۔

''تمہاری شادی نہیں ہو گی...... چاہے کتنی تاریخیں مقرر ہو جائیں۔'' فیصلہ کن انداز میں کہا گیا۔

''ایسا مت کہو۔'' وہ لرز اُٹھی۔

''تم مجھ سے دور ہو جانا چاہتی ہو۔'' خدشہ ظاہر کیا گیا

''ہاں۔'' دوٹوک انداز میں جواب دیا گیا۔

''ہو نہ سکو گی۔'' سیاہ لباس والا اس کے دماغ میں بولا ''میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے، اپنا گھر بار، اپنی دنیا، اپنا عیش و آرام، اپنا تاج و تخت۔''

''تم اپنی دنیا میں واپس چلے جاؤ۔ کچھ مت چھوڑو۔''

''جاؤں گا لیکن اکیلا نہیں...... تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''میرا تمہارا کیا ساتھ...... میں انسان ہوں، تم جانے کون ہو؟''

''میں جو بھی ہوں، تمہارا ہوں۔''

''میں تمہیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے قریب آؤ۔''

''مجھے اب تم سے کوئی دور نہیں کر سکتا۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔''

''تم میرے باپ کا انتخاب ہو، پر ماں نے تمہیں میرے لئے منتخب کیا...... میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

''مجھے مارنا چاہتے ہو؟''

''تم میری زندگی ہو، تمہیں مار کر میں بھلا کیسے زندہ رہوں گا۔''

''ان حالات میں، میں کس طرح زندہ رہ سکتی ہوں۔ تم آتے ہو تو مجھ پر قیامت گزر جاتی ہے۔ میں اذیت سے دوچار ہو جاتی ہوں۔'' آرزو نے کربناک لہجے میں کہا۔

''یہ سب تمہیں برداشت کرنا ہو گا۔''

''آخر تم کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ سب میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔''

''اور تمہاری شادی میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔'' اس کے لہجے میں ایک دم برہمی آ گئی۔

''تمہیں برداشت کرنا ہو گی۔''

''میں نے برداشت کرنا سیکھا ہی نہیں...... میرے اور تمہارے درمیان جو بھی آنے کی کوشش کرے گا، اسے میں ٹھیک ٹھاک سبق سکھا دوں گا۔ وہ سپیرے لوگ کچھ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ تم نے دیکھا کہ میں نے اس سپیرے کے بیٹے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا...... لیکن وہ سپیرن پھر بھی باز نہ آئی، جا کر قبرستان میں بیٹھ گئی۔ قبرستان میں بیٹھنے سے کیا ہو گا۔ مجھے اس نے کیا سمجھا ہے۔ کیا میں اتنی آسانی سے اس کے ہاتھ آ جاؤں گا۔ میں نے اس سپیرن کے باپ پر اپنی چادر ڈال دی۔ وہ ایک لمحے میں جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اب وہ گھر میں اکیلی رہ گئی ہے...... لیکن اسے ابھی میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ باپ بھائی گنوا کر بھی اسے عقل نہیں آئی۔ اب مجھے اسے آخری سبق سکھانا ہو گا۔''

''تم شبورا کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں، میں اسی کی بات کر رہا ہوں...... وہ خواہ مخواہ اپنی جان کے درپے ہو گئی ہے۔''

''دیکھو...... اسے کچھ نہ کہو۔ اگر اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔'' آرزو نے کہا۔

''وہ تمہاری کون لگتی ہے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کوئی نہیں۔''

''پھر تمہیں اس سے ہمدردی کیوں ہے؟'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔''

''لیکن مجھے معلوم ہے۔''

''کیا؟'' وہ بولی۔

''اسے دیکھ کر تمہیں اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ تمہیں توح یاد آتی ہے۔''

"ہاں، شاید......تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔"

"وہ ہوبہو تیوح کی شکل ہے......پہلی مرتبہ میں بھی اسے دیکھ کر چکرا گیا تھا۔ مجھے تیوح یاد آ گئی تھی۔ وہ میرے باپ کی پسند تھی جسے تمہارے باپ نے فنا کر دیا تھا۔"

"وہ ایسا بھلا کیوں نہ کرتے۔ وہ ان کی بیٹی کو پکڑنے آ گئی تھی۔" آرزو نے جواب دیا۔

"تم نہیں جانتیں کہ میرے باپ کا کتنا نقصان ہوا ہے۔"

"مجھے جان کی ضرورت بھی نہیں۔"

"دیکھو، تم ایسا کیوں نہیں کرتیں......؟" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیسا؟" آرزو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اس شادی سے انکار کیوں نہیں کر دیتیں۔" سیاہ لبادے والے نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"اب شادی سے انکار نہیں ہو سکتا......میرا رامش کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے۔ میں اس کی بیوی تو پہلے ہی بن چکی......بس ایک رسم باقی ہے......رخصتی باقی ہے......اور اس کی بھی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔" آرزو نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بہت خوش ہونا۔" سیاہ لباس والے کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں، بہت...... میں کیوں خوش نہ ہوں......رامش میری پسند ہے۔ وہ میرے باپ کی پسند ہے۔ میں اب بہت جلد اس کی ہو جاؤں گی۔ اس خوبصورت وقت کی تاریخ مقرر ہو چکی۔" آرزو نے اپنی بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔

"اتنا یاد رکھو کہ تم میری پسند ہو، میرے باپ کا انتخاب ہو۔ اگر تم میری نہ ہو سکیں تو پھر کسی کی نہ ہو سکو گی......یہ بات اپنی جگہ طے ہے۔"

ابھی آرزو کوئی جواب دینے والی تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا......پھر کوئی چادر گرنے کا احساس ہوا، یوں لگا جیسے کسی نے ایک بڑی چادر اس کے اوپر ڈال دی ہو۔ اس چادر کے گرتے ہی وہ اپنے حواسوں میں نہ رہی، اس پر ایک نیم غشی سی طاری ہوتی چلی گئی۔

تب وہ اپنے روپ میں آیا۔ وہ بڑی تیزی سے لہراتا ہوا، اس کے بیڈ پر چڑھا اور چادر میں داخل ہو کر اس کے مرمریں جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

☆......☆......☆

ستارہ صبح سے آرزو کے کمرے کے کئی چکر لگا چکی تھی۔ اس نے ہر بار آرزو کو مدہوش پایا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ جانے بی بی رات کو کتنی دیر تک پڑھتی رہی ہیں......نہیں اُٹھایا تھا۔ کالج کی آج چھٹی

تھی......لیکن جب گیارہ بج گئے اور آرزو نے کروٹ بھی نہ بدلی، وہ صبح سے جس طرح لیٹی تھی ویسے ہی پڑی سوتی رہی تو ستارہ کو تشویش ہوئی۔

اس نے آہستہ سے اسے ہلایا یا بار بار آوازیں دیں، تب کہیں جا کر آرزو کے جسم میں جنبش ہوئی۔ تھوڑی دیر میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنی خوبصورت آنکھوں سے ستارہ کو دیکھا، دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ ستارہ پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا بی بی......؟ خیر تو ہے......اب گیارہ بج رہے ہیں۔"

"ہاں، اُٹھتی ہوں ستارہ......میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔" آرزو نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کا چہرہ بھی زرد ہو رہا ہے......کیا لیموں کا پانی لاؤں؟"

"ہاں، لے آؤ......ستارہ۔" آرزو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں......کیا ہوا بی بی؟"

"کچھ نہیں ستارہ۔" آرزو نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ "تجھے کیا بتاؤں، جا تو لیموں کا پانی لے آ۔"

"اچھا......بی بی......ٹھیک ہے......لاتی ہوں۔" ستارہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد آرزو نے دو تکیے اپنے سر کے نیچے رکھے اور ذرا سا اونچا ہو کر لیٹ گئی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں کہیں کچھ نہ تھا، البتہ دھیمی دھیمی خوشبو ضرور پھیلی ہوئی تھی۔

آرزو کو اب اس خوشبو سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

شام کو آرزو کا جی گھبرانے لگا تو وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے؟

اصل میں اس کا جی کہیں باہر نکلنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

بیٹی کو دیکھ کر اس نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیا مگر توجہ ٹی وی اسکرین سے نہ ہٹائی۔ آرزو نے ٹی وی پر نظر ڈالی تو اسے وہاں جنگل میں شیر دھاڑتے ہوئے نظر آئے۔ شیروں کی زندگی کے بارے میں کوئی ڈاکومنٹری فلم آ رہی تھی۔ کمال رائے اس فلم کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

آرزو کو اس طرح کے پروگراموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کچھ دیر تو ٹی وی دیکھتی رہی۔ پھر اُٹھ کر باہر جانے لگی......مگر کمال رائے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"باہر۔" آرزو نے مختصر سا جواب دیا۔

"آئی کیوں تھیں؟" وہ بولا۔

"بور ہو رہی تھی۔ سوچا آپ کے پاس چلوں۔" آرزو نے بتایا۔

"تو پھر جا کیوں رہی ہو؟" کمال رائے نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے وائلڈ لائف سے کوئی دلچسپی نہیں یہ شیر آپ کو ہی مبارک ہو۔"

"اچھا، بیٹھ جاؤ۔" یہ کہہ کر کمال رائے نے ریموٹ کے ذریعے ٹی وی آف کر دیا۔ "بس۔"

"بابا...... میں بور ہو رہی ہوں...... کہیں باہر چلیں۔"

"کہاں جاؤ گی؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بابا...... سمندر پر چلیں۔"

"چلو۔" کمال رائے نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں نہ لگایا۔ فوراً فیصلہ سنایا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی سمندر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ گاڑی خود کمال رائے ڈرائیو کر رہا تھا۔ آرزو اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی مگر اپنی سوچوں میں گم تھی۔ کمال رائے نے ایک دو مرتبہ اس کی طرف دیکھا لیکن اس سے کہا کچھ نہیں۔ اس نے خاموشی سے ڈیک آن کر دیا اور اس طرح وہ غزلیں، گیت سنتے خاموشی سے سمندر پر آ پہنچے۔

یہاں کافی کم لوگ تھے۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سمندر جوش پر تھا۔ اونچی اور تیز لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ آہستہ خرامی کرتے ایک مناسب جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے۔

وہ سمندر سے اتنی دور تھے کہ کوئی بڑی لہر ہی ان کے پاؤں کو چھو سکتی تھی۔

آرزو دور کہیں سمندر میں دیکھ رہی تھی، جہاں اسے ایک جہاز کھڑا نظر آ رہا تھا۔

"آرزو، تم کچھ پریشان ہو؟" بالآخر کمال رائے سے رہا نہ گیا۔ وہ آرزو کی اس قدر طویل خاموشی کو برداشت نہ کر پایا۔ بولنے پر مجبور ہوا۔

"جی بابا...... کچھ نہیں بہت۔"

"کیا ہوا ہے......؟ مجھے بتاؤ۔"

"بابا، میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں لمحہ بہ لمحہ جل رہی ہوں، کسی موم بتی کی طرح قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوں۔ آخر کب تک جلوں گی، کب تک پگھلوں گی۔" اس کے لہجے میں کرب تھا۔

"تم پریشان مت ہو آرزو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کمال رائے نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہو گا بابا...... کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔" وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو...... تم اس قدر مایوس کیوں ہو آخر؟"

"میں جو دیکھ رہی ہوں، وہ کہہ رہی ہوں۔" آرزو نے کہیں بہت دور نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"آپ کو نہیں معلوم کہ اس نے کس قدر نقصان کر دیا ہے، وہ مسلسل تباہی پھیلا رہا ہے۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر یہ شادی ہوئی تو پھر جو کچھ بھی ہو گا، کم ہو گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا آرزو...... تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس کی دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

"بابا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس نے شبورا کے باپ کو بھی مار دیا ہے۔"

"نہیں۔" کمال رائے بری طرح چونک گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"جو کہہ رہی ہوں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے خود اس نے بتایا...... اور اب وہ شبورا کی جان کے درپے ہے کیونکہ شبورا کوئی ایسا عمل کر رہی ہے جس سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شبورا نے قسم کھائی ہے کہ وہ اسے پکڑ کر رہے گی اور اس نے بھی طے کر لیا ہے کہ اگر شبورا باز نہ آئی تو وہ اسے بھی ٹھکانے لگانے سے گریز نہ کرے گا۔"

"اوہ، یہ تو بہت بری خبر ہے...... شبورا اکیلی رہ گئی۔"

"بابا، اگر یہ شادی نہ رکی تو اب اس گھر میں تباہی آئے گی...... میں ڈرتی ہوں بابا...... وہ جانے کیا کر بیٹھے...... بابا، میں اب کسی کو کھونا نہیں چاہتی۔ بابا آپ یہ شادی ملتوی کر دیں۔"

"ارے نہیں بیٹا...... ڈرنے کی ضرورت نہیں...... وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یہ شادی انشاء اللہ اپنے وقت پر ہو گی اور ضرور ہو گی۔" کمال رائے نے بڑے یقین سے کہا۔

باپ کے اس جواب پر آرزو اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

دن کے گیارہ بجے تھے۔ بجیرو کو لعل محمد جہاں تک لے جا سکتا تھا، لے گیا...... بالآخر اسے بریک لگانے پڑے۔ آگے راستہ نہ تھا وہ گاڑی بند کر کے باہر آیا اور پھر گھوم کر ادھر پہنچا جہاں کمال رائے بیٹھا ہوا تھا۔

"مالک...... آپ گاڑی میں بیٹھیں...... میں اسے جا کر دیکھتا ہوں۔"

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' کمال رائے نے کہا پھر اسے کچھ خیال آیا۔ وہ بولا۔ ''دیکھو، لعل محمد اگر وہ تمہارے ساتھ آنا چاہے تو اسے روک دینا...... میں خود اس کے گھر جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے مالک۔'' یہ کہہ کر لعل محمد تیز قدموں سے چلنے لگا۔

ثمن گوٹھ میں کچھ پکے مکان بنے ہوئے تھے اور شبورا کا گھر کافی اندر تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی گلیاں عبور کر کے اس کے گھر کے سامنے پہنچا۔ اس نے جلدی سے دروازے پر ہلکی زنجیر کھڑکھڑائی۔

''کون ہے؟'' اندر سے فوراً ہی ایک مترنم آواز آئی، یہ یقیناً شبورا کی آواز تھی۔

''میں ہوں جی...... لعل محمد۔'' اس نے زور سے کہا۔

''لعل محمد...... کون لعل محمد؟'' یہ کہتے ہوئے شبورا نے دروازہ کھول دیا۔

جب اس کی نظر لعل محمد پر پڑی تو اس نے کمال رائے کے ڈرائیور کو فوراً پہچان لیا۔

''اچھا...... یہ تم ہو۔'' وہ خوشدلی سے بولی۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''ایک بات بتائیں جی...... شاہ بابا کیسے ہیں؟''

''شاہ بابا...... اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مالک کو ٹھیک اطلاع ملی۔'' لعل محمد نے یہ بات جیسے اپنے آپ سے کہی۔

''مالک کو کس نے بتایا؟'' شبورا حیران ہو کر بولی۔ ''آؤ تم اندر آ جاؤ۔''

''مجھے پتہ نہیں مالک کو کیسے اطلاع ملی۔ وہ میرے ساتھ آئے ہیں۔''

''مالک تمہارے ساتھ آئے ہیں۔'' شبورا کے لہجے میں حیرت اور خوشی کا ملا جلا تاثر تھا۔ ''ہاں، جی۔'' لعل محمد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کہاں ہیں وہ؟'' شبورا نے بے قراری سے پوچھا۔

''وہ جی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کو دیکھنے کیلئے بھیجا تھا۔ آپ گھر میں چلیں میں انہیں لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر لعل محمد فوراً پلٹ کر واپس چل دیا۔ اس نے شبورا کا جواب بھی نہیں سنا۔ اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔

''نہیں۔'' شبورا نے فوراً کہا تھا لیکن اتنی آہستہ کہ لعل محمد سن نہیں پایا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر آ گیا تھا۔ کسی کے آنے کی خوشی ہو اور وہ ملنے سے مجبور ہو...... شبورا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

وہ آیا بھی تو کس وقت......!

وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر بھاگی۔ اس نے ایک کمرے میں چارپائی بچھائی۔ اس پر ایک صاف سی

موٹی چادر بچھائی۔ کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری چیزوں کو جلدی جلدی سمیٹا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر لیا اور ان دونوں کمروں کو ملانے والا دروازہ کھول دیا اور دھڑکتے دل سے کمال رائے کا انتظار کرنے لگی۔

کمال رائے کی آمد کی خبر سن کر جو اس پر خوشی چھائی تھی، وہ انجانی نہ تھی۔ یہ وہی خوشی تھی جو کسی کو اپنے کے آنے پر محسوس ہوتی ہے۔ کمال رائے اس کے دل میں بس گیا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن ایسا کیوں ہوا تھا، یہ بات وہ نہیں جانتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد گھر کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کمال رائے نے اس دروازے سے اندر دیکھا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ صحن پار کر کے اسے ایک دروازہ نظر آیا جو بند تھا۔ اسے شبورا کہیں دکھائی نہ دی۔

''مالک آئیں۔'' یہ کہہ کر لعل محمد نے باہر کا پورا دروازہ کھول دیا اور گھر میں قدم رکھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے...... لعل محمد پہلے اندر جانے کی اجازت تو لے لو۔'' کمال رائے نے کہا۔

''شبورا۔'' لعل محمد نے زور سے آواز لگائی۔

''آ جائیں، اندر آ جائیں۔'' بند دروازے سے آواز آئی۔

تب وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ صحن میں انہیں ایک دروازہ اور نظر آیا جو کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں کھلے دروازے کی طرف بڑھے۔ لعل محمد نے دروازے پر رک کر کمال رائے کو پہلے اندر جانے کا راستہ دیا۔ کمال رائے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اسے ایک چارپائی نظر آئی۔ سامنے دیوار میں بنی ایک الماری تھی جس میں کچھ برتن وغیرہ رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے والے خانے میں ایک ٹین کا ٹرنک رکھا تھا۔ کمرہ خالی تھا، شبورا وہاں موجود نہ تھی۔

''صاحب جی...... آپ کی بڑی مہربانی...... آپ آئے۔'' کمرے کے اندر بنے دوسرے دروازے سے آواز آئی۔ یہ دروازہ دونوں کمروں کو ملاتا تھا اور اس وقت یہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

''شبورا، مجھے بڑا افسوس ہے۔'' کمال رائے چارپائی پر بیٹھتا ہوا بولا جبکہ لعل محمد مؤدبانہ اس کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ کمال رائے نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ اسے حیرت ضرور تھی کہ شبورا اس کے سامنے کیوں نہیں آ رہی۔

''بس صاحب جی...... مالک کی مرضی۔'' شبورا کی اندر سے آواز آئی۔

''شبورا، یہ سب کیسے ہوا؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''بس صاحب جی...... کیا بتاؤں اُس نے میرے بابا کے ساتھ بہت برا کیا۔ اس نے انہیں جلا کر

کوئلہ کر دیا۔" شبورا کی آواز میں کرب تھا۔

پھر اس نے کمال رائے کو اس حادثے کی پوری تفصیل بتا دی۔ ساری روداد سنانے کے بعد وہ بولی۔ "لیکن صاحب جی، آپ کو میرے بابا کے مرنے کی خبر کس طرح ہوئی۔"

"اسی نے بتایا جس نے میری بیٹی کی زندگی عذاب کر رکھا ہے۔" کمال رائے دُکھ سے بولا۔

"اوہ، اچھا...... اب سمجھی۔" شبورا نے دروازے کے پیچھے سے کہا۔

"اس نے تمہیں بھی دھمکی دی ہے۔"

"کیا کہا؟"

"یہی کہ اگر تم نے عمل کرنا نہ چھوڑا تو وہ تمہاری زندگی بھی ختم کر دے گا۔"

"اب اسے اپنی موت نزدیک نظر آ رہی ہے۔ اس لئے تلملایا ہوا ہے۔ میں اس کی دھمکی سے ڈرنے والی نہیں اس نے میرے بھائی کو مار دیا، باپ کی زندگی لے لی۔ اب مجھے اپنی فکر نہیں۔ ویسے بھی اس دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں، مر جاؤں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"کس نے کہا کہ فرق نہیں پڑے گا۔" کمال رائے نے بے اختیار کہنا چاہا لیکن یہ بات زبان کی نوک پر آتے آتے رہ گئی، اس نے خود کو سنبھال لیا اور حیرت سے سوچنے لگا کہ یہ کیا کہنے چلا تھا۔

"وہ بہت خطرناک ہے...... اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" کمال رائے نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"صاحب جی...... اگر میں اپنے عمل میں کامیاب ہو گئی تو پھر میں اسے کسی مرغی کے بچے کی طرح پکڑ لوں گی۔ اس کی ساری دھمکیاں دھری رہ جائیں گی۔" شبورا نے بڑے عزم سے کہا۔

"میری دعا ہے، اللہ تمہیں کامیاب کرے۔"

"صاحب جی...... آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں تو میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گی۔"

"شبورا، اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"صاحب جی...... کوئی ضرورت ہوگی تو آپ کو بتاؤں گی۔"

کمال رائے نے اپنی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر دروازے کی طرف بڑھایا اور بولا۔

"شبورا، میرا یہ کارڈ رکھ لو اس پر میرا فون نمبر اور پتہ موجود مجھے کہیں سے فون کروا دینا، خط لکھ دینا...... میں فوراً آ جاؤں گا۔"

"صاحب جی...... بڑی مہربانی آپ کی۔ یہ کارڈ چارپائی پر ڈال دیجئے۔" شبورا نے دروازے کے پیچھے سے کہا۔

کمال رائے کو ابھی شبہ تھا لیکن شبورا کے اس جواب سے اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کے سامنے آنے سے اجتناب برت رہی ہے...... لیکن آخر وہ اس سے پردہ کیوں کر رہی ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

"شبورا، کیا تم پردہ کرنے لگی ہو؟"

"نہیں، صاحب جی...... میں پردہ تو نہیں کرنے لگی لیکن میں آپ کے سامنے نہیں آ سکتی۔ اس کی ایک وجہ ہے...... وجہ مجھ سے مت پوچھنا، پھر کبھی بتا دوں گی۔"

"کوئی بات نہیں......" کمال رائے نے نرمی سے کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک بند لفافہ نکالا اور اسے وزیٹنگ کارڈ کے ساتھ رکھ دیا۔ اس لفافے میں جو رقم تھی وہ ہزاروں میں تھی۔

"آپ نے میرے سامنے نہ آنے کا برا تو نہیں مانا۔" شبورا دروازے کے نزدیک ہو کر بولی۔

"نہیں۔" کمال رائے نے مختصر سا جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

جب کمال رائے کو گاڑی میں بیٹھ کر یہ پتہ چلا کہ وہ لعل محمد کے سامنے تو آئی تھی لیکن اس کے سامنے نہیں آئی تو اسے بڑا احساس ہوا۔ اس نے اپنی اہانت محسوس کی۔ مرد تو وہ بھی تھا، اگر پردہ کرنا تھا تو دونوں سے کرتی...... کمال رائے نے دُکھ سے سوچا، اسے کیا معلوم تھا کہ مرد، مرد کا بھی فرق ہوتا ہے۔

جب شبورا کو یقین ہو گیا کہ کمال رائے گھر سے باہر جا چکا ہے تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور تیر کی طرح بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ دونوں کواڑ بھڑے ہوئے تھے۔ لعل محمد اچھی طرح دروازہ بند کر کے گیا تھا۔ شبورا نے بے قراری سے کواڑ کھولے اور باہر گلی میں جھانکا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اب گلی میں کوئی نظر نہ آئے گا کیونکہ یہ گلی زیادہ لمبی نہ تھی، دو چار گھروں کے بعد بائیں ہاتھ مڑ جاتی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی، کچھ دیر گلی میں دیکھتی رہی...... جیسے جانے والے کے نقش پا ڈھونڈتی ہو۔

کارواں گزر گیا، غبار دیکھتے رہے۔

صاحب جی نے اس کے سامنے نہ آنے کی بات محسوس کر لی تھی۔ ہائے، جانے وہ کیا سوچتے ہوں گے کہ وہ ان کے سامنے کیوں نہ آئی، کیوں پردہ کر لیا، وہ تو اتنی دور سے اس کے دُکھ میں شریک ہونے کیلئے آئے تھے اور وہ پردے میں بیٹھ گئی تھی...... وہ انہیں کیا بتاتی کہ وہ ان کے سامنے کیوں نہیں آئی اور اس نے لعل محمد سے کیوں پردہ نہیں کیا۔ وہ صاحب جی کو کیسے بتاتی کہ لعل محمد ایک عام مرد ہے اور

آپ خاص......!

وہ شوم کے عمل سے گزر رہی تھی۔ ابھی دن کے بارہ بجے سے شام چار بجے تک اس نے دھوپ میں بیٹھ کر عمل کرنا تھا۔ شوم کے عمل کے دوران کسی ایسے مرد کے سامنے آنا ممنوع تھا جسے دیکھ کر دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہو، دھیان بٹتا ہو، آدمی بے اختیار ہو جاتا ہو، صاحب جی اس کیلئے انہی مردوں میں سے تو تھے جنہیں دیکھ کر دل اُتھل پتھل ہو جاتا ہے، دھیان بٹتا ہے، آدمی بے اختیار ہو جاتا ہے۔

پھر وہ کیسے ان کے سامنے آجاتی!

چلو صاحب جی تو اس کے من مندر میں بس گئے تھے......مان لیا...... پر صاحب جی کو کیا ہوا تھا۔ انہوں نے کیوں چاہا تھا کہ وہ اس کے سامنے آئے۔ اس کے پردہ کرنے کا شکوہ صاحب جی کی زبان پر کیوں آیا تھا۔ کیا ان کا دل بھی بولنے لگا ہے، کیا ان کے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔

تب اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ دروازے میں کھڑی ہے اور بستی کے کئی لوگ اس کی طرف دیکھتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ اس نے فوراً ہوش پکڑا، جلدی سے باہر کا دروازہ بند کیا اور دوڑتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں اس نے کمال رائے کو بٹھایا تھا۔ چارپائی پر ایک کارڈ اور لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ پر نظر ڈالی۔ کارڈ انگریزی میں تھا، اس پر کمال رائے کا نام، فون نمبر اور گھر کا پتہ درج تھا۔ شبورا نے پرائمری اسکول تک تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا کارڈ پڑھنا آسان نہ تھا تو مشکل بھی نہ تھا۔

اس نے وہ کارڈ الماری میں بچھے اخبار کے نیچے رکھ دیا۔ پھر اس نے چارپائی پر بیٹھ کر بند لفافہ اُٹھایا۔ وہ ایک سفید رنگ کا سادہ لفافہ تھا۔ اس نے روشنی کی طرف کر کے لفافے پر نظر ڈالی۔ اس میں لمبی سی کوئی چیز نظر آئی۔ اس نے احتیاط سے لفافہ کھول لیا۔

لفافہ میں ایک ہزار والے پانچ نوٹ تھے۔

یہ لفافہ کمال رائے نے اسے بتائے بغیر خاموشی سے چارپائی پر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ بتا دیتا تو شبورا فوراً منع کر دیتی۔ اس کی ضرورت کیلئے گھر میں ابھی کافی پیسے تھے۔ اسے پیسوں کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی وہ احسان مند ہوئی کہ چلو صاحب جی نہ صرف اس کے غم میں شریک ہونے کیلئے اس کے گھر تک آئے بلکہ اس کی مالی معاونت کرنا بھی ضروری سمجھا۔

پانچ ہزار روپے اس نے دوبارہ لفافے میں ڈال دیئے۔ پھر اس نے ٹرنک کھولا اور اس کی تہہ میں اس لفافے کو ڈال دیا۔ چارپائی سے چادر اُٹھا کر ٹرنک میں ڈالی اور چارپائی کھڑی کر کے کمرے سے نکل آئی۔

ابھی بارہ بجنے میں دیر تھی۔ آج شوم کا ساتواں دن تھا۔ آج یہ عمل دن کے بارہ بجے سے چار بجے

تک صحن میں دھوپ میں بیٹھ کر کیا جانا تھا۔ اس نے صحن میں آ کر پانی کی ٹنکی کے نیچے پلاسٹک کی بالٹی رکھی اور اس کا نل کھول دیا۔ اپنے کمرے سے ایک چادر نکال کر لائی اور باہر کے دروازے پر ڈال دی۔ اگرچہ وہ آڑ میں بیٹھ کر نہاتی تھی اور باہر کے دروازے سے جس میں جھریاں تھیں، اس کا نظر آنا مشکل تھا، پھر بھی احتیاطاً اس نے چادر ڈال دی۔ شوم کے عمل کیلئے کھلے آسمان تلے نہانا ضروری تھا۔

چادر ڈال کر اس نے باورچی خانے سے پیڑھی اُٹھائی اور بغیر دروازے کے غسل خانے سے صابن دانی لا کر پیڑھی کے برابر رکھی۔ اس نے بالٹی پر نظر ڈالی، وہ آدھی سے زیادہ بھر چکی تھی۔

پھر وہ اندر سے جا کر کالی شلوار قمیص اُٹھا لائی، یہ لباس اس نے صحن میں بندھی ڈوری پر ڈالا اور پھر وہ کپڑے سے بے نیاز ہو کر کھلے آسمان تلے نہانے لگی۔ صحن میں بھری دھوپ میں، اس کا بدن جگمگانے لگا۔ وہ جلدی جلدی نہا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ڈوری سے کھینچ کر کپڑے پہنے اور اپنے بال تولیہ میں لپیٹتی ہوئی کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ اس نے ٹوٹی میز پر رکھی چھوٹی سی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی عمل شروع کرنے میں دس منٹ باقی تھے۔

ٹھیک بارہ بجے اس نے باورچی خانے سے سرسوں کے تیل سے بھری شیشی اُٹھائی اور کچھ پڑھتی ہوئی صحن کے بیچوں بیچ میں ایک دائرے کی شکل میں تیل گرانے لگی، یہ ایک اتنا بڑا دائرہ تھا کہ اس میں تین چار آدمی باآسانی سا سکتے تھے۔ تیل کی شیشی واپس باورچی خانے میں رکھی اور پھر اس نے کھونٹی پر ٹنگی جھولی اُتاری، اسے چارپائی پر اُتار کر اچھی طرح دیکھی، جھولی کا سامان چیک کرنے کے بعد کندھے پر ڈالی اور ایک پٹاری پر رکھی اپنی بین اُٹھائی اور صحن میں نکل آئی۔

پھر اس نے دائرے کے نزدیک پہنچ کر اپنا بایاں پاؤں پہلے دائرے میں رکھا، چند لمحے رکی، کچھ پڑھا اور پھر سیدھا پاؤں اُٹھا کر دائرے میں آ گئی۔ وہ دائرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی۔ ایک نظر سورج کی طرف دیکھا۔ سورج کے رُخ کا اندازہ کر کے وہ دائرے کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہوئے اس نے جھولی کندھے سے اُتار کر ایک طرف رکھ ڈالی اور بیٹھنے کا ایک مخصوص انداز اختیار کیا۔

☆......☆......☆

شادی سر پر تھی۔ کمال رائے روشن گوٹھ منتقل ہونے کا سوچ رہا تھا۔

نفیسہ بیگم کراچی کے کئی چکر لگا چکی تھی۔ جہیز کے سامان کی خریداری زوروں پر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کمال رائے آرزو کو لے کر جتنا جلد ممکن ہو سکے، روشن گوٹھ شفٹ ہو جائے۔ شفٹ ہونے میں کمال رائے کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی......بس آرزو کے کالج کا مسئلہ تھا۔ آرزو چاہتی تھی کہ اس کی پڑھائی کا زیادہ حرج نہ ہو۔

بہر حال طے ہوا کہ آنے والے اتوار کو روشن گوٹھ چلا جائے۔ دعوت نامے چھپ چکے تھے، کمال رائے اپنے تمام دوستوں اور واقف کاروں کو اس شادی میں شریک ہونے کیلئے دعوت نامے دے چکا تھا۔ سارے کام ہنسی خوشی ہو رہے تھے۔ کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ تھی۔

وہ ہفتے کی رات تھی، صبح روشن گوٹھ کیلئے نکل جانا تھا۔ آرزو اپنے کمرے میں موجود تھی اور اپنا ضروری سامان سمیٹ رہی تھی۔ اس سامان میں کتابیں زیادہ تھیں۔ سامان سمیٹتے سمیٹتے اچانک اسے اپنی بائیں کلائی پر کاٹنے کا احساس ہوا جیسے کسی چیونٹی نے کاٹا ہو۔

آرزو قمیص کی آستین اُٹھا کر اس جگہ کو دیکھنے لگی جہاں کاٹنے کا احساس ہوا تھا۔ وہاں کوئی چیونٹی نہ تھی......لیکن ایک چھوٹا سا سرخ نشان ضرور موجود تھا اور اس میں جلن ہو رہی تھی۔ آرزو نے اس نشان پر اپنا ہاتھ پھیرا لیکن جلن کم نہ ہوئی۔ اس قدر تیز خارش تھی کہ وہ اس داغ کو ناخنوں سے کھجانے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس سرخ نشان کو چاقو سے کھرچ دے۔

ابھی پہلے داغ کی خارش کم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے ہاتھ کی کلائی پر اچانک چیونٹی کے کاٹنے کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر دائیں کلائی پر نظر کی۔ وہاں بھی ویسا ہی نشان موجود تھا اور جلن ہو رہی تھی......اور پھر یہ نشان اس کے جسم پر بڑھتے گئے۔ ایک سے دو ہوئے اور دو سے چار۔

ہاتھوں سے ٹانگوں پر اور پھر آہستہ آہستہ پورے جسم پر پھیلنے میں آدھا گھنٹہ بھی نہ لگا۔

یہ نشان شروع میں چھوٹے تھے لیکن وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ کھجانے کی وجہ سے یہ داغ ایک دم سرخ ہو گئے تھے، بعض جگہوں سے خون جھلکنے لگا تھا۔ ان داغوں میں اس قدر تیز خارش تھی کہ کھجانے سے بھی آرام نہ آ رہا تھا۔

یہ ایک نئی آفت تھی۔

پورا گھر اکٹھا ہو چکا تھا۔

ستارہ اس کے جسم کو کھجا رہی تھی۔ آرزو چاہتی تھی کہ کوئی اس کے جسم کو کسی کھردری چیز سے رگڑ دے۔ آہستہ کھجانے کے نتیجے میں ہی ان داغوں سے خون رسنے لگا تھا۔ کسی کھردری یا سخت چیز سے کھجانے کے نتیجے میں تو کھال ہی اُدھڑ جاتی۔

آرزو بے چین ہو کر ان داغوں کو ناخنوں سے کھرچنے لگتی تو سروری اس کا ہاتھ پکڑ لیتی۔

''نا بی بی نا۔'' وہ بہت پیار سے اسے منع کرتی اور ستارہ کو اشارہ کرتی۔ ''ستارہ کھجا۔''

جب کمال رائے نے دیکھا کہ آرزو کو کسی پل قرار نہیں ہے اور یہ داغ زخم بنتے جا رہے ہیں تو وہ اسے اسپتال لے گیا۔

ڈاکٹروں نے آرزو کا معائنہ کر کے بتایا کہ کوئی جلدی بیماری ہے۔ ایک طرح کی الرجی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر نے دوائیں وغیرہ لکھ دیں اور اسے اسپتال سے رخصت کر دیا۔

گھر آ کر وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پانی میں ایک دوا ڈال کر نہائی، جسم کو اچھی طرح خشک کیا اور گاؤن پہن کر واش روم سے باہر آ گئی، ستارہ کمرے میں موجود تھی۔ اس سے اپنے داغوں پر کریم لگوائی، ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائی کھائی۔ اسی دوا میں ایک خواب آور گولی بھی تھی۔ دوائیں کھا کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔

نہانے اور کریم لگانے کی وجہ سے اس کے جسم میں ہونے والی جلن کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ خارش اب بھی تھی لیکن قابل برداشت تھی۔

کچھ دیر کے بعد کمال رائے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ آرزو اپنے بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو دیکھ کر اُٹھنا چاہا لیکن کمال رائے نے اسے اُٹھنے سے منع کر دیا، وہ خود جلدی سے اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''کیسی ہو آرزو؟''

''بابا، بہتر ہوں......اس دوا سے کچھ آرام آیا ہے۔''

''بیٹا تم پریشان مت ہونا...... بیماریاں اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ انشاءاللہ تم ایک دو دن میں بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔'' کمال رائے نے اسے تسلی دی۔

''بابا، اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' آرزو نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ستارہ۔'' کمال رائے ستارہ سے مخاطب ہوا۔

''جی مالک۔'' وہ گردن جھکا کر بولی۔

''رات کو تم یہیں بی بی کے پاس سو جانا......اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے آ کر فوراً جگا لینا۔'' کمال رائے نے اسے ہدایت کی۔ پھر اس نے آرزو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''بیٹا، معلوم ہوتا ہے تمہیں نیند آ رہی ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لو اور سو جاؤ......ستارہ رات کو تمہارے پاس ہی رہے گی۔''

''جی بابا۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں...... طاقتور نیند کی گولی نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی گہری نیند میں چلی گئی۔

اس کے سونے کے بعد کمال رائے بھی اُٹھ گیا۔ وہ دروازے سے نکلتے ہوئے بولا۔ ''ستارہ دروازہ اندر سے بند کر لو۔''

''جی، ٹھیک ہے مالک۔'' ستارہ کمال رائے کے پیچھے پیچھے آئی اور کمرے کا دروازہ اندر سے

لاک کرلیا۔

پھراس نے آرزو کو چادر اُڑھائی اور تکیہ صوفے پر رکھ کر خود بھی لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے کی ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ بس ایک نائٹ بلب جل رہا تھا۔

کروٹ بدلتے ہوئے اچانک اس کی نظر دیوار پر ٹھہر گئی۔ اس کو ایک لمبی سی لکیر نظر آئی، جب اس نے غور سے دیکھا تو اسے چیونٹیاں نظر آئیں جو ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے چلی جا رہی تھیں۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ مدھم روشنی میں چیونٹیوں کی یہ قطار اسے بیڈ کے پیچھے جاتی نظر آئی۔ اس نے فوراً کمرے کی ساری بتیاں روشن کر دیں اور جب اس نے بیڈ پر نظر کی تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔

وہ منظر ہی ایسا تھا۔

اسے بیڈ کی چادر پر بے شمار چیونٹیاں نظر آئیں، ستارہ نے جلدی سے آرزو کے جسم سے چادر کھینچ لی، آرزو گہری نیند میں تھی لیکن اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے، ستارہ نے دیکھا کہ ایک جگہ جہاں سے گاؤن ہٹا ہوا تھا، ایک زخم پر ہزاروں چیونٹیاں جمع تھیں، یہ لال چیونٹیاں تھیں اور عام چیونٹیوں کے مقابلے میں موٹی تھیں۔

ستارہ کے ہوش اُڑ گئے، وہ فوراً کمرے سے نکل کر بھاگی، اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے، کمال رائے کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی، اس نے جلدی جلدی مگر آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

پہلی دستک پر ہی کمال رائے کی آنکھ کھل گئی، وہ تیزی سے اُٹھ کر دروازے تک آیا۔

دروازہ کھولا تو سامنے ستارہ کو پایا، اسے دیکھ کر کمال رائے پریشان ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔

''کیا ہوا؟''

''مالک جلدی میرے ساتھ آئیں۔'' ستارہ یہ کہہ کر فوراً واپس پلٹی۔

کمال رائے سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے، اس لئے اس نے سوال جواب کرنے سے گریز کیا اور فوراً ہی اس کے پیچھے چل دیا۔

''یہ دیکھیں مالک......'' ستارہ، آرزو کے کمرے میں پہنچ کر بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ستارہ بیڈ پر کیا دکھا رہی ہے، جب وہ ذرا نزدیک آیا اور اس نے بیڈ پر نظر ڈالی تو اس کے حواس گم ہو گئے، اتنی چیونٹیاں ایک ساتھ اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

''بی بی کے جسم پر جو زخم ہیں، یہ چیونٹیاں انہیں کھا رہی ہیں۔'' ستارہ نے کلائی پر موجود ایک زخم کی طرف اشارہ کیا۔

اسی وقت آرزو کے جسم میں کسمساہٹ محسوس ہوئی اور پھر اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں، اپنے سامنے کمال رائے اور ستارہ کو پایا تو وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی اور جب اسنے اپنے بیڈ پر اور اپنے جسم پر نظر کی تو وہ چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔

''بابا، یہ کیا؟'' آرزو اپنے جسم پر پڑے زخموں سے چیونٹیوں کو جھاڑتے ہوئے بولی۔

''آرزو......تم فوراً واش روم جاؤ اور تیز شاور سے نہالو......ساری چیونٹیاں پانی میں بہہ جائیں گی۔'' کمال رائے نے بڑی دانشمندی کی بات کی۔

''اچھا، بابا۔'' آرزو بھاگتی ہوئی واش روم میں داخل ہو گئی۔

آرزو کے واش روم میں جانے کے بعد جب کمال رائے نے بیڈ پر نظر ڈالی تو وہاں کا منظر بدلا ہوا تھا، اب بیڈ پر ایک چیونٹی نہ تھی، کمال رائے نے اوڑھنے والی چادر بھی کھول کر دیکھ لی، اس چادر پر بھی کوئی چیونٹی نہ تھی، چیونٹیاں دیکھتے دیکھتے کہاں غائب ہو گئیں۔

آرزو کچھ دیر کے بعد واش روم سے کپڑے بدل کر نکلی تو دونوں کو اپنا منتظر پایا۔

اب تو کوئی چیونٹی تمہارے جسم پر نہیں ہے؟''

''نہیں، بابا۔'' آرزو نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''پر بابا یہ اتنی چیونٹیاں کہاں سے آگئیں؟''

''چیونٹیاں کہاں سے آگئیں، یہ معاملہ اپنی جگہ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ ہزاروں چیونٹیاں تمہارے جسم پر موجود تھیں اور اس کے باوجود تم پڑی سو رہی تھیں۔''

''بابا...... مجھے بے چینی تو ہو رہی تھی، لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز مجھے کاٹ رہی ہے لیکن نیند اتنی گہری تھی کہ میری آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔'' آرزو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ پھر بولی۔ ''لیکن بابا، آپ کو کیسے پتہ چلا......''

جواب میں کمال رائے نے ستارہ کی آمد کے بارے میں بتایا پھر ستارہ نے چیونٹیاں دیکھنے کی تفصیل بتائی۔

کمال رائے اور آرزو کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، کوئی دو بجے کے قریب کمال رائے اس کے کمرے سے اُٹھا، اس نے آرزو کو سونے کی ہدایت کی اور پھر اس کے کمرے سے نکل گیا۔

کمال رائے کے جانے کے بعد ستارہ نے دروازہ اندر سے مقفل کیا، آرزو کے جسم پر گہرے سرخ

دھبے تھے جو اب زخموں کی صورت اختیار کر گئے تھے، ستارہ نے ان زخموں پر ٹیوب سے نکال کر اچھی طرح دوا لگائی، ان زخموں میں ہلکی ہلکی خارش ہو رہی تھی، ستارہ نے اسے نیند کی آدھی گولی دی اور اس کے جسم پر گردن تک چادر ڈال دی۔

''بی بی...... لائٹ جلنے دوں؟'' ستارہ نے آرزو سے پوچھا۔

''ہاں، ستارہ لائٹ جلنے دو اور دیکھو تمہاری جب بھی آنکھ کھلے، مجھے اُٹھ کر دیکھ لینا۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں بی بی۔'' ستارہ نے بڑی محبت سے کہا۔ ''میں آپ کا پورا خیال رکھوں گی۔''

اور ستارہ نے جیسا کہا تھا، وہ کیا بھی، وہ ہر آدھے گھنٹے یا ایک گھنٹے کے بعد صوفے سے اُٹھ کر بیڈ کے نزدیک آتی، بیڈ کا اچھی طرح معائنہ کرتی اور پھر اس کے جسم سے چادر اُٹھا کر اندر جھانک لیتی۔

☆......☆......☆

بعض اوقات جب مصیبت آتی ہے تو یک طرفہ نہیں آتی، چو طرفہ آتی ہے۔

رات کو آرزو پر چیونٹیاں برسیں تو صبح ہوتے ہی مہرو کا فون آیا، یہ فون کال بڑی خطرناک اطلاع لئے ہوئے تھی۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے، رامش خیال کے خواب سجتے جا رہے تھے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

اس کی ممانی ثمینہ اور بہن مہر النساء شاپنگ کرنے میں مصروف تھیں، انہیں بازار لے جانے کی ذمہ داری رامش خیال کے سر تھی، وہ بڑی خوشی خوشی یہ ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔

شادی کے سلسلے میں جو زیورات بنوائے گئے تھے، وہ جیولرز نے تیار کروا کے رات کو ان کے حوالے کر دیئے تھے، رامش خیال ان سیٹوں کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ وہ رات گئے تک خوش گپیوں میں مصروف رہے تھے، مہرو نے سارے زیورات رامش خیال کو ہنس ہنس کر دکھائے تھے۔

رامش خیال رات کو سویا تو آرزو کے خوابوں میں کھویا رہا، وہ اسے زیورات سے لدی پھندی دلہن کے روپ میں نظر آتی رہی، اس کا حسن خیرہ کر دینے والا تھا۔

صبح رامش خیال نے کہیں جلدی جانا تھا، اس نے مہرو کو ہدایت کی تھی کہ وہ اسے سات بجے تک جگا دے، صبح مہرو کالج جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ ایک دم رامش خیال کا خیال آیا، اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، سات پانچ ہو رہے تھے، وہ بھاگتی ہوئی اس کے کمرے میں گئی۔

رامش خیال حسب معمول گھوڑے بیچ کر سویا ہوا تھا، مہرو نے اس کے سر پر کھڑے ہو کر جلدی

جلدی آوازیں دیں۔ ''بھائی...... بھائی۔''

''ہاں، کیا ہے؟'' رامش خیال نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے جانا نہیں ہے کیا......؟ سات پانچ ہو رہے ہیں۔'' مہرو بولی۔

''باہر کیا گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں؟'' رامش خیال نے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

''بھائی! آپ ہر وقت خوابوں میں کیوں رہتے ہیں، باہر خوب تیز دھوپ نکلی ہوئی ہے۔'' مہرو نے کہا۔

''ہیں، کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا کمرے کا دروازہ بند ہے، اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔''

''پردہ آپ کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے اور کچھ دن بعد جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو عقل پر بھی پڑ جائے گا، آرزو ویسے ہی ہوش و حواس گم کر دینے والی لڑکی ہے۔'' مہرو نے خوشدلی سے کہا۔

''مہرو، میں مذاق نہیں کر رہا...... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا...... میری آنکھوں کے سامنے بالکل اندھیرا ہے۔'' رامش خیال تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''ہائے بھائی......! یہ آپ کیا دل دہلا دینے والی بات کر رہے ہیں، کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اندر خوب روشنی ہے، میں آپ کے پاس کھڑی ہوں۔'' یہ کہہ کر مہرو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ یہاں...... کیا میں بھی آپ کو نظر نہیں آ رہی۔''

رامش خیال نے اپنے ہاتھ کندھے پر لے جا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''نہیں......''

رامش خیال کی یہ چھوٹی سی ''نہیں'' بڑی جان لیوا تھی، مہرو دہل کر رہ گئی۔

اسے کچھ عرصے پہلے دیکھا ہوا خواب یاد آ گیا۔ اس خواب میں اس نے رامش خیال کو اندھا اور بھیک مانگتا ہوا دیکھا تھا، اس خواب کے یاد آتے ہی وہ لرز اُٹھی۔

''مہرو، مجھے دکھائی نہیں دے رہا، میں اندھا ہو گیا ہوں۔'' رامش خیال نے بے بسی سے کہا۔

ماموں رشید کو اُٹھایا گیا، ممانی ثمینہ اوپر دوڑی آئیں، گھر میں جیسے طوفان آ گیا، اس کی بینائی ضائع ہونے پر گھر میں کہرام مچ گیا۔

مہرو رونے بیٹھ گئی، رامش خیال کے حواس گم تھے، وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا بار بار اپنی آنکھوں کو مل مل کر دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں کی روشنی واپس آ کر نہیں دے رہی تھی۔

ماموں رشید نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور رامش خیال کو گاڑی میں بٹھا کر اسپتال لے گئے، ان کے جانے کے بعد مہرو فون لے کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنی دھندلی

آنکھوں سے آرزو کا نمبر ملا رہی تھی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو ستارہ کی آنکھ کھل گئی، وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے آرزو کے بیڈ کو بغور دیکھا، بیڈ کی چادر صاف تھی، آرزو کروٹ لئے سو رہی تھی، اس سے پہلے کہ تیسری گھنٹی بجتی، ستارہ نے جلدی سے ریسیور اُٹھالیا اور کہا۔ ''ہیلو......''

''ہاں، آرزو۔'' اُدھر سے سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''بی بی...... میں ستارہ ہوں۔'' ستارہ نے مہرو کی آواز پہچان کر کہا۔

''آرزو بی بی کہاں ہیں؟''

''یہیں ہیں...... سو رہی ہیں۔'' ستارہ نے آرزو کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں آرزو کی آنکھ کھل گئی۔ ''وہ اُٹھ گئی ہیں جی...... میں فون ان کو دیتی ہوں۔''

''ستارہ کس کا فون ہے؟'' آرزو نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مہرو بی بی کا......'' ستارہ نے ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی مہرو...... آج صبح ہی صبح کیسے وارد ہوگئیں آپ......! کیا کالج جانے کا ارادہ نہیں۔'' آرزو نے شگفتہ انداز میں پوچھا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' مہرو نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''ٹھیک نہیں ہے...... لیکن مہرو تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے...... تم ٹھیک تو ہو۔'' آرزو نے بڑی فکرمندی سے پوچھا۔

بس اتنا سنتے ہی وہ پھوٹ پڑی، ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ روتے ہوئے بولی۔ ''آرزو بڑی بری خبر ہے...... رامش بھائی اندھے ہوگئے ہیں...... انہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔''

''یا میرے اللہ......!'' آرزو اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ ''یہ کیسے ہوا؟''

''کچھ نہیں معلوم کیسے ہوا؟'' مہرو نے کہا۔ ''رات کو وہ اچھے بھلے سوئے تھے، صبح میں نے اُٹھایا تو آنکھوں میں روشنی نہ تھی۔''

''اوہ...... یہ بتا...... آنکھوں میں کوئی خرابی نظر آئی، سرخی، کوئی زخم وغیرہ۔'' آرزو نے پوچھا۔

''نہیں ان کی آنکھوں میں کسی قسم کی بظاہر کوئی خرابی نہیں ہے، آنکھیں ان کی بالکل صاف ہیں۔''

''اچھا...... وہ کہاں ہیں؟''

''ماموں انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔'' مہرو نے بتایا۔

''چلو ٹھیک ہے، وہ لوگ اسپتال سے آجائیں تو مجھے بتانا...... تُو فکرمند نہ ہو...... وہ ٹھیک

ہوجائیں گے۔''

''آرزو تجھے خواب یاد ہے...... میں نے تجھے اپنے ایک خواب کے بارے میں بتایا تھا۔''

''ہاں، یاد ہے۔'' آرزو کو اس کا بتایا ہوا خواب فوراً یاد آ گیا۔

''آرزو یہ کیا ہو رہا ہے؟'' مہرو کی آواز میں دُکھ تھا۔

''رات کو میرے ساتھ کیا ہوا...... میں تجھے بتاتی ہوں۔'' آرزو نے افسردگی سے کہا۔

''ہائے...... تیرے ساتھ کیا ہوا؟'' مہرو ایک دَم گھبرا کر بولی۔

تب آرزو نے اپنے ساتھ بیتنے والی ہر بات اسے سنادی۔

☆......☆......☆

شوم کا عمل پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا، شبورا اپنے گھر کے صحن میں موجود تھی، وہ حصار کھینچے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھی، آج کی رات بہت اہم تھی، آج کی رات یہ معلوم ہو جانا تھا کہ رنسارو کا ٹھکانہ کہاں ہے۔

شبورا بڑے انہماک سے بین بجا رہی تھی، یہ ایک کالی رات تھی، صحن میں مکمل اندھیرا تھا، اس کی بین کی آواز پوری بستی میں گونج رہی تھی، بستی والے جانتے تھے کہ وہ شوم کا عمل کر رہی ہے، یہ بستی والوں کیلئے قابل فخر بات تھی کہ ان میں سے کوئی اور وہ بھی عورت...... اس عمل کیلئے راضی ہوئی۔

بستی کے سارے لوگ اس کا خیال رکھے ہوئے تھے، ویسے بھی وہ اس بستی کے سردار کی بیٹی تھی، اس بستی پر اس کا حق تھا، شاہ بابا کی موت کے بعد اگر راولا زندہ ہوتا تو اس بستی کا سردار بنتا، وہ نہیں تھا تو سوچا جا رہا تھا کہ اس بستی کا سردار کس کو بنایا جائے، کوئی عورت اس بستی کی سردار نہیں بن سکتی تھی، اس طرح کی کوئی روایت موجود نہ تھی، جہاں تک روایت کا تعلق تھا تو آج تک کسی نے شوم کا عمل کرنے کی جرأت نہ کی لیکن شبورا نے عورت ہوتے ہوئے یہ جرأت کرلی تھی، روایت تو عورتوں کے بین بجانے کی بھی نہ تھی، اس بستی میں بین بجانے والی عورتیں پیدا ہوئی تھیں لیکن بہت کم...... کسی نے شوقیہ بین بجانے کی تربیت حاصل کرلی ہو، یہ الگ بات ہے لیکن شبورا جیسی سپیرن کی کوئی روایت پچھلے پچاس سالوں میں بھی موجود نہ تھی، اب بستی کے بزرگ اس بات پر غور کر رہے تھے کہ اگر شبورا شوم کے عمل میں کامیاب ہو جاتی ہے تو کیوں نہ اسے سپیروں کا سردار بنادیا جائے۔

شبورا نے اچانک بین بجانا بند کیا اور ایک خاص انداز سے بیٹھ کر اس نے بین زمین پر تین بار ماری اور پھر اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔

اب وہ آنکھیں بند کئے، کچھ پڑھ رہی تھی۔

بستی پر سناٹا طاری تھا، کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی یہاں کے بستی کے کتے بھی آنکھیں بند کئے خاموش لیٹے تھے، شبورا کی آنکھیں بند تھیں لیکن کان کھلے ہوئے تھے وہ پوری توجہ سے پڑھ رہی تھی لیکن صحن میں پیدا ہونے والی ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے، وہ پوری طرح چوکنا تھی، آج کی رات بہت اہم تھی، ذرا سی غلطی اسے ہمیشہ کیلئے مفلوج کر سکتی تھی۔

وہ بڑی روانی سے پڑھ رہی تھی اور اب وہ وقت قریب ہی تھا، کسی بھی وقت منظر بدل سکتا تھا، وہ خود کو صحن کی بجائے کہیں بھی دیکھ سکتی تھی۔

تب پڑھتے پڑھتے اچانک اسے زوردار جھٹکا لگا، اس جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ کسی صحرا میں ہے، بادل چھائے ہوئے ہیں، صبح کا وقت ہے یا شام کا...... اس کا اندازہ نہیں ہوتا...... ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی ہے اور بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔

بارش کا پانی اس کے جسم پر پڑ رہا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بھیگ نہیں رہی، وہ اپنے جسم پر بارش کے تیز قطرے پڑتے ہوئے محسوس کر رہی ہے، اس کے باوجود اس کے کپڑے، اس کا جسم، اس کا سر بالکل سوکھا ہے۔

سامنے اسے ایک ریت کا ٹیلہ نظر آتا ہے، وہ بلا سوچے سمجھے اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگتی ہے، وہ ننگے پاؤں ہے، اسے بھیگی ریت پر چلنے کا احساس ہوتا ہے۔

کوئی ایک فرلانگ کے قریب چلتی ہے تو آگے دیکھتی ہے کہ بارش بند ہو چکی ہے اور سورج نکلا ہوا ہے، سورج کی روشنی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شام کا وقت ہے، پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے تو بارش ہو رہی ہوتی ہے، کالے بادل چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اندھیرا ہوتا ہے، یہ ایک عجیب منظر تھا، پیچھے مڑ کر دیکھتی تو بادل، بارش اور اندھیرا محسوس ہوتا تھا اور اپنے سامنے دیکھتی تھی تو روشنی، صاف آسمان اور سوکھی ریت دکھائی دیتی تھی۔

وہ ٹیلہ اب بھی سامنے موجود تھا اور اس کا فاصلہ اتنا ہی تھا جتنا اسے پہلی بار نظر آیا تھا، حالانکہ وہ ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ٹیلے کی طرف کیوں بڑھ رہی تھی، کوئی اندر سے اُٹھنے والی لہر اسے ٹیلے کی طرف کھینچ رہی تھی، آگے بڑھتے ہوئے جب وہ پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتی تھی تو اسے بارش کا منظر نظر آتا تھا لیکن یہ منظر لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا تا رہا تھا جبکہ سامنے کا منظر ویسے کا ویسا ہی تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اتنا چل لینے کے باوجود وہ وہیں کھڑی ہے۔

اس کے قدم بلا ارادہ ٹیلے کی طرف اُٹھ رہے تھے، وہ تیز تیز چل رہی تھی، چاہتی تھی کہ جلد از جلد

ٹیلے کے پاس پہنچ جائے لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ جتنا فاصلہ وہ طے کرتی ہے، ٹیلہ اس سے اتنا ہی دور ہو جاتا ہے۔

عجیب کشمکش تھی، وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی، اسے ٹیلے کے اوپر سے ایک چیل اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اس چیل کو بغور دیکھنے لگی، چیل بہت تیزی سے اور بغیر پر ہلائے اُڑ رہی تھی، اس کی نظریں چیل کا تعاقب کرنے لگیں، چیل مغرب کی طرف پرواز کر رہی تھی لیکن اس نے اچانک ہی غوطہ کھایا اور وہ پلٹ کر شبورا کی طرف پرواز کرنے لگی پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے شبورا کی طرف آنے لگی اور چند لمحوں میں اس کے سر پر سے گزر گئی۔

شبورا نے چیل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ سہم گئی لیکن جب وہ اس کے سر پر سے گزر گئی تو اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن چیل کا کہیں پتہ نہ تھا اور پیچھے کا منظر بھی تبدیل ہو چکا تھا، اب نہ وہاں بادل تھے، نہ بارش اور نہ اندھیرا تھا۔

وہاں سے اسے ایک بہت بڑا درخت نظر آ رہا تھا، چاروں طرف پھیلا ہوا، اس کا تنا اتنا بڑا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پانچ چھ درخت کو ملا کر بنایا گیا ہو، اس درخت کے پتے سبز نہ تھے بلکہ سیاہی مائل تھے اور ان کی شکل بھی عجیب تھی۔

شبورا اب اس درخت کی طرف چلنے لگی، وہ دو قدم چلتی تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ درخت سو قدم اس کے قریب آ گیا ہے، وہ درخت حیرت انگیز طور پر اس کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا۔

شبورا نے دیکھا کہ اس درخت کے تنے میں ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔

وہ اس دروازے کو دیکھ کر رک گئی۔

یہ ایک عجیب و غریب دروازہ تھا، چوکور تھا، اس پر کسی قسم کا کوئی کواڑ نہ تھا۔ اور اس دروازے کے اندر اندھیرا تھا، اس درخت پر کسی قسم کا کوئی پھول، کوئی پھل نہ تھا، سیاہی مائل یہ درخت بڑے پراسرار انداز میں کھڑا تھا، اس درخت کے علاوہ دور تک کوئی اور درخت نہ تھا۔

شبورا اس درخت کے دروازے سے اندازاً سات قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، وہ سوچ رہی تھی کہ اس درخت کے دروازے میں قدم رکھے یا نہ رکھے...... تب ہی اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اس نے دیکھا کہ ایک شخص شاہی لباس میں بڑی تمکنت سے چلتا، اس درخت دروازے سے برآمد ہو رہا ہے اور جب شبورا نے اس کے چہرے پر غور کیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

وہ کمال رائے تھا اور اسے دیکھ کر بڑے پیار بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

کمال رائے کو اچانک اپنے سامنے پا کر وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی، اسے یہ یاد نہ رہا کہ وہ کون ہے

اور یہاں کس غرض سے آئی ہے، اسے بس اتنا یاد رہا کہ اس کے سامنے کمال رائے ہے وہ کمال رائے جو اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا بیٹھا تھا اور اب شاید وہیں سے نکل کر مجسم ہو گیا تھا۔

"صاحب جی آپ؟" شبورا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں، یہ میں ہوں، تمہارا کمال رائے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دروازے کھول دیئے۔

"وہ، صاحب جی۔" وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی اور آن کی آن اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

اور یہی لمحہ قیامت کا تھا۔

شوم کا عمل بھنگ ہو گیا تھا، ٹوٹ گیا...... اس عمل کے دوران کسی سے بات کرنا قطعاً ممنوع تھا، شبورا، کمال رائے کو دیکھ کر نہ صرف بولنے پر مجبور ہو گئی بلکہ بے اختیار اس کے قریب بھی چلی گئی تھی، یہ قربت، یہ گویائی اسے لے ڈوبی، اس کی ساری محنت اکارت گئی۔

تب اس نے دیکھا کہ وہ جنہیں بازو سمجھ رہی تھی، بازو نہیں سرسراتے سانپ ہیں اور وہ کمال رائے نہیں کوئی بدہیئت شخص ہے، کالا بھجنگ، سرخ سرخ آنکھوں والا...... جب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کیا غلطی کر بیٹھی ہے تو اس کا صدمے سے دل بیٹھ گیا اور وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھی۔

سرخ آنکھوں والے سیاہ رُو شخص نے جس کے بازو سانپوں کی طرح تھے، اپنے ان بازوؤں سے شبورا کو کسی بوری کی طرح اپنی پیٹھ پر لادا اور تیز قدموں سے چلتا درخت دروازے میں داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

ایک ہال نما کمرہ...... جس کی دیواروں میں بے شمار طاق بنے ہوئے تھے اور ان طاقوں میں چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ہوئے تھے اس ہال کی دیواریں سفید تھیں جبکہ چھت سرخ تھی اور ہال کا فرش اینٹوں سے بنا تھا اور یہ اینٹیں بھی سرخ تھیں۔

اس ہال نما کمرے کے چار دروازے تھے، یہ چاروں دروازے بیک وقت کھلے اور ان دروازوں سے تیز ہوا کے جھکڑ اندر داخل ہوئے، کمرے میں تیز ہوا داخل ہونے سے طاقوں میں رکھے مجسموں میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ پھر یہ ہوا ایک دم ساکت ہو گئی اور ہال نما کمرے میں ایک خوشبو پھیل گئی۔

خوشبو پھیلتے ہی ایک شخص شاہانہ انداز میں چلتا، ایک دروازے سے داخل ہوئی، وہ ایک سنہری چادر اپنے جسم سے لپیٹے ہوئے تھا، اس کے سر پر ایک سنہری سانپ بیٹھا ہوا تھا، جس کی آنکھیں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں اور اس شخص کے سر پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے سر کا تاج معلوم ہوتا تھا، وہ شخص پر اسرار قوتوں کا مالک پر مان تھا، اس کے پیچھے ایک خوبصورت عورت زرق رق

لباس میں داخل ہوئی، وہ اپنی چال ڈھال سے رانی دکھائی دیتی تھی اور راجہ پر مان کی رانی تھی، اس کا نام ملائے کا تھا۔

ہال نما کمرے کے درمیان رکھی ایک اونچی زرق برق کرسی پر راجہ پر مان براجمان ہو گیا اور رانی ملائے کا اس کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔

راجہ پر مان کے کرسی پر بیٹھتے ہی ہال نما کمرے کے تین دروازے خود بخود بند ہو گئے، دروازے بند ہونے کے بعد پر مان نے زور سے تالی بجائی تو ایک خادمہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی جب وہ قریب آ گئی تو پر مان نے کہا۔ "کہاں ہے قیدی...... ؟ ابرش سے کہو کہ وہ قیدی کو حاضر کرے۔"

"جو حکم پر مان۔" یہ کہہ کر وہ خادمہ اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد سرخ آنکھوں، سیاہ چہرے اور سانپوں کی طرح بازو والا شخص جس کا نام ابرش تھا، ہال نما کمرے میں داخل ہوا، اس کی پیٹھ پر شبورا لدی ہوئی تھی اور وہ ابھی بے ہوش تھی۔

جب ابرش نے شبورا کو اپنی پیٹھ سے اتار کر پر مان کے قدموں میں ڈالا تو پر مان نے دیکھا کہ وہ کوئی پرکشش جسم کی عورت ہے، اس عورت کا چہرہ ابرش کی طرف تھا۔

"کون ہے یہ...... ؟" پر مان نے پوچھا۔ "اس کا چہرہ ادھر کرو۔"

ابرش نے فرش پر بیٹھ کر شبورا کا چہرہ، پر مان کی طرف گھما دیا اور اس کے چہرے پر پڑے ریشمی بال ہٹائے تو پر مان اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا، وہ ایک دَم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

پر مان کے ساتھ ہی رانی ملائے کا کی بھی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو اس کا ردعمل پر مان سے بھی شدید تھا۔ وہ کرسی کے ہتھے سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی جیسے اس نے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

"یہ تو تیوح ہے...... یہ کہاں سے آ گئی...... ابرش اس منحوس کو لے جاؤ یہاں سے۔" رانی ملائے کا بڑے ہذیانی انداز میں چیخی۔

"رانی ملائے کا اپنے حواسوں میں رہو...... کیا تم جانتی نہیں ہو کہ اس بستی میں صرف پر مان کا حکم چلتا ہے، راجہ پر مان کا......" پر مان نے غصے سے کہا۔

"معافی چاہتی ہوں پر مان...... غلطی ہو گئی...... میں اس کی شکل دیکھ کر بے اختیار ہو گئی تھی۔" رانی ملائے کا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کہاں سے آئی ہے...... ؟ تم نے کہاں سے پکڑا ؟" پر مان، ابرش سے مخاطب ہوا۔

"یہ رنتارو کا کارنامہ ہے، اسے میں نے درخت دروازے سے پکڑا۔" ابرش نے اس سانپوں کو

لہرا کر کہا جو اس کے بازو کی جگہ جڑے ہوئے تھے، دو کالے رنگ کے موٹے سانپ جن کی زبان بار بار باہر نکل رہی تھیں۔

"اوہ...... یہ میرے بیٹے کا کارنامہ ہے، کہاں ہے میرا رنتارو...... ہم نے اسے معاف کیا...... اسے بلاؤ۔" پرمان خوش ہو کر بولا۔

رانی ملائے کا رنتارو کے معاف کئے جانے پر خوش ہوئی لیکن وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ رنتارو کو کیوں معاف کیا گیا ہے۔

رنتارو، تیوح کی ہم شکل عورت کو پکڑ لایا تھا، وہ تیوح جو پرمان کے دل پر راج کرتی تھی اور جسے کسی انسان نے موت کی نیند سلا دیا تھا، اس حادثے میں تیوح کے ساتھ ہورا بھی مارا گیا تھا۔

یہ بات رانی ملائے کا سوچ سکتی تھی لیکن زبان پر نہیں لا سکتی تھی۔

ابرش پرمان کا حکم سن کر ہال نما کمرے میں جانے لگا تو پرمان نے کہا۔ "تو کہاں جاتا ہے؟"

"تیرے حکم کی بجا آوری کیلئے...... رنتارو کو تیرے حضور حاضر کرنے کیلئے۔" ابرش نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"اچھا...... ہاں...... ٹھیک ہے...... رنتارو کو لے کر آؤ...... اس سے کہہ کہ وہ بخشا گیا۔"

"جو حکم پرمان۔" ابرش یہ کہہ کر پلٹ گیا، اس کے بازو کی جگہ لٹکے سانپ اِدھر اُدھر لہرانے لگے۔

ابرش کے جانے کے بعد پرمان نے شبورا کو غور سے دیکھا، وہ تو بنی بنائی تیوح تھی، وہ ابھی تک بے ہوش تھی، پرمان نے تالی بجائی تو کھلے دروازے سے ایک خادمہ داخل ہوئی، اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی پرمان نے زور سے کہا۔ "پیالہ لاؤ۔"

وہ خادمہ پرمان کا حکم سن کر فوراً رک گئی اور اسی لمحے واپس پلٹ گئی۔

رانی ملائے کا کی حالت بڑی غیر تھی، تیوح نے اس کی زندگی میں زہر گھول رکھا تھا، اس نے بڑی مشکل سے تیوح سے نجات پائی تھی، وہ ان انسانوں کو بڑی دعائیں دیتی تھیں جنہوں نے تیوح کا قلع قمع کیا تھا، وہ پرمان کی بڑی وفادار بنتی تھی، وہ برہا (آرزو) کو انسانوں سے چھیننے گئی تھی، اگر وہ برہا کو واپس لے آتی تو پھر اس کے غرور کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا، رانی ملائے کا پھر اس کے سامنے چراغ نہ جلتا، ہوسکتا تھا کہ تیوح کی وفاداری دیکھ کر پرمان اسے رانی بنانے کا اعلان کر دیتا اور اس طرح ملائے کا موت کا نشانہ بن جاتی کیونکہ یہاں کی رسم کے مطابق ایک ہی رانی رہ سکتی تھی اور جسے پرمان مسترد کر دیا کرتا تھا، اس کے لئے موت کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہ تھی، پرمان کی رانی کو بستی میں کوئی اور نہیں رکھ سکتا تھا، وہ تو اس کی تقدیر اچھی تھی کہ تیوح، برہا کو واپس نہ لا سکی اور خود بھی آنے کے قابل نہ

رہی لیکن اب تیوح کی بجائے اس کی ہم شکل آ گئی تھی، اس کی شکل بھی اس قدر ملتی تھی کہ رانی ملائے کا اس کی صورت دیکھ کر سناٹے میں آ گئی تھی۔

اچانک ایک خوشبو کا جھونکا آیا، پرمان نے شبورا سے نظریں ہٹا کر سامنے دروازے کی طرف دیکھا اسی وقت رانی ملائے کا کی بھی نظر دروازے کی طرف اُٹھی۔

دروازے سے رنتارو اندر داخل ہو رہا تھا، وہ سیاہ لباس میں تھا اور بڑے باوقار انداز میں پرمان کی طرف بڑھ رہا تھا، پرمان اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اُٹھ گیا، جب وہ دو چار قدم دور رہ گیا تو پرمان اپنی بانہیں پھیلا کر آگے بڑھا اور بولا۔ "میرا رنتارو......"

پرمان نے اسے گلے لگا کر زور سے بھینچ لیا اور پھر اس سے الگ ہوتا ہوا بولا۔ "ہم نے تجھے معاف کیا۔"

"پرمان، یہ تیری مہربانی ہے، تیرا احسان ہے۔" یہ کہہ کر وہ رانی ملائے کا کی طرف مڑا، رانی نے اسے گلے لگانے کی بجائے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی۔

"رنتارو، تجھے معافی مبارک ہو۔" رانی ملائے کا نے رنتارو کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"رنتارو یہ کون ہے؟" پرمان نے شبورا کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"پرمان یہ سپیرن ہے؟ بڑی خطرناک سپیرن ہے، یہ مجھے مارنے کا عمل کر رہی تھی۔" رنتارو نے بتایا۔

"اوہ...... اچھا...... یہ سپیرن ہے...... ہم سانپ، یہ سپیرن...... واہ کیا خواب مزہ آئے گا۔" پرمان خوش ہو کر بولا۔

اتنے میں خادمہ ایک بڑا پیالہ لے کر آ گئی، اس میں پیلے رنگ کا کوئی مشروب تھا، خادمہ نے اس پیالے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "پرمان، پیالہ......"

"اس کے نزدیک بیٹھ جا...... اس کے منہ میں چند قطرے ٹپکا۔" پرمان نے حکم دیا۔

خادمہ پیلے رنگ کے مشروب سے بھرا بڑا سا پیالہ لے کر شبورا کے نزدیک بیٹھ گئی، شبورا کا منہ بند تھا، خادمہ نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بھینچا...... جب اس کا تھوڑا سا منہ کھل گیا تو اس نے پیالے سے چند قطرے اس کے منہ میں ٹپکا دیئے...... چند قطرے اس کے منہ میں گئے تو اس کا دہانہ تھوڑا سا اور کھل گیا...... پرمان نے جو اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا، پیالے سے مزید مشروب ٹپکانے کا اشارہ کیا۔

خادمہ نے اس مرتبہ چند قطرے ٹپکانے کی بجائے ایک موٹی دھار اس کے منہ میں ڈالی، شبورا کا

منہ کھلا ہوا تھا، اس نے یہ مشروب فوراً پی لیا، اس کے بعد اس کے جسم میں حرکت سی ہوئی، آنکھوں کے پپوٹوں میں لرزش دکھائی دی اور پھر اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر پرمان پر پڑی، وہ اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ کر ایک دم چونک گئی...... پرمان نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو اسے تیوح یاد آ گئی، خوبصورت اور چمکیلی......اوہ اس کی کوئی چیز بھی مختلف نہیں...... پرمان نے سوچا۔

شبورا فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے اپنے چاروں طرف لوگوں کو دیکھا، بائیں ہاتھ کی طرف اسے ایک خوبصورت سی عورت نظر آئی جو زرق برق لباس پہنے تھی پھر اس نے ایک سیاہ لباس والے نوجوان کو دیکھا، وہ بلاشبہ ایک خوبصورت نوجوان تھا، اس نوجوان کے پاس ایک اور شخص تھا، وہ شخص تھا یا کوئی بلا تھی، سرخ آنکھیں، سیاہ چہرہ اور بازوؤں کی جگہ دو کالے ناگ لٹکے ہوئے جو تیزی سے اِدھر اُدھر ہوا میں لہرا رہے تھے، تب اسے یاد آیا کہ ایسا ہی کوئی شخص تھا جس نے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا اور وہ خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

شبورا کو یاد آیا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا، اس نے کمال رائے کو درخت دروازے سے نکلتے دیکھا تھا اور وہ بے اختیار ہو گئی تھی...... وہ سب فریب نظر تھا، شوم کے عمل میں بھنگ ڈالنے کا حربہ تھا، اس کا عمل ان لوگوں نے برباد کر دیا تھا، وہ اب ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔

''میں پرمان ہوں...... اس بستی کا مالک...... یہاں صرف میرا حکم چلتا ہے۔'' راجہ پرمان نے اپنا تعارف کرایا۔

شبورا جو ابھی سرخ اینٹوں کے فرش پر بیٹھی تھی، اُٹھنے لگی تو پرمان نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''بیٹھی رہو۔'' پھر وہ خادمہ سے مخاطب ہوا۔ ''اسے پیالہ دو۔''

خادمہ نے اس کی طرف پیالہ بڑھا دیا، شبورا نے اس پیالے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس مشروب کی طرف دیکھنے لگی۔

''پی لو اسے...... پیالہ منہ سے لگاؤ۔'' پرمان نے حکم دیا لیکن اس حکم میں سختی نہ تھی، مہر تھی

شبورا نے اس پیالے کو منہ سے لگا لیا اور جلدی جلدی سارا مشروب پی گئی، وہ ایک فرحت بخش شربت تھا، اسے پی کر شبورا کو توانائی محسوس ہوئی۔

رانی ملائے کا کو یہ سب دیکھ کر غصہ آیا تھا، وہ رنتارو کی دشمن تھی، ان کے بیٹے کو مارنا چاہتی تھی، ایسی عورت کو توانائی بخش مشروب پلانے کی بجائے موت کی نیند سلانے والا شربت دینا چاہیے تھا، اس کے ساتھ دشمنوں والا سلوک کرنا چاہیے تھا لیکن یہاں تو اس کے ساتھ زندگی بخش سلوک کیا جا رہا

تھا، رانی ملائے کا یہ سب برداشت نہیں کر سکتی تھی، وہ پیر پٹختی ہوئی بلا اجازت اس ہال نما کمرے سے نکل گئی۔

پرمان نے اسے جاتے ہوئے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' پرمان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام شبورا ہے۔'' شبورا کھڑی ہوتی ہوئے بولی۔

''ہمارے بیٹے کی دشمن کیوں ہو گئی ہے تُو......؟'' پرمان نے پوچھا۔

''کون ہے تیرا بیٹا۔'' شبورا نے پوچھا۔

''یہ جو تیرے دائیں کھڑا ہے۔'' پرمان نے رنتارو کی طرف اشارہ کیا۔

''میں اسے نہیں جانتی۔'' شبورا نے کالے لباس والے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ رنتارو ہے...... تو اس کیلئے کیا عمل کر رہی تھی...... تُو اسے کیوں مارنا چاہتی تھی۔''

''اوہ، اچھا اب میں سمجھی...... یہ ہے وہ رنتارو جو ایک معصوم لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے، جس نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔'' شبورا نے قدرے خفگی سے کہا۔

''معصوم لڑکی......؟ وہ کون ہے؟'' پرمان نے پوچھا۔

''یہ رنتارو سے پوچھ۔'' شبورا نے سیاہ لباس والے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پرمان...... یہ برہا کی بات کر رہی ہے۔''

''میں کسی برہا کی بات نہیں کر رہی...... میں آرزو کی بات کر رہی ہوں۔'' شبورا دوٹوک لہجے میں بولی۔

''رنتارو...... یہ آرزو کون ہے؟'' پرمان نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پرمان وہ تیرا انتخاب ہے...... وہ یہاں تھی تو برہا تھی...... وہاں وہ آرزو ہو گئی ہے۔'' رنتارو نے وضاحت کی۔

''اچھا، اچھا۔'' پرمان بات کو سمجھتا ہوا بولا۔ ''تو برہا کی کون ہے؟''

''پرمان...... میں بتاتا ہوں...... یہ میں کون خواہ مخواہ ہے۔'' یہ کہہ کر رنتارو زور سے ہنسا۔

اس کو ہنستا دیکھ کر شبورا کو غصہ آ گیا، وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''ہنستا ہے...... ذرا اپنے باپ کو یہ بتا کہ تُو نے میرے باپ اور بھائی کی زندگی چھینی ہے...... تُو ان کا قاتل ہے۔''

''چل اب بتا دیتا ہوں...... ہاں پرمان یہ سچ کہہ رہی ہے۔'' رنتارو اپنے باپ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پرمان اب تُو اسے یہ بتا دے کہ ہمارے راستے میں جو آتا ہے، ہم اسے کبھی نہیں چھوڑتے......

دیکھ لے اب تو بھی ہماری گرفت میں ہے......اب تیرا فیصلہ پرمان کرے گا۔''

''ہاں، رنتارو نے ٹھیک کہا...... یہاں میرا حکم چلتا ہے...... تیرا فیصلہ میں کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک تبسم پھیل گیا...... آنکھوں میں چمک آ گئی۔

☆......☆......☆

چیونٹیوں نے آرزو کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

وہ جب بھی سوتی، چیونٹیاں جانے کہاں سے نمودار ہو جاتیں اور اس کے جسم پر بنے زخموں کو چاٹنے لگتیں، یہ وہ زخم تھے جو پہلے سرخ دھبوں کی صورت میں نمودار ہوئے تھے اور اب یہی سرخ دھبے زخم بن گئے تھے اور آہستہ آہستہ پورے جسم پر پھیل گئے تھے، ان زخموں میں پانی بھرا رہتا تھا۔

زخموں کا بڑھنا بذاتِ خود ایک عذاب تھا لیکن اس سے بڑا عذاب یہ چیونٹیاں تھیں، اس کے زخموں کا علاج جاری تھا لیکن وہ ٹھیک ہونے کے بجائے بڑھتے جا رہے تھے، ڈاکٹر پریشان تھے، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، دواؤں پر دوائیں بدلی جا رہی تھیں، ٹیسٹ پر ٹیسٹ ہو رہے تھے لیکن مرض تھا کہ قابو میں نہیں آ رہا تھا، اوپر سے چیونٹیوں کا عذاب......

آرزو کی حالت قابل رحم ہو گئی تھی۔

جب چیونٹیاں کسی طرح قابو میں نہ آئیں تو سروری نے ایک تجویز پیش کی، اس کی تجویز قابل عمل تھی۔ کمال رائے نے اس کی تجویز سن کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، یہ بھی کر کے دیکھ لو۔''

رات کو سوتے ہوئے سروری نے آرزو کے سرہانے بالوں سے لے کر پیر کے انگوٹھے تک تیل لگا دیا اور پھر بیڈ پر ایک موٹی سی چادر بچھا کر اسے لٹا دیا گیا اور ایک چادر اس کے جسم پر ڈال دی گئی اور ستارہ کو حسب معمول اس کے کمرے میں اس کے ساتھ سونے کو کہا گیا۔

رات کے دو بجے اچانک اس کی آنکھ کھلی، ستارہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی، کمرے میں ٹیبل لیمپ روشن تھا، اس کی ہلکی ہلکی روشنی آرزو کے جسم پر پڑ رہی تھی وہ کسمسا رہی تھی۔

ستارہ فوراً اُٹھ کر اس کے نزدیک گئی، وہ سو رہی تھی لیکن سوتے میں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی جیسے سخت بے چین ہو، اس نے خواب آور گولی کھائی ہوئی تھی کیونکہ آج کل اسے خواب آور گولی کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔

ستارہ نے چادر پر نظر کی تو اسے وہاں کچھ چیونٹیاں گھومتی ہوئی دکھائی دیں، اسی وقت آرزو کا ہاتھ چادر سے باہر نکلا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے ہاتھ پر تیل لگے ہونے کے باوجود چیونٹیاں موجود تھیں، ہاتھ پر جہاں جہاں زخم تھے، چیونٹیاں اس پر موجود تھیں تب ستارہ نے اس کے بدن سے

چادر ہٹا دی، اس کے جسم کا بھی یہی حال تھا، اس کے جسم پر بے شمار چیونٹیاں موجود تھیں اور جسم پر تیل لگانے کے باوجود چیونٹیاں بڑی روانی سے اس کے جسم پر دوڑ لگا رہی تھیں۔

جب یہ ترکیب بھی ناکام ہو گئی تو سوچا گیا کہ جگہ بدل کر دیکھ لیا جائے، یہ سوچ کر اسے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا، ستارہ کو اس کے ساتھ رکھا گیا۔

رات کو جب اس کے زخموں میں خارش بڑھ گئی تو اور آرزو بے قابو ہو کر انہیں اپنے ناخنوں سے کھجانے لگی تو ستارہ ایک نرس کو بلا لائی اس نے آرزو کی حالت کے پیش نظر نیند کا انجکشن لگا دیا، تھوڑی دیر میں اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

آرزو کے سونے کے بعد ستارہ نے اس کا جسم اچھی طرح چادر سے لپیٹ دیا اور خود بھی سونے کیلئے لیٹ گئی، لائٹ جلنے دی، آج اسے جانے کیوں یہ اطمینان تھا کہ چیونٹیاں نہیں آئیں گی۔

تب ستارہ کے بازو میں کسی نے زور سے کاٹا۔

وہ ابھی پوری طرح سوئی نہیں تھی۔ نیم غنودگی میں تھی، چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے ایک نظر آرزو کو دیکھا۔ وہ چادر اوڑھے سو رہی تھی، ستارہ نے جلدی سے اپنی ڈھیلی آستین اوپر کی تو اپنے بازو پر ایک سرخ چیونٹی چلتی نظر آئی۔ وہ ایک عام سی چیونٹی تھی لیکن اسے دیکھ کر جانے کیوں ستارہ سہم گئی، پھر اس نے ہمت کر کے چیونٹی کو چٹکی میں پکڑ کر مسل دیا۔ پھر اسے اپنی انگلی سے جھاڑ کر اپنے بازو کو دیکھا، وہاں کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا لیکن جہاں چیونٹی نے کاٹا تھا، وہاں ہلکی سی سوجن ضرور ہو رہی تھی۔ ستارہ نے اپنی قمیص کی آستین نیچے کی اور اُٹھ کر آرزو کے پاس آئی۔ اس نے آرزو کو بغور دیکھا۔ چادر پر کوئی چیونٹی نظر نہ آئی۔ آرزو اطمینان سے سو رہی تھی۔ پھر ستارہ نے اس کی چادر اُٹھا کر اندر جھانکا۔ اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ اسے کہیں کوئی چیونٹی نظر نہ آئی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے بیڈ پر چلی گئی اور آرام سے لیٹ گئی...... جلد ہی اسے نیند نے دبوچ لیا۔

یہ رات کا جانے کون سا پہر تھا اور نہ جانے اس کی آنکھ کیوں کھلی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بجے تھے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی آنکھ کس وجہ سے کھلی کہ اچانک آرزو کی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ ''ستارہ۔''

''ستارہ ایک دَم تڑپ کر اُٹھ گئی۔'' جی بی بی۔''

وہ بھاگ کر آرزو کے بیڈ کے نزدیک پہنچی تو اس نے دیکھا کہ آرزو کے بیڈ کی چادر چیونٹی سے بھری ہوئی ہے اور جو چادر اس نے اوڑھی ہوئی تھی، اس پر بے شمار چیونٹیاں تھیں۔ آرزو اُٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے پورے جسم پر چیونٹیاں چل رہی تھیں۔

ستارہ نے سب سے پہلے اوڑھنے والی چادر کھینچ کر نیچے ڈالی۔ آرزو نے اسپتال کے ڈھیلے ڈھالے لباس پہن رکھے تھے۔ ستارہ کو آرزو کے زخموں پر بے شمار چیونٹیاں چمٹی ہوئی نظر آئیں۔ وہ اسے بری طرح کاٹ رہی تھیں۔

''بی بی...... جلدی واش روم میں چلیں۔'' ستارہ کے پاس ان چیونٹیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ آرزو کو واش روم میں لے جا کر شاور کے نیچے کھڑا کر دے۔

''چلو۔'' آرزو بیڈ سے اُترتے ہوئے بولی۔

''بی بی...... آپ واش روم میں جا کر کپڑے اُتار کر باہر پھینک دیں۔'' ستارہ نے آگے بڑھ کر واش روم کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' آرزو نے کہا اور پھر اندر جا کر اس نے اسپتال کے کپڑے اپنے جسم سے الگ کئے اور دروازہ کھول کر باہر پھینک دیئے۔

ستارہ نے اس کے کپڑے چٹکی سے پکڑ کر اوڑھنے والی چادر کے ساتھ ڈال دیئے۔ تب اس پر حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ جو چادر ابھی چیونٹیوں سے بھری ہوئی تھی، اب چیونٹیوں سے خالی ہو چکی تھی۔ یہی حال بیڈ کی چادر کا تھا۔ ہاں اکا دکا، چیونٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے اوڑھنے والی چادر اُٹھا کر بیڈ پر ڈال دی اور اب جو کپڑوں پر توجہ کی تو معلوم ہوا کہ کپڑے بھی چیونٹیوں سے صاف ہو چکے ہیں۔ چند لمحوں بعد چیونٹیوں کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

ستارہ نے آرزو کے کپڑے جھاڑ کر اسے دوبارہ دے دیئے۔ وہ انہیں پہن کر باہر آ گئی۔ اس کے جسم سے چیونٹیاں تو صاف ہو گئی تھیں لیکن زخموں میں خارش بڑھ گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے زخموں کو کھرچ ڈالے۔ ستارہ نے اسے دوا کھلائی۔ پھر اس کے زخموں پر کریم لگانے لگی۔

آرزو کو یہ سوچ کر اسپتال منتقل کیا گیا تھا کہ شاید جگہ بدلنے سے چیونٹیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں لیکن یہ تجربہ ناکام رہا تھا۔

صبح جب کمال رائے اسپتال آیا اور اسے ستارہ نے رات کی صورتحال بتائی تو ساری بات سن کر اس نے کہا۔ ''آج کی رات اور دیکھ لو...... ورنہ پھر گھر چلے جائیں گے۔''

دوسری رات بھی وہی تماشا ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہزاروں چیونٹیاں اچانک کہاں سے نمودار ہو جاتی تھیں اور پھر اچانک کہاں غائب ہو جاتی تھیں۔

اب اسپتال میں رہنے کا کیا جواز تھا۔ دوسرے دن کمال رائے آرزو کو گھر لے آیا۔ چیونٹیوں کی پریشانی اپنی جگہ لیکن اس کے جسم پر اُبھرنے والے دھبے جو اب زخموں کی صورت اختیار کر چکے تھے،

آرزو کو عذاب میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔ ان زخموں میں اس قدر تیز خارش ہوتی تھی کہ آرزو کا جی چاہتا تھا کہ ان زخموں کو چاقو سے کھرچ دے۔ علاج جاری تھا۔ بہترین سے بہترین دوائیں دی جا رہی تھیں لیکن مرض کم ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔

اِدھر رامش خیال کی حالت خراب تھی۔ وہ اندھا ہو کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ اسے بھی اچھے سے اچھے اسپتال میں دکھا لیا گیا لیکن مرض کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا جو ڈاکٹر بھی آنکھوں کا معائنہ کرتا، وہ کہتا۔ ''آنکھیں تو بالکل ٹھیک ہیں، آنکھوں میں کوئی خرابی نہیں۔''

آرزو کی بیماری سمجھ میں آ رہی تھی نہ رامش کی بیماری پکڑ میں آ رہی تھی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ دونوں طرف سے کارڈ بھی بٹ چکے تھے لیکن ان حالات میں جبکہ ایک اندھا، ایک کوڑھی ہو چکا تھا کسی طور شادی ممکن نہ تھی۔

شادی ملتوی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لہٰذا شادی کی تاریخ میں ایک ماہ کی توسیع کر دی گئی۔

شادی ملتوی ہونے کا رامش خیال کو بہت افسوس ہوا۔ وہ تو شادی کے انتظار میں ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہا تھا۔ اسے اپنے اندھے ہونے کا بھی اس قدر افسوس نہ تھا جس قدر شادی ملتوی ہو جانے کا تھا۔ پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ آرزو کی حالت ٹھیک نہیں۔ اندھے ہونے کے باوجود آرزو سے ایک دو مرتبہ مل آیا تھا۔ آرزو اسے دیکھ کر رو پڑی تھی۔ اس کا دل تو اپنی بیماری اور چیونٹیوں کے عذاب سے دُکھا ہوا تھا۔ رامش خیال کے ہاتھ میں چھڑی جو دیکھی تو اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ سسک سسک کر رو پڑی۔

تب مہر النساء اسے ڈرائنگ روم سے اُٹھا کر لے گئی۔ اسے اس کے بیڈ روم میں پہنچایا گیا اور بہت دیر تک بیٹھی اسے تسلی دیتی رہی۔

کمال سے اپنی بیٹی کی حالت ویسے ہی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اسے روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی رو پڑے۔ مگر اس کے سامنے رامش خیال بیٹھا تھا، وہ اپنے نابینا ہو جانے کی وجہ سے پہلے ہی غم زدہ تھا اور اب آرزو کی سسکیوں نے اسے مزید ملول کر دیا تھا تو وہ کیسے اس کے سامنے رونے بیٹھ جاتا۔ وہ بڑا تھا، اسے بچوں کے سامنے حوصلے سے کام لینا تھا۔

عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ کمال رائے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ آرزو کے سلسلے میں اس نے شہر کا کوئی اسپتال نہیں چھوڑا تھا۔ جہاں بھی جس ڈاکٹر کا پتہ چلا، وہ آرزو کو وہاں دکھانے لے گیا...... نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

کچھ ایسی ہی صورتحال رامش خیال کے سلسلے میں تھی۔ کراچی کا کوئی بڑا آنکھوں کا ماہر نہیں چھوڑا

گیا تھا جس سے رامش خیال کا معائنہ نہ کرایا گیا ہو......لیکن نتیجہ وہی ٹائیں ٹائیں فش۔

پھر اچانک اسے بلی والے بابا کا خیال آیا۔ وہ اسے بھولا ہوا تھا۔ اس دوران ایک آدھ مرتبہ اس نے بابا کے بارے میں سوچا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا تھا کہ وہاں جائے نہ جائے۔ بلی والا بابا آخر ان مسائل میں کیا کرے گا۔ اب یہ خیال اس کے دل میں پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس کے پاس جا کر تو دیکھے...... بے شک وہ اس معاملے میں پڑنے سے انکار ہی کر دے۔ اس خیال نے اسے اتنا مجبور کیا کہ وہ اپنے ایک دوست کے پاس جاتے جاتے بلی والے بابا کی طرف مڑ گیا۔

وہ بڑے پرامید انداز میں بلی والے بابا کے علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جانے اسے یہ یقین کیوں ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں اس کی مدد ضرور کرے گا۔

شام کا وقت تھا۔ جب اس نے اپنی گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ لگا کر سامنے نظر کی تو اسے وہ جگہ صاف نظر آئی جہاں بلی والے بابا بیٹھے ہوتے تھے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا ہوا، وہ تو بڑی اُمیدیں لے کر بابا کے پاس آیا تھا۔ اس کی ساری اُمیدیں ایک لمحے میں چکنا چور ہو گئی تھیں۔

کمال رائے گاڑی بند کر کے باہر نکلا۔ اس جگہ تک آیا جہاں بلی والے بابا بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ بڑے افسوس سے خالی جگہ کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے وہیں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ آج جوس والا بھی موجود نہ تھا۔ وہ کس سے بلی والے بابا کے بارے میں معلوم کرتا...... آخر وہ مایوسانہ قدم اُٹھاتا گاڑی کی طرف بڑھا۔

☆......☆......☆

اچانک کال بیل بجی۔

مہرالنساء اپنی ممانی ثمینہ کے پاس بیٹھی تھی۔ ثمینہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ ماموں کے بچے اپنے کمرے میں پڑھائی میں مصروف تھے اور رامش خیال اوپر اپنے بیڈ روم میں تھا۔

گھنٹی کچھ اس انداز میں بجی کہ جیسے بیل دینے والا کچھ زیادہ ہی عجلت میں ہو۔ اس نے لگا تار تین چار گھنٹیاں ایک ساتھ بجا دیں۔

ممانی ثمینہ نے مہرو کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون آ گیا؟''

''جو بھی ہے، خاصی جلدی میں ہے...... میں دیکھتی ہوں۔'' مہرالنساء یہ کہہ کر اُٹھ گئی۔

وہ تیز تیز چلتی گیٹ تک پہنچی۔ جب اس نے چھوٹا گیٹ کھول کر باہر جھانکا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا غصہ آیا کہ وہاں کسی ملاقاتی کی بجائے ایک فقیر کھڑا ہے۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے غصے پر قابو پا لیا اور نرم لہجے میں بولی۔ ''اچھا بابا ٹھہرو۔'' یہ کہہ کر اس نے گیٹ بند کیا اور پھر کھڑکی کی طرف بڑھی۔

''کون تھا؟'' ثمینہ نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھا نہیں ہے۔ وہ گیٹ پر کھڑا ہے۔ کوئی فقیر ہے۔'' مہرو نے بتایا۔

''تم نے اسے ڈانٹا تو نہیں۔'' ثمینہ نے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ میں اسے ٹھہرا آئی ہوں۔'' مہرو نے ہنس کر کہا۔

''اچھا کیا...... جاؤ، میرے پرس میں سے دس روپے نکال کر اسے دے آؤ۔''

مہرالنساء نے ثمینہ کے پرس سے دس روپے نکالے اور تیز تیز چلتی گیٹ پر پہنچ گئی۔ اس نے گیٹ کھول کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''لو بابا۔''

''کیا دیتی ہے...... یہ ہمیں نہیں چاہئے۔''

فقیر نے بے نیازی سے کہا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ ''جا اسے بھیج۔''

یہ عجیب فقیر تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں یہ پہلا فقیر دیکھا تھا جو بھیک لینے سے انکار کر رہا تھا اور بھیک بھی کوئی روپیہ دو روپیہ نہیں تھی، پورے دس روپے تھے۔ مہرالنساء نے حیرت سے اس پر نظر ڈالی تو وہ عام فقیروں سے بالکل مختلف نظر آیا۔

اس کے کندھے پر ایک بلی کا بچہ بیٹھا ہوا تھا اور جانب ایک سفری بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس فقیر کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی کہ اس کی آنکھوں میں چند لمحوں سے زیادہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

مہرالنساء مایوس ہو کر واپس لوٹ آئی۔ اس نے ثمینہ سے کہا۔ ''مامی، اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا ہے، وہ کچھ عجیب سا فقیر ہے، اس کے کندھے پر ایک بلی کا بچہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جا اسے بھیج۔''

''اسے بھیج۔'' ثمینہ نے حیرت سے دہرایا۔ ''کسے؟ یہ اس نے نہیں بتایا؟''

''مامی شاید وہ تمہیں بلا رہا ہے۔'' مہرالنساء نے دس کا نوٹ ثمینہ کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''ہائے نہیں...... مہرو، ایسی بات نہ کر...... مجھے ایسے فقیروں سے بڑا ڈر لگتا ہے...... تُو آرام سے بیٹھ جا، وہ خود ہی چلا جائے گا۔'' یہ کہہ کر ثمینہ دوبارہ سبزی کاٹنے میں مصروف ہو گئی اور مہرو اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ دوبارہ اسی انداز میں گھنٹی بجی۔

''مامی، وہ گیا نہیں...... آپ جا کر اسے ڈانٹو۔''

''اچھا، میں دیکھتی ہوں...... آ جاؤ...... تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔'' ثمینہ بادل ناخواستہ اُٹھی۔

جب ثمینہ نے چھوٹے گیٹ سے باہر جھانکا تو وہ فقیر اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''اب تو آ گئی؟...... میں کہہ رہا ہوں اسے بھیج۔'' یہ بات اس نے اتنے رعب میں کہی کہ ثمینہ کی زبان گنگ ہو گئی اور اس نے گھبرا کر گیٹ بند کر لیا۔

''مہرو...... وہ تو مجھے نہیں بلا رہا۔'' ثمینہ نے پیچھے کھڑی مہرو سے کہا۔

''پھر کسے بلا رہا ہے؟'' مہرو نے پوچھا۔

''پتہ نہیں...... کہہ رہا ہے تو کیوں آ گئی۔ اسے بھیج۔'' ثمینہ نے جواب دیا۔

''اب کسے بھیجیں۔'' مہرو سوچتے ہوئے بولی۔ پھر اچانک خیال آیا۔ ''ارے کہیں وہ رامش بھائی کو تو نہیں بلا رہا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' ثمینہ نے اس کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو اسے بھیجیں۔''

''اچھا، امی آپ یہیں کھڑی رہو، میں بھائی کو لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مہرو دوڑتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

رامش خیال اپنے بیڈ پر لیٹا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ جانے کن خیالوں میں تھا۔ اس نے دروازے پر آہٹ سنی تو فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو بند آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''بھائی۔'' مہرو نے دروازے میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔ ''ارے بھائی کیا ہوا، آپ رو رہے ہیں۔''

''نہیں تو۔'' رامش خیال نے فوراً اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور آستین سے آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

''بھائی آپ ذرا میرے ساتھ چلیں...... ایک فقیر گیٹ پر کھڑا ہے شاید وہ آپ کو بلا رہا ہے۔'' مہرو نے بتایا۔

''مہرو...... اس بات کا کیا مطلب ہے...... مجھے کوئی فقیر آخر کیوں بلائے گا۔'' رامش خیال نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''بھائی...... میں اسے دس روپے دینے گئی تھی لیکن اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اور بولا اسے بھیج۔ میں پھر امی کو لے گئی لیکن انہیں دیکھ کر بھی اس نے یہی کہا...... ارے تو کیوں آ گئی، اسے بھیج...... وہ بڑا عجیب سا فقیر ہے۔ ایک بلی کا بچہ اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا ہے...... بھائی آپ چلو۔ کیا پتہ وہ آپ کو بلا رہا ہو۔'' مہرو نے جلدی جلدی ساری روداد بیان کیا۔

''چلو...... میں چلتا ہوں۔'' رامش خیال اس کی بات سن کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

مہرو اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے گیٹ تک لے آئی۔ پھر اس نے چھوٹا گیٹ کھولنے کی بجائے پورا

گیٹ کھول دیا۔ وہ اور ثمینہ گیٹ کے پیچھے ہو گئیں اور رامش خیال اس فقیر کے مقابل آ گیا۔

''کہاں چھپا بیٹھا تھا تو...... اتنی دیر سے تجھے بلا رہا ہوں۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔ دنیا کے سو بکھیڑے ہیں۔'' اس فقیر نے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اندر آ کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ بلی کا بچہ کود کر زمین پر آ گیا اور آرام سے بیگ پر بیٹھ گیا۔ ''ادھر آ جا۔'' اس فقیر نے رامش خیال کو مخاطب کر کے کہا۔

مہرو نے فوراً رامش خیال کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو فقیر کے مقابل لے آئی۔

''بیٹھ جا، کھڑا کیوں ہے؟'' فقیر نے ڈانٹ بھرے لہجے میں کہا۔

رامش خیال فوراً اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں نیچی تھیں۔ مہرو اور ثمینہ تھوڑے سے فاصلے پر ایک دوسرے کے قریب کھڑی تھیں اور حیرت سے اس فقیر کو دیکھ رہی تھیں۔ اس فقیر نے ایک لمحے کو بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ساری توجہ رامش خیال کی طرف تھی۔

پھر اس فقیر نے اپنے بیگ سے ایک چمکتا ہوا اسٹیل کا پیالہ نکالا اور اسے ثمینہ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''دودھ چاہئے۔''

''مل جائے گا...... دودھ بہت۔'' ثمینہ نے پیالہ پکڑتے ہوئے کہا اور پھر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''کبھی گونگا ہو جاتا ہے، کبھی اندھا ہو جاتا ہے...... آخر تو چاہتا کیا ہے؟'' فقیر نے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا...... میں کیا کروں...... میں خود پریشان ہوں۔'' رامش خیال نے بے بسی سے کہا۔

''پریشان ہونے سے کیا ہوگا...... کل تو بہرہ ہو گا...... پرسوں مفلوج ہو جائے گا...... بس یہی باقی رہ گیا ہے۔''

''نہیں بابا...... ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کچھ کریں نا۔''

''میں کون ہوں کرنے والا...... کرنے والا وہ ہے جو آسمانوں میں بیٹھا ہے۔'' فقیر نے بڑے یقین سے کہا۔

''بابا...... آپ نے ٹھیک کہا۔'' رامش خیال فوراً بولا۔

''لو بابا...... دودھ۔'' اتنے میں ثمینہ آ گئی۔ اس نے دودھ سے بھرا پیالہ بابا کی طرف بڑھایا۔

''اس کے سامنے رکھ دے۔'' بابا نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

ثمینہ نے دودھ سے بھرا پیالہ احتیاط کے ساتھ رامش خیال کے سامنے رکھ دیا...... اور پھر وہ مہرو

کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

"چل بھئی...... دونوں ہاتھوں میں پیالہ اُٹھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ...... دیکھ احتیاط سے...... پیالہ بھرا ہے دودھ نہ چھلکے۔" بابا نے رامش خیال کو ہدایت کی۔

رامش خیال نے اندازے سے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا، جب اس کے ہاتھ نے پیالہ محسوس کر لیا تو اس نے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر پیالہ اُٹھا کر اونچا کر لیا۔ اتنا اونچا کہ دودھ میں اس کی آنکھوں کا عکس نظر آنے لگا۔

وہ فقیر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر رامش خیال کی طرف جھکا۔ اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی دو بار جلدی جلدی دودھ میں ڈبوئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اس کی آنکھوں کا عکس تھا۔ پھر وہ تیزی سے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

جہاں فقیر نے اپنی انگلی ڈبوئی تھی، وہاں یوں محسوس ہوا جیسے تازہ تازہ خون کا قطرہ اُبھرا ہو۔ یہ دو قطرے تھے۔ پھر یہ قطرے پھیلنے شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا دودھ خون میں نہا گیا...... اب پیالے میں دودھ نہیں خون تھا۔

خون سے بھرا پیالہ دیکھ کر مہرو خوفزدہ ہوگئی۔ وہ منہ پھیر کر فوراً ثمینہ سے لپٹ گئی۔ خوف تو خیر ثمینہ کو بھی محسوس ہوا لیکن وہ بڑی تھی آخر اپنے بڑے ہونے کا اسے بھرم رکھنا تھا۔ اس نے اسے لپٹا لیا۔

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے...... اے لڑکی، یہ پیالہ پکڑ اور اسے سامنے کیاری میں ڈال دے اور ہمارا پیالہ دھو کر لاؤ۔" بابا نے حکم دیا۔

"لائیں میں کر دیتی ہوں۔" ثمینہ آگے بڑھی۔

"نہیں...... تم نہیں...... اگر اس نے ایسا نہ کیا تو برے برے خواب دیکھے گی۔" فقیر نے بتایا۔

"چل مہرو!" ثمینہ نے اسے تسلی دی۔

مہرالنساء ہمت کر کے رامش خیال کی طرف بڑھی۔ اس نے اس کے ہاتھوں سے پیالہ لے لیا اور تیزی سے قدم بڑھا کر سامنے لگے پودوں کی جڑ میں وہ دودھ جو اب خون ہو گیا تھا، ڈال دیا اور کچن میں جا کر پیالہ دھولائی۔ اب وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھی۔

اس نے پیالہ لا کر بابا کو دے دیا۔ فقیر نے اس پیالے کو پکڑ کر آئینے کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔ اس چمکتے پیالے میں رامش خیال کا پورا چہرہ نظر آ رہا تھا اور پیالے سے منعکس ہوتی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"چل اب آنکھیں بند کر لے۔" بابا نے حکم دیا۔

رامش خیال نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو سکون کا احساس ہوا۔ اب سے پہلے جو چبھن تھی، وہ اب نہ رہی تھی۔

اس فقیر نے رامش خیال کی بند آنکھوں کو بغور دیکھا اور بیٹھے بیٹھے دور سے ہی پھونک ماری۔ پھر بولا۔ "چل کھول آنکھیں اور پیالے میں دیکھ۔"

رامش خیال نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں کا اندھیرا دور ہو چکا تھا اسے پیالے میں ایک سنہری سانپ لہراتا ہوا نظر آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔

"اندھے کو کیا دکھائی دیا۔" بابا نے ہنس کر کہا۔

"مجھے ایک سانپ نظر آیا۔" رامش خیال نے اس فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ، میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"بھائی۔" مہرو فوراً آگے بڑھی۔

رامش خیال فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ان کی طرف آیا، مہرو اور ثمینہ کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔ رامش خیال ان دونوں کو دیکھ کر بولا "میں دیکھ سکتا ہوں...... میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"اچھا، ہم چلتے ہیں۔" وہ فقیر اپنے کندھے پر بیگ ڈالتا ہوا بولا۔ بلی کا بچہ اس کے ہاتھ پر بیٹھا تھا۔

"بابا...... ہمیں کچھ خدمت کا موقع دیں...... کھانا کھا کر جائیں۔"

"ہم اللہ کی روٹی کھاتے ہیں...... تو ہمیں کیا کھلائے گا۔" بابا نے بڑی تمکنت سے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

"بابا ٹھہریں...... میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"ہم بہت بھاری ہیں...... تیری گاڑی ہمارا بوجھ نہ اُٹھا سکے گی۔ ہم پیدل جائیں گے۔ یہ تو زمین ہی ہے جو ہمارا بوجھ اُٹھا لیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ فقیر گیٹ سے نکل گیا۔ اور جب وہ تینوں گیٹ سے باہر آئے تو انہیں وہ فقیر کہیں نظر نہ آیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

☆......☆......☆

وہ بڑے مایوسانہ انداز میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ ابھی کپڑے تبدیل ہی کر رہا تھا کہ سروری نے رامش خیال اور مہرو کے آنے کی اطلاع دی، ساتھ ہی اس نے یہ بتایا کہ وہ دونوں آرزو کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔

کمال رائے کو اس کے اندھے ہو جانے کا بے حد افسوس تھا، وہ اندھے ہو جانے کے باوجود کئی مرتبہ اس کے گھر آ چکا تھا، اسے آرزو کی بہت فکر تھی...... اور کیوں نہ ہوتی، وہ اس کی منکوحہ جو تھی۔ کمال رائے کو رامش کی بہت فکر تھی، اس لئے وہ آج بلی والے بابا کے پاس گیا تھا۔ شاید اس کے پاس اس کا کوئی حل ہو لیکن وہ اپنی جگہ پر تھا ہی نہیں، وہ مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ تینوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ آرزو سامنے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس نے کندھے تک چادر اوڑھی ہوئی تھی، صرف چہرہ کھلا ہوا تھا، آرزو کے پورے جسم پر داغ تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ چہرے پر کسی قسم کا کوئی داغ یا زخم نہ تھا۔ اس کا چہرہ بالکل صاف تھا۔

اپنی بیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی...... اور اس سے زیادہ خوشی رامش خیال کو دیکھ کر ہوئی جس نے ایک توانائی سے بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔

کمال رائے کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر رامش خیال ایک دم صوفے سے اٹھا۔

''اوہ، انکل۔''

پھر وہ دو چار قدم آگے بڑھا۔ اس نے بڑے بھرپور انداز میں کمال رائے سے ہاتھ ملایا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔

''رامش تم دیکھ سکتے ہو؟'' کمال رائے کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ہاں، انکل...... میں دیکھ سکتا ہوں۔'' رامش خیال نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''بڑی خوشی کی بات ہے...... یہ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟''

''بس انکل...... آنکھوں کی روشنی ملتے ہی سیدھا یہاں چلا آیا ہوں۔'' اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مہرو، تم کیسی ہو؟'' کمال رائے نے مہرو کی مزاج پرسی کی۔

''اب تو بہت اچھی ہوں۔ بھائی کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔'' مہرو نے آرزو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس اب دعا ہے کہ آرزو کسی طرح ٹھیک ہو جائے۔''

''اللہ بہتر کرے گا۔'' کمال رائے نے کہا۔ ''یہ آنکھیں کس طرح ٹھیک ہوئیں، کوئی دوا وغیرہ استعمال کی۔''

''نہیں انکل...... بس یوں سمجھیں کہ اللہ نے کوئی مسیحا بھیج دیا۔ بھئی مہرو...... انکل کو ذرا پورا واقعہ سناؤ نا۔'' رامش خیال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابھی سناتی ہوں۔'' مہرو نے کمال رائے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

اس واقعہ میں سب سے حیران کن بات اس فقیر کا حلیہ تھا جسے سن کر بلی والے بابا کا اپنے ٹھکانے پر نہ ملنے کا افسوس کمال رائے کے دل سے فوراً نکل گیا۔ بلی والا بابا اگر اپنے ٹھکانے پر موجود ہوتا تو رامش خیال کی آنکھیں کیسے ٹھیک ہوتیں...... اس کا مطلب ہے کہ بلی والا بابا اس گھرانے سے غافل نہ تھا۔

☆......☆......☆

شام کا وقت تھا۔

کمال رائے سیاہ رنگ کے چمکیلے گھوڑے پر بیٹھا صحرا میں چلا جا رہا تھا۔ اس کا گھوڑا برق رفتاری سے بھاگ رہا تھا۔ وہ اپنے پیچھے ریت کا بادل اڑاتا چلا جا رہا تھا۔ کمال رائے ادھر ادھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ صحرا میں کسی کو تلاش کرنے نکلا تھا؟ لیکن کسے......؟ یہ اسے معلوم نہ تھا۔

جب وہ صحرا میں کافی دور نکل آیا تو اچانک اسے اپنے سامنے ایک عورت نظر آئی۔ وہ دور تھی اس لئے پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔ کمال رائے اس عورت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ بصارت کی حدود میں آئی...... کمال رائے نے فوراً اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔''

وہ شبورا تھی...... وہ مچل رہی تھی، تڑپ رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔

''صاحب جی...... مجھے بچالیں...... صاحب جی مجھے بچالیں۔''

شبورا کو مشکل میں دیکھ کر وہ فوراً اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور بے اختیار شبورا کی طرف بڑھا...... لیکن اب وہاں کوئی نہ تھا۔

صحرا میں دور تک ریت اڑ رہی تھی۔

کمال رائے نے جب پلٹ کر اپنے گھوڑے کی طرف دیکھا تو وہاں اس کا گھوڑا بھی نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دور تک دیکھا۔ لق و دق صحرا اور بگولوں کی شکل میں اڑتی ریت۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ لق و دق صحرا میں تنہا رہ گیا ہے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جتنا جلد ممکن ہو سکے، وہ اس صحرا سے نکل جائے...... گھبرا کر اس نے بھاگنا شروع کیا مگر اس کے پاؤں ریت میں دھنسنے لگے۔ صحرا کی ریت جیسے دلدل بن گئی۔ کمال رائے اس دلدل میں دھنسنے لگا۔

تب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر پایا۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس نے کس قسم کا خواب دیکھا ہے۔

صبح کو دانتوں میں برش کرتے ہوئے رات کا خواب پوری طرح اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ شبورا کی درد بھری آوازیں اس کی سماعت میں گونج رہی تھیں۔

"صاحب جی...... مجھے بچالیں...... صاحب جی...... مجھے بچالیں۔"

اس کے جسم سے لپٹے ہوئے دو کالے سانپ کمال رائے کے دل کی دھڑکن اب بھی تیز کر رہے تھے۔ جب وہ نہا دھو کر واش روم سے نکلا تو اس نے سب سے پہلے لعل محمد کو طلب کیا۔ لعل محمد فوراً ہی اس کے کمرے میں آ گیا۔ "جی مالک۔"

"یہ بتاؤ...... تمہیں شبورا کا گھر یاد ہے۔" کمال رائے نے پوچھا۔

"جی مالک...... یاد ہے...... وہاں جانا ہے کیا؟" لعل محمد نے سمجھداری کا ثبوت دیا۔

"ہاں...... تم گاڑی لے کر شن گوٹھ چلے جاؤ۔ مجھے شبورا کی خیر خیریت چاہئے۔ اگر وہ کسی وجہ سے پریشان ہو تو اسے اپنے ساتھ لے آنا...... کہنا کہ مالک نے بلایا ہے۔" کمال رائے نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے...... مالک میں ابھی چلا جاتا ہوں۔" لعل محمد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ناشتہ کرلو...... پھر چلے جانا۔" کمال رائے نے اسے ہدایت کی۔

☆......☆......☆

لعل محمد شبورا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر تنگ آ گیا تھا لیکن وہ دروازہ کھول کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ لعل محمد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر میں کوئی ہے ہی نہیں...... جب دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے لعل محمد کو کافی دیر ہو گئی تو بستی کے کئی لوگ شبورا کے دروازے پر جمع ہو گئے۔ انہیں بھی تشویش ہوئی کہ آخر شبورا دروازہ کیوں نہیں کھول رہی۔ وہ دو تین دن سے کسی کو نظر بھی نہیں آئی تھی۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ وہ شوم کا عمل کر رہی ہے اور اس عمل میں روز کا معمول برقرار نہیں رہتا، اس لئے اگر شبورا بستی والوں کو دکھائی نہیں دے رہی تھی، تو یہ تشویش کی کوئی بات نہ تھی...... لیکن تشویش کی اب یہ بات تھی کہ ایک شخص گھر کا دروازہ اتنی دیر سے کھٹکھٹا رہا ہے تو وہ کھول کیوں نہیں رہی...... کہیں خدانخواستہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔

کواڑوں کی جھریوں میں سے جھانک کر دیکھا گیا لیکن وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ البتہ سامنے کمرے کا دروازہ ضرور کھلا ہوا دکھائی دیا۔ صلاح مشورے کے بعد یہی طے ہوا کہ شبورا کے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر جایا جائے۔

بستی کا ایک نوجوان حکم سنتے ہی فوراً دیوار پر چڑھ گیا اور آناً فاناً شبورا کے گھر میں اُتر گیا اور اس نے بلاتاخیر گھر کا دروازہ کھول دیا۔

تب سب سے پہلے بستی کے دو بزرگ اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے لعل محمد تھا۔

صحن کے ایک طرف سرسوں کے تیل سے حصار کھینچا ہوا تھا۔ اس حصار کے درمیان شبورا کی جھولی رکھی تھی اور جھولی کے دائیں جانب شبورا کی بین پڑی تھی لیکن شبورا کہیں نہیں تھی۔

پھر اس کے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا...... لیکن کہیں کوئی ایسے آثار نظر نہیں آئے جس سے شبورا کے بارے میں کچھ معلومات ہو سکتیں، تب بستی کے لوگوں نے یہ طے کیا کہ اس کے گھر کو تالا لگا دیا جائے۔ شبورا جب لوٹ کر آئے گی تو گھر کا تالا کھلوا لے گی۔

لعل محمد نے شبورا کے گھر پر جو دیکھا تھا، وہ من وعن کمال رائے کی خدمت میں گوش گزار کر دیا۔

"لوگوں کا اس کے بارے میں کیا خیال تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔" کمال رائے نے پوچھا۔

"مالک...... وہاں جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ ان ساری باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ شبورا شوم کے عمل کے سلسلے میں کہیں نکل گئی ہے یا پھر اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔" لعل محمد نے کہا۔

اس وقت کمال رائے کی آنکھوں کے سامنے شبورا آ گئی۔ اس کے جسم سے دو کالے سانپ لپٹے ہوئے تھے اور وہ دردناک انداز میں دہائی دے رہی تھی۔ صاحب جی...... مجھے بچالیں۔"

یقیناً اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ کمال رائے نے سوچا۔

☆......☆......☆

کمال رائے فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی کھڑی کر کے باہر آ گیا۔ اس نے بلی والے بابا کو دیوار سے پشت لگائے اور سامنے ایک طرف یک ٹک دیکھتے ہوئے نظر میں بھر لیا تھا۔ وہ گاڑی بند کر کے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔

بلی کا بچہ بیگ کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا اور اپنی زبان سے اپنے پیر چاٹ رہا تھا۔

کمال رائے خاموشی سے بلی والے بابا کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنی نظریں جھکا لیں۔

"آ گیا۔" کچھ دیر کے بعد بلی والے بابا کی آواز سنائی دی تو کمال رائے نے اپنی آنکھیں اُٹھائیں۔

"جی۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"ہم نے تجھ سے کہا تھا نا کہ وہ بہت خبیث ہے۔ آخر وہ اپنی خباثت سے باز نہ آیا۔ اس نے لڑکے کو اندھا کر دیا۔ پہلے وہ اسے گونگا کر چکا تھا...... لیکن وہ بھول میں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو چاہے گا کر گزرے گا۔ ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمارے صبر کو آزمائش میں ڈال رہا ہے۔ ہم نے اندھے کو سوجھتا کر دیا ہے۔ اب وہ اس لڑکے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔" بلی والے

بابا نے اپنی دھن میں کہا۔

''بابا، میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ وہ لڑکا بہت خوش ہے۔'' کمال رائے نے خوشی کا اظہار کیا۔

''وہ تو خوش ہے لیکن لڑکی ابھی مشکل میں ہے۔'' بابا بولا۔

''ہاں، بابا...... میری بیٹی کیلئے کچھ کریں۔ اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔'' کمال رائے نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''ہم کرنے والے کون ہیں......؟ کرنے والا تو وہ اوپر بیٹھا ہے۔'' بلی والے بابا نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بے شک کرنے والا وہی ہے...... لیکن وہ اوپر سے خود تو نہیں آئے گا۔''

''اسے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم جو یہاں بیٹھے ہیں۔ بس اس کا اشارہ ہی کافی ہے۔'' بابا نے کہا۔

''لڑکی کی خراب حالت کی وجہ سے اس کی شادی کی تاریخ بھی ملتوی کر دی ہے۔'' کمال رائے نے افسردگی سے بتایا۔

''گھبراتا کیوں ہے...... اس کی شادی ہوگی اور ضرور ہوگی...... وہ خبیث اس کی شادی نہیں روک سکتا ہم دیکھ لیں گے۔ اس کو بھی اور اس کے باپ کو بھی۔''

''باپ۔'' کمال رائے بابا کی بات سمجھ نہ پایا۔

''ہاں باپ۔'' بلی والے بابا نے کہا۔ ''باپ، بیٹے سے دو ہاتھ آگے ہے۔''

''بابا، میں سمجھا نہیں۔'' کمال رائے نے تذبذب سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو سمجھ بھی نہیں سکتا، تو بس خواب دیکھ سکتا ہے۔'' بابا نے اندر کی بات کی۔

''بابا، کیسا خواب؟'' کمال رائے ایک دم چونکا۔

''اگر تو نے یہ دیکھا کہ اس کے گرد دو سانپ لپٹے ہوئے ہیں اور وہ مدد کیلئے پکار رہی ہے...... تو سمجھتا کیوں نہیں کہ وہ واقعی پریشانی میں ہے۔'' بلی والے بابا نے اس کے خواب کی تعبیر بیان کی۔

''بابا، وہ کہاں ہے؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''وہ جہاں بھی ہے قید میں ہے...... وہ اس خبیث کے باپ کی قید میں ہے۔'' بابا نے بتایا۔ ''خیر کوئی بات نہیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا...... سب سے پہلے تو اس خبیث کا انتظام کرنا پڑے گا۔ لڑکی کی حالت بہت تیزی سے خراب ہو رہی ہے...... لیکن یہ کام ہم نہیں کر سکیں گے۔ یہ کام سیّد بابا کا

خادم کرے گا۔ تجھے لڑکی کو جزیرے پر لے جانا ہوگا۔''

''لے جاؤں گا بابا...... آپ جہاں کہیں گے لڑکی کو لے جاؤں گا۔ بس کسی طرح اس کی حالت ٹھیک ہو جائے اور آئندہ کیلئے اس خبیث سے نجات مل جائے۔'' کمال رائے نے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا...... اب اس خبیث کے دن پورے ہوئے۔ تو ہماری بات اب غور سے سن۔'' یہ کہہ کر بلی والا بابا خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر وہ سامنے یک ٹک دیکھتا رہا، پھر اس نے جو کچھ کہا...... وہ کمال رائے نے اپنے دماغ میں اچھی طرح بٹھا لیا۔

☆......☆......☆

پرمان کچھ دیر شبورا کو دیکھتا رہا، جیسے اس کی تصویر اپنی آنکھوں میں نقش کر لینا چاہتا ہو یا تیوح کے نقوش سے شبورا کا تقابل کرنا چاہتا ہو۔ تیوح اور شبورا میں اتنی گہری مماثلت تھی کہ وہ باوجود کوشش کے کوئی فرق نہ ڈھونڈ پایا۔

تب اس نے زور سے تالی بجائی۔ فوراً ہی ایک خادمہ دروازے سے اندر داخل ہوئی اور پرمان کے نزدیک آ کر مؤدبانہ کھڑی ہو گئی۔

''تیوح کے گھر کے دروازے اس پر کھول دو۔'' پرمان نے شبورا کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

''جو حکم پرمان۔'' خادمہ ہلکی سی خم ہوئی اور پھر شبورا کی کلائی نرمی سے تھام کر بولی۔ ''آؤ، میرے ساتھ۔''

شبورا نہیں جانتی تھی کہ اس حکم کا کیا مطلب ہے۔ بہرحال وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ ان لوگوں سے کسی خیر کی تمنا عبث ہے۔ دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ وہ تقدیر کے فیصلے پر شاکر ہو کر خادمہ کے ساتھ چل دی۔ اس نے ایک نظر رنتارو پر ڈالی۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ یہ ایک طنز بھری مسکراہٹ تھی۔

جب وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچی تو اسے بستی میں عجیب و غریب انداز کے مکان دکھائی دیئے، ان تمام مکانوں کے دروازے بند تھے۔ کوئی مکیں دور تک نہ دکھائی دیا۔

پھر وہ خادمہ ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ یہ مکان دوسرے مکانوں کے مقابلے میں کچھ بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس مکان کا دروازہ بھی دوسرے مکانوں کے دروازوں سے بڑا اور منقش تھا۔ اس دروازے پر کوئی تالا نہ تھا۔ اس خادمہ نے اپنا دایاں ہاتھ دروازے پر رکھا تو وہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔

جب شبورا گھر میں داخل ہوئی تو اسے ایک تیز ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس گھر

میں دو دروازے اور ہیں اور دونوں کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر آنے کے بعد یہ دو دروازے خود بخود بند ہو گئے جیسے ہوا کے تیز جھونکوں نے انہیں بند کر دیا ہو۔ بس ایک دروازہ کھلا رہ گیا اور یہ وہ دروازہ نہ تھا جس سے وہ دونوں اندر داخل ہوئی تھیں۔

یہ ایک بڑا سا چوکور کمرہ تھا اور اس کمرے میں تین دروازے تھے۔ کمرے میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ اسے اس گھر کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ اسے تو توقع تھی کہ وہ کسی کال کوٹھڑی میں ڈالی جا رہی ہے لیکن یہ کال کوٹھڑی نہ تھی، ایک پُر آسائش کمرہ تھا۔ اسے تو یہ کمرہ کسی ملکہ کی خواب گاہ دکھائی دے رہا تھا۔

پھر وہ خادمہ بغیر کچھ کہے کھلے دروازے سے باہر نکل گئی اور اس کے نکلتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس کمرے میں ایک دھیمی دھیمی خوشبو بسی ہوئی تھی اور یہ خوشبو اس سے ملتی جلتی تھی جو آرزو کے کمرے میں محسوس ہوتی تھی۔

اس خوشبو سے شبورا کا دھیان آرزو کی طرف گیا اور وہاں سے کمال رائے پر...... شبورا درمیان میں بچھے اس بیڈ پر بیٹھ گئی جس پر مخمل کی چادر بچھی تھی۔

یہ کمال رائے ہی تھا جس کی وجہ سے اس کا شوم کا عمل بھنگ ہوا تھا۔ شوم کا عمل کرتے وقت بولنا ممنوع ہوتا تھا۔ اس نے کمال رائے کو جو درخت دروازے سے نکلتا دیکھا تو اس لمحے بھول گئی کہ کہاں بیٹھی ہے، کیا کر رہی ہے۔ وہ کمال رائے کو یوں اچانک دیکھ کر بے اختیار ہو گئی اور پکار اُٹھی۔

”صاحب جی آپ؟“

کاش...... وہ ہوش میں رہتی۔ وہ اگر ہوش میں رہتی تو یہ ضرور جان لیتی کہ یہ سب فریب ہے۔ دشمن کا بچھایا ہوا جال ہے بولنا نہیں ہے۔ سب کچھ خاموشی سے دیکھنا ہے...... لیکن تقدیر میں تو کچھ اور لکھا تھا۔ شوم کا عمل بھنگ ہو گیا اور وہ ان خبیثوں کے جال میں پھنس گئی۔

اس کا خیال تھا کہ جانے یہ خبیث اس کا کیا حال کریں گے لیکن ابھی تو معاملہ اُلٹ ہوا تھا۔ اسے سزا کی جگہ جزا دی گئی۔ اسے پُر صعوبت قید کی جگہ پُر آسائش رہائش دی گئی تھی۔ یوں بھی تو ہوتا ہے کہ بکرے کو قربان کرنے سے پہلے اسے خوب کھلایا پلایا جاتا ہے اور پھر اچانک اس کے گلے پر چھری رکھ دی جاتی ہے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، اسی وقت تینوں دروازے بیک وقت کھلے اور ہوا کا ایک تیز جھکڑ اندر آیا۔

ہوا اتنی تیز تھی کہ اس کے کپڑے اُڑنے لگے اور زلفیں چہرے پر بکھر گئیں۔

وہ جہاں بیٹھی تھی، وہاں سے تینوں دروازے اس کی نظر میں تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ تینوں دروازے بیک وقت کیوں کھلے ہیں۔ ان دروازوں سے آخر کیا برآمد ہو گا۔

چند لمحوں کے بعد مغربی دروازے سے بڑے شاہانہ انداز میں چلتا پرمان داخل ہوا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی دو دروازے خود بخود بند ہو گئے۔ بس ایک دروازہ کھلا رہ گیا جس سے وہ اندر داخل ہوا تھا۔ وہ پوری تمکنت سے چلتا ہوا شبورا کے نزدیک آ گیا۔

شبورا بیڈ پر جس طرح بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ پرمان اس کے بیڈ کے نزدیک رکھی ایک اونچی اور شاندار سی کرسی پر بیٹھ گیا...... اور اسے مسکرا کر دیکھنے لگا۔ شبورا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کے سر پر بیٹھے سانپ کو دیکھا جو اس کے سر پر کچھ اس طرح لپٹا تھا کہ سر کا تاج معلوم ہوتا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی شبورا نے اندازہ کر لیا کہ وہ ایک انتہائی زہریلا سانپ ہے۔ پھر اس نے اپنی نظر جھکا لیں۔

پرمان، شبورا کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بار بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔ وہ جیسے کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن بول نہیں پا رہا تھا، اسے لفظوں کا انتخاب مشکل ہو رہا تھا۔

”یہ تیورح کا گھر ہے۔“ بالآخر پرمان نے لب کھولے۔

تیورح کا نام سن کر شبورا چونکی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ تیورح کون ہے؟ لیکن یہ نام اس نے پہلے بھی سنا تھا۔ اسے یاد آیا۔ پہلی بار جب آرزو نے اسے دیکھا تھا تو بے اختیار اس کے لبوں پر یہ نام آیا تھا۔

اب اس منحوس نے آتے ہی اس کا ذکر چھیڑ دیا ہے، آخر یہ تیورح ہے کون بلا؟

شبورا خاموش رہی۔ وہ بھلا کیوں پوچھے کہ تیورح کون تھی؟

”جانتی ہو، تیورح کون تھی؟“ پرمان نے بڑے پُر شوق انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

شبورا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر بولی اب بھی کچھ نہیں۔

”وہ میری زندگی تھی۔“ پرمان نے بتایا۔ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ”وہ تم لوگوں کی بستی میں برہا کو تلاش کرنے گئی تھی...... برہا میرا انتخاب تھی۔ اسے میں نے رنتارو کیلئے منتخب کیا تھا۔ رنتارو باغی ہونے لگا تو میں نے اسے احتیاطی طور پر تمہاری بستی میں بھجوا دیا۔ وہاں سے تمہارے لوگوں نے اسے غائب کر دیا اور جب تیورح اسے تلاش کرنے نکلی تو تم لوگوں نے اسے مار ڈالا، اس کے ساتھ میرا ایک وفادار خادم ہورا بھی چل بسا۔ تم لوگوں نے ہمیں خاصا نقصان پہنچایا...... پھر رنتارو بڑا ہوا تو وہ برہا کی تلاش میں نکل گیا۔ اس نے میری نافرمانی کی...... میں اسے تمہاری بستی میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دیتا۔ وہ چلا گیا۔ اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی...... مگر اس نے برہا کو تلاش کر لیا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اسے وہاں برہا مل گئی۔ ورنہ اس کی جان کو زیادہ خطرہ تھا۔ وہ وہاں سے صحیح سلامت واپس آ گیا،

یہ اس کا کارنامہ ہے اور ساتھ وہ تمہیں بھی لے آیا، یہ اس سے بھی بڑا کارنامہ ہے۔ میں نے تمہاری آمد کے صلے میں رنتارو کو معاف کر دیا۔ تمہارے صدقے اس کی جان بخشی گئی۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ تم میرے لئے کیا ہو۔"

"میں تمہارے لئے کیا ہوں؟" شبورا نے بے نیازی سے پوچھا۔

"تم میری زندگی ہو۔" پرمان نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔

"تم بھی عجیب ہو، کبھی کہتے ہو تیوح تمہاری زندگی تھی، کبھی کہتے ہو میں تمہاری زندگی ہوں۔ تم اپنی زندگیاں پاؤں میں جوتی کی طرح کیوں بدلتے ہو؟"

شبورا کی بات سن کر پرمان نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "وہ بھی بالکل اسی طرح بات کرتی تھی کٹیلی اور تیز۔"

"کون؟" شبورا نے پوچھا۔

"تیوح اور کون؟" پرمان نے ہنس کر کہا۔

"آخر تم تیوح کا میرے سامنے بار بار ذکر کیوں کر رہے ہو؟" شبورا خفگی سے بولی۔

"اس لئے کہ تم تیوح ہو؟"

"تمہاری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔ مجھے غور سے دیکھو...... میں تیوح نہیں، شبورا ہوں۔ میں تمہاری زندگی نہیں تمہاری موت ہوں۔"

"میں تمہارے لئے مرنے کیلئے تیار ہوں۔" پرمان یہ کہہ کر ہنسا۔

"تم یہ بات غیر سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔ مذاق سمجھ رہے ہو...... اس لئے کہ تم میری اصلیت نہیں جانتے۔ میں واقعی تمہاری موت ہوں۔" شبورا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"وہ کیسے؟" پرمان نے لاپروائی سے پوچھا۔

"تم سانپ اور میں سپیرن۔" شبورا نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"تم نے غلط کہا...... سپیرا، سانپ کو مارتا نہیں، اسے قید کر لیتا ہے، وہ اسے سدا اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اپنے پاس رکھتا ہے...... لیکن یہاں معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے، یہاں سپیرا، سانپ کی قید میں رہے گا۔ یہ قید محبت بھری ہوگی۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تم یہاں رانیوں کی طرح رہو گی۔ اس بستی کے حکمراں پر راج کرو گی۔ بس اتنا ضرور ہوگا کہ تم یہاں سے جا نہ سکو گی۔ ہم تمہارے سارے قصور معاف کر دیں گے۔ بس تمہیں تیوح بننا ہوگا۔ تیوح تو تم ہو...... بس اپنا دل اس جیسا کرنا ہوگا۔"

"میں پھر کہوں گی کہ میں تیوح نہیں شبورا ہوں۔"

"آؤ...... میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر پرمان کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں تیوح دکھاؤں۔ پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم تیوح ہو کہ نہیں۔"

شبورا نے اسے اس دیوار کی طرف جاتے ہوئے دیکھا جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ دو سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے سامنے ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا اور اس چبوترے پر کوئی چیز ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ وہ کوئی لمبی سی چیز تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ اونچی ضرور رہی ہوگی۔ دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے اندر کیا ہے، ایک بڑی سی کالی چادر اس پر پڑی ہوئی تھی جو زمین کو چھو رہی تھی۔

پرمان پورے وقار سے چلتا ہوا اس چھپی ہوئی چیز تک پہنچا۔ اس نے ایک سیڑھی پر پاؤں رکھا پھر پلٹ کر شبورا کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے ہی آ کھڑی ہوئی تھی۔ پرمان اسے دیکھ کر مسکرایا، جیسے کوئی جادوگر اپنا کوئی کھیل دکھانے سے پہلے مسکراتا ہے۔

"لو دیکھو۔" یہ کہہ کر پرمان نے کالی چادر کھینچ لی۔

اس کالی چادر کے اندر سے جو کچھ برآمد ہوا، اسے دیکھ کر شبورا دم بخود رہ گئی۔

اس کے سامنے ایک اور شبورا کھڑی تھی۔ وہی چمکیلی آنکھیں، سیاہ لمبے بال، وہی سانولا چہرہ، وہ پرکشش جسم...... ایک خاص انداز سے کھڑی ہوئی۔ ایک خاص انداز کے کپڑے پہنے ہوئے۔

شبورا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہے...... تو یہ ہے تیوح...... یہ تو ہو بہو اس کی تصویر ہے۔ اگر اسے دیکھ کر لوگ مجھے تیوح کہتے ہیں تو اس میں لوگوں کا کیا قصور...... وہ سچ کہتے ہیں۔ تیوح اور اس میں کوئی فرق نہیں...... پھر تیوح کا مجسمہ جس نے بھی بنایا تھا، کمال کا بنایا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں ابھی حرکت ہوگی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ جائے گا۔

"دیکھا تم نے۔" پرمان نے شبورا کو بت بنا دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

"ہاں دیکھا۔" شبورا نے تیوح کے مجسمے کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"اب کیا کہتی ہو...... کیا اب بھی انکار کرو گی کہ تم تیوح نہیں ہو؟" پرمان نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... اب بھی انکار کروں گی۔" شبورا نے جواب دیا۔

"تیوح کا مجسمہ دیکھنے کے باوجود۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" شبورا نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا مجھے یقین آ گیا کہ وہ میری ہم شکل تھی۔ ہو بہو میری تصویر تھی۔ اب تم بھی اس بات کا یقین کر لو کہ میں تیوح نہیں ہوں، تمہاری زندگی نہیں ہوں...... محض اس کی ہم شکل ہوں۔"

"تمہیں تیوح بننا ہوگا...... اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھا، اس نے شبورا کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اور کھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شبورا اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی، جب وہ کمرے سے نکل گیا تو وہ کھلا دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد شبورا بیڈ سے اُٹھی اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی ہوئی اس چبوترے کے نزدیک پہنچی جس پر تیوح کا مجسمہ کھڑا تھا۔ وہ مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

شبورا نے خود کو ایک چھوٹے سے آئینے میں دیکھا تھا۔ وہ آئینہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں محض شبورا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا، اب وہ تیوح کو سر سے پیر تک دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ایک احساسِ تفاخر میں مبتلا ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ اس قدر پرکشش شخصیت کی مالک ہے۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی...... پھر مسکرا کر بولی۔ "تیوح تو بڑی خطرناک ناگن تھی لیکن میں ناگن نہیں، سپیرن ہوں...... یہ اپنے پرمان کو بتا دینا۔"

یہ کہہ کر اس نے چبوترے پر پڑی سیاہ چادر اُٹھائی اور پھر تیوح کے مجسمے کو سر سے پیر تک ڈھک دیا اور پھر بڑی تمکنت سے چلتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

زخم اتنے بڑھ گئے تھے کہ آرزو کو اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں خاصی دقت ہو رہی تھی۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ آرزو کو بلی والے بابا کی ہدایت کے مطابق جزیرے لے جایا جائے۔

کمال رائے اس جزیرے سے واقف نہ تھا اور بابا سے جو بات کی تھی، وہ مختصر کی تھی اور وہیں کی صورتحال کے متعلق تھی۔ کمال رائے نے اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے اس کا ذکر کیا۔ ماموں رشید کو بھی بتایا۔

سب معلومات اکٹھا کرنے میں لگ گئے۔ تب ماموں رشید کے ایک بہت اچھے دوست ڈاکٹر عرفان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کئی مرتبہ سیّد بابا کے اس جزیرے پر جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر عرفان کو شکار کا بہت شوق تھا، وہ مچھلیوں کے شکار پر اکثر جاتے رہتے تھے۔ اسی لئے انہیں اس جزیرے کے بارے میں بھرپور معلومات تھیں۔ جب ڈاکٹر عرفان کو ساری صورتحال کا پتہ چلا تو انہوں نے ان کے ساتھ جانے کی خود بخود ہامی بھر لی۔ ایک تو تجسس، دوسرے وہ ان کے دوست کے بھانجے کی ہونے والی بیوی تھی۔

جب انسان کسی کام کو کرنے کیلئے نکلتا ہے تو اللہ بھی راہ دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر عرفان کا ملنا اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ڈاکٹر عرفان ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر تھا اور ایک خوش مزاج انسان تھا۔ کمال رائے اس

سے مل کر خوش ہوا۔ ڈاکٹر عرفان نے پوری طرح اُسے اطمینان دلا دیا کہ جزیرے میں پہنچنے تک کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

اور ہوا بھی یہی...... یہ لوگ ایک کوسٹر کے ذریعے ساحل سمندر کے کنارے آباد مچھیروں کی بستی پہنچے۔ صبح کا وقت تھا، ساڑھے آٹھ بجے تھے۔

ڈاکٹر عرفان نے گاڑی سے اُتر کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اسے مچھیروں کی بستی کے باہر چند چھوٹے بچے کھیلتے نظر آئے۔ اس نے اشارے سے انہیں اپنی طرف بلایا۔

دو لڑکے بڑی تیزی سے اس کی طرف بھاگے آئے۔

"جی صاحب۔" ان میں سے ایک لڑکے نے کہا۔

"بیٹا...... اکو...... کو جانتے ہو۔" ڈاکٹر عرفان نے لڑکے سے پوچھا۔

"ہاں...... اکو دادا کو کون نہیں جانتا۔" اس لڑکے نے بڑے فخر سے کہا۔

"تو پھر اس سے جا کر کہو کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔"

"ابھی کہتا ہوں جا کر۔" وہ دونوں لڑکے تیزی سے جھونپڑیوں کی طرف دوڑ گئے۔

آرزو کوسٹر کی پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ رامش خیال اس کے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ ماموں رشید اور کمال رائے ڈاکٹر عرفان کے ساتھ گاڑی سے باہر کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر میں ایک مضبوط جسم اور اونچے قد کا اُدھیڑ عمر شخص بستی سے برآمد ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا، ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"لو بھئی...... رشید اکو آ گیا۔ یہ شخص سمندر کا نباض ہے۔ جس طرح ایک حکیم نبض دیکھ کر مریض کا حال بتا دیتا ہے ویسے ہی یہ شخص سمندر کو دیکھ کر اس کی ہر کیفیت کو سمجھ لیتا ہے۔" ڈاکٹر عرفان نے اس کا تعارف کرایا۔

"اپنے چہرے مہرے سے کافی سمجھدار آدمی دکھائی دے رہا ہے۔" ماموں رشید نے اکو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کمال رائے نے کوئی رائے نہ دی، وہ بس اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

اکو نے قریب آ کر سب سے پہلے ڈاکٹر عرفان سے سلام دعا کی۔ ڈاکٹر عرفان نے کمال رائے اور ماموں رشید کا تعارف کرایا۔ اکو کو دیکھ کر رامش خیال بھی کوسٹر سے باہر آ گیا تھا۔ اکو نے اس سے بھی ہاتھ ملایا۔ سلام دعا کی۔

"اکو...... تمہیں میرا پیغام مل گیا تھا۔" ڈاکٹر عرفان نے پوچھا۔

"جی صاحب...... میں نے آپ کے حکم کے مطابق سارا انتظام کرلیا ہے، گھاٹ پر موٹر بوٹ تیار کھڑی ہے...... ویسے پروگرام کیا ہے؟" اکو نے کہا۔

"اکو پروگرام شکار کا نہیں۔ بس سید بابا کے جزیرے تک جانا ہے۔ رات کو وہیں رہنا ہے۔"

"دوسرے دن واپسی؟" اکو نے پوچھا۔

"واپسی کا ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہوسکتا ہے دوسرے دن واپسی ہوجائے یا پھر مزید ایک رات ٹھہرنا پڑے۔" ڈاکٹر عرفان نے بتایا۔

"سید بابا کے جزیرے کا انتخاب کس لئے کیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ کوئی پکنک کی جگہ نہیں۔" اکو نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی تھی۔

"ہم وہاں پکنک منانے جا بھی نہیں رہے۔" ڈاکٹر عرفان نے تصدیق کی۔

"پھر کیا معاملہ ہے؟" اکو بولا۔

"معاملہ...... میں تمہیں راستے میں بتاؤں گا۔" ڈاکٹر عرفان نے کہا۔ "فی الحال تم سامان کوسٹر سے اُٹھوا کر موٹر بوٹ تک پہنچانے کا انتظام کرو۔"

"آپ بے فکر ہوجائیں اور گھاٹ کی طرف چلیں۔ میں سامان لے کر آتا ہوں۔" اِکو نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر عرفان نے کہا۔ اس کے بعد ماموں رشید کی طرف مڑا اور ان سے مخاطب ہوکر بولا۔ "گاڑی کا سامان...... یہ اکو اُٹھوا لے گا۔" "ہمیں آرزو کو لے کر چلنا چاہئے۔"

"تم نے وہ جگہ دیکھی ہے، جہاں موٹر بوٹ کھڑی ہے۔" ماموں رشید نے پوچھا۔

"ہاں دیکھی ہے...... یہاں سے زیادہ دور نہیں۔" ڈاکٹر عرفان نے جواب دیا۔

"چلو پھر چلتے ہیں۔" ماموں رشید نے کمال رائے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کمال رائے کچھ کہے بغیر گاڑی میں چڑھا۔ آرزو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی حالت خاصی سنگین ہوگئی تھی۔ اب اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا بھی محال تھا۔ یہ زخم اس کے پورے جسم پر موجود تھے۔ بس ایک چہرہ بچا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ بالکل صاف تھا۔

"آؤ...... بیٹا۔" کمال رائے نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"بابا...... ہم کہاں جارہے ہیں؟" آرزو نے کمال رائے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... آپ کو بتایا تو ہے کہ سید بابا کے جزیرے پر جارہے ہیں۔"

"بابا، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" آرزو خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"کس قسم کا ڈر؟" کمال رائے نے پوچھا۔

"بابا، مجھے پتہ نہیں بس ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... تمہارے ساتھ اتنے لوگ تو ہیں...... میں ہوں، رامش ہے، ماموں رشید ہیں، ڈاکٹر عرفان ہیں۔ تم بالکل فکر مت کرو...... انشاء اللہ جب ہم واپس آئیں گے تو تم بالکل ٹھیک ہوچکی ہوگی۔" کمال رائے نے اطمینان دلایا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" آرزو کمال رائے کے ہاتھ کے سہارے اُٹھتے ہوئے بولی۔

کمال رائے اسے پکڑ کر آہستہ آہستہ چلاتا کوسٹر کے دروازے تک لایا۔

اتنی دیر میں رامش خیال نے کپڑے کا اسٹریچر کھول لیا تھا۔ ماموں رشید اور وہ، اسے دروازے پر پکڑے کھڑے تھے۔ کمال رائے نے ماموں رشید سے اسٹریچر لینے کی کوشش کی۔

"مجھے دے دیں۔" وہ بولا۔

"نہیں، کوئی بات نہیں۔" ماموں رشید نے مسکرا کر کہا۔

آرزو، اسٹریچر پر آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ ماموں رشید نے اس کے پیروں کی طرف سے اسٹریچر کے ڈنڈے پکڑے ہوئے تھے جبکہ رامش خیال نے اسے سر کی طرف سے پکڑا ہوا تھا، آسمان صاف تھا۔ ایک چیل بہت اونچائی پر اڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ سورج نکلا ہوا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی جارہی تھی۔ سمندر کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔

آرزو کو اس طرح اسٹریچر پر لیٹے بڑی شرمندگی ہورہی تھی۔ پر وہ کیا کرتی...... مجبوری تھی اس سے اتنی دور پیدل نہیں چلا جاسکتا تھا۔ زخم اس کے پاؤں کے تلوؤں میں بھی موجود تھے۔

وہ گردن اُٹھا کر رامش خیال کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتی تو رامش خیال فوراً مسکرا پڑتا۔ یہ مسکراہٹ اس کا حوصلہ بڑھانے کیلئے ہوتی۔

سمندر کا کنارہ آگیا۔ آرزو کا اسٹریچر بڑی احتیاط سے موٹر بوٹ تک پہنچایا گیا اور پھر اسے ایک اچھی جگہ پر گدے پر لٹا دیا گیا۔

اکو نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سارا سامان موٹر بوٹ میں رکھوایا اور پھر موٹ بوٹ کو اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی موٹر بوٹ پانی کی 'سڑک' پر رواں دواں ہوگئی۔

ابھی موٹر بوٹ کو چلتے ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ رامش خیال کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ وہ بار بار اپنا سینہ ملنے لگا۔

کمال رائے نے اس کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"جی مالش کررہا ہے۔" رامش خیال نے بتایا۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سمندر کے سفر میں ایسا ہو جاتا ہے۔ سمندری ہوا بندے کو پریشان کر دیتی ہے۔ اس مقصد کیلئے ہمارے پاس لیموں موجود ہیں۔“ ڈاکٹر عرفان نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ اکو سے مخاطب ہوا۔ ”اکو...... بھئی ذرا لیموں دینا۔“

اکو نے فوراً ایک لیموں کاٹ کر رامش خیال کے حوالے کر دیا۔ رامش خیال نے اسے ہلکا سا دبا کر دو تین قطرے اپنی زبان پر ٹپکائے۔ لیموں چوسنے کی وجہ سے کچھ دیر تو اس کی حالت سنبھلی رہی لیکن لیموں ختم ہوتے ہی پھر اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔

موٹر بوٹ گہرے سمندر میں تھی اور سمندر کی لہروں کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ اب ابکائی کے ساتھ اسے شدید چکر آنے لگے۔ اس سے بیٹھنا دوبھر ہو گیا تو وہ گدے پر لیٹ گیا۔

ڈاکٹر عرفان سفر میں اپنے ساتھ چند ضروری دوائیں رکھا کرتا تھا۔ اس نے ایک دوا نکال کر چند قطرے اس کی زبان پر ٹپکائے اور بولا۔ ”بس تھوڑی دیر میں تمہاری حالت سنبھل جائے گی۔“

رامش خیال نے جواب میں کچھ نہ کہا، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر ڈاکٹر آرزو کے قریب آیا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں، بی بی آپ کا کیا حال ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، اُبکائی وغیرہ تو نہیں محسوس ہو رہی۔“

”نہیں انکل۔ میں ٹھیک ہوں۔“ آرزو نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”چلو ٹھیک ہے...... کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو فوراً بتا دینا۔ سمندر کی بو سے اکثر طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔“ ڈاکٹر عرفان کی دوا سے رامش خیال کی طبیعت خاصی بہتر ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر موٹر بوٹ سے سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔

اکو، ڈاکٹر عرفان کے برابر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر عرفان نے مختصراً ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ گفتگو کے دوران کئی مرتبہ اکو نے آرزو کی طرف دیکھا جو ایک گدے پر لیٹی اپنی سوچوں میں گم تھی۔

اکو نے ساری بات سمجھ لینے کے بعد ڈاکٹر عرفان کو تسلی دی، وہ بولا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں وہاں کے حالات سنبھال لوں گا۔ میں خود بھی بہت سی باتوں سے واقف ہوں۔ پھر وہاں اللہ بخش موجود ہے، وہ ہمارے مدد کرے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

سفر تیزی سے جاری تھا۔ موسم بالکل صاف تھا۔ سمندر میں بھی کسی قسم کی کوئی ہلچل نہ تھی۔ موٹر بوٹ معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔

”ہاں بھئی، کچھ سناؤ۔“ ڈاکٹر عرفان نے اس سے گانے کی فرمائش کی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔

اکو نے بغیر کوئی تکلف دکھائے ایک گیت چھیڑ دیا۔ اس کی آواز بڑی جاندار اور بڑی پاٹ دار تھی۔ وہ اونچی تانیں لے رہا تھا...... اور سب اس کے گیت کے بول نہ سمجھنے کے باوجود اس کی لے سے محظوظ ہو رہے تھے، خاص طور پر آرزو کو بڑا مزہ آ رہا تھا۔ وہ تکیوں کا سہارا لے کر تھوڑی سی اونچی ہو کر بیٹھ گئی اور اکو کو بڑی دلچسپی سے گاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اکو ایک ہاتھ کان پر رکھے، آنکھیں بند کئے بڑی محویت سے گانے میں مصروف تھا۔ اس کی آواز نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔

پھر اچانک ہی اکو نے گانا بند کر دیا اور دور سمندر میں دیکھنے لگا۔ اس کی ناک کے نتھنے تیزی سے پھول پچک رہے تھے، شاید وہ فضا میں کوئی چیز سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں اسے چند چیل، کوے تھوڑے فاصلے پر اُڑتے نظر آئے۔

ڈاکٹر عرفان اکو کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، اسے اندازہ تھا کہ اکو کی خاموشی میں کوئی طوفان چھپا ہوا ہے۔ ڈاکٹر عرفان اور اس کے شکاری ساتھیوں نے بارہا سمندر کا سفر کیا تھا۔ انہوں نے اکو کو سفر کے معاملے میں بڑا مستعد اور ہوشیار پایا تھا۔ سمندر کے معاملے میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔

اب وہی اکو گانا بند کر کے گہرے سانس لے کر، کبھی چیل، کوؤں کو تو کبھی سامنے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔

”اکو...... خیر تو ہے۔“ ڈاکٹر عرفان سے بالآخر نہ رہا گیا۔

”ڈاکٹر صاحب...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”مجھے کچھ بتاؤ تو آخر معاملہ کیا ہے؟“

”ایسا کبھی ہوا نہیں...... سمندر کا تیور ایک دَم ہی بدلا ہے۔“ اِکو نے یہ بات آہستہ سے کہی۔

”کیا تبدیلی محسوس کر رہے ہو؟“

”ہوا بند ہو گئی ہے۔ فضا میں ایک عجیب سی بُو رچ گئی ہے۔ یہ چیل، کوے اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو گئے ہیں...... اور سامنے سمندر کی سطح میں بظاہر خاموشی نظر آ رہی ہے...... لیکن یہ خاموشی بھی اپنے اندر کوئی معنی رکھتی ہے۔ اللہ خیر کرے۔“ اکو نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اگر تم کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو تو موٹر بوٹ کا رُخ تبدیل کروا لو۔“ ڈاکٹر عرفان نے دانشمندانہ مشورہ دیا۔

”او، جانو۔“ اِکو نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

علی جان عرف جانو جو موٹر بوٹ چلا رہا تھا، اس نے اِکو کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا۔ ''ہاں رے اِکو۔''

''جانو...... کشتی بائیں ہاتھ موڑ لے۔'' اِکو نے زور سے کہا۔

''کیوں اِکو...... راستہ لمبا ہو جائے گا۔'' جانو بولا۔

''ہو جانے دے۔'' اِکو نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

تب علی جان ملاح نے موٹر بوٹ کا رخ اِکو کے حکم کے مطابق بائیں جانب موڑ لیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ سمندر کے تیور کچھ اس تیزی سے بگڑے کہ اکو ہکا بکا رہ گیا۔ اکو کی پوری زندگی سمندر کی لہروں سے کھیلتے ہوئے ہی گزری تھی...... لیکن آج اس کی زندگی کا تجربہ اسے مات دے گیا تھا......

لیکن جو کچھ ہوا تھا اور جس قدر تیزی سے ہوا تھا، اس پر موٹر بوٹ پر موجود ہر شخص حیرت زدہ تھا۔

ایک دم ہی، ایک موٹی بلا نے موٹر بوٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے ساتھ ایک طاقتور لہر اندر ہی اندر آئی تھی اور اس نے موٹر بوٹ کو ایک دم ہی اوپر اچھال دیا تھا۔ آرزو کی چیخیں نکل گئی تھیں۔

''بابا...... یہ کیا ہو رہا ہے؟''

رامش خیال نے مضبوطی سے موٹر بوٹ کا تختہ پکڑ لیا تھا۔

اِکو، ڈاکٹر عرفان اور ماموں رشید لڑھک کر موٹر بوٹ کے فرش پر آ گئے تھے۔ کمال رائے بھی اوپر بیٹھا نہ رہ سکا۔ ہر شخص اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔

کمال رائے کھسک کر آرزو کے قریب ہو گیا۔ موٹر بوٹ زبردست ہچکولے لے رہی تھی۔ کمال رائے نے آرزو کے ہاتھ پکڑ لئے تھے لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر اس سے بری طرح لپٹ گئی تھی۔

موٹر بوٹ سمندر کی طوفانی لہروں کے ساتھ بے اختیار اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ سمندر کا پانی بھی اونچی لہر کے ساتھ اندر آ رہا تھا، ہوا بہت تیز تھی۔

اِکو کسی طرح گرتا پڑتا جانو کے پاس پہنچ گیا تھا۔ موٹر بوٹ کا انجن تند و تیز لہروں کی تاب نہ لا کر ایک جھٹکے سے بند ہو گیا تھا۔ اب موٹر بوٹ کلی طور پر موجوں کے اختیار میں تھی۔

کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

''اِکو...... تم کہاں ہو؟'' ڈاکٹر عرفان نے ایک دم چیخ کر پوچھا۔

''میں اِدھر ہوں...... جانو کے پاس...... زبردست طوفان ہے، اللہ سے دعا کریں۔''

''اکو کی اس بات نے کہ اللہ سے دعا کریں، موٹر بوٹ کے مسافروں میں سراسیمگی پھیلا دی۔

آرزو نے دل ہی دل میں دعائیں مانگنا شروع کر دیں...... اس نے کبھی سمندر میں سفر نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا پہلا سفر تھا جو دل دہلا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ موٹر بوٹ بری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ اگرچہ موٹر بوٹ کافی بڑی تھی لیکن اس وقت ماچس کی ڈبیا بنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی کشتی ڈولتی آرزو کا دم حلق نے آ اٹکتا۔ وہ اپنے باپ سے لپٹی ہوئی تھی۔ گھبرا کر اپنے باپ کو دیکھتی۔ کمال رائے اسے تسلی آمیز نظروں سے دیکھتا۔ وہ اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیتی۔

''بابا...... اب کیا ہو گا؟''

''کچھ نہیں بیٹا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ موٹر بوٹ اونچی لہروں میں پھنس گئی ہے۔''

''بابا...... یہ موٹر بوٹ ڈوب تو نہیں جائے گی۔''

''اللہ نہ کرے بیٹا...... یہ لوگ بڑے ماہر ہیں، کشتی نکال لے جائیں گے۔''

''بابا...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈرو مت، اللہ سے دعا کرو۔'' کمال رائے نے اسے اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

اِکو، جانو کے ساتھ اگلے حصے میں تھا۔ وہ اور بقیہ آدمی اس بات کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ موٹر بوٹ اُلٹ نہ جائے۔ بعض وقت لہروں کی زد میں آ کر موٹر بوٹ اس قدر ٹیڑھی ہو جاتی تھی کہ احساس ہوتا تھا کہ بس اب اُلٹی...... لہریں اتنی اونچی اور تیز تھیں کہ خاصا پانی موٹر بوٹ کے اندر آ رہا تھا۔

صورتحال بہت خطرناک ہو گئی۔ اِکو کسی طرح گرتا پڑتا ڈاکٹر عرفان کے نزدیک پہنچا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بمشکل بولا ''ڈاکٹر صاحب! اب اللہ کے سوا ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ کلمہ پڑھ لیں۔''

ڈاکٹر عرفان نے خالی خالی نظروں سے اِکو کو دیکھا لیکن وہاں اب اکو تھا کب...... وہ فوراً ہی کشتی کے اگلے حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی کشتی کو موجوں سے محفوظ رکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ کشتی ٹوٹنے یا ڈوبنے کی صورت میں موٹر بوٹ میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو زندگی بچانے میں معاون ہوتی۔ کشتی میں دو چار ٹائر ضرور پڑے ہوئے تھے لیکن یہ ٹائر زندگی بچانے میں معاون نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ لہریں اتنی تند و تیز تھیں کہ ٹائروں پر گرفت برقرار رکھنا آسان نہ تھا۔

یہ موٹر بوٹ اچانک جن طوفانی لہروں سے دوچار ہوئی تھی، اس کی توقع کسی کو نہ تھی۔ اِکو تو حیران تھا کہ یہ سمندر کو اچانک ہوا کیا...... سمندر کو اس طرح بپھرتے ہوئے اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اور جب سب لوگوں نے کلمے پڑھ لئے اور جتنی جس کو دعائیں یاد تھیں، دہرالیں اور مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو سمندر نے فوراً بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس کی بے قابو لہریں تیزی سے قابو میں آنے لگیں۔ وہیل کی طرح منہ پھاڑتی لہروں نے اپنے جبڑے بند کر لئے۔ کسی اژدھے کی طرح پھنکارتی موجوں نے اپنا شور بند کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سطح سمندر برابر ہوگئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو قیامت مچی ہوئی تھی، وہ گزر گئی تھی۔ اب ہر طرف امن تھا۔

اِکو اور اس کے لوگوں نے موٹر بوٹ میں بھرنے والا پانی نکالا، موٹر بوٹ کا انجن چیک کیا، وہ ٹھیک تھا۔ اسے اسٹارٹ کیا تو وہ چل پڑا۔

اب موٹر بوٹ پھر اپنی منزل کی طرف گامزن تھی اور اِکو مسکراتا ہوا ڈاکٹر عرفان کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''ہاں بھئی...... اِکو۔'' ڈاکٹر عرفان بولے۔

''جی ڈاکٹر۔'' اِکو نے اسے پوچھا۔

''تم اتنے تجربہ کار آدمی ہو...... کیا تمہیں اس طوفان کا اندازہ نہ تھا؟''

''ڈاکٹر صاحب...... آپ کس طوفان کی بات کر رہے ہیں، کہاں ہے طوفان؟''

''ابھی جو ہم پر قیامت گزری ہے، تم نے کلمہ بھی پڑھوا دیا تھا۔ اس قدر مایوس ہو گئے تھے۔''

اِکو یہ سن کر ہنسا اور بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب کلمہ پڑھنا تو اچھی بات ہے۔ آدمی کو ہر وقت پڑھتے رہنا چاہئے۔''

''ہاں...... اِکو...... میں جانتا ہوں۔'' ڈاکٹر عرفان نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ''تم کیا چھپانا چاہ رہے ہو؟''

''ڈاکٹر صاحب...... میں کیا چھپاؤں گا۔'' وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔ ''چھپاؤں گا تو اس وقت جب میرے پاس کچھ چھپانے کو ہوگا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ طوفان نہ تھا۔''

''تو پھر کیا تھا؟'' ڈاکٹر عرفان نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم...... میں نے اپنی زندگی میں ایسا طوفان نہیں دیکھا۔ جو آناً فاناً آیا اور آناً فاناً غائب ہو گیا۔ یہ طوفان نہ تھا۔ طوفان ہوتا تو اتنی جلد ختم نہ ہو جاتا۔ یہ کچھ اور تھا...... شاید کسی سمندری بلا نے اندر ہی اندر کروٹ لی تھی۔'' اِکو نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''یہ کیا بے وقوفوں کی طرح باتیں کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر عرفان نے اسے ڈانٹا۔

''بس ڈاکٹر صاحب...... میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں، میں اتنا ہی سمجھا ہوں۔'' اِکو نے گہرا سانس

لے کر کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

یہ باتیں سبھی سن رہے تھے، سب کو حیرت ہوئی۔ بہرحال بچ جانے پر سب خوش تھے۔ کمال رائے نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ ''اِکو...... اگر چاہو تو واپس چلو۔''

''کیوں صاحب...... واپس کیوں چلیں؟''

''جانے آگے کتنے اور طوفان چھپے ہوں۔''

''دیکھا جائے گا۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... جس اللہ نے ہمیں ابھی بچایا ہے، آگے بھی وہی بچائے گا۔ اب وہ جزیرہ زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ اطمینان رکھیں، کچھ نہیں ہوگا۔'' اِکو نے مطمئن لہجے میں کہا۔

اِکو کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ سب کے دلوں پر سکون اُتر آیا۔

موٹر بوٹ اب اپنی پوری روانی سے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی بڑھی جا رہی تھی۔

دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد بالآخر وہ سیّد بابا کے جزیرے پہنچ گئے۔ موٹر بوٹ سے سارا سامان اُتار لیا گیا۔ اگرچہ خاصا سامان بھیگ گیا تھا لیکن فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ دھوپ اور ہوا دونوں تیز تھیں۔ سامان سوکھنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ موٹر بوٹ کو ایک محفوظ مقام پر کھڑا کر کے اسے باندھ دیا گیا۔

یہ جزیرہ خاصی اونچائی پر تھا۔ اس کے تینوں اطراف میں پانی تھا اور ایک طرف خشکی تھی۔ یہ ایک ویران جزیرہ تھا۔ اوپر جانے کیلئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو ریت میں چھپی ہوئی تھیں۔ اوپر جزیرے کے درمیان ایک عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہ ایک گنبد نما پرانی عمارت تھی۔ اس عمارت کے چاروں اطراف میں ریت ہی ریت تھی۔

اس گنبد نما عمارت میں ایک قبر تھی، یہ ایک معمولی سی لمبی قبر تھی۔ پندرہ سولہ فٹ رہی ہوگی۔ یہ سیّد بابا کا مزار تھا، سیّد بابا کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ کب انتقال ہوا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس جزیرے پر کس نے ان کا مقبرہ بنوایا، اس سلسلے میں مختلف روایات تھیں، صحیح بات کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس جزیرے پر کسی کی رہائش نہ تھی۔ البتہ جزیرے سے ہٹ کر بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مقبرے کے نیچے تھوڑے سے فاصلے پر چند جھونپڑیاں تھیں۔ بس یہاں کی آبادی یہی تھی۔ یہ لوگ یہاں صدیوں سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ دادا، پردادا...... اب انہی کی نسل چلی آ رہی تھی۔ آج کل اس بستی کا سربراہ اللہ بخش تھا۔

اللہ بخش کو فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ سیّد بابا کے مزار پر کوئی پارٹی آئی ہے۔ وہ یہ دیکھنے کیلئے کون لوگ ہیں اور کس غرض سے آئے ہیں، فوراً کنارے کی طرف چل پڑا۔

اِدھر کنارے پر اُترے ہی اِکو نے ڈاکٹر عرفان سے کہا۔ ''میں اللہ بخش کو پکڑ کر لاتا ہوں۔''

اِکو اِدھر چلا، اللہ بخش اُدھر سے آیا۔ دونوں کی درمیان میں ملاقات ہوگئی۔ اِکو کو دیکھ کر اللہ بخش بہت خوش ہوا، دونوں ایک دوسرے سے گلے لگے اور پھر دونوں ایک ساتھ بولے۔ ''سب خیر ہے۔''

''ہاں، بابا سب خیر ہے۔'' دونوں نے باری باری جواب دیا۔

''یہ کون لوگ ہیں بابا؟''

''ڈاکٹر عرفان آئے ہیں۔'' اِکو نے بتایا۔ ''ان کے ساتھ کچھ دوست ہیں۔ ایک جوان لڑکی ہے۔ اس پر کوئی سایہ وایہ ہے۔''

''یہ لوگ اوپر تو نہیں گئے۔'' اللہ بخش نے پوچھا۔

''ابھی تو آئے ہیں...... میں فوراً ہی تمہیں لینے چلا آیا۔ کیونکہ اس مزار کے حالات سے تم ہی واقف ہو۔ آؤ، میرے ساتھ۔'' اِکو پلٹتا ہوا بولا۔

کنارے پر پہنچ کر اِکو نے سب سے اللہ بخش کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر عرفان اس سے واقف تھا۔ وہ دو تین بار یہاں آچکا تھا۔ کمال رائے نے اللہ بخش کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا سیدھا سادہ شخص تھا۔

خیمے نصب کر دیئے گئے۔ فولڈنگ بیڈ پر آرزو کو لٹا دیا گیا۔ دوپہر کا کھانا ان لوگوں کے ساتھ تھا جو بڑی حد تک محفوظ تھا۔ کھانا گرم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اِکو اپنے لوگوں کو لے کر اللہ بخش کے ساتھ چلا گیا۔ ان لوگوں نے اللہ بخش کے ساتھ کھانا کھایا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو اِکو نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب، میں چلتا ہوں۔ کل صبح آجاؤں گا۔ مچھلیاں بھی پکڑ لاؤں گا۔ یہاں اللہ بخش موجود ہے۔ وہ ہر طرح سے آپ لوگوں کا خیال رکھے گا۔ ابھی آپ لوگ اس کے ساتھ مزار پر جاؤ۔ اوپر جا کر دیکھو۔ وہاں کیا کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے اِکو۔'' ڈاکٹر عرفان نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اِکو کے جانے کے بعد، یہ لوگ اللہ بخش کے ساتھ اوپر مزار پر آئے۔ رامش خیال، آرزو کے پاس رہ گیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی، دھوپ تیز تھی لیکن اس میں تپش نہ تھی۔ ہوا تیز اور ٹھنڈی چل رہی تھی۔

مزار پر جانے کیلئے تیرہ چودہ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر ریت پڑی ہوئی تھی۔ اللہ بخش نے ایک سیڑھی سے ریت ہٹا کر دکھائی۔ سیڑھی پتھر کی بنی ہوئی تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر ریت پر چلنے کے بعد مزار تک پہنچے۔ مزار پر جانے کیلئے بھی پانچ سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ اندر ایک پختہ قبر بنی ہوئی تھی۔ کتبہ لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے لفظ مٹ چکے تھے، کچھ پڑھا

نہ جاتا تھا۔

اللہ بخش نے بتایا کہ یہ مقبرہ اس کے دادا کے زمانے میں بھی موجود تھا اور پردادا کے زمانے میں بھی...... یہ کس زمانے میں بنا، معلوم نہیں۔ ایک روایت یہ تھی کہ اسے کراچی کے کسی سیٹھ نے بنوایا۔ اس سیٹھ کے خواب میں کوئی بزرگ آئے اور انہوں نے اس جگہ مقبرہ بنانے کی ہدایت کی۔ جب وہ سیٹھ یہاں پہنچا تو اس نے ایک ٹیلے پر کچی قبر کو پایا۔ اس نے اس مقبرے کی تعمیر کی۔

بس تبھی سے اللہ بخش کا خاندان اس مقبرے کی خدمت کرتا چلا آرہا ہے۔

اس مزار میں دو دروازے تھے۔ دونوں آمنے سامنے تھے۔ اللہ بخش دوسرے دروازے سے لے کر انہیں جب مزار کے عقب میں پہنچا تو وہاں دور تک سمندر ہی سمندر نظر آیا۔

سمندر کی لہریں ٹیلے کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

''کبھی سمندر اوپر تک نہیں آیا۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''نہیں...... صاحب جی...... جب سمندر چڑھاؤ پر ہوتا ہے تو نیچے کی دو چار سیڑھیاں ضرور ڈوب جاتی ہیں، اس سے اونچا پانی کبھی نہیں ہوا؟'' اللہ بخش نے جواب دیا۔

''حیرت ہے۔'' ماموں رشید نے کہا۔

''ہاں، ابھی آپ کو میں کچھ اور بھی دکھاتا ہوں۔ ذرا آگے آکر نیچے دیکھئے۔'' اللہ بخش نے دروازے سے آگے نکل کر چبوترے کے آخری سرے پر پہنچ کر کہا۔

جب یہ لوگ وہاں پہنچے جہاں اللہ بخش کھڑا تھا اور انہوں نے نیچے جھانکا تو وہ حیران رہ گئے۔ نیچے دو گڑھے بنے ہوئے تھے۔ ان گڑھوں میں بچھو بھرے ہوئے تھے۔ اتنے بچھو تھے کہ انہیں چلنے پھرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر لدے ہوئے تھے۔

''اوہ۔'' کمال رائے واقعی حیران رہ گیا۔ ''کیا یہ بچھو...... باہر نہیں نکلتے۔''

''صاحب جی، میں نے ان بچھوؤں کو آج تک ان گڑھوں سے باہر نہیں دیکھا۔ یہی بات میرا باپ کہتا تھا اور یہی بات میرے باپ کو میرے دادا نے بتائی۔'' اللہ بخش بولا۔ ''اب آپ ذرا اِدھر آئیں۔'' وہ مزار کے ساتھ گھومتا ہوا بولا۔ ''آپ لوگوں نے کبھی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ اس لئے کہ ایسا ممکن نہیں ہے...... لیکن یہاں دو جاندار ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایسے جاندار جن کی ازل سے دشمنی ہے۔ میں سانپ اور نیولے کی بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں، یہ بات تو سچ ہے۔ نیولا تو سانپ کو دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیتا ہے۔'' کمال رائے نے کہا۔

''اب آپ ذرا نیچے دیکھئے۔'' اللہ بخش نے ایک جگہ رک کر اشارہ کیا۔

کمال رائے نے اس گڑھے میں جو کچھ دیکھا، وہ نا قابلِ یقین تھا۔

وہ ایک گہرا گڑھا تھا...... چھوٹا سا کنواں بنا ہوا تھا۔ اس گڑھے میں کوئی پچیس تیس چھوٹے بڑے سانپ ہوں گے تو پندرہ سولہ نیولے بھی تھے۔ نیولے اور سانپ تھے ایک ہی جگہ ایک گڑھے میں لیکن ان کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ ایک غیر واضح خط فاصل موجود تھا۔ دونوں موذی جانور اِدھر اُدھر حرکت کر رہے تھے لیکن ایکدوسرے پر حملہ نہیں کر رہے تھے۔ دونوں ایک اچھے پڑوسی کی طرح رہ رہے تھے۔

''کیا یہ بھی گڑھے سے باہر نہیں نکلتے؟'' ماموں رشید نے سوال کیا۔

''نہیں...... میں نے کبھی انہیں باہر نہیں دیکھا۔'' اللہ بخش نے بتایا۔

''پھر یہ اپنی خوراک کہاں سے حاصل کرتے ہوں گے۔'' اس مرتبہ کمال رائے نے پوچھا۔

''صاحب...... اللہ بہتر جانتا ہے۔ یہ کیا کھاتے ہیں اور کیسے زندہ رہتے ہیں۔'' اللہ بخش نے کہا۔

''بہت حیرت کی بات ہے۔'' ماموں رشید بولے۔

''صاحب...... ایک بات اور بھی ہے۔'' اللہ بخش انہیں مسلسل حیرت زدہ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

''وہ کیا؟''

''ہم لوگ مغرب کے بعد یہاں نہیں آتے۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''میں سرِ شام ہی ایک لیمپ جلا کر مزار پر رکھ جاتا ہوں اور صبح آ کر اُسے اُٹھا کر لے جاتا ہوں۔''

''اچھا...... کیا مغرب کے بعد یہاں آنے کی پابندی ہے؟'' کمال رائے نے پوچھا۔

''صاحب...... ایسا ہی سمجھ لیں...... مغرب کے بعد سیّد بابا کا خادم باہر نکل آتا ہے، وہ مزار پر گھومتا پھرتا ہے...... اس کی موجودگی میں یہاں کوئی نہیں آسکتا۔''

''سیّد بابا کا خادم۔'' کمال رائے ایک دم چونکا۔ ''بلی والے بابا نے بھی سیّد بابا کے خادم کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے اسی نے کرنا ہے۔ یہ سوچ کر کمال رائے نے فوراً کہا۔ ''اللہ بخش، سیّد بابا کے خادم سے تو مجھے ملنا ہے۔''

''صاحب...... کیا بات کر رہے ہیں...... اس سے کوئی نہیں مل سکتا۔'' اللہ بخش بولا۔

''آخر کیوں؟'' کمال رائے تذبذب بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہم تو اسی سے ملنے آئے ہیں۔''

یہ سن کر اللہ بخش مسکرایا اور پُرفکر انداز میں کمال رائے کو دیکھنے لگا، بولا کچھ نہیں۔

''کیوں مسکرا رہے ہو؟''

''صاحب...... سیّد بابا کا خادم کوئی آدمی نہیں ہے۔ آپ اس سے بھلا کیسے مل سکتے ہیں۔ یہاں

آنے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔ صاحب وہ بارہ تیرہ فٹ کا سانپ ہے۔''

''ہیں...... وہ سانپ ہے، اتنا لمبا...... پھر وہ سانپ تو نہ ہوا، اسے اژدھا کہو۔''

''نہیں...... وہ اژدھا نہیں ہے۔ اژدھا موٹا ہوتا ہے اور سست رفتار ہوتا ہے، اس کی جسامت ایک موٹے سانپ سے زیادہ نہیں...... پھرتیلا اتنا ہے کہ چند لمحوں میں اِدھر سے اُدھر ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے بس ایک مرتبہ ہی دیکھا ہے۔ اس دن لیمپ مزار پر رکھنے میں دیر ہوگئی تھی۔ میں مغرب کے وقت یہاں آیا تھا تو میں نے مزار کے دوسرے دروازے پر ایک کالے سانپ کو پھن پھیلائے جھومتے پایا تھا، وہ کوئی ایک گز اونچا اُٹھا ہوا تھا۔ اور کنڈے مارے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا پھن زمین پر رکھا اور چند لمحوں میں غائب ہوگیا۔ اس رات وہ میرے خواب میں آیا اور مجھے سخت تنبیہہ کی کہ آئندہ اتنی دیر سے نہ آنا۔ وہ دن اور آج کا دن، میں لیمپ لے کر عصر کے بعد ہی آجاتا ہوں۔''

''اوہ...... اچھا۔'' کمال رائے نے ایک گہرا سانس لیا۔

''آپ نے یہاں بچھو دیکھے...... سانپ اور نیولے دیکھے۔ سیّد بابا کے خادم کا ذکر سنا۔ اس مزار پر ایک مخلوق اور ہے۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کسی نے بھی نہیں دیکھا، نہ میرے باپ نے، نہ میرے دادا نے...... لیکن اس کا وجود سب نے محسوس کیا ہے۔ آپ بھی دیکھیں گے۔ یہاں ہر مہینے چاند کی چودہ تاریخ کو ایک بکرا قربان کر کے مزار کے پیچھے ریت پر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ قربانی مزار پر آنے والے لوگ کرتے ہیں، اور آج تک ایسا نہیں ہوا کہ چاند کی چودہ تاریخ ہو اور کوئی یہاں آیا نہ ہو۔ آج بھی آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ چاند کی چودہ تاریخ ہے۔'' اللہ بخش نے انکشاف کیا۔

''ہاں واقعی۔'' کمال رائے نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''لیکن ہم تو بکرا نہیں لائے ہیں۔'' ماموں رشید نے کہا۔

''بکرا آپ کو اللہ بخش فراہم کرے گا۔'' ڈاکٹر عرفان نے فوراً کہا۔

''جی بالکل۔'' اللہ بخش نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

''یہ قربانی کب کرنا ہوگی؟''

''عصر کے بعد، مغرب سے پہلے۔'' اللہ بخش نے بتایا۔ ''اور بکرا سالم رکھا جائے گا۔ اس کی بوٹیاں نہیں کی جائیں گی۔ قربانی کے بعد آپ اس مخلوق کو محسوس کر سکیں گے۔''

اللہ بخش نے مزار کے بارے میں اتنا کچھ دکھا اور بتا کر ان لوگوں کا تجسس بہت بڑھا دیا تھا۔ اس میں ایک دو باتوں کا بلی والے بابا نے بھی ذکر کیا تھا۔ بہرحال عصر کے بعد اللہ بخش کے فراہم کردہ

بکرے پر کمال رائے نے چھری پھیری۔ اللہ بخش نے اس کی کھال اُتار کر ایک طرف ڈالی اور سالم بکرا اُٹھا کر ٹیلے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے یہ تینوں تھے۔ رامش خیال، آرزو کے ساتھ ہی رہا کہ اس کو تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ ماموں رشید کے ہاتھ میں اس بکرے کا سر تھا۔ یہ سری بھی بکرے کے ساتھ ہی رکھی جانی تھی۔

اللہ بخش نے اوپر پہنچ کر مقبرے کے اندر جانے کی کوشش نہ کی بلکہ وہ مقبرے کے چبوترے کے ساتھ اس کے عقب میں چلا گیا۔ وہاں ایک جگہ اس نے ریت پر سالم بکرا ڈال دیا اور ماموں رشید سے سری لے کر بکرے کے ساتھ رکھ دی۔ پھر اس نے کہا۔ ''اس جگہ کو آپ غور سے دیکھ لیں۔''

کمال رائے اور ماموں رشید نے اس جگہ کو بہت غور سے دیکھا، وہاں کوئی خاص بات نہ تھی۔ ریت پر بکرا پڑا ہوا تھا اور اس کی سطح ہموار نہ تھی۔ تھوڑی اونچی نیچی تھی۔ تب اللہ بخش نے نیچے بیٹھ کر بکرے کے آس پاس کی سطح ہموار کر دی اور بولا۔ ''یہاں اب کسی قسم کا نشان تو نہیں؟''

''نہیں۔'' کمال رائے نے ریت کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس اب آپ لوگ میرے ساتھ آجائیں۔'' اللہ بخش نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ اس کے پیچھے چل دیئے اور چلتے ہوئے مزار کے سامنے آگئے۔ پھر وہ چاروں مزار کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ اللہ بخش ان سے مزار کے متعلق باتیں کرتا رہا۔

کوئی دس منٹ کے بعد وہ سیڑھیوں سے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ گیا اور بولا۔ ''آئیں صاحب، میرے ساتھ۔''

اللہ بخش انہیں دوبارہ اسی جگہ لے کر پہنچا جہاں وہ سالم بکرا اور اس کا سر ریت پر ڈال کر آیا تھا۔

جب یہ لوگ گھوم کر مزار کے عقب میں پہنچے تو ایک حیرت انگیز منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

اب نہ وہاں بکرا تھا اور نہ اس کا سر..... وہاں بے شمار پنجوں کے نشان موجود تھے۔ یہ نشان کوئی چار پانچ گز کے دائرے میں پھیلے ہوئے تھے۔

''یہ نشانات کیسے ہیں.....؟ یہ تو کسی خونخوار جانور کے معلوم ہوتے ہیں۔'' کمال رائے نے ریت پر بیٹھ کر ان نشانات کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''اور یہ بکرا کہاں گیا؟ اس کی تو ہڈیاں بھی یہاں موجود نہیں۔'' ماموں رشید بولے۔

''صاحب..... میرے خیال میں تو یہ بھیڑیئے کے پنجوں کے نشانات ہیں۔'' اللہ بخش نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''شاید..... تم ٹھیک کہتے ہو..... وہ تعداد میں ایک دو نہیں بلکہ خاصے تھے۔'' ڈاکٹر عرفان نے کہا۔

''بھائی تم اگر ہمیں پہلے بتا دیتے تو ہم چھپ کر انہیں دیکھ لیتے۔''

''صاحب..... اس بات کی اجازت نہیں ہے..... اور میں حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔'' اللہ بخش نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''ویسے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرے باپ نے ایک مرتبہ انہیں دیکھنے کی کوشش کی تھی اسے نظر تو کچھ نہیں آیا تھا..... بس غرانے کی آوازیں تھیں، اور بکرا نظروں کے سامنے چھوٹا ہوتا چلا جارہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا بابا وہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور گھر آتے آتے اسے بخار چڑھ گیا۔ پھر بڑی مشکل سے سیّد بابا سے معافی ملی۔ تب جاکر میرے بابا کا بخار اُترا۔ اس کے بعد بابا نے ہمیں سخت تنبیہہ کر دی کہ کبھی دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس لئے میں نہ خود دیکھتا ہوں اور نہ کسی اور کو جانے دیتا ہوں۔''

''تم اچھا کرتے ہو۔'' ڈاکٹر عرفان نے کہا۔

''صاحب..... میں اب گھر جاتا ہوں۔ وہاں سے لیمپ روشن کر کے لے آؤں۔'' اللہ بخش نے کہا۔

''ہاں، ٹھیک ہے..... تم جاؤ..... ہم بھی نیچے جاکر کچھ کھانے پکانے کا انتظام کرتے ہیں۔''

''صاحب..... خود کرلیں گے یا میں کسی بندے کو بھیج دوں۔''

''اللہ بخش..... مجھے کھانا پکانا بہت عمدہ آتا ہے..... ویسے میری مدد کیلئے چاہو تو کسی کو بھیج دو۔''

''تمہاری مدد کیلئے..... میں جو ہوں۔'' ماموں رشید فوراً بولے۔

''میں بھی تو ہوں۔'' کمال رائے آخر کیوں پیچھے رہتا۔

اللہ بخش ہنستا ہوا چلا گیا اور یہ لوگ ٹیلے سے نیچے اُتر آئے اور ہانڈی چولہے کے چکر میں لگ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد اللہ بخش ہاتھ میں لیمپ اُٹھائے واپس آیا اور ان کے قریب سے گزر کر جانے لگا تو کمال رائے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

''جی صاحب۔''

''اللہ بخش اوپر جارہے ہو تو ذرا انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، انہیں اوپر کے عجائبات دکھا دو۔'' اس نے رامش خیال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

رامش خیال ابھی تک مزار پر نہیں گیا تھا۔ وہ آرزو کے ساتھ ہی بیٹھا رہا تھا۔ کیونکہ اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اب کیونکہ وہ سب نیچے آگئے تھے اس لئے کمال رائے نے رامش خیال کو اوپر لے جانے کو کہا تھا۔

رامش خیال اوپر جانے کیلئے اُٹھا تو آرزو نے پوچھا۔ ''بابا، میں بھی جاؤں۔''

"تم میں ہمت ہے اوپر جانے کی۔" کمال رائے نے پوچھا۔

"اس وقت تو کچھ جسم میں جان محسوس ہو رہی ہے۔" آرزو نے بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر چلی جاؤ۔" کمال رائے نے کہا۔ "ذرا احتیاط سے اور آہستہ آہستہ جانا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔" آرزو نے رامش خیال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پھر جب وہ رامش خیال کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچ گئی تو کمال رائے نے مامون رشید کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کمال رائے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آرزو کی حالت کچھ بہتر نہیں ہوگئی۔" مامون رشید نے کہا۔

"اچھی خاصی ٹھیک نظر آ رہی ہے ...... ورنہ اس سے تو دو قدم چلنا بھی مشکل تھا۔" کمال رائے بولا۔

"اللہ کرے یہ بالکل ٹھیک ہو جائے۔" مامون رشید نے دل سے دعا کی۔

یہ دونوں آہستہ آہستہ اوپر جا رہے تھے۔ اللہ بخش نے مزار کی سیڑھیاں چڑھ کر چبوترہ کراس کیا اور مزار کے دروازے میں داخل ہوگیا۔ اس نے قبر کے سرہانے کتبے کے پاس لیمپ رکھا۔ اس کی چمنی اُتار کر ماچس سے اسے جلایا اور پھر لیمپ پر چمنی رکھ دی اور باہر نکل آیا۔

وہ دونوں اس وقت تک مزار کی سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ اللہ بخش نے ان دونوں کے اوپر آنے کا انتظار کیا۔ پھر وہ ان کے ساتھ مزار کے اندر آیا۔

آرزو نے مزار کو بڑی پرتجسس نظروں سے دیکھا۔ اس نے مزار پر لگے ہوئے کتبے کو پورے انہاک سے پڑھنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ پڑھا جا سکا۔

"آئیں صاحب ...... ادھر آئیں۔" اللہ بخش یہ کہہ کر عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر وہ عقبی دروازہ عبور کر کے چبوترے پر آیا اور وہاں سے چبوترے کے آخری سرے پر پہنچ کر رک گیا۔

"یہ دیکھیے!" اللہ بخش نیچے دیکھتا ہوا بولا۔

آرزو رامش خیال کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ چلتی اللہ بخش کے پاس پہنچی اور ان دونوں نے بیک وقت نیچے نگاہ کی۔

نیچے دو گڑھے تھے اور ان گڑھوں میں بچھو بھرے تھے۔

"اوہ۔" اتنے سارے بچھو دیکھ کر آرزو کی سٹی گم ہوگئی۔

☆......☆......☆

کھلے دروازے سے ایک خادمہ اندر داخل ہوئی اور بیڈ پر بیٹھی شبورا کے پاس آ کر رک گئی اور اسے

پرتجسس نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ شبورا نے اسے یوں دیکھتے ہوئے پایا تو سمجھ گئی کہ وہ کسی خاص کام سے یا کوئی اہم پیغام لے کر آئی ہے۔ شبورا نے ایک نگاہ اس خادمہ پر ڈالی اور ذرا برہم لہجے میں بولی۔

"ہاں، بول کیوں آئی ہے؟"

"پرمان کا پیغام لے کر آئی ہوں۔" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"کیا کہا ہے اس نے؟" شبورا بیڈ پر بیٹھی ہوئی بولی۔

"اس نے تجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔" خادمہ نے بتایا۔

"کب؟" شبورا نے پوچھا۔

"رات کو۔" خادمہ نے کہا۔ "تجھے راج نرتکی کا لباس پہن کر وہاں جانا ہوگا۔"

"میں سمجھی نہیں ...... یہ کس قسم کا لباس ہے؟"

"اس لباس کو پہن کر رقص کیا جاتا ہے۔ تو روح یہی لباس پہن کر رقص کیا کرتی تھی۔ وہ لباس یہاں موجود ہے۔ میں تجھے نکال کر دے دیتی ہوں۔" پھر اس خادمہ نے شبورا کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ سامنے ایک منقش لکڑی کا صندوق رکھا تھا، اس نے اس میں سے وہ لباس نکالا اور اس کے نزدیک بیڈ پر رکھ دیا۔

"یہ ہے وہ لباس ...... جسے تجھے پہن کر پرمان کے دربار میں جانا ہے ...... تو نہا دھو کر تیار ہو جا۔ میں رات کو تجھے لینے آؤں گی۔" خادمہ نے اتنا کہا اور پھر اس نے شبورا کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا ...... فوراً دروازے کی طرف چل دی۔

"سنو۔" شبورا نے جلدی سے آواز دی، اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ دروازے سے نکل نہ جائے۔

خادمہ رک گئی، اس نے پلٹ کر شبورا کی طرف دیکھا، نگاہوں میں سوال تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کوئی رقاصہ ہوں؟"

"یہ خیال میرا نہیں ...... میں کون ایسا خیال کرنے والی ...... یہ خیال پرمان کا ہے۔" خادمہ نے مسکرا کر کہا۔

"اپنے پرمان سے کہہ دینا کہ میں رقاصہ نہیں ہوں ...... میں ناچتی نہیں نچاتی ہوں۔ میری بین سن کر اچھے سے اچھا سانپ جھومنے لگتا ہے۔" شبورا نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔

"میں نے تجھے پرمان کا حکم سنا دیا۔ تجھے لباس نکال کر دے دیا، اب میرا کام ختم ہوا۔ تو جانے اور پرمان جانے۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور تیز تیز چلتی دروازے سے نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔

خادمہ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ وہ قید میں تھی...... وہ ایک آزاد زندگی گزار رہی تھی، باپ اس پر جان چھڑکتا تھا اور بھائی اس کا ہر مان رکھتا تھا۔ بستی میں اسے ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ ایک تو وہ سردار کی بیٹی تھی۔ دوسرے وہ مانی ہوئی سپیرن تھی، اس بستی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ سینکڑوں سانپ اس کے گھر میں موجود تھے۔ وہ ان سانپوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتی تھی۔ وہ ان سانپوں کی ایک طرح ملکہ تھی۔ آج وہی ملکہ قید ہو گئی تھی، وہ مخلوق جو اس کے اشارے پر چلتی تھی، اب وہ اس مخلوق کی قید میں آ گئی تھی۔ اس کے سامنے ناچنے والے اب اسے نچانے کے چکر میں تھے۔

ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا...... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

شبورا نے دور رکھے لباس کو کھینچ کر اپنے نزدیک کیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ یہ ایک شرمناک لباس تھا اسے پہن کر رقص کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اسے پہن بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اس لباس کو اُٹھایا اور صندوق کھول کر اس میں پھینک دیا۔ اس نے تیوح کے ڈھکے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھا۔ پہلے سوچا اس کے مجسمے سے چادر اُتار کر اسے دیکھے، پھر ارادہ بدل دیا اور آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے......؟ اس قید سے کس طرح آزاد ہو کہ کمرے کے تینوں دروازے ایک ساتھ کھلے۔ وہی تیز ہوا کا جھکڑ اور پھر ایک دم ہوا کا ساکت ہونا، خوشبو کا جھونکا اور کسی کی آمد...... اس آمد کیلئے بھی کوئی دروازہ مخصوص نہ تھا۔ جدھر سے جس کا جی چاہتا تھا، کمرے میں داخل ہو جاتا تھا۔

تب ایک دروازے سے رانی ملائے کا اندر داخل ہوئی، وہ زرق برق لباس میں تھی اور بڑی شان سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ابرش تھا۔

ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دروازے خود بخود بند ہو گئے۔ بس ایک دروازہ کھلا رہ گیا۔

شبورا آرام سے بیٹھی ان دونوں کو آتا دیکھتی رہی۔ ابرش نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک کرسی رانی ملائے کا کے بیٹھنے کیلئے سیدھی کی لیکن رانی ملائے کا کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے چلی گئی اور اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر بڑے باوقار انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ جیسے وہ بھرے مجمع سے خطاب کرنے والی ہو۔

''کھڑی ہو جا...... دیکھتی نہیں ہے کہ رانی ملائے کا تیرے پاس آئی ہے۔'' ابرش نے بڑے غصیلے لہجے میں حکم دیا۔

شبورا نے اس منحوس صورت ابرش کو دیکھا جو اسے اس کی دنیا سے گرفتار کر کے لایا تھا۔ اسے

ابرش سے انتہائی نفرت تھی۔ ایک تو اس کی صورت منحوسوں جیسی تھی، دوسرے اس نے کام بھی خبیثوں والا کیا تھا۔

وہ اسے تیز نظروں سے دیکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی، مجبور جو تھی۔

''ابرش...... اب تو جا۔'' رانی ملائے کا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ بڑی توجہ سے شبورا کو دیکھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے رانی...... میں جاتا ہوں۔'' وہ حکم سنتے ہی فوراً دروازے کی طرف بڑھا۔

''اور سن...... یہ بات پر مان تک نہ پہنچے۔'' رانی ملائے کا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ تو جانتا ہے۔''

''یہ بات پر مان تک نہیں پہنچے گی۔ تو بے فکر ہو جا۔'' یہ کہہ کر ابرش کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''تو جانتی ہے کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں؟'' ابرش کے جانے کے بعد وہ شبورا سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں۔'' شبورا نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''تجھے تیرے انجام سے باخبر کرنے۔'' رانی ملائے کا نے بتایا۔

''کیا ہے...... میرا انجام۔'' شبورا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''آج رات تجھے پر مان نے اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔'' پتہ نہیں یہ سوال تھا یا جواب۔

''ہاں، ابھی ایک خادمہ مجھے اطلاع دے کر گئی ہے۔'' شبورا نے اپنے طور پر تصدیق کی۔

''پھر اس نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ اس طلبی کا مقصد کیا ہے؟'' رانی ملائے کا نے پوچھا۔

''ہاں، اس نے یہ بھی بتا دیا ہے۔'' وہ بولی۔

''پر مان کی تجھ پر نظر ہے، وہ تجھے تیوح بنا کر چھوڑے گا۔'' انکشاف ہوا۔

''تیوح کی ہم شکل ہونا، میرے لئے عذاب بن گیا ہے۔'' شبورا نے افسردگی سے کہا۔

''لیکن تیوح کیلئے یہ کھیل عذاب نہ تھا۔ اس نے یہ کھیل، کھیل کر میری زندگی عذاب کر دی تھی۔''

''کون سا کھیل؟'' شبورا نے پوچھا۔

''عشق کا کھیل!'' رانی ملائے کا نے بتایا، اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''اوہ، اب سمجھی...... تیوح پر مان سے عشق کرتی تھی۔''

''ہاں...... وہ پر مان کے گلے کا ہار تھی اور بڑی اونچی ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ بڑے اونچے خواب دیکھ رہی تھی۔'' رانی ملائے کا کے لہجے میں انتہائی نفرت تھی۔ ''وہ اپنی اوقات بھولتی جا رہی تھی۔''

’’وہ کیا چاہتی تھی؟‘‘شبورا نے پوچھا۔

’’وہ میری جگہ لینا چاہتی تھی، وہ رانی بننا چاہتی تھی۔‘‘

’’پھر؟‘‘شبورا نے سوال کیا۔

’’پھر کیا۔ اگر وہ زندہ رہتی تو ایسا کر گزرتی...... بھلا ہو تم لوگوں کا کہ تم نے اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ سچی بات ہے، مجھے اس کی موت کا سن کر بے پناہ خوشی ہوئی...... اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتی تو وہ میری جگہ لے چکی ہوتی...... اور موت میرا مقدر بن چکی ہوتی۔‘‘رانی ملائے کا نے صاف گوئی سے کہا۔

’’اب تو مجھ سے کیا چاہتی ہے؟‘‘شبورا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں نہیں چاہتی کہ وہ کہانی دوبارہ دہرائی جائے۔‘‘رانی ملائے کا نے اپنے دل کی بات کہی۔

’’لیکن تو جانتی ہے کہ میں تیوح نہیں...... میں پرمان کے عشق میں مبتلا نہیں۔‘‘

’’ہاں، جانتی ہوں لیکن پرمان تو تیرا دیوانہ ہے...... وہ تجھے طرح طرح کے لالچ دے گا۔ تجھے رانی بنائے جانے کی پیشکش کرے گا۔‘‘خدشہ ظاہر کیا گیا۔

’’رانی تو دور کی بات ہے، وہ مجھے رقاصہ بھی نہیں بنا سکتا۔ میں نے ابھی اسے کہلوایا ہے کہ میں ناچنے والی نہیں، نچانے والی ہوں۔ میں سپیرن ہوں، میری بین کے آگے اچھے اچھے سانپ جھومنے لگتے ہیں۔‘‘شبورا نے اسے بتایا۔

شبورا کا یہ جواب سن کر رانی ملائے کا کے چہرے پر ایک طمانیت آ گئی۔ وہ خوش ہو کر بولی۔’’کیا واقعی تو نے ایسا جواب دیا ہے؟‘‘

’’ہاں واقعی میں نے ایسا جواب دیا ہے...... میرا جواب اس تک پہنچ چکا ہوگا۔‘‘شبورا نے بڑے یقین سے کہا۔

’’یہ جواب تجھے مشکل میں ڈال سکتا ہے۔ وہ تجھ سے یہ گھر چھین سکتا ہے۔‘‘

’’چھین لے، مجھے پرواہ نہیں۔‘‘

’’وہ تجھے قید میں ڈال دے گا۔‘‘

’’ڈال دے...... میں قید سے ڈرنے والی نہیں...... قید میں ڈال دے گا تو اچھا ہوگا۔ کم از کم میں اس کی ڈراؤنی شکل دیکھنے سے بچ جاؤں گی۔‘‘شبورا نے بے ساختہ کہا۔

اگرچہ اس جواب میں راجہ پرمان کی توہین تھی...... اگر یہ توہین کوئی اور کرتی تو وہ اسے ناگوں سے ڈسوا دیتی لیکن یہ توہین شبورا نے کی تھی۔ اس شبورا نے جسے پرمان، اس کے مقابل لا کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ توہین بہت اچھی لگی تھی۔

’’تیرا نام کیا ہے؟‘‘رانی ملائے کا نے بڑی محبت سے پوچھا۔

’’میرا نام شبورا ہے۔‘‘

’’تیرا نام بہت اچھا ہے...... تو خود بہت اچھی ہے۔‘‘رانی ملائے کا خوش ہو کر بولی۔ بتا اب تو کیا کیا چاہتی ہے؟ مانگ اب کیا مانگتی ہے؟‘‘

’’میں جو چاہوں گی، وہ مجھے مل جائے گا؟‘‘

’’ہاں مل جائے گا۔‘‘

’’قول دے۔‘‘

’’جا قول دیا۔‘‘رانی ملائے کا نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

’’اپنے قول سے پھرے گی تو نہیں۔‘‘شبورا نے اسے پکا کیا۔

’’میں رانی ملائے کا ہوں، ایک بار جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔‘‘

’’میں یہاں سے آزادی چاہتی ہوں، نکلنا چاہتی ہوں...... میری مدد کر۔‘‘

’’یہ پرمان کی بستی ہے...... یہاں صرف پرمان کا حکم چلتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر اس کے پہرے دار بیٹھے ہیں۔ وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ تیرا یہاں سے نکل جانا کوئی آسان کام نہیں...... بہرحال میں نے قول دیا ہے تو اپنا قول ہر قیمت پر نبھانے کی کوشش کروں گی۔ تو اب بے فکر ہو جا...... میں سوچتی ہوں کہ تیرے لئے کیا کرنا ہے۔‘‘رانی ملائے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

’’میں تیری بڑی شکر گزار ہوں گی۔‘‘شبورا نے ممنونیت سے کہا۔

’’ممنون تو میں تیری ہوں کہ تو نے مجھے ایک بڑی اُلجھن سے نکال دیا۔‘‘رانی ملائے کا نے کہا۔

’’رنسارو کہاں ہے؟‘‘اچانک شبورا نے پوچھا۔

’’ابھی تو یہیں تھا...... اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کب کہاں نکل جائے۔‘‘

’’رانی ملائے کا کیا تو اسے سمجھا نہیں سکتی ہے کہ وہ آرزو کا پیچھا چھوڑ دے۔‘‘

’’وہ سمجھنے والوں میں سے نہیں ہے...... وہ اپنے باپ پر گیا ہے، وہ ہر قیمت پر برہا کو حاصل کر کے رہے گا چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔‘‘رانی ملائے نے غصے سے کہا۔

’’وہ آرزو کو کبھی حاصل نہ کر سکے گا...... اس کوشش میں وہ اپنی زندگی ضرور گنوا بیٹھے گا۔‘‘

’’شبورا، میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔‘‘

’’تو اس کی ماں ہے...... اسے سمجھا، کیا وہ تیری نہیں سنتا۔‘‘

’’اس معاملے میں میری کیا، اپنے باپ کی بھی نہیں سنتا۔‘‘رانی ملائے کا نے افسوس زدہ لہجے

میں کہا۔

''باغی ہو گیا ہے؟'' شبورا نے پوچھا۔

''ہاں، وہ آج کا باغی نہیں..... شروع سے ہی باغی ہے۔ اس نے باپ کی کبھی نہیں سنی۔ تبھی تو رہا کو یہاں سے بھیجنا پڑا۔ خیر اسے بھیجنا تو تھا، وہ یہاں ایک طویل عرصے تک نہیں رہ سکتی تھی۔ بس اس کا یہاں سے روانہ ہونا ہی غضب ہو گیا۔ تمہارے لوگوں نے اسے اغوا کر لیا۔ یہ ایک اور غضب ہوا۔ رستارو کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بالکل ہی پاگل ہو گیا۔ اس نے خطرناک راستے اختیار کر لئے اور پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔'' رانی ملائے نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''اس نے آرزو کو نقصان پہنچایا ہی، میرے باپ اور بھائی کو بھی مار ڈالا۔'' شبورا نے شکوہ کیا۔

''مجھے بڑا افسوس ہے..... میں جانتی ہوں کہ رہا کی جدائی نے اسے پاگل کر دیا تھا..... وہ رہا کے حصول میں جو نہ کر گزرے کم ہے۔'' رانی ملائے کا نے کہا۔

''وہ بہت شاطر ہے۔ اس نے میرا شوم کا عمل، مجھے فریب دے کر بھنگ کر دیا۔ ورنہ آج میں نہ یہاں بیٹھی ہوتی، وہ میری قید میں ہوتا۔''

''اب اس معاملے میں کیا کہوں..... وہ جیسا کرے گا بھگتے گا۔ رہی بات چالاکی کی تو اس میں واقعی کوئی شک نہیں..... وہ اپنے باپ کیلئے اس بستی سے ایک ایسا تحفہ لے کر آیا ہے کہ باپ اس کی ساری بغاوت بھول گیا، ایک لمحے میں اس کے سارے قصور معاف کر دیئے..... ورنہ نافرمانی کی سزا..... یہاں موت ہوتی ہے۔'' رانی ملائے کا نے بتایا۔

شبورا خاموش رہی، وہ کیا کہتی۔ اس کے پاس کہنے کو کیا تھا۔ غلطی اس کی اپنی تھی۔ وہ کیوں اس کے فریب میں آئی۔ ایسا اپنی کمزوری کی وجہ سے ہوا ورنہ شوم کا عمل بھی بھنگ نہ ہوتا..... کیوں اس نے کمال رائے کو اپنے دل میں بسایا.....؟ نہ اس کی چاہت اس کے دل میں ہوتی، نہ کوئی اس کے نام پر اسے فریب دیتا۔ وہ بھی تو اس معاملے میں بے بس تھی، اس نے کمال رائے کو کب دعوت دی تھی کہ آؤ، میرے دل میں آ کر بیٹھ جاؤ۔ ایسا تو خودبخود ہو گیا۔ وہ بلا اجازت اس کے دل میں گھسا چلا آیا تھا۔ وہ اس معاملہ میں بالکل بے بس تھی۔

☆.....☆.....☆

چودھویں کی رات تھی۔

چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ چاند کی کرنیں سمندر کو چھو رہی تھیں، سمندر چاندنی کے لمس سے بپھرا ہوا تھا، پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی لہریں اتنی زور سے اچھل رہی تھیں جیسے چاند کو اپنی

آغوش میں لے لیں گی۔ موجیں مارتا سمندر، لہروں کا شور، ٹھنڈی ہوا، پورے چاند کی رات..... اُف کیا غضب کا منظر تھا۔

سیّد بابا کا مزار چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ سیّد بابا کی قبر پر ایک لیمپ روشن تھا جسے اللہ بخش نے سرِشام رکھا تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی تھی اور یہ ڈیوٹی اس کے گھرانے میں برسوں سے چلی آ رہی تھی۔

ٹیلے کے نیچے مزار کی سیڑھیوں کے نزدیک ان لوگوں نے بسیرا کیا ہوا تھا۔ آرزو اپنے خیمے میں فولڈنگ بیڈ پر لیٹی تھی۔ کمال رائے اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ خیمے میں ایمرجنسی لائٹ موجود تھی۔ آرزو کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی۔

ان لوگوں نے اپنے لئے ایک شامیانہ نصب کروایا تھا اور اسے قناتوں سے ڈھک لیا تھا۔

پھر زمین پر گدے ڈال کر وہ لوگ بیٹھ گئے تھے۔ ان لوگوں نے طے کیا تھا کہ ایک آدمی ہر قیمت پر جاگے گا۔ وہ شامیانے سے نکل کر آرزو کے خیمے کا جائزہ لے گا۔ مزار کے آس پاس بھی گھومے گا۔ کسی خطرے کی صورت میں وہ آ کر سب کو اُٹھا دے گا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔

پہلی ڈیوٹی رامش خیال نے اپنی لگوائی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں نے کون سا جلدی سو جانا تھا۔ ابھی یہ لوگ تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ پکنک کا سا سماں تھا۔ ڈاکٹر عرفان صحیح معنوں میں یہاں کی فضا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ ایک باتونی آدمی تھا اور پرلطف باتیں کرنے کا عادی تھا۔ اسے ہزاروں قصے یاد تھے وہ ہر بات کا جواب کوئی قصہ سنا کر دیا کرتا تھا۔

اللہ بخش نے ان لوگوں کا بہت خیال رکھا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لوگ بستی میں چل کر قیام کریں، جیسا بھی اس کا غریبانہ گھر ہے، وہاں رات بسر کر کے اس کی عزت افزائی کریں..... لیکن یہ لوگ یہاں ٹھہرنے کے پورے انتظام سے آئے تھے۔ لہٰذا اللہ بخش کی پیشکش کو ممنون احسان ہوتے ہوئے نرمی سے ٹال دیا تھا۔

جاتے ہوئے وہ کہہ گیا تھا۔ ''صاحب جی، میں اب چلتا ہوں۔ رات کو ادھر کا چکر لگاؤں گا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے گھر سے اُٹھا لیں۔''

''ٹھیک ہے اللہ بخش تم جا کر آرام کرو۔ اگر تمہاری ضرورت ہوئی تو تمہیں گھر سے بلوا لیں گے۔'' ڈاکٹر عرفان نے اسے تسلی دی۔

☆.....☆.....☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

سمندر کی آواز کے علاوہ اس وقت کوئی اور آواز نہ تھی۔ رو پہلی موجیں ایک دوسرے کے پیچھے

بھاگ رہی تھیں۔سمندر کا حسن اس وقت دیکھنے والا تھا۔

تب وہ مزار کے پچھلے دروازے سے سرسراتا ہوا اندر داخل ہوا، اس نے بہت تیزی سے سمٹنا ن لیا۔اس نے کنڈلی بنائی اور اپنا پھن اوپر اُٹھایا۔وہ کوئی ایک گز اونچا اُٹھ گیا۔پھر وہ اپنا پھن پھیلا کر دائیں بائیں جھومنے لگا۔اس کا منہ مزار کی طرف تھا۔پھر اس نے اپنا منہ مزار کے فرش پر رکھا جیسے تعظیماً جھکا ہو۔اس کے بعد وہ زمین پر پھسلتا چلا گیا۔وہ تیزی سے قبر کی طرف بڑھا اور قبر کے گرد گھومنے لگا۔قبر کے گرد اس نے تین چکر لگائے۔

وہ بہت لمبا سانپ تھا۔اس کی لمبائی بارہ تیرہ فٹ سے کم نہ ہوگی۔وہ کالے رنگ کا ایک چمکیلا اور پھرتیلا سانپ تھا۔وہ بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا۔

مزار کے گرد چکر کاٹ کر وہ سامنے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔اس نے پھر تیزی سے کنڈلی ماری اور ایک گز اونچا اُٹھ کر اپنا پھن اِدھر اُدھر لہرایا۔اس کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی کوندرہی تھیں اور لمبی زبان تیزی سے اندر باہر ہو رہی تھی۔

پھر اس نے ایک تیز پھنکار ماری، فضا میں چنگاریاں سی اُڑی اور سانپ چبوترہ پار کر کے مزار کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔سیڑھیاں اُتر کر وہ ریت پر آیا۔وہ اس قدر طویل تھا کہ اس کا پھن ریت پر تھا تو اس کی دُم چبوترے پر اور اس کا دھڑ سیڑھیوں پر......

اب وہ برق رفتاری سے ریت پر پھسل رہا تھا اور اس کا رخ ٹیلے کی سیڑھیوں کی جانب تھا۔

رامش خیال اپنی ڈیوٹی دے کر سو چکا تھا۔کمال رائے جاگ رہا تھا۔وہ کئی مرتبہ آرزو کے خیمے میں جھانک آیا تھا۔وہاں ایمرجنسی لائٹ روشن تھی اور آرزو پورے اطمینان سے سو رہی تھی۔باقی لوگ بھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔

اس وقت ایک عجیب سی فضا تھی۔پُراسرار اور حسین۔

کمال رائے دھیرے دھیرے ٹہلتا سمندر کے کنارے کی طرف نکل آیا۔پورے چاند کی رات، رُوپہلی لہریں ایک دوسرے کو اپنی گرفت میں لینے کیلئے سرگرداں، ٹھنڈی ہوا...... سمندر کا جوش اور شور ......کمال رائے نے اپنی زندگی میں اس قدر حسین سمندر بھلا کب دیکھا تھا۔وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔

کمال رائے ریت پر بیٹھ گیا۔اس نے پیچھے مڑ کر خیمے کی طرف دیکھا، وہاں کچھ نہ تھا، پھر اس نے اپنا رخ سمندر کی طرف کر لیا اور محویت سے اسے دیکھنے لگا۔

سیّد بابا کا خادم ٹیلے کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا۔حسب معمول اس نے ایک گز اونچا پھن اُٹھا کر چاروں طرف کا جائزہ لیا......اور اس کے بعد وہ تیزی سے پھسلتا ہوا آرزو کے خیمے کی طرف بڑھنے

لگا۔وہ انتہائی برق رفتاری سے ریت پر پھسل رہا تھا۔

خیمے میں داخل ہو کر اس نے خود کو بڑی تیزی سے سمیٹا، کنڈلی مار کر بیٹھا اور اپنا پھن ایک گز اونچا کر لیا۔اب اس کا پھن، آرزو کے چہرے کے مقابل تھا۔

سیّد بابا کے خادم نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔وہ بے خبر سو رہی تھی۔پھر سیّد بابا کے خادم نے اپنا پھن گھمایا، اب اس کی نظر آرزو کے ہاتھ کی طرف تھی۔آرزو کے ہاتھ اس کے پہلو میں تھا اور ذرا سا بیڈ سے لٹکا ہوا تھا۔

سیّد بابا کے خادم نے اپنا پھن اس کے ہاتھ کے قریب کیا اور اپنی لمبی زبان دو تین بار اس کے ہتھیلی پر موجود زخم پر لگائی۔پھر وہ تیزی سے زمین پر گرا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔

اب اس کی نظر کمال رائے پر پڑی جو بڑی محویت سے سمندر کو دیکھ رہا تھا، اور اس کی پیٹھ خیمے کی طرف تھی۔سیّد بابا کے خادم نے اسے اپنا پھن اُٹھا کر بڑے غور سے دیکھا......پھر ایک پھنکار ماری، فضا میں چنگاریاں سی اُڑیں اور وہ تیزی سے ٹیلے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

کمال رائے پر بیٹھے بیٹھے ایک دم نیند کا غلبہ سا ہوا، اس نے ایک زوردار جمائی لی اور سوچنے لگا کہ یہ مجھے نیند کیوں آرہی ہے۔وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خیموں کی طرف واپس آیا، خیموں کا اگرچہ زیادہ فاصلہ نہ تھا لیکن اتنی دیر میں اسے دو تین جمائیاں اور آگئیں۔نیند کا غلبہ مزید بڑھنے لگا۔

اس نے آرزو کے خیمے میں جھانکا۔وہ بخیر تھی اور آرام سے محو استراحت تھی۔اُدھر سے مطمئن ہو کر وہ اپنے شامیانے میں آیا۔قنات کھول کر وہ اندر گیا، پھر اس نے قنات باندھی اور یہ سوچ کر اپنے گدے پر بیٹھ گیا کہ ابھی ماموں رشید کو اُٹھانا ہے......لیکن کمال رائے کو مہلت نہ ملی۔کسی کو اُٹھانے کی بات تو دور کی ہے وہ خود نہ اُٹھ سکا۔اس پر اس قدر تیزی سے نیند غالب آئی کہ وہ بیٹھے بیٹھے گدے پر ڈھیر ہو گیا اور بے خبر سو گیا۔

سیّد بابا کا خادم اوپر پہنچ چکا تھا اور مزار کے دروازوں پر پھن پھیلائے بیٹھا تھا اس کا پھن کسی ریڈار کی طرح اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔وہ کچھ محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سیّد بابا کے خادم کی نظریں اس مخلوق پر ٹھہر گئیں جو اس وقت ریت پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی جا رہی تھیں۔اس مخلوق کا رخ ٹیلے کی سیڑھیوں کی طرف تھا۔سیّد بابا کا خادم اس مخلوق کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔اس نے ایک زوردار پھنکار مار کر فضا میں چنگاریاں اُڑائیں اور زمین پر پھن ڈال کر بیٹھ گیا۔

وہ مخلوق ٹیلے کی سیڑھیاں اُترتی نیچے جا رہی تھی۔وہ نیولے تھے جو چیونٹیوں کی طرح قطار میں ایک

دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ وہ نیولے جو تعداد میں بیس پچیس ہوں گے۔ آرزو کے خیمے کے سامنے جا کر رک گئے۔

اب وہ نیولے آرزو کے خیمے اور کمال کے شامیانے کے سامنے کچھ اس طرح صف آراء ہو گئے جیسے سپاہی دشمن کی گھات میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس صف آراء فوج کی نظریں سامنے سمندر کے کنارے کی طرف مرکوز تھیں۔ انہیں کسی کا انتظار تھا۔

پھر انہیں جس کا انتظار تھا، وہ آ گیا۔

وہ اچانک ہی سمندر کی لہروں سے برآمد ہوا تھا۔ وہ پانی کے ساتھ بہتا ہوا کنارے پر آیا تھا۔ اب وہ لہراتا ہوا خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا سنہرا بدن چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس کے سر پر رکھا پتھر کسی ہیرے کی مانند شعاعیں دے رہا تھا۔ اس پتھر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایک خوشبو سی فضا میں رچ بس گئی تھی۔

وہ بڑے والہانہ انداز میں خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں اس کی برہا محو خواب ہے۔

تب اچانک ہی اسے خطرے کا احساس ہوا، اس نے خیمے کے نزدیک پہنچ کر اپنا پھن اُٹھایا تو اسے اپنے سامنے نیولے نظر آئے۔ اتنے سارے نیولے دیکھ کر اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ وہ جلدی سے سمندر کی طرف پلٹا لیکن اب سمندر کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ وہاں پانچ چھ نیولے گھوم کر پہنچ چکے تھے۔

ان نیولوں نے اسے تین طرف سے گھیر لیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے اس کے گرد دائرہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔

اب ایک راستہ رہ گیا تھا...... اور وہ تھا ٹیلے کی سیڑھیاں۔ رنتارو تیزی سے ان سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ وہ نیولے شاید یہی چاہتے تھے کہ ان کا دشمن کسی طرح سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ جائے۔ وہ اسے گھیرے ہوئے اوپر لے گئے۔

مزار کے دروازے پر سیّد بابا کا خادم موجود تھا، وہ اپنے سپاہیوں کی اس جنگی حکمت عملی کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب رنتارو اس کی حد میں آئے اور وہ اس پر حملہ کرے۔

رنتارو حواس باختہ ہو چکا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ بس ان خونخوار نیولوں سے بچنے کیلئے جدھر راستہ مل رہا تھا، بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ مزار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

جہاں سیّد بابا کا خادم اس کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔

جیسے ہی رنتارو کا پھن آخری سیڑھی سے اُبھرا، سیّد بابا کے خادم نے برق رفتاری سے اپنے جسم کو

یٹ کر زوردار پھنکار ماری، دور تک چنگاریاں سی اُڑیں۔

پھنکار کی آواز سن کر رنتارو نے اپنا سر اوپر اُٹھایا اور پھر وہ سیّد بابا کے خادم کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ گھبرا کر واپس پلٹا لیکن اب واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ نیچے نیولے تھے اور وہ اپنی کارروائی شروع کر چکے تھے۔

اور جو کچھ ہوا، وہ بڑی مستعدی اور پھرتی سے ہوا۔ ان نیولوں نے رنتارو کے جسم کو مختلف جگہوں سے اپنے دانتوں میں دبا لیا۔ کچھ اس طرح کہ وہ اب ہل نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ آزاد ہونے کیلئے زور لگاتا تو اس کا جسم کٹ جاتا، نیولوں کے دانت آری کی طرح تیز تھے۔

سیّد بابا کے خادم کو بس اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ برق رفتاری سے رنتارو کی طرف بڑھا اور اس کے پھن پر اپنا پھن مارا۔ رنتارو کے سر پر چمکتا پتھر اس کے سر سے جھڑ کر سیڑھی پر جا گرا جسے سیّد بابا کے خادم نے فوراً اپنا منہ کھول کر، اپنے پیٹ میں اُتار لیا اور پھر ایک زوردار پھنکار ماری۔ دور تک چنگاریاں سی اُڑیں۔

اور پھر سیّد بابا کا خادم تیزی سے مزار کے دروازے کی طرف بڑھا اور غائب ہو گیا۔

تب نیولوں نے اس کے جسم کو چھوڑ دیا۔ اگر وہ چاہتے تو اس کے ٹکڑے کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا، شاید اس کی ضرورت نہ تھی۔ رنتارو کے جسم کو جہاں سے انہوں نے اپنی گرفت میں لیا تھا، زخم آ گئے تھے۔

رنتارو کے سر پر چمکتا پتھر کیا گرا، گویا اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کے جسم کی جان نکل گئی۔ اس نے خود کو اندھیروں میں پایا۔ وہ حرکت تو کر رہا تھا لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کبھی وہ سیڑھیوں کے اوپر جاتا تو کبھی واپس ریت کی طرف بڑھنے لگتا۔ ایک یہی مصیبت نہ تھی کہ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کی جسمانی طاقت بھی معدوم ہوتی جا رہی تھی، اس کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

نیولے اپنا کام کر کے جا چکے تھے، اب وہاں کوئی نہ تھا۔

چاندنی رات تھی۔ اُٹھتی ہوئی لہریں تھیں، سمندر کا شور تھا اور ٹھنڈی ہوا تھی۔

رنتارو مزار کی سیڑھیوں کے نیچے نیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنا پھن اُٹھاتا اور پھر فوراً ہی زمین پر رکھنے پر مجبور ہو جاتا...... اس میں سکت ہی نہ رہی تھی۔

☆...... ☆...... ☆

وہ ایک چمکیلی صبح تھی۔ روشن اور صاف۔ سمندر کو بھی قرار آ گیا تھا۔ وہ رات بھر جوش میں رہا تھا۔

چاند نے اسے رات بھر پریشان رکھا تھا۔

سورج کی روشنی خیموں پر پڑ رہی تھی۔ ابھی سورج نکلا ہی تھا۔

سب سے پہلے آرزو کی آنکھ کھلی۔ پہلے تو اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے؟ پھر وہ آنکھیں کھولے لیٹی رہی تو دھیرے دھیرے اسے یاد آ گیا کہ وہ کہاں ہے...... اس وقت وہ اپنے جسم میں توانائی محسوس کر رہی تھی۔ سمندر پر آنے سے پہلے اس کی یہ حالت تھی کہ آنکھ کھل جانے کے باوجود وہ اُٹھ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس سے اُٹھا ہی نہ جاتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے جان محسوس ہوتے تھے اور اس کے جسم پر پھیلے ہوئے زخم الگ، تکلیف دیتے تھے...... لیکن اس وقت جب آنکھ کھلی تو اس کی طبیعت میں بشاشت تھی اور زخموں میں تکلیف یا خارش نہ تھی۔

وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت خیمے میں اکیلی تھی۔ ایمرجنسی لائٹ روشن تھی لیکن اس کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی۔ باہر سورج روشن تھا اور اس کی روشنی اندر محسوس ہو رہی تھی۔

آرزو چپل پہن کر باہر نکل آئی۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ بڑے آرام سے چل کر باہر آ گئی تھی اسے کسی قسم کی کوئی نقاہت محسوس نہ ہوئی تھی۔

باہر نور بھرا اُجالا تھا۔ سمندر کی لہریں پُرسکون تھیں جیسے رات بھر سفر کر کے تھک کر سو گئی ہوں۔ سمندر پر پرندے اُڑ رہے تھے۔ مزار پر براہِ راست سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ وہاں پُرسکون سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پھر آرزو کی یکا یک اپنے ہاتھوں پر نظر پڑی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر مسرت سے جھوم اُٹھی۔ رات کو سوئی تھی تو اس کے ہاتھوں پر زخم تھے۔ زخم تو خیر اس کے پورے جسم پر تھے لیکن اب وہ زخم سوکھ چکے تھے۔ اس نے الٹ پلٹ کر ہاتھوں کو دیکھا۔ قمیص کی آستین اُٹھا کر دیکھا۔ پھر وہ جلدی سے خیمے میں آئی۔ اس نے اپنے جسم کے زخموں کو چیک کیا۔ زخم تو تھے لیکن وہ سب کے سب سوکھ چکے تھے۔ اب ان میں درد تھا اور نہ خارش...... اور اس کا جسم بھی چاق و چوبند ہو گیا تھا۔

یہ ایک بڑی خبر تھی۔ خوشخبری تھی۔ وہ خیمے سے نکل کر باہر آئی۔ اسے اپنے بابا کی تلاش تھی۔ سب سے پہلے وہ اس خبر کو اپنے باپ کو ہی سنا سکتی تھی۔ وہ بھاگ کر شامیانے کے نزدیک آئی۔ یہاں دروازہ پر قنات بندھی ہوئی تھی۔

"بابا..... بابا۔" اس نے باہر سے آواز لگائی۔

آرزو کی آواز سن کر کمال رائے کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ اس نے جانا کہ آرزو کسی مصیبت میں ہے۔ وہ بھاگ کر قنات کے پاس آیا۔ اس نے جلدی جلدی بندھی ہوئی قنات کھولی اور اسے ایک طرف گرا کر باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

"ہاں، کیا ہوا؟" کمال رائے نے اسے سامنے کھڑا دیکھ کر خود سے قریب کر لیا۔

"بابا، آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔" آرزو نے اپنے پریشان باپ کو اطمینان دلایا۔

"شکر ہے..... تمہاری آواز سن کر میرے تو ہوش اُڑ گئے تھے۔"

"بابا، آپ کو ایک خوشخبری سناؤں۔"

"ہاں، بیٹا..... جلدی کرو۔" کمال رائے بے چین ہو کر بولا۔

"میرے ہاتھ دیکھیں۔" آرزو نے پیچھے ہٹ کر اپنے دونوں ہاتھ کمال رائے کے سامنے کر دیئے۔

کمال رائے نے جب اس کے دونوں ہاتھوں پر نظر کی تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھا۔ "ارے واہ...... تمہارے زخم تو بالکل سوکھ گئے۔"

"دیکھ لیں بابا...... نہ صرف پورے جسم کے زخم اچھے ہو گئے بلکہ ان میں اب نہ درد ہے اور نہ ہی خارش۔" آرزو نے خوش ہو کر بتایا۔

پھر ایک ایک کر کے سب اُٹھ گئے۔ سب کو یہ خوشخبری سنائی گئی۔ سب خوش تھے لیکن رامش خیال کی خوشی قابل دید تھی۔

"آؤ، بیٹا...... اوپر چلیں۔" کمال رائے، آرزو کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

وہ سب لوگ ٹیلے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"صاحب جی۔"

کمال رائے نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے اللہ بخش نظر آیا۔

"آ جاؤ، اللہ بخش..... آ جاؤ۔" وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اللہ بخش جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر ان کے نزدیک پہنچ گیا۔

"صاحب..... سب خیر ہے۔" اللہ بخش نے پوچھا۔

"ہاں، اللہ بخش سب خیر ہے۔" پھر اس نے اللہ بخش کو آرزو کے زخموں کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ جان کر کہ ایک رات میں ہی آرزو کے جسم کے زخم اچھے ہو گئے ہیں، بہت خوش ہوا۔

"اللہ سائیں، بڑا بادشاہ ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں، اس میں کیا شک ہے۔"

سیڑھیاں چڑھ کر اب وہ ریت پر چل رہے تھے۔ ماموں رشید اور رامش خیال آ گئے تھے۔ وہ مزار کی سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

اچانک ''سانپ، سانپ'' کی آواز گونجی اور رامش خیال پلٹ کر پیچھے آیا۔

اللہ بخش فوراً آگے بڑھا۔'' کہاں ہے سانپ؟''

''یہ رہا۔'' رامش خیال نے مزار کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ایک سانپ مزار کی سیڑھی پر کسی رسی کی طرح پڑا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ تھی۔ وہ ایک سنہری سانپ تھا۔ اس کا بدن چمکدار تھا۔ اس کے جسم پر زخموں کے نشان تھے۔ سب سے بڑا زخم اس کے سر پر تھا۔

اللہ بخش کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، اس نے اپنی لاٹھی آگے بڑھا کر اس کے جسم کو چھیڑا، اللہ بخش کا خیال تھا کہ شاید یہ سانپ مر چکا ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ اس کے لاٹھی لگاتے ہی سانپ کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی، اس نے اپنا پھن اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اُٹھا نہ سکا۔

''ابھی زندہ ہے۔'' اللہ بخش نے اپنی لاٹھی پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''بابا، یہ تو وہی ہے۔'' آرزو نے اس سانپ کو ایک نظر دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا۔

''کون ہے؟'' کمال رائے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہی میری جان کا دشمن ...... رنتارو۔'' آرزو اس رسی کی طرح پڑے سانپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پر اس کے سر پر ایک چمکدار پتھر ہوتا تھا، وہ کہاں گیا؟''

''اس کے سر پر زخم نظر آ رہا ہے ...... ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے اس کے سر سے پتھر اُکھاڑ لیا ہو۔'' کمال رائے نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب اس سانپ کا کیا کریں؟'' ماموں رشید نے ڈاکٹر عرفان کی طرف دیکھا۔

''یہ تو پہلے ہی مرا ہوا ہے۔ ایسا عجوبہ روزگار سانپ کو تو محفوظ کر لینا چاہئے۔'' ڈاکٹر عرفان نے مشورہ دیا۔

''اس وقت شبورا ہوتی تو کس قدر خوش ہوتی، اس سانپ کو پکڑنے کیلئے ہی تو وہ عمل کر رہی تھی اس سانپ نے اسے بہت نقصان پہنچایا، اس کے باپ بھائی کی جان لے لی۔'' کمال رائے نے کہا۔

''بابا ...... یہ پھر کسی کو نقصان نہ پہنچائے اسے مار دینا چاہئے۔'' آرزو نے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

اور ابھی کمال رائے کوئی جواب دینے والا تھا کہ پیچھے سے ایک بچے کی آواز آئی۔ ''ابا...... ابا۔''

کمال رائے نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ کوئی دس بارہ سال کا بچہ تھا، ریت پر دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس نے اللہ بخش کے پاس پہنچ کر دم لیا۔

''کیا ہوا؟''

''ابا ...... بڑے پتھر کے پاس کوئی پڑا ہوا ہے۔''

''ہیں ...... آ چل میرے ساتھ۔'' اللہ بخش اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

پھر وہ دونوں تیزی سے نیچے اُترنے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی چلے۔

اللہ بخش دوڑتا ہوا، اپنے بیٹے کے ساتھ سمندر کے کنارے پہنچا۔ اس نے بڑے پتھر کے پیچھے کسی کو کالے کپڑوں میں پڑا پایا۔ سمندر کا پانی اس کے جسم کو چھو کر واپس جا رہا تھا۔ اس کے سر کے لمبے بال دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے، وہ کوئی عورت تھی۔

اللہ بخش نے اسے پلٹ کر سیدھا کیا، اس کا چہرہ سامنے آیا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ ایک سانولے رنگ کی بے حد پرکشش عورت تھی۔ سینے کے اتار چڑھاؤ سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

اللہ بخش اپنے بیٹے کی مدد سے اسے کھینچ کر خشکی پر لے آیا۔

اتنے میں یہ لوگ بھی سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ اللہ بخش اسے ہوش میں لانے کی تدبیروں میں لگا ہوا تھا۔

سب سے پہلے کمال رائے کی اس پر نظر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔

''ارے، یہ تو شبورا ہے۔'' اس کے لہجے میں مسرت تھی۔

''ہاں، بابا ...... واقعی۔'' آرزو فوراً اس پر جھک گئی اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''شبورا، شبورا ...... آنکھیں کھولو۔''

یہ آرزو کی آواز کا اعجاز تھا یا پھر وہ ہوش میں آنے ہی والی تھی کہ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں، چند لمحے وہ آسمان کی طرف دیکھتی رہی، بالکل خالی الذہن ہو کر ...... پھر اس نے اپنے گرد کھڑے لوگوں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔

اور جب اس کی نظریں کمال رائے کے چہرے پر پہنچیں تو اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''صاحب جی آپ۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

پھر اس نے فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگی ...... کہیں یہ فریب نظر تو نہیں۔ یہ کمال رائے آخر اس کی زندگی پر اس قدر کیوں چھا گیا ہے، جب بھی آنکھ کھلتی ہے، وہ اس کے سامنے آ جاتا ہے، ایک مرتبہ وہ اس کے نام پر دھوکا کھا چکی ہے، کیا اس مرتبہ پھر اس کیلئے کوئی جال تیار کیا گیا ہے ...... اور وہ اس وقت ہے کہاں؟ یہ اتنے سارے لوگ کون ہیں؟

اسے یاد آیا کہ وہ تو راجہ پرمان کی بستی میں تھی۔ اسے گرفتار کر کے وہاں لے جایا گیا تھا۔ رنتارو نے اس کا شوم کا عمل بھنگ کر دیا تھا۔ اسے کمال رائے کا چہرہ دکھا کر فریب میں مبتلا کر دیا تھا اور اسے پکڑ کر پرمان کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ تیوح کی ہم شکل تھی اور تیوح راجہ پرمان کی منظورِ نظر تھی جسے کمال رائے نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر پرمان کو تیوح یاد آ گئی تھی۔ وہ اسے تیوح کے روپ میں دیکھ کر مچل اُٹھا تھا۔ وہ اسے تیوح بنا دینا چاہتا تھا تب رانی ملائے کا درمیان میں آئی، وہ تیوح سے نجات مل جانے پر خوش تھی لیکن جب ایک بار پھر تیوح اس کی شکل میں ظاہر ہوئی تو رانی ملائے کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

رانی ملائے کا جلاپے میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے طے کر لیا کہ ہر قیمت پر شبورا سے نجات حاصل کر کے رہے گی۔ اُدھر شبورا کون سا اس بستی میں رہنا چاہتی تھی، اسے منحوس صورت پرمان سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ہر قیمت پر اس بستی سے، پرمان کی گرفت سے آزاد ہو جانا چاہتی تھی۔

دونوں کا مفاد ایک تھا۔ شبورا اس بستی سے آزادی چاہتی تھی تو رانی ملائے کا شبورا سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ اگر چہ پرمان کی بستی سے کسی بندے کا آزاد ہو جانا آسان نہ تھا لیکن جب کوئی عورت کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کا کوئی راستہ نہیں روک سکتا، وہ ہزار راستے نکال لیتی ہے۔

موقع دیکھ کر اس نے شبورا کو بستی سے فرار کرا دیا۔ جس طرح ابرش اسے گرفتار کر کے پرمان کی بستی میں لے گیا تھا ویسے ہی پکڑ کر وہ شبورا کو اس کی دنیا میں چھوڑ گیا۔ جب وہ گرفتار ہوئی تو اس کی آنکھ پرمان کے سامنے کھلی تھی اور اس وقت جب وہ ہوش وحواس میں آئی تو سامنے کمال رائے تھا۔

''شبورا۔'' کسی نے اتنے میٹھے لہجے میں پکارا کہ وہ جھوم اُٹھی۔

وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''جی، صاحب جی۔''

''تم خیریت سے ہو۔'' کمال رائے نے پوچھا۔

''ہاں جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شبورا نے کمال رائے کی آنکھوں میں دیکھا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں تمہارے گھر گیا تھا۔'' کمال رائے نے بتایا۔

''میں بتاؤں گی آپ کو...... سب بتاؤں گی۔'' پھر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ایک طرف سمندر کا کنارہ دوسری طرف اونچے سے ٹیلے پر کسی مزار کی عمارت، تیسرا طرف ریتلا میدان ...... اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ بالآخر اس نے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں، صاحب جی؟''

کمال رائے نے فوراً کہنا چاہا۔ ''میرے پاس......'' لیکن وہ یہ بات کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ہمارے پاس۔''

شبورا کے دل میں سینکڑوں چراغ جھلملا اُٹھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمال رائے نے کہا ہو۔ ''میرے پاس۔''

پھر اس کی نظر آرزو پر پڑی، وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی، ابھی وہاں پہنچی تھی۔

''ارے، بی بی آپ!'' شبورا فوراً اُٹھ کر اس کے نزدیک چلی گئی۔ اسے آرزو کا چہرہ زرد لگا اور ہاتھوں پر سیاہ دھبے دکھائی دیئے۔ یہ زخم تھے جو کل رات تک بڑی خطرناک صورت اختیار کئے ہوئے تھے اور ان زخموں کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی تھی...... اور صبح ہوتے ہی یہ زخم ایک دم سوکھ گئے تھے، وہاں سیاہ نشان سے رہ گئے تھے اور یہ کوئی جانتا تھا کہ یہ زخم کس طرح ٹھیک ہوئے، یہ سیّد بابا کے خادم کا کارنامہ تھا۔

''یہ آپ کے ہاتھوں پر کیا ہوا؟'' شبورا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تو یہ بہت اچھی ہے...... کل اگر تم اسے دیکھتیں تو شاید پریشان ہو جاتیں ...... ہم آرزو کی وجہ سے ہی یہاں اس جزیرے پر آئے ہیں اور یہاں آنا ہمارے لئے بڑا سود مند ثابت ہوا...... نہ صرف آرزو اچھی ہو گئی بلکہ جو آرزو کیلئے مصیبت کا باعث تھا، وہ بھی ٹھکانے لگ گیا۔'' کمال رائے نے بتایا۔

''کون؟'' شبورا نے بے قراری سے پوچھا۔

''رنتارو۔'' آرزو نے دھیرے سے کہا۔

''ہیں، وہ یہاں ہے۔'' شبورا حیران رہ گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ اس کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے اس کے باپ بھائی کو ٹھکانے لگایا۔ وہ غصے سے بولی۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''آؤ، میرے ساتھ۔'' کمال رائے نے کہا۔

پھر یہ چھوٹا سا قافلہ مزار کی طرف چل دیا۔ راستے میں کمال رائے نے سب سے شبورا کا تعارف کرایا۔ رامش خیال کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ وہ آرزو کا شوہر ہے، بہت خوشی ہوئی۔

ٹیلا چڑھتے ہی، شبورا کو مزار کی سیڑھی پر پڑا ہوا، رنتارو نظر آ گیا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بھاگی۔ وہ سیڑھی پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے جسم پر زخموں کے نشان تھے اور سب سے بڑا زخم اس کے سر پر تھا۔ اس میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ اس کی زبان بھی باہر نہیں نکل رہی تھی۔

''رنتارو۔'' وہ اس پر جھکتی ہوئی بولی۔ ''او خبیث، اب بتا تو کیسا ہے؟''

رنتارو نے اپنا پھن اُٹھانے کی کوشش کی لیکن کسی مفلوج انسان کی طرح صرف کوشش کر کے

رہ گیا۔

"یہ خوش قسمتی ہے میری کہ تُو ابھی زندہ ہے اور یاد رکھ کہ میں تجھے ماروں گی بھی نہیں تجھے مارنا کوئی مسئلہ نہیں۔ تیری دُم پکڑ کر ایک چٹکی لگاؤں گی تو تیری جان نکل جائے گی لیکن میں تجھے ماروں گی نہیں، تجھے زندہ رکھوں گی۔" یہ کہہ کر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی۔

اتنے میں کمال رائے اس کے قریب آ گیا۔

"ہم اسے ختم کرنے والے تھے کہ اللہ بخش کا بیٹا آ گیا، اس نے بتایا کہ وہاں سمندر کے کنارے کوئی پڑا ہے تو ہم سب اسے چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔ تم نے اسے دیکھ لیا۔ اب بتاؤ، اس کا کیا کرنا ہے؟"

"صاحب جی...... بہت اچھا ہوا جو آپ نے اسے نہیں مارا۔ اسے میں اب زندہ رکھوں گی۔ اسے اپنے پاس رکھوں گی۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔ بہت اچھا ہوا کہ یہ ابھی زندہ ہے۔" وہ پُر جوش لہجے میں بولی۔

"شبورا، یہ سانپ ہے اور جس طرح کا سانپ ہے، تمہیں اچھی طرح اندازہ ہے، کہیں یہ پھر نہ تمہیں یا آرزو کو نقصان پہنچائے۔" کمال رائے نے خدشہ ظاہر کیا۔

"نہیں، صاحب جی...... آپ بے فکر ہو جائیں۔ یہ اب کسی چوزے کی طرح ہے، اس کی پُراسرار قوتیں اس سے چھینی جا چکی ہیں۔ اب یہ اندھا اور معذور ہو چکا ہے۔ اسے اب میں روز ماروں گی اور روز زندہ کروں گی۔ یہ اب کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" شبورا نے بڑے یقین سے کہا۔

آرزو نے پہلی مرتبہ رنتارو کو بڑے غور سے دیکھا۔ یہ وہ سانپ تھا جس نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ جب وہ اس کے بیڈروم میں آتا تھا تو وہ بے بس ہو جاتی تھی۔ اب وہ اس کے سامنے بے بس پڑا تھا۔ وقت وقت کی بات ہے۔

اللہ بخش نے اسے ایک ٹوکری لا کر دی۔ شبورا نے بڑے اطمینان سے رنتارو کو پکڑ کر اس میں ڈال لیا اور پھر ایک ڈوری سے ٹوکری کا منہ بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد اکو موٹر بوٹ لے کر آ پہنچا۔ اب یہاں رکنا فضول تھا، ان لوگوں نے ناشتہ کیا اور اپنے خیمے سمیٹ کر کراچی کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆......☆......☆

شبورا جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو اس نے اندر سے دروازہ بند پایا۔ گلی کے ایک لڑکے کو گھر میں کدوا کر دروازہ کھلوایا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو سب کچھ ویسا کا ویسا ہی تھا۔

شبورا نے سب سے پہلے رنتارو کو ایک بڑی پٹاری میں منتقل کیا۔ پھر اس نے صحن میں بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹا۔ اپنے گھر کی صفائی کی، خود نہائی دھوئی اور ابھی وہ اپنے بالوں کو خشک کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" شبورا نے دور سے ہی آواز لگائی۔

"ہم ہے ری شبورا، دروازہ کھول۔" باہر سے کسی مرد کی آواز آئی۔

یہ آواز بستی کے کسی بزرگ کی تھی۔ وہ اپنے بال جھٹکتی ہوئی دروازے کے نزدیک آئی۔ کواڑ کی جھری میں جھانک کر باہر دیکھا، اسے اپنے دروازے پر کئی لوگ کھڑے نظر آئے۔

شبورا نے جلدی جلدی اپنے گیلے بال تولیہ سے لپیٹ کر دروازہ کھول دیا اور پھر دروازے سے پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔ "آؤ، چاچا۔"

دروازے پر اس وقت بستی کے کئی بزرگ موجود تھے، سب سے آگے شرفو تھا۔

شام کا وقت تھا، صحن سے دھوپ جا چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شبورا نے صحن میں کھڑی دو چارپائیاں ان لوگوں کیلئے بچھا دیں اور ان لوگوں کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پانچ تھے۔ چار ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور شرفو اکیلا ایک چارپائی پر بیٹھا جبکہ اس چارپائی پر شبورا کے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ دی گئی۔ شبورا نے ان پانچوں کیلئے شربت بنایا۔ اسٹیل کے گلاس میں پانچوں کو پیش کیا۔ جب ان لوگوں نے شربت پی لیا تو پھر شبورا فرش پر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"ہاں ری شبورا، شوم کا کیا بنا؟" شرفو نے اپنی سفید مونچھوں کو موڑتے ہوئے کہا۔

شبورا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی، اندر کمرے میں گئی اور میز پر رکھی سب سے بڑی پٹاری اٹھا لائی۔ یہ پٹاری اس نے شرفو کے سامنے رکھ دی اور بولی۔ "دیکھ لے چاچا۔"

"اچھا...... پکڑ لیا۔" شرفو نے تھوڑی سی پٹاری کھول کر اس میں جھانکا۔

"چاچا...... پوری پٹاری کھول لے...... ڈر مت۔" شبورا نے کہا۔

تب شرفو نے ڈرتے ڈرتے پٹاری کا پورا ڈھکن کھول دیا۔ پٹاری کا ڈھکن کھلنے کے بعد شرفو کو جو کچھ نظر آیا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ ایسا سانپ اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا، باری باری ان پانچوں نے اس سانپ کا قریب سے نظارہ کیا۔

"شبورا...... تجھے مبارک ہو...... ہم سب کو مبارک ہو۔ تو نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا۔ آج تیرا باپ جیتا ہوتا تو کس قدر خوش ہوتا۔" شرفو نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔ "شوم کا عمل تو اچھے اچھے سپیرے نہیں کر پاتے تو نے ایک عورت ہو کر اس عمل کو مکمل کر لیا...... شبورا تجھے مبارک ہو، ہم سب کو

مبارک ہو۔''

شبورا نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے کسی نے کچھ کہنے نہ دیا۔ وہ ایک ایک کر کے کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ تب شبورا نے چپ سادھ لی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ اس نے شوم کا عمل مکمل کرلیا ہے تو سمجھنے دو۔ اس سے اس کی ذات پر کیا اثر پڑے گا۔

پھر جب مبارک باد دینے کے بعد سب خاموش ہو گئے تو شرفو بولا۔ ''اب تو اس بستی کی سردارنی بننے کی تیاری کر لے۔ ہم کل شام کو تیرے سر پر پگڑی باندھنے آئیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ لوگ اُٹھنے لگے تو شبورا نے ہاتھ کے اشارے سے شرفو کو روک لیا۔ ''چاچا، میری بات سنو۔''

''ہاں، کیا ہوا؟''

''چاچا، میں اس بستی کی سردار نہیں بننا چاہتی۔'' شبورا نے بڑی انوکھی بات کہی۔

''کیوں آخر؟'' وہ پانچوں حیران رہ گئے۔

''میں یہ بستی چھوڑنا چاہتی ہوں۔'' شبورا دوٹوک لہجے میں بولی۔

''کہاں جائے گی......؟ کہاں رہے گی......؟ سب پریشان ہو گئے۔

''شہر جاؤں گی......شہر میں رہوں گی۔'' اس نے سب پر واضح کیا۔

''وہاں کون ہے تیرا......'' شرفو نے پوچھا۔

''چاچا...... مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔'' اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

☆......☆......☆

کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ یہ ایک غیر مانوس سی دستک تھی۔ شبورا یہ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی کہ کون آ گیا؟

''کون ہے؟'' شبورا نے دروازے کے پیچھے سے پوچھا۔

''میں ہوں جی لعل محمد۔''

لعل محمد کا نام سن کر شبورا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

''تم لعل محمد......خیر تو ہے؟''

''ہاں سب خیر ہے......میرے ساتھ صاحب آئے ہیں، گاڑی میں بیٹھے ہیں......وہ تم سے ملنے آئے ہیں۔'' لعل محمد نے جلدی جلدی بتایا۔

لعل محمد الٹے قدموں لوٹ گیا۔ شبورا دروازہ کھلا چھوڑ کر جلدی سے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس

نے جلدی جلدی ادھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹا، چارپائی ڈال کر اس پر صاف ستھرا بستر بچھایا اور اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اسے اندازہ تھا کہ کمال رائے کو گھر تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی۔ اس کے باوجود اس نے ابھی تک کئی چکر صحن کے لگا لئے تھے اور کئی مرتبہ دروازے سے جھانک کر گلی میں دیکھ لیا تھا۔

کمال رائے کے ساتھ لعل محمد شبورا کے گھر تک آیا، دروازے کے نزدیک پہنچ کر کمال رائے نے لعل محمد سے کہا۔ ''لعل محمد تم گاڑی میں چلو، میں آتا ہوں۔''

لعل محمد اس کا حکم سن کر واپس گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کمال رائے نے دروازے کی کنڈی پر ہاتھ ہی رکھا تھا کہ ایک دم دروازہ کھل گیا۔ شبورا دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں چراغ جگمگا رہے تھے۔ کمال رائے نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یوں لگا جیسے چند لمحوں کیلئے دنیا رہی ہو اور نہ دنیا والے......بس وہ رہ گئے ہوں۔

''کیسی ہو شبورا؟'' تب اچانک کمال رائے نے اپنے لب کھولے۔

''میں بہت اچھی ہوں......صاحب جی اندر آجائیں۔'' وہ دروازہ چھوڑ کر بولی۔

کمال رائے نے اندر قدم رکھا۔ شبورا نے اسے چارپائی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھ جاؤ......شبورا۔'' وہ بولا۔

''جی......صاحب جی۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے چارپائی پر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

دونوں کی نظریں ملیں اور وہ دونوں ایک ساتھ مسکرا دیئے۔ جانے کیوں، جانے کیا سوچ کر۔

''شبورا، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' کمال رائے نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

یہ بات سن کر وہ اندر ہی اندر جھوم اُٹھی۔ ابھی کل ہی تو اس نے یہاں سے جانے کا قصد کیا تھا۔ اس نے بستی والوں کو بتا دیا تھا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گی، شہر چلی جائے گی۔ اب وہ اسے لینے آ گیا تھا۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے......شاید اسی لئے کہتے ہیں......اور سچ کہتے ہیں۔

''کیوں صاحب جی؟'' شبورا کا عورت پن جاگ اُٹھا۔

''میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم یہاں رہ کر کیا کرو گی۔'' اس کے اندر کا مرد بولا۔

''اور وہاں کون ہوگا؟'' شبورا نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھا، وہ جانے کیا سننا چاہتی تھی۔

''وہاں آرزو ہے...... وہ تمہاری منتظر ہے۔'' کمال رائے نے بتایا۔

''بس؟'' وہ ہنسی، جو سننا چاہتی تھی، وہ سنائی نہ دیا۔

''اور میں ہوں گا۔'' کمال رائے نے بالآخر کہہ دیا جو وہ سننا چاہتی تھی۔

''چلو صاحب جی...... پھر چلو...... یہاں اب میرے لئے کچھ نہیں۔'' وہ ایک دَم کھڑی ہوگئی۔

پھر اس نے اپنے چند جوڑے کپڑے سمیٹے، انہیں ایک کپڑے میں باندھا، گھر میں جو نقدی اور چاندی کا زیور موجود تھا، اسے ایک رومال میں باندھا۔ کمال رائے بڑی دلچسپی سے اسے چلنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

شبورا نے کپڑے اور نقدی کا رومال، رنتارو کی پٹاری پر رکھا اور باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ''آئیں صاحب جی۔''

''بس اور کچھ تو نہیں لینا۔'' وہ بولا۔

''نہیں صاحب جی...... ویسے اس گھر میں لے جانے کو رکھا ہی کیا ہے۔'' شبورا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اپنے آپ کو کیوں بھول جاتی ہو۔'' وہ ہنسا۔

''صاحب جی...... میں اپنے آپ کو کہاں بھولی...... میں اپنے آپ کو تو لے جارہی ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''تم نے اپنی بین تو اُٹھائی نہیں۔'' کمال رائے نے اسے یاد دلایا۔

''نہیں صاحب جی...... میں بین نہیں اُٹھاؤں گی، وہ اس بستی کی میراث ہے، اسے ورثہ سمجھ کر چھوڑے جاتی ہوں۔'' شبورا نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

''آؤ چلو۔'' کمال رائے نے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اور وہ دن بستی والوں پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ شبورا گاڑی میں کسی کے ساتھ بیٹھی ہے۔ وہ ایک خوبصورت آدمی ہے اور اس کی گاڑی، اسی کی طرح شاندار ہے۔ گاڑی بیک ہوتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بستی والوں کی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

شبورا کو کوئی نہ روک پایا۔ اس شبورا کو کون روک سکتا تھا جو تخت و تاج ٹھکرا کر چلی گئی تھی۔ بستی کا سردار بننے میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

☆......☆......☆

شبورا کی آمد سے آرزو کو بہت خوشی ہوئی۔ جانے وہ اس عورت میں کیوں کشش محسوس کرتی تھی

شاید اس جیسی عورت کے ہاتھوں میں اس کا بچپن گزرا تھا اور وہ عورت اس پر بہت مہربان تھی۔ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ آرزو نے اپنے برابر والا بیڈروم، شبورا کو دلوا دیا...... اور اس بیڈروم میں موجود کمال رائے کا ضروری سامان اوپر والے بیڈروم میں شفٹ کروا دیا۔

شبورا بھی یہاں آکر بہت خوش تھی۔ اسے آرزو بہت اچھی لگتی تھی۔ معصوم سی، پیاری سی، دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتی تھیں۔

شبورا نے کچھ جڑی بوٹیوں کا محلول بنا کر رنتارو کے زخموں پر لگایا۔ چند دنوں میں ہی رنتارو کے زخم ٹھیک ہوگئے۔ وہ روزانہ اسے دودھ پلاتی اور رنتارو کو دودھ پیتے دیکھ کر اس کی عجیب سی کیفیت ہو جاتی۔

شبورا نے کمال رائے سے کہہ کر رنتارو کے لئے ایک شیشے کا شوکیس بنوالیا تھا اور اسے اس شوکیس میں ڈال دیا تھا اور یہ شوکیس اس نے کارنر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب رنتارو ہر وقت اس کی نظروں میں رہتا تھا۔

آرزو رنتارو کو دیکھ کر اب بھی خوفزدہ ہو جاتی...... لیکن اب یہ ڈر آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا۔ وہ شبورا کو اسے دودھ پلاتا دیکھتی تو اس کے پاس ہی آکر کھڑی ہو جاتی۔

''اپنے دشمن کو دودھ پلاتے ہوئے میں نے آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔'' آرزو ہنس کر کہتی۔

''اسے دودھ نہیں پلاؤں گی تو یہ مر جائے گا اور میں نہیں چاہتی کہ ہمارا دشمن اس قدر جلد مر جائے۔'' شبورا کی آنکھوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہوتی۔

''ہاں، یہ ہے تو اسی قابل کے اسے زندہ رکھ رکھ کر مارا جائے۔'' آرزو کو بھی اس کی دی ہوئی اذیتیں یاد آجاتیں۔

اور جب شبورا دیکھتی کہ اس کے زخم اچھے ہوگئے ہیں، اس کے جسم میں حرکت ہونے لگی ہے اور وہ اپنا پھن اُٹھانے لگا ہے تو وہ اسی وقت چاقو کی نوک سے اس کے جسم پر نئے زخم ڈال دیتی اور پھر اس کا علاج کرنا شروع کر دیتی۔

☆......☆......☆

روشن گوٹھ کی حویلی جگمگا رہی تھی۔ حویلی ہی کیا، اس وقت تو پورے روشن گوٹھ میں جشن کا سا سماں تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس حویلی میں کوئی شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔ روشن رائے کو بڑا ارمان تھا کمال رائے کی شادی کا...... لیکن کمال رائے نے ماروی سے خفیہ شادی کر کے روشن رائے کے سارے ارمانوں پر اوس ڈال دی تھی۔ پھر ماروی چل بسی، ماروی کو مارنے والا بھی اپنے کیفر کردار

کو پہنچا۔ نفیسہ بیگم نے لاکھ چاہا کہ کمال رائے دوسری شادی کر لے، اس نے مائرہ کو منتخب بھی کر لیا تھا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر حویلی میں کس کی شادی ہوتی، حویلی کو کس کے لئے سجایا جاتا۔

اللہ اللہ کر کے آج ایک موقع آیا تھا۔ آرزو کی شادی ہو رہی تھی اور بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ اس شادی پر ہر شخص خوش تھا۔ نفیسہ بیگم کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا، وہ جیسے جوان ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی، ہر چیز پر اس کی نظر تھی۔

کمال رائے بھی بہت خوش تھا۔ اس کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کی شادی تھی اور یہ دن دیکھنا بڑی مشکل سے نصیب ہوا تھا۔ اِدھر کمال رائے کے ننھیال والے خوشی میں اُڑتے پھر رہے تھے، سب نے اپنی اپنی حویلیاں سجائی ہوئی تھیں جیسے شادی روشن گوٹھ میں نہ ہو رہی ہو، ان کے اپنے گھر میں ہو رہی ہو۔

کمال رائے نے روشن گوٹھ کی ہر گلی، ہر سڑک کو جھنڈیوں سے سجایا تھا۔ بارات کا شاندار استقبال کیا گیا۔ بارات کو تین دن تک حویلی میں روکا گیا، باراتیوں کی خوب خاطر مدارت کی گئی، بہترین کھانے کھلائے گئے، رات کو رنگ برنگی محفلیں سجائی گئیں اور رخصتی کے وقت ہر باراتی کو ایک چاندی کی طشتری پیش کی گئی جس پر آرزو کا نام اور شادی کی تاریخ درج تھی۔

اس طرح آرزو کی شادی کو یادگار بنایا گیا۔ لوگوں نے اس شادی کو برسوں یاد رکھا۔ ایک طویل عرصے تک اس کے تذکرے رہے۔

آرزو کی رخصتی سے پہلے یہ سوچا گیا کہ رسم کے مطابق اس کے ساتھ کون جائے گا۔ نفیسہ بیگم نے اپنے طور پر مائرہ کو اس کام کیلئے منتخب کر لیا تھا، مائرہ سے آرزو مانوس تھی۔ نفیسہ بیگم نے مائرہ سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ خوشی خوشی آرزو کے ساتھ جانے کے لئے راضی ہو گئی۔

شبورا جب سے گھر میں آئی تھی تو آرزو فطری طور پر اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ جانے کیوں آرزو کو وہ اپنی اپنی سی لگتی تھی۔ شبورا اگرچہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی اس کے باوجود اس میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ اس گھر میں آ کر اس رکھ رکھاؤ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ آرزو نے اسے ڈھیروں ملبوسات دلوا دیئے تھے، لباس کی تبدیلی نے اس میں ایک وقار پیدا کر دیا تھا۔ اب وہ سپیرن تو لگتی ہی نہ تھی کوئی غیر آدمی اسے دیکھتا تو متاثر ہوئے بنا نہ رہتا۔

جب نفیسہ بیگم نے کمال رائے سے مائرہ کے ساتھ جانے کا ذکر کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا ذہن فوراً شبورا کی طرف گیا۔ مائرہ کے مقابلے میں شبورا ذہنی طور پر اس کے زیادہ قریب تھی۔ اس نے سوچا کہ خود فیصلہ کرنے سے بہتر ہے کہ وہ جانے والی سے پوچھ لے کہ وہ کسے ساتھ لے جانا پسند کرے گی۔

مائرہ یا شبورا......؟

اور جب کمال رائے نے آرزو سے سوال کیا۔ ”ہاں، بیٹا، تمہارے ساتھ کس کو بھیجو...... مائرہ کو شبورا کو۔“

تو آرزو نے ایک لمحہ بھی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی، وہ فوراً بولی۔ ”آنٹی شبورا۔“

”ٹھیک ہے۔“ کمال رائے نے کہا۔ اس کے اس فیصلے پر کمال رائے کو جانے کیوں خوشی ہوئی۔

لیکن جب نفیسہ بیگم کو معلوم ہوا کہ مائرہ کی جگہ شبورا جائے گی تو اس کے دماغ میں گھنٹی سی بجی۔ وہ ایک دم چونکی۔ یہ عورت کون ہے؟ اس کی شخصیت نے نفیسہ بیگم کو متاثر تو کیا تھا لیکن اسے شبورا کے بارے میں اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ آرزو کو سانپ سے نجات دلانے میں اپنے بھائی اور باپ کو گنوا بیٹھی۔ نیز یہ کہ کمال رائے اس کے تنہا رہ جانے پر، اس پر ترس کھا کر اپنے گھر لے آیا۔ بس وہ اس بارے میں اتنا ہی جانتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس عورت کے اثرات اتنی دور تک ہیں۔ نفیسہ بیگم خاموش رہی، یہ لڑائی جھگڑے کا وقت نہ تھا، ویسے بھی جب لے جانے والی نے خود اپنے ساتھ جانے والی کا انتخاب کر لیا تو لڑائی جھگڑے کا کیا جواز تھا۔ بہر حال نفیسہ بیگم کو اس بات کا افسوس ہوا۔

اور اس سے زیادہ افسوس مائرہ کو ہوا۔

☆......☆......☆

آرزو، رامش خیال کی ہو کر ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ رامش خیال آرزو کو پا کر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ان دنوں ہنی مون پر تھے۔

کمال رائے نے ڈیفنس کی رہائش چھوڑ دی تھی۔ اس نے روشن گوٹھ کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ شبورا اس کے ساتھ حویلی میں تھی۔ رنتارو اس کے پاس موجود تھا۔ وہ اسے زندہ رکھے ہوئے تھی۔ نفیسہ بیگم کو اس سانپ سے بہت ڈر لگتا تھا، اگرچہ وہ شیشے کے شوکیس میں بند تھا، پھر بھی نفیسہ بیگم، شبورا کے کمرے میں جانے سے گریز کرتی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ شبورا سے ہی گریز کرتی تھی جتنا وہ گریز کرتی تھی اتنا ہی کمال رائے شبورا کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

نفیسہ بیگم، کمال رائے کی ماں تھی، وہ کمال رائے کی آنکھیں دیکھ رہی تھی جو ہر وقت شبورا کا احاطہ کئے رہتی تھیں۔ اس کا رویہ بھی اَن کہی کہانیاں سنا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو، وہ مائرہ کو اس حویلی میں دیکھنا چاہتی تھی لیکن تقدیر کچھ اور ہی گل کھلانے پر تلی ہوئی تھی۔

بالآخر وہ قیامت کی گھڑی آ پہنچی۔

ایک دن صبح ہی صبح کمال رائے نفیسہ بیگم کے کمرے میں آ گیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر بولا۔

''ماں، میں شبورا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بیٹا خوشی سے کرو۔'' نفیسہ بیگم نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر کہا۔ وہ اس کے اس فیصلے پر خوش نہ تھی۔ پر وہ ماں تھی، اپنی ناراضی کا اظہار کر کے اپنے اس بیٹے کو دُکھ پہنچانا نہیں چاہتی تھی جس نے زندگی میں کبھی سکھ دیکھے ہی نہ تھے۔

ماں کی رضامندی پا کر کمال رائے نے انتہائی سادگی سے شبورا سے نکاح کر لیا۔ اسے اپنا بنا لیا اور آرزو، شبورا کو اپنی ماں کے روپ میں دیکھ کر پھول کی طرح کھل اُٹھی تھی۔

مائرہ نے جب کمال رائے کی شادی کا سنا تو اس کے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ مائرہ جو ایک عرصے سے اس کی آس میں جیتی آئی تھی، ایک دَم مایوس ہوگئی۔ وہ خود کو نہ سنبھال سکی۔ اس نے کیڑے مار دوا کی پوری شیشی اپنے حلق میں اُلٹ لی...... اور سب کو روتا چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر نکل گئی۔

☆............تمت بالخیر............☆